خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اگست 2015

عید مبارک



سسپنس ڈائجسٹ

مدیراعلیٰ ۔ نذر رسول

07 انشائیہ / جون ایلیا
آزادی کے لمحات اور معنی و مفہوم کا احساس جگاتی تحریر

08 آپ کے خط / مدیراعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

16 رموزِ شاہی / الیاس سیتاپوری
ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

53 بچے سانجھے / کاشف زبیر
خود غرض معاشرے میں ایک جانور کی محبت اور فہم و فراست کا قصہ

72 سودائے جنوں / ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر

105 ناقابلِ گرفت / تنویر ریاض
ایک معصوم کے ہاتھوں ناقابلِ گرفت جرم کا ارتکاب

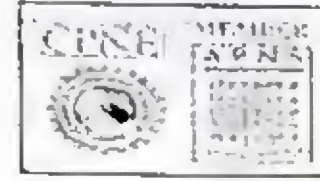
114 سفید پوش / ملک صفدر حیات
دل کے ہاتھوں مجبور اپنی چادر سے پاؤں نکالنے والے ایک سر پھرے عاشق کی دلیری

143 احتجاج شکن / ابوضیا اقبال
دنیا میں کچھ انوکھا کر دکھانے کے خبط میں مبتلا ایک احتجاج شکن کا قصہ

152 محفلِ شعر و سخن / قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

جلد45 • شمارہ 08 اگست 2015 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



155 پہیلی / ابراہیم جمالی
اپنی چاہت سے ترسانے والے ایک شوہر کی برتی محبت کا قصہ

162 ماروی / محی الدین نواب
ایک جزکئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ

209 تحفہ / بابر نعیم
مٹھی میں دنیا کو قید کرنے کے جنون میں مبتلا ایک ہوس زدہ حسینہ کا ماجرا

217 مضبوط فیصلے / مریم کے خان
محبت کا انتقام محبت سے لینے والی ایک حسینہ کی نفرتوں کی انتہا

235 شیخ سما الدین / ضیا تسنیم بلگرامی
فانی دنیا اور باقی آخرت کے فلسفے کو دل میں اتارنے والی ایک برگزیدہ ہستی کی داستان

249 سراب / ڈاکٹر شیر شاہ سید
یک جان دو قالب جوڑے کی تنہائیوں کا قصہ

253 آخری قہقہہ / ثمر عباس
تمام عمر عیش کرنے کے خواب دیکھنے والے کی بے بس تندگی کا احوال

260 راگم / ناہید سلطانہ اختر
تنہائی میں شیطانی کھیل کھیلنے والے ہوس پرستوں کا انجام عبرت

000 کترنیں / ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

روشن خیالی

جون ایلیا

میرا گمان یہ ہے کہ زندگی میں خود کوئی معنی نہیں ہوتے بلکہ پیدا کیے جاتے ہیں۔ انسان کی ساری ہنرمندی، سارے خواب اور خیال اور ساری دانش، یہ سب کچھ زندگی میں معنی ہی کی تلاش ہے۔ سوچا جائے تو موجود ہونا بہت بڑی اذیت اور بہت بڑا عذاب ہے۔ موجود ہونا کیا ہے؟ دم بہ دم گزرتے رہنا اور گزر جانا۔ کیا یہ احساس ایک اذیت اور عذاب نہیں ہے کہ ہم گزر رہے ہیں اور ہم گزر جائیں گے۔ یہ کیسی حسرت ناک رائگانی ہے۔ اس رائگانی کی اذیت اور عذاب کی تلخی کو کم کرنے کے لیے انسان نے اپنے وجود میں ایک نئی جہت تلاش کی، اپنے وجود میں اور اپنے وجود سے باہر۔ یہ معنی کی جہت ہے۔ مہمل میں مفہوم کی دریافت۔ اگر تمام انسان ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہوں اور ان کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے ہوں مگر ان کے وجود میں معنی اور مفہوم ناپید ہوں تو وحشت سے ان کے سینے پھٹ جائیں۔ سو معنی اور مفہوم کی تلاش ہی میں نجات ہے۔ جو لوگ تمہارے لیے ہدایتیں، حکمتیں اور زندگی کے حوالے لے کر آئے، وہ معنی اور مفہوم ہی کی بشارتیں دینے والے تھے۔ معنی ہی وقت کے عذاب کو کم کرتے ہیں ورنہ وقت تو انسان کو پاگل کردے کہ وقت سب سے بڑا آشوب اور سب سے بڑی آشوب ناکی ہے۔ فرد کی زندگی یا گروہوں اور قوموں کی زندگی، معنی کا یہ نکتہ دونوں ہی کے بارے میں درست ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ معنی کو زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر زندگی ندامت اور ملامت کے سوا کچھ بھی نہیں کما سکتی۔

بہتر یہ ہے کہ میں اس گفتگو کو پاکستان کی نسبت سے آگے بڑھاؤں کہ اب یہ ملک اپنی سال بہ سال سالگرہ منا رہا ہے۔ اب سے پہلے کا زمانہ، پاکستان کی زندگی کا پہلا برس، آج سے کہیں زیادہ دشوار اور ناسازگار تھا مگر اس وقت پاکستان کے لوگوں کی زندگی بامعنی تھی۔ وہ معنی کیا تھے؟ ایک مقصد کا احساس اور ایک مثالیے کا شعور، جس نے دلوں میں ایک ترنگ پیدا کردی تھی۔ حیرت ہے کہ اس وقت کوئی واضح منصوبہ سامنے نہ تھا۔ پھر بھی وہ دور جاں فزا سرگرمیوں اور سرشاریوں کا دور تھا۔ اس لیے کہ زندگی بامعنی تھی۔ اسی لیے شروع کے ایک دو برس انتشار اور خلفشار کے باوجود قرینے سے گزر گئے۔ تم چاہو تو تین چار برس کہہ لو۔

پھر یہ ہوا کہ معنی کا خلا پیدا ہوا۔ وہ یوں کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مسلم لیگ کا کام تمام ہو چکا تھا۔ وہ یوں کہ پاکستان ہی مسلم لیگ کا مقصود تھا۔ اس کے بعد کیا ہونا ہے؟ شاید اس کے بارے میں سوچنے کی مہلت نہ پائی جا سکی ہوگی۔ نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ کوئی منشور۔ اس صورت حال میں پاکستان کی سیاست نے جو تیرہ اختیار کیا، وہ سخت حسرت ناک اور انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ مختلف معاملوں کے جو معنی دریافت کیے گئے، دریافت نہیں بلکہ معین کیے گئے۔ ان کا زندگی اور زمانے کی حقیقتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ حکمراں اور سیاست داں ایسے تیمار دار تھے جو بیمار کو نسخے تو پڑھ کر سنائیں مگر دوا نہ پلائیں۔

آنے والے زمانے میں پاکستان جن مشکلوں اور مہلکوں سے دوچار ہوا، ان کی پیش گوئی بڑی آسانی سے کی جا سکتی تھی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شروع کا زمانہ سخت دشوار اور ناسازگار ہونے کے باوجود ایک خاص اعتبار سے ایک بہت درخشاں زمانہ تھا۔ اس سرزمین میں ایک دوسرے کے لیے عام طور پر دردمندی، غمگساری، محبت اور ایثار کے جذبے موجزن تھے۔ یہاں کے پرانے رہنے والوں نے، آنے والوں کا بے حد دل انگیز اور بے مثال استقبال کیا تھا۔ اس سلسلے میں سرزمین سندھ نے اخوت اور برادر نوازی کا جو نمونہ پیش کیا، تاریخ میں اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ لاکھوں انسانوں کا استقبال کرکے انہیں اپنے دلوں اور اپنے دیاروں میں جگہ دینا داستانوں اور افسانوں کی بات لگتی ہے۔ ایسے بے مثال انسانی جذبوں اور دلوں کے اتنے گہرے رشتوں کی فضا میں انسانی سیاست اور شریفانہ ملک داری کے ذریعے ایک بے مثال معاشرے کی صورت گری کرنا بہت آسان تھا مگر بدنصیبی سے سیاست بھی غیر انسانی تھی اور حکومتیں بھی غیر شریفانہ۔ نتیجہ کیا ہوا کہ آنے والوں اور آنے والوں کا گرم جوشانہ استقبال کرنے والوں کے درمیان آہستہ آہستہ نفرت جگہ پانے لگی۔ بہرحال یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے سنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں پیشہ ورانہ سیاست کے شعور سے یکسر محروم ہوں لیکن ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے خوامخواہ دخل در معقولات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے عاجزانہ طور پر جو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کو اپنے دوسرے جنم میں اپنے پہلے جنم کی ایک بنیادی خصوصیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہیے اور وہ خصوصیت کیا ہے؟ وہ خصوصیت قائداعظم کی روشن خیالی ہے جس کا کسی آمریت کے پس منظر سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

.... ❊❊❊ ....

عزیزانِ من السلام علیکم!

اگست 2015ء کا معیاری شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔

14 اگست 1947ء کا دن، خون کی ہولی کھیلتے لمحات و واقعات اور نتیجہ خیز جدوجہد کا اختتام کبھی نہ مٹنے کے لیے نہ صرف تاریخ کے اوراق پر رقم ہے بلکہ اس کے اثرات گزرنے والی نسلوں کی طرح آنے والی نسلوں کے ذہنوں سے کبھی بھی نہ نکل سکیں گے مگر...... سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کے حالات ان اذیتوں کا ازالہ اور حکمران ان لمحات کا حق ادا کر رہے ہیں؟ کیا حکمران اور عوام دونوں بانیٔ پاکستان کے نظریات و مقاصد کی پاسداری کر رہے ہیں؟ تو جواب ہوگا ''ہرگز نہیں'' اور اس مایوسی کی صرف ایک وجہ سامنے آتی ہے کہ یہاں قانون بنانے والے ادارے تو ہیں مگر...... قانون کی بالادستی نہیں۔ جس دن اس ملک میں قانون کا نفاذ اس کی اصل روح کے ساتھ ہوگیا تو یقین ہے کہ اندھیر نگری اور چوپٹ راج کا تاریک دور بھی ختم ہو جائے گا۔ ورنہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہونے والی کیفیت کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اور بے شمار سمجھوتوں میں ابھی یہ قوم ایک خوشگوار اور طاقتور معاشرے کی پرورش کبھی نہیں کر سکے گی۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ ہر چیز اپنے وقت اور مقام پر اچھی لگتی ہے مگر جب زندگی موت سے قبل ختم ہو جائے اور طاقت استعمال سے پہلے کمزور پڑ جائے تو شعور کسی ناگہانی سے آگاہ کرتا ہے جبکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ طاقتور اور زرخیز ذہنوں کے لوگ ملک کی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ ویسے دورِ حاضر میں چند حکومتی اقدامات سے اس خوش آئند بات کا اندازہ تو ہوتا ہے کہ اب رفتہ رفتہ حالات میں سلجھاؤ کی صورت نکلتی جا رہی ہے۔ اگر اسی نیک نیتی سے اصول پرستی پر عمل کیا جاتا رہا تو امید ہے کہ جلد ہی معاشرتی ناسوروں کا قلع قمع ہو جائے گا اور عوام بھی سکھ کا سانس لیں گے۔ قلمی طبقے کا کام ہے بند ذہنوں پر دستک دیتے رہنا۔ سو ہم دیتے رہیں گے اس امید کے ساتھ کہ پانی کا قطرہ تسلسل سے ٹپکے تو پتھر میں سوراخ ہو سکتا ہے۔ پرچے کی تیاری کے دوران عید الفطر کی خوشیاں بھی ساتھ ہیں اگرچہ رمضان المبارک کے ابتدا میں گرم موسم کی شدتوں نے اپنا جلال دکھایا اور کئی معصوم جانوں کا بھی امتحان لے لیا۔ تاریخ میں کبھی کراچی کے موسم میں اتنی شدت اور حدت نہیں آئی جس کا مقابلہ تقریباً ناممکن تھا۔ اب تو اس قوم کے مہربانو! کچھ سوچ لو...... اگر انہیں پانی، بجلی اور طبی امداد جیسی بنیادی سہولتوں سے محروم نہ رکھا جاتا تو شاید ان میں سے بہت سے لوگ اس عید پر ہمارے سنگ ہوتے۔ بہرحال اس غم میں پوری قوم شریک ہے...... اور عید کے لمحات میں اپنے اردگرد ان غمزدہ لوگوں کی دلجوئی بھی ضروری ہے، اللہ انہیں صبر اور حوصلہ عطا فرمائے...... اور اب عید کے بہت سے پیغامات لیے ہمارے دوست احباب ہمارے منتظر ہیں تو چلیے چلتے ہیں اپنی رنگارنگ محفل کی جانب۔

✠ **ادریس احمد خان،** ناظم آباد کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں ''اس ماہ کا سسپنس لانا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ثابت ہوا جس کی اصل وجہ ریکارڈ توڑ گرمی جس طرح لو کے جلتے ہوئے تھپیڑے تھے مگر دوسری طرف سوئے اشتیاق اور محبوب کی دید کے لیے جہدِ مسلسل جس کے سبب سسپنس کا حصول ممکن ہو سکا۔ جون کے مہینے میں بجٹ میں غریب شہریوں کے لیے کوئی خوش خبری نہیں تھی۔ پھر ہیٹ اسٹروک نے ایسی خوف ناک تباہی مچا دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں جانوں کا نذرانہ لے گئی اور درجۂ حرارت بھی پینتالیس ڈگری سے تجاوز کر گیا۔ ایسی گرمی کہ الامان الحفیظ...... شاید ایسی گرمی مزید کئی عشروں تک نہ ہو سکے۔ رمضان شریف کی بھی بابرکت ساعتیں ایسی گرمی کے دوران شروع ہوئیں مگر آفرین آفرین کہ ایسی قیامت خیز گرمی میں لوگ روزے بھی رکھ رہے ہیں اور کارِ دنیا سے بھی لگے ہوئے ہیں۔ احقر بھی شدید متاثر ہوا چونکہ پہلے سے ہی ہاسپٹلائز ہوں لہٰذا اللہ نے بہتری پیدا کر دی۔ (اللہ آپ کو صحتِ کاملہ دے) اگرچہ کراچی میں بارش کے بادلوں نے زور باندھا گھنگھور گھٹائیں چھائیں مگر دھرتی کی پیاس نہ بجھ سکی۔ نلکوں میں بھی گرم پانی آ رہا تھا۔ گویا گیزر کی سہولت مفت میسر آ گئی تھی مگر گرمی کے موسم میں بیکار کہ اس سے کوئی حظ نہیں اٹھا سکتے۔ ٹائٹل گرل بھی نکھرے نکھرے چہرے والی کیل کانٹوں سے لیس شاید آنے والے عید کے چاند کی منتظر ہے۔ جگمگاتی روشنیوں میں عید مبارک بھی نظر آ رہا ہے۔ ہماری طرف سے تمام اہلِ اسلام اہلِ وطن سسپنس کے تمام دوستوں کو پرخلوص پیار بھری مبارک باد اور سلام۔ ذاکر صاحب کو بھی ٹائٹل خوب صورت بنانے پر مبارک باد۔ انشاء پڑھنے دو لفظوں میں تبصرہ کروں گا کہ جس کو آگہی کا احساس ہے وہ تو سارے موسموں کو، دیکھنے اور سمجھنے کی حس رکھتا ہے اور جس کو آگہی کا احساس نہیں وہ بے حس ہے۔ اداریہ میں بھی کوئی خوشی کی بات ہے تو وہ عید اور رمضان المبارک کی نیک ساعتوں کی۔ اپنی محفل میں اعجاز احمد راحیل صاحب کو مبارکباد۔ محمد قدرت اللہ نیازی سے اتفاق کرتا ہوں۔ اندرونی صفحات پر سرشتِ آدم پڑھی۔ جس میں تخت حاصل کرنے کے لیے سگے رشتوں کی محبت بھی پسِ پشت چلی جاتی ہے۔ مقصد صرف اور صرف حصولِ امارت و حکومت ہوتا ہے۔ مگر ایسی ریشہ دوانیاں کرنے والوں کا خود کا بھی برا حشر ہوتا ہے۔ بے ساختہ میں جون کو ہمت سے کام لینے پر حسین ساتھی کی رفاقت میسر

ہوئی اور اسے دونوں جانی دشمنوں سے بھی نجات مل گئی۔ سودائے جنوں میں اسرائیلیوں کی سفاک اور مسلمانوں کی ایمان افروز کارروائیاں جاری ہیں۔ ہیرا پھیری بھی اچھے انداز میں لکھی ہوئی تھی۔ منظر امام کی کاش اچھے موضوع پر لکھی ہوئی تھی۔ محفل شعر و سخن میں معیاری اشعار نے مزہ دیا۔ شکار پور سے شکاگو تک واقعی شکاگو جانے کا اچھا فیصلہ کیا۔ حاصل بھی اچھی کہانی تھی۔ اقوالِ زریں پر مشتمل کترنیں بھی علم میں اضافے کا سبب بنیں۔ دمیت نے بھی اچھا تاثر دیا۔ میٹھے بول سب سے بہتر اثر کرتے ہیں۔ اس میں اپنے پرائے کی تفریق نہیں۔ ولیوں کے حالات میں خواجہ ابواحمد کے حالات نے قلب کو روشنیوں سے منور کیا۔ بھم جو بھی اچھی تھی۔ طاہر جاوید مغل کی رات کا مسافر، بہت زبردست اور بہترین رہی۔ اس کے ساتھ ہی عید کی دوبارہ مبارک باد کے ساتھ رخصت۔''

✠ **رضوان تنولی کریڑوی،** اورنگی ٹاؤن کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''رات کی سیاہ بدلیوں کا سینہ چاک کرتا سپیدۂ سحر دستِ قدرت کی صناعی اور رنگت آمیزی، پرندوں کی سریلی چہچہاہٹ اور پھولوں کی معطر مہکار کے ساتھ روشن چمکیلے دن کی نوید لاتا ہے۔ گزرتے شب و روز کے ساتھ سسپنس کا نکھرتا معیار ادارے کے اعلیٰ حکام کا قابلِ ستائش اقدام ہے۔ کافی عرصے بعد خوب صورت ٹائٹل چھما چھم برس کے من جل تھل کر گیا۔ خوبرو دوشیزہ کے کان کا دل آویز جھمکا اس دور کی یاد تازہ کروا گیا جب جذبے صادق اور محبت خالص ہوا کرتی تھی۔ جون ایلیا کو پڑھنے والا ہمیشہ کے لیے ایلیا کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ ایلیا ایسا جادوگر ہے جس کا جادو موت کے بعد بھی کارگر ہو کے اپنا مرید بناتا چلا جا رہا ہے۔ مدیرہ اعلیٰ جی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا زمانہ اور آقا عمرؓ کا فرمان...... نہر فرات کے کنارے اگر کوئی کتا بھی بھوکا رہ گیا تو اس کا حساب مجھ سے لیا جائے گا اور آج مسلمانوں کی پستی کی وجہ ہماری اپنی کوتاہیاں اور دین سے دوری ہے۔ یارانِ من کو عید سعید کا سلام دوستانہ...... بشریٰ افضل رب کریم آپ کی مشکلات دور فرمائے اور مرحومین کو باغ بہشت میں اعلیٰ مقام نصیب ہو آمین۔ بلقیس خان کا کول تبصرہ سات سروں کی راگنی کا لطف دے گیا کستوری لگا کے۔ مرحوم الیاس سیتاپوری تاریخ سے انمول جوہر پارے منتخب کرتے تھے۔ ابتدائی صفحات مجھے بہت محبوب ہیں۔ انگریزی ادب سے کاشف زبیر نے عمدہ ترجمانی کی کاؤبوائے جون واہ رے تیری قسمت ایڈگر اور شارلی جیسے خونی دشمنوں کے خاتمے کے ساتھ شیبا مقدر بنی۔ سودائے جنوں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے نایاب لفظوں کا وافر ذخیرہ پڑھ کر روح سرشار ہو جاتی ہے۔ تنویر ریاض کی ہیرا پھیری میں برونس کی جھاڑیوں سے برآمدگی لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔ مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے لش پش کیس سوا سیر جاسوسی صلاحیتوں کے مالک وکیل نے کمال مہارت سے چھت والے دروازے کی چابی کا مسئلہ حل کر کے مقتول ساجد کے اصل قاتل داؤد کو چھاپ لیا (زبردست) ڈاکٹر شیر شاہ سید کی شکار پور سے شکاگو تک عمدہ رہی۔ فاروق انجم کی دل پر اثر کرتی کہانی ''حاصل'' کتاب مبین کی سورۃ الناس میں شیطان کی پہچان یوں بیان کی گئی ہے۔ ''جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے اور خناس ڈالتے ہیں وہ جن و انس''...... کہانی میں فراز شیطان ثابت ہوا۔ ماروی میں قبلہ نواب کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ ابراہیم جمالی کی اسٹوری آف منتھ وصیت دل پر گہرا چرکا لگا گئی۔ مسٹر جیمس وارن جیسے تنہائی کے روگی لوگ صرف مغرب تک محدود نہیں، اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی ایسے کئی مظلوم افراد ہمارے اردگرد نظر آتے ہیں۔ جادو نگار مصنف کی رات کا مسافر عاشقوں کے دلوں کو فتح کرتی اختتام پذیر ہوئی۔ محبتوں کے سفیر، محبتوں کے نقیب، محبتوں کے رفیق اور میرے حبیب پیارے طاہر جاوید مغل، قارئین کے من کے راج سنگھاسن پر شہنشاہِ محبت بن کر جلوہ افروز ہو گئے ہیں۔ محفل شعر و سخن میں بلقیس خان اور رمضان پاشا کا انتخاب خوب رہا۔ کستوری لگا کے۔ آخری صفحات کے لیے ڈاکٹر ساجد امجد اور رزاق شاہد کوہلر کی کہانی کی فرمائش کے ساتھ سرورق سے پس ورق تک سسپنس اختتام پذیر ہوا۔''

✠ **قمر صائم،** خوشاب سے تشریف لائے ہیں'' ٹک...... ٹک...... ٹک...... سسپنس کی اس پیار بھری محفل میں اجازت چاہتا ہوں چونکہ مطالعہ کا شوق ورثے میں ملا ہے سو تقریباً پانچویں جماعت سے ہی رسالے چاٹنا شروع کر دیے اور اب تو عرصہ تین سال سے سسپنس کا باقاعدہ مستقل مگر نوجوان قاری ہوں۔ اصل میں میری وابستگی سسپنس سے ناصر ملک صاحب کی مسافر کے بعد ہوئی اور اب تک جاری و ساری ہے۔ میرا تعلق ضلع خوشاب کی تحصیل قائد آباد کے ایک پس ماندہ علاقے (21 ایم بی) سے ہے۔ اس وقت (دمِ تحریر) بھی تھل کی جلتی دھوپ میں شیشم کی تاروں پڑتی چھاؤں میں پسینا پسینا، شوقِ مطالعہ کی آگ ٹھنڈی کرنے میں معروف ہوں۔ اب آتے ہیں ذرا تبصرہ کرنے۔ واہ جی واہ! کیا اسٹائل ہے۔ کانوں میں ہارٹ شیپ جھمکے ڈالے، اونچی ستواں ناک کے ساتھ، تیکھے نینوں سے کسے دیکھ رہی ہیں؟ آج تو طاہر جاوید مغل کی ''رات کا مسافر'' کا کچھ یوں انتظار تھا کہ سب سے پہلے آخری صفحات زیرِ نظر آئے۔ اس کے بعد تو ٹاپ کلاس سودائے جنوں کو بغور پڑھا۔ اس دفعہ نسبتاً مجاہدین کی کامیابی کا تناسب بہتر رہا۔ جتنی سنسنی خیز سودائے جنوں ہے، ایسی آج تک قارئین کی نظر سے نہ گزری ہوگی۔ ماروی بھی لگی بندھی ڈگر پر جا رہی ہے البتہ مراد نے درست فیصلہ کیا ہے۔ ایک دم مردوں والا۔ امجد بیگ صاحب کی سوا سیر بھی خوب رہی۔ ویسے ایک راز کی بات بتاؤں، اپنا جھکاؤ بھی وکالت کی جانب ہے۔ اعجاز بھائی، کرسیِ صدارت مبارک۔ بشریٰ صاحبہ، اللہ عزوجل آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ طالب حسین طلحہٰ بھائی، قدرے دیر سے سہی، آزادی کے شب و روز مبارک ہوں اور آخر میں سب قارئینِ محفل کو ماہِ رمضان مبارک۔''

✠ **محمد صفدر معاویہ**، ضلع خانیوال سے تبصرہ کررہے ہیں ’’جولائی کا شمارہ ہمیں کراچی میں 19 کو ملا۔ اس دفعہ کراچی میں گرمی نے بھی اودھم مچا رکھا ہے میرا تو پہلا سال ہے لیکن بتانے والوں نے بتایا کہ کبھی کراچی میں ایسی گرمی نہیں پڑی بہت ہی برکتوں والا مہینا چل رہا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس کا صحیح طرح سے احترام واہتمام کرنے کی توفیق دے۔ اس دفعہ کا سرورق بہت ہی بیسٹ ہے اور پھر اس سے خوب صورت ماڈل اگر میں کہوں یہ بے جا نہ ہوگا۔ اشتہارات سے کنی کتراتے ایک نظر کہانیوں کے ناموں پر ڈالتے محترم جون ایلیا کے پاس جا پہنچے، دو سوال کیا نقشہ پیش کیا نوعِ انسانی کا۔ جانور کی قدریں انسان سے بہتر ہے وہ لڑائی جھگڑے نہیں کرتا اس کی کوئی جائداد نہیں لیکن انسان ایک مرلہ زمین کی خاطر کئی کئی قتل کردیتا ہے۔ ہم نے انشائیہ کو آنکھوں سے دیکھا، زبان سے پڑھا اور دل میں سمولیا۔ بے شک ایسے لفظوں کی جگہ دل میں ہوتی ہے۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ بجٹ مہنگائی لوڈشیڈنگ اور دیگر امور پر سچا رونا روتے نظر آئے پر جب تک کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جائے حکومتِ وقت کے خلاف نہ ان کے کان پر جوں رینگتی ہے اور نہ آپ کے یا کسی بھی اور کے یہ لفظ ان پر اثر رکھتے ہیں چاہے ہم ان معاملات میں جتنے مرضی صفحات کالے نیلے کردیں، اپنی محفل میں آئے تو برادر محترم عزیز دوست اعجاز احمد راحیل کو کرسیِ صدارت پر اعلیٰ اور جامع تبصرہ کرتا پایا۔ مبارک ہو بھائی سچ کہا غم دیتے بھی اپنے اور بانٹتے بھی اپنے ہیں۔ سید کاظمی صاحب کو سسپنس میں ویلکم کرتے ہیں۔ بشریٰ افضل باجی بے شک یہ جو دکھ ہوتے ہیں بہت ظالم ہوتے ہیں۔ بھلائے نہیں بھولتے، پر کیا کریں موت برحق ہے اور اس ربِ حقیقی کے پاس واپس جانا ہے۔ اپنے پیارے بھولتے نہیں میری ماں کو ہم سے جدا ہوئے گیارہ سال ہونے کو ہیں۔ میں ایک پل کے لیے ماں کو نہیں بھولتا پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مغل صاحب کی رات کا مسافر پڑھی۔ بہت دکھی کرگئی آخری قسط جہاں ہارون بھوکے کو کھانا کھلا کر واپس آیا ابراہیم کو محبت مل گئی تو کوئی دیارِ غیر میں زندگی کی بازی ہار گئے۔ الیاس سیتاپوری سرشتِ آدم لے کر آئے۔ وہی ازلی زر، زن، زمین کے فساد۔ تاریخ کے ایک بڑے باب سے واقف ہوئے۔ جہاں حکومت کے لیے باپ بیٹے کی کوئی حیثیت نہیں قتل کیے جارہے ہیں۔ کاشف زبیر صاحب بے ساختہ لے کر آئے۔ جون سے شروع ہونے والی کہانی میں کئی موڑ آئے پر جیت جون کی ہوئی اور شیبا جیسی جیون ساتھی بھی ملی۔ بھٹی صاحب کی سودائے جنوں کیا کمال اسٹوری ہے۔ سب سے بڑی خوشی نائمہ اور عابد کے زندہ ہونے کے بارے میں جان کر ہوئی۔ باقی تمام پارٹیاں یہودیت کو خاک چٹانے کے لیے پُرعزم اور اپنے ٹارگٹ قریب، براہوا کمال اور جینی لوگوں کے ساتھ۔ لگتا ہے کہ وہ ڈاکٹر کمال کو اپنی گرفت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ تنویر ریاض کی ہیرا پھیری بھی اچھی اسٹوری تھی۔ مرزا امجد بیگ سوا سیر لے کر آئے جہاں بیگ صاحب نے اپنے موکل کو بڑے آرام کے ساتھ جیل سے باہر نکالا اور اصل مجرم کو بھی بے نقاب کردیا۔ ویلڈن بیگ صاحب۔ منظر امام کی کاش ایک جوان اور خوب صورت بیوہ کی غربت کو آشکار کرتی تحریر جس نے بیٹے کے لیے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب اس کو پچھتاوا ہورہا ہے۔ محفلِ شعروسخن عمدہ شعروں سے مزین نعمان شازل واہ کینٹ کا انتخاب اچھا لگا۔ ڈاکٹر شیر شاہ شکار پور سے شکاگو تک لے کر آئے، بہت عمدہ تحریر تھی۔ ملک کے غیر منصفانہ انصاف کو عیاں کرتی ہوئی کہ کس طرح یہاں لاقانونیت ہوتی ہے۔ فاروق انجم کی حاصل جس میں فراز کی دل میں آئی شیطانیت نے اس کا سب کچھ برباد کردیا۔ ماروی اس دفعہ ایک دو نئے کرداروں کے ساتھ تھوڑی درمیانی ٹائپ پر رہی۔ ابراہیم جمالی کی وصیت دکھی کرگئی۔ باقی کترنیں بھی اچھی تھیں۔ تمام دوستوں کے تبصرے بھی بہت عمدہ تھے۔ باقی سسپنس میں تمام نئے آنے والوں کو ویلکم۔ تمام ادارہ کے ممبر اور قارئین کو دلی عید مبارک۔‘‘

✠ **محمد قاسم رحمان**، ابرار کالونی، ہری پور سے شریکِ محفل ہیں ’’طویل انتظار کے بعد سترہ جون کو دوسرے چکر پر جولائی کا سسپنس ملا تو دل کو راحت ملی۔ اس ماہ بھی ٹائٹل بہترین رہا۔ سرورق کی حسینہ شاید مستقبل کے سنہرے سپنے بُن رہی تھی۔ اشتہار کو پھلانگتے ہوئے کہانیوں کی فہرست میں آئے جو بہترین انداز میں سجی ہوئی تھی۔ انشائیہ میں جون ایلیا نے قابلِ غور بات پر توجہ دلوائی۔ اداریے میں ایڈیٹر صاحب نے بھی خوب باتیں کیں لیکن مہنگائی کا زور ایک دن ٹوٹے گا ان شاء اللہ۔ رات کتنی ہی تاریک اور طویل کیوں نہ ہو، صبح ضرور ہوتی ہے۔ ہمارے وطنِ عزیز کے حالات بھی ایک نہ ایک دن ضرور بہتر... ہوجائیں گے اور سیاستدانوں کو عقل آجائے گی۔ اعجاز احمد راحیل نے اس مرتبہ میدان مارلیا۔ مبارک ہو بھائی! محمد صفدر معاویہ برادر کوئی بھی چیز خطرناک نہیں ہوتی۔ ہم خود اسے خطرناک بناتے ہیں۔ افتخار حسین اعوان جون کے تبصرہ اچھا تھا۔ بشریٰ افضل آپ نے تو ٹائٹل گرل کا الٹرا ساؤنڈ کردیا۔ کہیں بھائی بنانے کا ارادہ تو نہیں۔ ٹائٹل کے متعلق آپ کی رائے سے متفق ہوں۔ قدرت اللہ نیازی ڈائجسٹ میں مجھے تین تین بار ویلکم کیا اور فیس بک پر اتنی رکھائی۔ رضوان تنولی کا تبصرہ بھی اچھا تھا، غالباً کستوری لگا کر لکھا گیا تھا۔ کہانیوں کی ابتدا اس مرتبہ رات کا مسافر سے کی۔ ابراہیم اور مہرو کی محبت کے بارے میں پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ایسی بھی ہوتی ہے یہ کم بخت محبت۔ اختتام خلافِ معمول خوشگوار تھا۔ ماروی بھی اچھی جارہی ہے۔ بشریٰ تو مرینہ بنتی جارہی ہے۔ مراد کے بارے میں اتنا کہوں گا پل میں تولہ تو پل میں ماشہ۔ کاش ماروی اور محبوب ایک ہوجاتے تو اچھا ہوتا۔ ویسے نواب صاحب نے عدیل یا عدیلہ کو غائب کردیا کیوں جی! مرزا امجد بیگ نے سچائی کو بے نقاب کیا۔ منزہ اور ساجد کے افیئر کی وجہ سے داؤد کو جیل میں چکی پیسنی پڑے گی۔ بے ساختہ لٹکا سٹک رہی۔ کاشف زبیر ہمیشہ کہانی پر اپنی گرفت کو مضبوط تر رکھتے ہیں۔ کاش اور وصیت ایک ہی طرز کی تحریریں تھیں۔ جہاں وصیت میں بتایا گیا کہ اولاد کیسے بے حس ہوکر والدین کو بھول جاتی ہے وہیں کاش میں والدین کی

مجبوریاں بتائی گئیں۔ سودائے جنوں بھی خوب صورتی کے ساتھ جاری وساری ہے۔ فاروق انجم کم لکھتے ہیں مگر زبردست اور معیاری لکھتے ہیں۔ فراز نے اپنی بیوی سعدیہ کو چھوڑ کر شنا کو اپنانا چاہا پھر وہی ہوا جو ہوتا ہے...... دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا...... ماضی کے جھروکوں میں سرشتِ آدم اچھے تناظر میں لکھی گئی خوب صورت کہانی تھی۔ ہیرا پھیری اور مہم جو نے بھی دل جیت لیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ بھی حسبِ روایت حقیقت میں ڈوبی ہوئی بہترین تحریر لائے۔ اشعار بھی بہت زبردست تھے۔ کترنیں کم ہی تھیں۔ آخر میں سب تبصرہ نگاروں سے یہی کہوں گا۔ چار دن کی زندگی ہے کیا کروگے کسی سے الجھ کر، رہو تو پھولوں کی طرح اور بکھرو تو خوشبو کی مانند۔‘‘

✠ **بشریٰ افضل**، بہاولپور سے محفل میں شریک ہیں ’’18 جون کو سسپنس ملا عید مبارک آپ نے ہم سب کو پہلے ہی دے دی۔ آپ کا شکریہ۔ ٹائٹل گرل نے انسپائر نہیں کیا انکل خوب صورت اور نازک اندام سی گرل بناتے۔ اپنی محفل میں پہنچے ان کی باتیں سنیں انکل آپ ہی مہنگائی کو قینچی سے کاٹ دیں۔ (اگر ہمارے بس میں ہوتا تو پہلی فرصت میں کاٹ ڈالتے) اعجاز احمد راحیل کرسیِ صدارت مبارک ہو۔ خدا آپ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ صحیح کہتے ہیں نا! اپنے ہی گراتے ہیں نشیمن پہ بجلیاں۔ میرے تو اپنے دکھ اتنے ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ پہلے بہن بھائی گئے اب بشریٰ افضل کی باری ہے۔ زندگی اچھی نہیں لگتی۔ مایوس ہوگئی تھی کہ اندھیرے میں ایک روشن ستارہ سسپنس میرے پاس پہنچا۔ اپنا تبصرہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا دکھ درد بھول گئی۔ سسپنس نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ تمام ساتھیوں سے التماس ہے میرے لیے دعا کریں مشکلات ختم ہوجائیں۔ (ان شاء اللہ سب مشکلات ختم ہوجائیں گی۔ اللہ پر بھروسا رکھیں) تمام ساتھیوں اور اہلِ اسٹاف کو عید کی ڈھیروں خوشیاں نصیب ہوں۔ محمد قدرت اللہ نیازی آپ کو کوئی مسئلہ ہے۔ آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے حاصل میں فراز کو اپنے کیے کی سزا مل گئی جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود ہی اس میں گرجاتا ہے۔ وصیت، ایسی اولاد کے لیے بہتر ہے کہ جائداد سے کوئی حصہ ان کو نہ ملے۔ جیمس وارن کی وصیت پسند آئی۔ تصوف میں ایمان افروز واقعات نے دل ودماغ کو معطر کردیا اور معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ شکار پور سے شکاگو تک، ستار نے اپنے دوست کو سمجھایا بہت مگر اس کا ضمیر برداشت نہ کرسکا۔ کسی کو جاب سے ہٹا کر اس کی جگہ لے۔ محفلِ شعروسخن میں معیاری شعر تھے۔ امتیاز احمد انعام کے حق دار ٹھہرے، مبارکاں۔‘‘

✠ **سید عبادت کاظمی**، ڈیرہ اسماعیل خان سے چلے آرہے ہیں ’’خلافِ معمول اس دفعہ سسپنس نے 18 جون کو درشن کرائے۔ عید کی مناسبت سے سجا سرورق دل کے تار چھیڑ گیا۔ حسینہ کی اداس آنکھیں کسی کی یاد دلاگئیں۔ شاید اس کو بھی عید پر ساجن کے آنے کا انتظار تھا خیر سب سے پہلے محفلِ دوستاں میں گئے۔ اعجاز احمد راحیل بہت بہت مبارک ہو۔ وکٹری اسٹینڈ پر براجمان ہونے کی لیکن آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ بیمار تھے خدا پاک آپ کو صحت دے۔ اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اتنی کہ بس...... بشریٰ افضل آپ کا دکھ دل پر محسوس ہوا۔ اللہ آپ کو صبرِ عظیم عطا فرمائیں۔ اس مشکل وقت میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بلقیس خان آپ ادھر بھی، بھئی مان گئے آپ کو۔ سعدیہ بخاری کو بھی یہاں دیکھ کر اچھا لگا۔ قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ چھا گیا۔ سب سے پہلے رات کا مسافر پڑھی۔ یہ کیا آخری قسط جھٹکا سا لگا۔ خیر ابراہیم اور مہرو کی ملن کی خوشی ہوئی۔ عشق انجام کو بہت کم پہنچتا ہے۔ سودائے جنوں میری فیورٹ بنتی جارہی ہے۔ زبیدہ کا حوصلہ قابلِ تعریف ہے۔ اسرائیلی فوج کو خدا غارت کرے۔ ماروی کی تو سمجھ نہیں آتی۔ سرشتِ آدم تاریخ پر مبنی کہانی گرمیوں میں ٹھنڈی پھوار کا مزہ دے گئی۔ اسما قادری کی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ کاشف زبیر آتے ہی چھا گئے۔ ویلڈن جی بے ساختہ لکھنے پر۔ ناصر ملک کی کہانی کا بھی انتظار ہے اور ماہا ایمان جو سسپنس میں لکھتی تھیں کہاں غائب ہیں۔‘‘ (بھئی یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا۔ وہ خود ہی بتائیں گی)

✠ **محمد انعام**، لودھراں سے محفل میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں ’’محفل میں شرکت کرنے والے تمام دوستوں کو عید مبارک ہو۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ یقیناً تمام دوست خوش آمدید کہیں گے۔ خطوط میں محمد یوسف سانول، افتخار حسین اور شفقت محمود کے خط اچھے تھے۔ بشریٰ افضل صبر کریں۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اس دفعہ رسالہ بہت جلدی 16 کو مل گیا۔ کہانیوں کی ابتدا طاہر مغل . . . کی کہانی سے شروع کی۔ کہانی بڑی زبردست تھی۔ آفتاب گل نے فرح کو تو بچالیا لیکن خود کو کمال رشید کی گولی سے نہ بچاسکا۔ بے ساختہ کہانی بہت پسند آئی۔ سودائے جنوں میں اسرائیل مظلوم مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ مجاہدین اسرائیل سے گن گن کر بدلہ لے رہے ہیں۔ منظر امام کی کہانی بہت اچھی تھی۔ شکار پور سے شکاگو میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ دنیا تیزی سے ترقی کررہی ہے اور پاکستان ترقی کرنے کے باوجود ترقی نہیں کررہا۔ سرشتِ آدم پڑھ کے مزہ آگیا۔ ہادی نے اپنے باپ مہدی کو قتل کیا اور ماں نے اپنے بیٹے ہادی کو قتل کیا۔ اگر ماں ہادی کو قتل نہ کرتی تو وہ یحییٰ اور ہارون کو قتل کردیتا۔‘‘

✠ **انجم فاروق ساحلی**، لاہور سے محفل میں شرکت کررہے ہیں ’’اس بار خوشنما تیز رنگوں کے امتزاج سے سسپنس کا ٹائٹل بے حد خوب صورت اور جاذبِ نظر ہے۔ اس کی کشش نے بے اختیار کھینچ لیا۔ محمد صفدر معاویہ صاحب تذکرہ قلم بند کرنے کا شکریہ۔ خطوط کی محفل خوب ہری بھری اور ساتھیوں کی دلچسپی سے بھرپور تھی۔ قارئین اور ادارے کو عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ سندھ و کراچی میں گرمی کی شدت سے ہونے والی ہلاکتوں پر دلی افسوس ہے۔ پہلے روزے والے دن شام کے وقت گرمی کی شدت سے میری اپنی طبیعت بھی بگڑ گئی

تھی لیکن اب گرمی کا زور کم ہو چکا ہے اور اس وقت بارش ہو کر تھم چکی ہے۔ ذاکر صاحب نے سسپنس کے ٹائٹل پر چاند ستارے اور عید مبارک کے الفاظ کو اچھے ڈھنگ سے پیش کیا۔ کہانیوں میں سرشتِ آدم، سواسیر، کاش، حاصل اور رات کا مسافر اچھی اور متاثر کن تھیں۔ محفل شعر وسخن میں اشعار کا انتخاب بھی خوب تھا۔ سودائے جنوں اور ماروی ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

✠ **غلام یاسین نوناری،** چوک سرور شہید سے تبصرہ کر رہے ہیں'' ٹائٹل حسبِ معمول خوب صورت حسینہ کے حسن سے سجا دلکش لگا۔ خطوط کی محفل اپنے جوبن پر نظر آئی۔ اعجاز احمد راحیل بھائی، ہماری طرف سے کرسیِ صدارت کی بے حد مبارک باد قبول ہو۔ آپ کا خط دل کی آنکھ سے پڑھا۔ ایک ایک لفظ موتیوں کے مانند لگا۔ آپ کا اندازِ بیاں آپ کی وسعتِ مطالعہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اعجاز بھائی ایک بات عرض ہے جو اپنے ہوتے ہیں، وہ کبھی غم دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تو خوشیوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں اور جو غم دیں انہیں اپنا کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ تو ہین ہے ان اپنوں کی جو آپ کے لیے اپنا تن من وار دینے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ سید عبادت کاظمی، شفقت محمود کی پہلی شرکت پسند آئی۔ ڈیرہ مراد جمالی سے اپنے جگری دوست زبیر حسین شیخ کا نام محفل میں جگمگاتے دیکھ کر دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ یہ میرا وہ دوست ہے جو دوستی کی روح کو پہچانتا ہے۔ دوستی کر کے نبھانا جانتا ہے۔ میری طرف سے زبیر حسین کو دل کی گہرائیوں سے محفل سسپنس میں خوش آمدید۔ سرشتِ آدم میں عباسی خلافت کے خلیفہ مہدی، ملکہ خیزران، ہارون اور ہادی کا پُرمغز تذکرہ دلچسپ وخوب رہا۔ الیاس سیتاپوری کا اندازِ بیاں، برجستہ وشگفتہ مکالمے اور طنز ومزاح کہانی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ رات کا مسافر میں طاہر جاوید مغل کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ آفتاب گل کی موت نے گم صم کر دیا۔ مہرداد اور ابراہیم کا ملاپ پسند آیا۔ البتہ مغل صاحب کی یہ اسٹوری ان کی سابقہ اسٹوریز سے قطعی مختلف تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی لازوال تحریر سودائے جنوں کے آٹھویں حصے کا مطالعہ کیا۔ کہانی اپنے جوبن پر ہے۔ سب کردار اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔ یہ قسط بھی گزشتہ کی طرح ہنگامہ خیز رہی۔ ماروی میں مراد ماروی سے متنفر ہو کر نئے مشن پر نکل گیا۔ مرینہ کو بھی چکما دے گیا۔ دوسری طرف بلا اور بلی بھی ہنگامے مچا رہے ہیں۔ کہانی ایک دم تیز رفتار ہو گئی ہے۔ محمد فاروق انجم کی تحریر حاصل میں فراز کی شیطانیت اسے لے ڈوبی۔ اسے حاصل کیا ہونا تھا اپنا گھر بھی برباد کر بیٹھا۔ ہوس انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ سواسیر میں بیگ صاحب کی ذہانت وحکمتِ عملی سے بے گناہ ریاض پھانسی کے پھندے سے بچ گیا اور ساتھ ہی اصل مجرم زاہد قانون کے شکنجے میں آ گیا۔ منظر امام کی تحریر کاش مختصر مگر مؤثر رہی۔ کاشف زبیر کی کہانی بے ساختہ سحر انگیز ثابت ہوئی۔''

✠ **محمد جاوید شبیر بربرہ،** علی پور مظفر گڑھ سے لکھ رہے ہیں'' جولائی کا شمارہ 16 جون کو مل گیا۔ ابھی کراچی ودیگر شہروں میں دوستوں کو نہیں ملا۔ ہمیں پہلے مل گیا۔ سارا دن دوستوں کو ان کے خطوط، اشعار کی محفل سے مووی بنا بنا کر send کرتے رہے۔ جن میں ایک صدارت کی کرسی پر فائز اعجاز احمد راحیل صاحب بھی تھے۔ سرورق بہت ہی پیارا تھا۔ ذاکر انکل کے کیا کہنے لیکن عید مبارک پڑھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ عید تو 19 جولائی کو ہونی ہے اور سولہ جولائی کو اگست کا شمارہ آ جاتا ہے۔ عید سے دو دن پہلے ہماری عید کی خوشیاں دوبالا کرنے اور آپ ہمیں اگست کے شمارے میں ہی عید مبارک کہیں، وہ ذرا تازہ مبارک ہو جائے گی۔ (بالکل آپ کی فرمائش پوری ہو گی) میری طرف سے آپ اور آپ کے تمام اسٹاف اور قارئین اور لکھاریوں کو دل کی گہرائی سے عید مبارک قبول ہو۔ آپ کی کھری کھری باتیں پڑھ کر دل نے آپ کے لیے لمبی عمر کی دعا کی۔ واقعی آپ اپنے ہم وطنوں کا دکھ دلی طور پر محسوس کرتے ہیں۔ آپ کی باتیں حقیقت ہوتی ہیں۔ پتا نہیں ہمارے حکمرانوں کو کب عقل آئے گی کہ وہ اس دنیا کے لیے لوٹ مار کر کے پیٹ بھر رہے ہیں۔ اس دنیا کے لیے نہیں سوچتے جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔ اعجاز احمد راحیل کا تبصرہ شاندار تھا۔ اعجاز بھائی صحت کا خیال رکھا کریں۔ سید عبادت کاظمی صاحب ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اشفاق شاہین آتے رہا کریں۔ بشریٰ افضل بہن اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل دے۔ مایوس نہ ہوں اللہ کے پاس ہر کسی نے جانا ہے۔ یہ اٹل حقیقت ہے حوصلہ رکھیں۔ سرشتِ آدم الیاس سیتاپوری کا لاجواب تاریخی ناول تھا۔ کاشف زبیر صاحب کی بے ساختہ بہت ہی دلچسپ تحریر تھی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ تنویر ریاض کی ہیرا پھیری کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ سودائے جنوں کی تو کیا بات ہے۔ عبدالرب بھٹی صاحب کی یہ شاہکار تحریر جب تک پوری قسط نہ پڑھ لیں ہلتے بھی نہیں ہیں۔ ماروی کا اب اینڈ ہی کر دیں۔ رات کا مسافر اتنی جلدی تیسری قسط پر ختم یقین نہیں آ رہا۔ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ کافی لمبا سلسلہ ہوگا۔ واقعی سسپنس کو مان گئے۔ اچانک سرپرائز دینا کوئی آپ کے ادارے سے سیکھے۔ آپ اچانک حیران کر دیتے ہیں۔ بہت کمال کا سلسلہ تھا، رات کا مسافر ایک لازوال کہانی تھی۔ جو ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔''

✠ **ریاض علی البغدادی،** نیوسینٹرل جیل ملتان سے محفل میں شریک ہیں'' جولائی 15ء کا شمارہ 17 جون کو دستیاب ہوا۔ انشائیہ میں محترم جون ایلیا صاحب دو سوال کے تحت دانش بھری باتیں کرتے ہوئے سوالات اٹھاتے نظر آئے۔ درحقیقت بات یہی ہے کہ عقل انسانیت سکھاتی ہے لیکن جب عقل کو بے لگام چھوڑ دیا جائے اور اللہ رب العزت کی طرف سے انسانیت کی راہنمائی کے لیے

تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دیا جائے تو پھر عقل انسانیت سکھانے کے بجائے فتنہ وفساد اور تخریب کا باعث بنتی ہے۔ محفل یاراں میں برادرم اعجاز احمد راحیل اور محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ پسند آیا۔ اس کے بعد الیاس سیتاپوری کی سرشتِ آدم اور ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر نے دل ودماغ کو تر وتازہ کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں کا آٹھواں حصہ بہترین تھا۔ مرزا امجد بیگ کی سواسیر، منظر امام کی کاش اور فاروق انجم صاحب کی تحریر حاصل مزیدار تھیں۔ محفل شعر وسخن میں امتیاز احمد، عبدالقدیر، جاوید اختر رانا، سعدیہ بخاری، بلقیس خان، مہتاب احمد، رمضان پاشا، محمد جاوید عباسی، داؤد اشفاق، شاہین اقبال اور نافع ضیا کا انتخاب شاندار تھا۔ برادرم طالب حسین طلحہ کو آزادی کی فضائیں مبارک ہوں اور ان کے ہمراہی محمد مجاہد عباسی کو بھی آزادی کی فضا مبارک ہو۔ خدائے بزرگ وبرتر برادرم محمد جاوید عباسی کو بھی جلد آزادی نصیب فرمائے (آمین) تمام قارئین نے زور وشور سے رمضان المبارک کی برکتوں اور رحمتوں کو ضرور سمیٹا ہوگا۔ اللہ رب العزت آئندہ بھی سب کو رمضان المبارک کی مبارک ساعتیں نصیب فرمائے۔ آمین۔ بندۂ عاجز کی طرف سے تمام قارئین کو اور بالخصوص مدیرِ محترم کو عید الفطر مبارک ہو۔ اللہ رب العزت سب کو ڈھیروں خوشیاں دے۔ (آمین)''

✠ **محمد حنیف گبول،** نیوسینٹرل جیل ملتان سے شریکِ محفل ہیں'' اس بار جولائی 15ء کا شمارہ بندۂ عاجز کو 18 جون کو ملا۔ آپ کے خطوط میں محمد صفدر معاویہ اور بھائی اعجاز احمد راحیل کا تبصرہ بہترین تھا۔ الیاس سیتاپوری اور ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر نے خصوصی مزہ دیا۔ ماروی نے تو ہر بار کی طرح اس بار بھی بہترین انداز اختیار کیے رکھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں، مرزا امجد بیگ کی سواسیر، منظر امام کی کاش اور ڈاکٹر شیر شاہ کی شکار پور سے شکاگو تک بہترین تھی۔ محفل شعر وسخن میں محمد جاوید عباسی، مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ، داؤد اشفاق، عبدالقدیر، سعدیہ بخاری اور شاہین اقبال کا انتخاب زبردست تھا۔ برادر مکرم طالب حسین طلحہ کو آزادی کی نعمتِ عظمیٰ مبارک ہو۔ امید ہے کہ جس طرح جیل کی چار دیواری کے اندر اپنی مقبول دعاؤں میں یاد فرماتے تھے، اسی طرح آزاد فضاؤں میں بھی اپنی مقبول دعاؤں میں یاد فرماتے رہیں گے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ تمام اسیران کو رہائی والی نعمتِ عظمیٰ عطا فرمائے۔ آمین، ثمہ آمین۔ تمام قارئین کو رمضان المبارک کی مبارک سعادتیں مبارک ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ بندۂ عاجز کی طرف سے تمام قارئین کو عید الفطر کی ڈھیروں مبارکیں ہوں، بالخصوص مدیرِ محترم سمیت تمام سسپنس انتظامیہ کو بھی رمضان المبارک اور عید الفطر مبارک ہو۔''

✠ **محمد خواجہ،** کورنگی، کراچی سے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں'' گزشتہ 2 ماہ سے کچھ نہ لکھ سکا۔ اس دو ماہ میں بڑے بھائی کی وفات ہوئی۔ پھر ہمارے ننھیال میں صرف ایک ممانی تھیں۔ ان کا انتقال ہوا۔ صرف 15 دن بعد بڑی بھابی بھی دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئیں (اللہ ان سب کی بخشش ومغفرت فرمائے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین) پھر رمضان شریف کی آمد کے ساتھ شدید گرمی کی لہر اور 10 گھنٹے کی لوڈشیڈنگ۔ رات کو 2 بجے لائٹ گئی۔ تہجد کی نماز پڑھ کر بیٹھا ہوں اور ایمرجنسی لائٹ میں خط تحریر کر رہا ہوں۔ پتا نہیں بجلی کب آئے۔ ان تمام مشکل حالات میں ایک سسپنس کا سہارا ہے۔ میں اس کو پڑھ کر ذہن کو پریشانیوں سے کسی حد تک دور کر سکتا ہوں۔ جولائی کا شمارہ عید مبارک کے ساتھ موصول ہوا۔ خطوط کی محفل میں پیارے دوستوں اور بہنوں کی جانب سے اظہارِ تعزیت اور بھائی کی مغفرت کی دعا کے لیے بہت ممنون ہوں۔ خاص طور پر بھائی رضوان تنولی کریڑوی کے پیار بھرے انداز نے ایک دفعہ پھر آنکھیں نم کر دیں۔ جولائی کا ٹائٹل، عید کا چاند اور حسینہ کی بے ساختگی میں ہونٹوں کو علیحدہ کرنا پڑا۔ نیچرل لگا۔ سرشتِ آدم، الیاس سیتاپوری جب بھی کہانی کا انتخاب کرتے ہیں خوب کرتے ہیں۔ ایسا رنگ بھرتے ہیں کہ قاری پڑھتے ہوئے دم بخود رہتا ہے۔ جنگیں ہوں یا محلاتی سازشیں، بڑی تفصیل دلکش انداز میں۔ بے ساختہ، کاؤبوائز کی مار دھاڑ سے بھرپور فلم کا مزہ دیا اور آخر کار انجام بھی بہت عمدہ رہا۔ سواسیر، امجد بیگ کے کارنامے اور مجرم کو اپنے مقام تک پہنچانا۔ ان کے کارنامہ جادوگری کا حقیقت میں ہونا۔ اس کہانی میں مجرم چالاکی کے باوجود بیگ صاحب سے نہ بچ سکا۔ ان کی تحقیق اور ذہانت شرلاک ہومز کی فرضی کہانیوں کا حقیقی روپ ہے۔ سودائے جنوں، اسرائیل کی خفیہ اور خطرناک تنظیم کا مقابلہ فلسطینی مسلمان مجاہدوں سے زور آزمائی اور جان ہتھیلی پر لے کر لڑنا اور ان کو نقصان پہنچانا۔ دلوں کو گرما دینے والی داستان ہے۔ لکھنے والے کی عکاسی، حالات کا انتہائی تیزی سے پلٹا کھانا، یہ سب لکھنے والے کا حسن ہے۔ ہیرا پھیری، تنویر ریاض کی ہمت افزا کوشش ایک مغربی معاشرے کی کہانی، بہت جان ڈالنے پر بھی ایک معمولی درجے کی کہانی ثابت ہوئی۔ کوئی چونکا دینے والا معرکہ نہیں تھا۔ کاش، ایک مظلوم عورت کی قربانی کی کہانی۔ ایک اولاد نافرمان، ضدی اور ناسمجھ، کہانی پڑھ کر عورت کی مظلومیت پر ترس اور نافرمان اولاد پر غصہ آیا۔ کیا ایسی بھی اولاد ہوتی ہے جو اپنی ماں پر تھوڑا سا رحم نہ کھائے۔ شکار پور سے شکاگو تک، ڈاکٹر شیر شاہ نے ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی اپنوں میں بیٹھ کر اندرونی زخموں کی نشاندہی کی۔ ہزاروں لوگ پیشہ اور اچھے مستقبل کی تلاش میں اپنی سرزمین کو چھوڑ کر پردیس چلے گئے۔ افسوس واپس آنے کا سوچتے ہیں تو یہاں رہنے والوں نے پیاری سرزمین کو جہنم بنا دیا۔ حاصل، ایک سرپھرے انسان کی کہانی۔ اس کہانی میں ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کی گئی۔ وصیت، ایک دردناک کہانی، آخری عمر میں جب توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اولادیں تنہائی کی عذاب ناک سزا دے کر خود سنہرے سپنے میں کھو جاتی ہیں لیکن اس شخص نے بھی ایسی سزا تجویز کر دی جو دنیا کے لیے مثال بن گئی۔ مہم جو، ایک اچھی تیز رفتار کہانی۔ شکاری اور شکار کی بھاگ دوڑ۔ اس مرتبہ شکار... اپنی ذہانت سے شکاری پر حاوی ہو گیا۔ رات

کامسافر، ایک لاجواب کہانی، ملکوں کی سیر، مصنف کی جادوگر تحریر۔ قدم قدم پر آفتیں اور کامیابی، ناکامی کا سفر لاجواب۔ کہانی کا اختتام دل گرفتگی کے ساتھ، کہانی بہت جلد اختتام پذیر ہوئی۔ محفل شعروسخن میں احمد حسن عرضی، وزیر محمد خان، خرم عزیز اور حنا عروج کا انتخاب زبردست رہا۔ ادارے اور قارئین کو عید مبارک۔''

✠ **فرح گل**، ورابن کلاں سے چلی آرہی ہیں ''سرورق پر حسینہ ماہ جبینہ صراحی دار گردن یاقوتی لب سحر انگیز آنکھیں ستواں ناک خوب صورت اسٹائل لیے عید کی منتظر کھڑی تھی۔ محفل میں انٹری رات کا مسافر کی وجہ سے ہے۔ کہانی کا اختتام ہوا اور ہم اپنی قیمتی رائے سے ادارے کو نہ نوازیں یہ تو ہو نہیں سکتا۔ نہایت ہی بے تابی سے آخری صفحات نے ہماری آنکھوں کو روشنی بخشی۔ ایسی ٹھنڈک ملی کہ روزے کا احساس کم ہوگیا۔ پڑاؤ در پڑاؤ نہایت ہی زبردست اسٹوری۔ طاہر جاوید مغل نے کمال کردیا۔ ویلڈن مغل انکل۔ اس کے بعد ماروی کو اعزاز بخشا جو کہ نہایت الجھتی جارہی ہے۔ حاصل، فاروق انجم ایک نئے انداز کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے۔ پہلے صفحات پر ہادی کے انجام پر افسوس ہوا۔ مغربی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ اعجاز احمد راحیل کا خط پڑھ کر ملے جلے تاثرات دل میں آئے، ہنسی بھی آئی اور صحت کی طرف سے فکر بھی ہوئی۔ اللہ انہیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے (آمین) قاری وقاص کا شعر پسند آیا۔ آخر میں تمام اہلِ پاکستان کو رمضان ...... مبارک ہو اور دل کی گہرائیوں سے ایڈوانس عید مبارک۔ آخر میں یہ کہنا چاہیں گے کہ ہمارا سسپنس میں پہلا خط ہے، آدھا ہضم نہ کر جایئے گا۔''

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن خانیوال سے تشریف لائے ہیں ''جولائی 2015ء کا شمارہ رمضان سے چند روز قبل موصول ہوا۔ حسینہ عید کی مناسبت سے تیار نظر آئی۔ ادارے کی جانب سے بھی ٹائٹل عید مبارک کے الفاظ سے سجا نظر آیا۔ دعا ہے کہ اللہ سب کے لیے رمضان اور عید ایمان و عافیت کا سبب بنائے۔ جون ایلیا انسان کی تعریف ''حیوانِ ضاحک'' کے طور پر کرتے نظر آئے۔ جانور اپنے حریف جانوروں کو ہلاک کر کے فتح کا جشن نہیں مناتے۔ کیا دل چھو لینے والی بات کی ہے جون ایلیا نے۔ اداریہ میں مدیرہ مہنگائی کا رونا روتی نظر آئیں۔ اس ہوشربا مہنگائی نے تو عوام و خواص کو بلبلانے پر مجبور کردیا ہے۔ فروٹ مافیا جتنا سرگرم رمضان میں ہوتی ہے شاید ہی کبھی ہوتی ہو۔ رہی بات بنیادی سہولیات کی فراہمی اور امن و سکون کی تو وہ ملک کے ہر کونے میں ناپید ہو چکا ہے۔ اعجاز احمد کرسیٔ صدارت پر قابض نظر آئے، بیماری نے آپ کے خط کو شاید زیادہ ہی زوردار اور پُراثر بنا دیا کہ صدارت کے حق دار ٹھہرائے گئے۔ مبارک ہو۔ وزیر باتدبیر کا عہدہ میرے شہر کے حصے میں آیا۔ محمد صفدر معاویہ اپنے تیز رفتار تبصرے میں سب کو نمٹاتے نظر آئے۔ صفدر بھائی منظر امام کی سنجیدگی سے ہم بھی خوفزدہ ہیں۔ جب سنجیدہ ہوتے ہیں تو آخری صفحات کے لیے تحریر لکھنا شروع کردیتے ہیں۔ آ کے آپ خود سمجھدار ہیں۔ سید عبادت کاظمی خوش آمدید! کئی نئے تبصرہ نگار سوشل میڈیا کے سسپنس فین کلب میں آنے کے بعد تبصرہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہارون ہیرس، اسد عباس وغیرہ اس کی مثال ہیں۔ اشفاق شاہین! بروقت سسپنس ملنے کا گر ہمارے بھائی صفدر معاویہ کو بھی بتا دیں۔ بشریٰ افضل! اللہ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو صبرِ جمیل دے۔ زیب حسن لگتا ہے آپ ابھی چھڑے ہیں جو ایسا ماحول ترتیب دے لیتے ہیں۔ ہم تو بچوں کے شور میں بھی پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ رمضان پاشا! یہ پھڑ پھڑاتی کہانی کیا ہوتی ہے بھئی؟ سعدیہ بخاری! ایڈیٹر سے گلہ بے جا ہے کیونکہ صنفِ نازک میدان چھوڑ کر بھاگ چکی ہیں۔ رضوان تنولی! ہم نے بھی تبصرہ نگاروں کے تبصرے پڑھ کر ہمت پکڑی اور تبصرے لکھنے شروع کیے۔ محمد جاوید شبیر! تجویز تو بہترین ہے آپ کی ہم اس میں آپ کے ساتھ ہیں۔ سب سے پہلے رات کا مسافر پڑھی ہارون وغیرہ کے ساتھ جو کچھ لانچ والوں نے کیا اور جو کچھ بعد میں ان پر بیتی اس قسم کے واقعات کئی بار اخبارات کی زینت بھی بن چکے ہیں۔ ابراہیم اور مہرو کے ظن نے ہارون کو بھی گھر والوں سے ملوا دیا۔ جعفر سے بے وقوفانہ ملاقاتوں نے آخرکار رنگ دکھا دیا۔ جعفر کے ہاتھوں ہارون کی پٹائی کچھ زیادہ ہی کروادی گئی ہے۔ محی الدین نواب لگتا ہے میرے تبصرے شوق سے پڑھتے ہیں کہ ماروی میں ایک کردار کا نام ہی قدرت اللہ رکھ دیا ہے بلا اور للی کے ایکشن اچھے لگے۔ مراد اور چھپت راؤ کا دشمنوں کے خلاف جوڑ زبردست رہا۔ ماروی اپنی ابتدائی کوفت ختم کرنے میں کافی کامیاب نظر آئی۔ کاشف زبیر کی ترجمہ شدہ بے ساختہ میں گھوڑوں پر فرار اور تعاقب نے مزہ دیا۔ جون کے اپنے بچاؤ میں کیے جانے والے قتل ایڈگر اور شارلی کی تباہی کا سبب بن گئے۔ مرزا امجد بیگ کی سواسیر میں واؤد کا ردِعمل مجرمانہ لیکن فطری تھا۔ ساجد کی فطرت کو اچھی طرح جانتے ہوئے داؤد کا فرض تھا کہ منزہ کو اس سے بچائے تاہم بچاؤ کا طریقہ غلط تھا۔ شکار پور سے شکاگو تک میں پاکستانی معاشرے کی حقیقت بیان کی گئی کہ سہولت حاصل کرنے کے لیے دیہی علاقے کا رہائشی سرٹیفکیٹ بنایا جاتا ہے جبکہ اسی دیہی علاقے میں رہ کر اس کی ترقی کی کوشش نہیں کی جاتی۔ فاروق انجم کی حاصل میں فراز نہ ثنا کو حاصل کرسکا اور نہ ہی سعدیہ اس کے پاس رہی۔ ثنا کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں یہ بھی بھول گیا کہ اس کی غلط بیانی کسی بھی مرحلے پر کھل سکتی ہے۔ فراز کے ساتھ وہی ماجرا ہوا۔ ادھر کے رہے، نہ ادھر کے۔''

✠ **سید محی الدین اشفاق**، فتح پور، لیہ سے چلے آرہے ہیں ''کراچی میں گرمی کی شدت کی وجہ سے ہونے والی اموات پر دل غمگین ہے۔ مگر ہمارے حکمرانوں کو آپس میں ہونے والی سیاسی چالوں اور چپقلشوں سے فرصت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اچھے حکمران

سسپنس عید کی مبارک دے رہا تھا۔ ذاکر انکل نے کیا خوب ٹائٹل گرل بنائی۔ سچ میں اتنی خوب صورت لڑکیاں نہیں نظر آتیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا کے دو سوال سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اداریہ میں ایڈیٹر کی عید پر ہونے والی مہنگائی کی نشاندہی سے کلی طور پر متفق ہوں۔ رات کا مسافر میں طاہر جاوید مغل نے دینی و دنیاوی دونوں طرح کا منظر دکھا دیا۔ ہارون نے دو محبت کرنے والوں کو ملا دیا۔ لگتا ہے جاسوسی سسپنس کا لافانی دور پھر سے شروع ہونے والا ہے۔ طاہر جاوید مغل، اسماء قادری کی تحاریر آنے والی ہیں اگر ناصر ملک اور کاشف زبیر سے بھی سسپنس میں قسط وار ناول کی فرمائش ہو تو؟ ماروی میں ایک کالم اچھا ہے تو دوسرا بور ہے۔ اس بار سواسیر میں بیگ صاحب کا کارنامہ اچھا تھا۔ خطوط کی محفل میں اعجاز راحیل بیمار ہو کر بھی چھائے ہوئے تھے۔ محمد صفدر آپ کی باتوں سے متفق ہوں۔ سید عبادت کاظمی جی آیاں نوں، افتخار اعوان ایسا کیا مسئلہ تھا کہ محفل سے کنارہ کرنے کا سوچا؟ نیازی صاحب چھائے ہوئے تھے۔ سعدیہ بخاری اور رضوان تنولی اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتے نظر آئے۔ اس بار سسپنس زبردست تھا۔ سب کو عید مبارک ہو۔''

✠ **قاضی عرفان احمد عاجز**، آزرہ، جوا سیدن شاہ سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں ''1995ء سے سسپنس کا قاری ہوں مگر کبھی آپ کی محفل میں شرکت نصیب نہ ہوئی۔ حالانکہ محفل شعروسخن میں کبھی کبھی حاضری لگواتا رہتا ہوں۔ سیانے کہتے ہیں کہ جس رستے پہ انسان چلنا چھوڑ دے، وہ رستے مٹ جاتے ہیں تو ہماری کوشش ہے کہ اپنے اور اپنے سسپنس تک کا جو رستہ ہے وہ کبھی مٹنے نہ دیں (بہت شکریہ اس اپنائیت کا) آج جس چیز نے خط لکھنے پر مجبور کیا، وہ ہے ہماری بہن بشریٰ افضل صاحبہ کا دکھ اور ہمیں بھی یقین کریں بشریٰ صاحبہ! آپ کے عزیزوں کی وفات کا بہت بہت دلی افسوس اور دکھ ہوا۔ اللہ آپ کے عزیزوں (مرحومین) کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ یہ اللہ پاک کا نظام اور قانون ہے کہ ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک آپ کو صبر، ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین۔ سرورق بہت ہی خوب صورت لگا۔ حسینہ ہونٹوں پر سرخی، آنکھوں میں کاجل اور کانوں میں خوب صورت دل کی شکل والے ٹاپس لٹکائے کچھ خوش، کچھ حسرت اور کچھ امید لیے عید کے چاند کو دیکھ رہی ہے۔ جون ایلیا نے حضرتِ انسان کو انسانیت کا مطلب سمجھایا۔ اب بھی انسان نہ سمجھے تو انسان اور حیوان میں فرق نہیں رہتا۔ محفل شعروسخن کے کیا کہنے ہر شعر لاجواب ہوتا ہے۔ سرشتِ آدم پڑھی۔ والدین اور اولاد کی محبت تو مثالی ہوتی ہے چلیں اولاد نافرمان سہی ماں بھی اپنے بیٹے کے گلے پہ چھری پھیر سکتی ہے۔ یہ اقتدار کی ہوس اور لالچ بہت ہی بری چیز ہے۔ سودائے جنوں میں بھٹی صاحب جذبۂ جہاد کو ابھار رہے ہیں۔ خدا کرے ہر مسلمان کا ذہن اور دل علی، باقر، لیلیٰ، خالد، دانیال، زبیدہ اور محسن کی طرح ہو جائے تو کفر ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو کے رہ جائے۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی چالاکیاں پڑھیں۔ مرزا صاحب ایک بات تو بتائیں۔ ٹھیک ہے آپ بہت زیادہ ذہین، ہوشیار اور منجھے ہوئے وکیل سہی مگر پھر بھی آپ انسان ہیں، کبھی کبھی کسی کو سمجھنے میں انسان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ کیا کبھی ایسا ہوا کہ آپ آخر تک اپنے مؤکل کو حق پہ سمجھتے رہے مگر جب نتیجہ نکلا تو آپ کا مؤکل قصوروار نکلا ہو اور آپ ہار گئے ہوں۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ سسپنس کی پوری ٹیم اور تمام قارئین کو دلی عید مبارک۔''

✠ **اطہر حسین**، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں ''یوں تو ہم پڑھنے کے چور رہے ہیں لیکن کیا کریں اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ ڈائجسٹ پڑھنے کو نہ ملے تو بے چینی رہتی ہے۔ وہ بھی سسپنس یعنی پڑھنے کے لیے سسپنس ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے علاوہ کسی ڈائجسٹ کو پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ خیر اس دفعہ ڈائجسٹ 16 جون کو خریدا۔ مگر فوری طور پر پڑھ نہیں پائے۔ اور پھر اسی دوران رمضان شروع ہوگئے۔ اس دفعہ تو سورج سر پر تھا۔ شدید گرمی نے لوگوں کو بے حال کردیا۔ کئی لوگ گرمی کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے۔ لوڈشیڈنگ اسی طرح تواتر سے ہوتی رہی بلکہ مزید زیادہ ہوگئی۔ تقریباً پندرہ سو سے زائد افراد چل بسے مگر ہمارے اربابِ اقتدار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ہم اسے سفاکی ہی کہیں گے۔ کیونکہ جو لوگ اپنے دل میں دوسروں کا درد نہیں رکھتے ہماری نظر میں وہ سفاک ہی کہلائیں گے۔ مزید برآں عوام پر اضافی مہنگائی کا بوجھ ڈال کر اسے ہر طرح سے کچلنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ حکومت کا بس نہیں چل رہا کہ وہ غربت کے بجائے غریب ہی کو ختم کردے۔ بہرحال اللہ ہم سب پر رحم فرمائے اور اعلیٰ ایوانوں میں بیٹھنے والوں کو لوگوں کا درد محسوس کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس دفعہ کا سسپنس پوری شان سے جلوہ گر تھا۔ سب سے پہلے سرشتِ آدم پڑھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ کاشف زبیر کی بے ساختہ میں کاؤبوائز کو دکھایا گیا۔ یوں لگا کہ پرانی انگلش فلم دیکھ رہے ہیں۔ منظر امام کی کاش سب سے بہترین کہانی تھی۔ مختصر مگر جامع ..... ڈاکٹر شیر شاہ نے ایک مرتبہ پھر تلخ حقیقت کا سامنا کرایا۔ رات کا مسافر کا آخری حصہ پڑھا۔ ایسا لگا کہ کہانی کو جلدی سمیٹ دیا گیا۔ بہرحال کہانی بہت اچھی تھی۔ ماروی بس ہمیں کچھ خاص نہ لگی۔ بس چل رہی ہے۔ اس کے علاوہ مرزا امجد بیگ کی سواسیر بھی ٹھیک تھی۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ انشاء اللہ زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گے۔ تمام قارئین کو اور ادارے کو ہماری طرف سے ڈھیر ساری دعائیں اور عید کی مبارکباد۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

عقیل الرحمٰن، کورنگی، کراچی۔ راحیل نواب، ملتان۔ علیم الدین، نارتھ کراچی۔ رؤف علی، لاہور۔ عنبرین حسن، سکھر۔ کہکشاں فاروقی، سیالکوٹ۔ منور حسین، سیالکوٹ۔ احمد خان، راولپنڈی۔ محمد احسن، کراچی۔ عامر حفیظ، دادو۔ صبیحہ تبسم، ملتان۔ تسلیم رضا، لاہور۔



رموزِ شاہی

ایس اے سیتا پوری

تاریخ میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو تول کے دھنی تو تھے لیکن حالات کے دھارے کے آگے زیادہ دیر ثابت قدم نہ رہ سکے، انہی لوگوں میں ہادی، خیزران اور ہارون کی مثلث بھی ایسی ہی گزری ہے جس کا ہر زاویہ ایک نئی داستان بیان کرتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہادی کے رفیق ابراہیم کی وفاداریوں سے وابستہ ہے۔ طاقت کے نشے میں انسان جب عتاب بن کر کسی پر نازل ہوتا ہے تو پستی کی کتنی گہرائی میں چلا جاتا ہے اس کا اندازہ اسے خود بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو حریف کے حوصلے آزمانے کی خواہش میں بس ایک جنون کی طرف گامزن ہوجاتا ہے جیسے کہ ہارون نے کیا... ہادی کے دوست احباب کو ایک تاریک اور گہرے کنویں میں قید کرکے اس نے گویا اپنی بادشاہت کو سجدہ کروا لیا تھا... اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کھلے آسمان میں سانس لینے سے بھی ترس جاتے۔ ان تمام واقعات کے پیچھے ایک عجیب و غریب فطرت کی مالک ایسی ماں کا ہاتھ تھا جس کے دونوں ہی بیٹے سگے تھے مگر ایک دل سے اترا ہوا دوسرا دل پر چڑھا ہوا... جانے یہ سب کیسے اور کیونکر ہوا مگر... یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں ایسا ہوا...

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ابراہیم موصلی اپنے گھر کی چار دیواری میں مقید ہوگیا، اسے مرحوم خلیفہ ہادی کی نوازشیں یاد آرہی تھیں۔ اس کو اپنی برگشتہ قسمت پر غصہ آرہا تھا جس نے اوج ثریا سے تحت الثریٰ میں پھینک دیا تھا۔ اس نے کبریا کے بارے میں کیسی کیسی خوش فہمیاں قائم کرلی تھیں کیونکہ ہادی نے گزشتہ رات اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ اگر وہ اپنے منصوبوں اور ارادوں میں کامیاب ہوگیا تو اس خوشی میں کبریا اس کو بخش دی جائے گی لیکن ہادی کی غیر متوقع اور بے موقع موت نے اس کی امنگوں اور خوش فہمیوں کا خون کردیا تھا۔ وہ عیسیٰ باذ کے قصرِ ابیض میں مزید قیام نہ کرسکا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر چپ چاپ بغداد چلا گیا۔ وہ اپنے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوا، اس کے آلاتِ موسیقی قصرِ ابیض ہی میں رہ گئے تھے۔ وہ سوگوار صورت لیے اپنی ماں اور بیوی کے سامنے پہنچا تو دونوں کے دل ہول گئے۔ ماں نے ابراہیم کے سہمے ہوئے چہرے کو خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ”ابراہیم! کیا بات ہے تو سہما ہوا کیوں ہے؟“

ابراہیم کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی، زبان لرز رہی تھی، دل بیٹھا جارہا تھا، ماں کی پرسش نے زخمی دل کو کرید کر رکھ دیا۔ آنکھیں پرآشوب ہوگئیں اور موتی لڑھک لڑھک کر رخساروں پر بہنے لگے۔ مرتعش آواز میں جواب دیا۔ ”ماں! میں ایک بار پھر یتیم ہوگیا۔“

ماں نے پوچھا۔ ”ابراہیم! مجھے گالی نہ دے۔ میں نے تیرے باپ کی وفات کے بعد پہاڑ جیسی جوانی بیوگی میں گزار دی پھر تو دوبارہ کس طرح یتیم ہوگیا؟“

ابراہیم نے ماں سے نظریں چرالیں، بولا۔ ”ماں! امیر المومنین ہادی رات رحلت فرماگئے۔ میری قسمت اور ہادی کی موت نے مجھے میرے مربی سے محروم کردیا۔“

بیوی نے منہ بنا کر کہا۔ ”ایک ہادی مرگیا تو کیا ہوا، دوسرا آجائے گا۔ تیرا فن تیرا ہنر تو نہیں مرگیا، اس کو زندہ رکھ ایک کے بعد دوسرا مربی پیدا ہوجائے گا۔“

ابراہیم نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ ”تو چپ رہ نادان عورت۔ ہادی کے بعد جو شخص امیر المومنین کہلائے گا، وہ میرے خلاف کینہ و حسد رکھتا ہے کیونکہ میں نے ہمیشہ اس پر مرحوم ہادی کو ترجیح دی تھی اور اب جو شخص اس کا وزیر بنے گا، میں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے، اس لیے میں ان دونوں سے اپنی فلاح و بہبود کی امید نہیں کرسکتا۔“ ابراہیم نے اپنے ساتھ اپنی ماں اور بیوی کو بھی فکرمند کردیا۔

ظہر سے پہلے ہی ہارون رشید کی سواری بغداد میں داخل ہوگئی۔ خلافت کے منادیے امیر المومنین کی تشریف

آوری سے پہلے ہی مطلع کر چکے تھے۔ ابراہیم کا خیال تھا کہ اہلِ بغداد ہادی کی اچانک موت کے پیچھے موجود سازش کو غم و غصے سے محسوس کریں گے اور اس کا اظہار شورش اور ہنگاموں سے کریں گے۔ اس نے بغداد کی اس شاہراہ کے دونوں طرف، جس سے ہارون کی سواری گزرنے والی تھی، لوگوں کے سیلِ رواں کو ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ شاہراہ کے متوازی مکانوں اور بڑی بڑی عمارتوں کی چھتیں عورتوں، مردوں اور بچوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ سڑک کے کنارے درختوں کی موٹی موٹی شاخوں پر انسانوں کا جمگھٹا مشرقی افق پر نظریں جمائے ہوئے اس نقطے کو دیکھ رہا تھا جو آہستہ آہستہ بڑا ہوتا جا رہا تھا اور جس کے اٹھے ہوئے تیروں کی چمک دار شعاعیں سورج کی شعاعوں سے نظروں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ ابراہیم بھی ایک درخت پر چڑھ گیا۔ وہ ہارون رشید کی گزرگاہ میں اس لیے آ گیا تھا کہ شاید اس قافلے میں کہربا بھی موجود ہو اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھ لینے میں کامیاب ہو جائے۔

کچھ دیر بعد ہارون اپنے ہمراہیوں کو لیے ہوئے قریب آ گیا۔ ہجوم بے قابو ہو گیا۔ ہر طرف سے تکبیر و تہلیل کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ابراہیم کی توقع کے برعکس ہجوم نئے خلیفہ کا جوش و خروش سے استقبال کر رہا تھا۔ بغداد کے ابنائے انصار کے بعد بنو عباس کی سر برآوردہ اور معزز شخصیتیں نظر آنے لگیں۔ انہوں نے اس میلے جیسے ہجوم کو فخر و خوشی کے ملے جلے جذبات سے دیکھا اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ ان سر برآوردہ اور معزز شخصیتوں کے درمیان میں اکیس بائیس سالہ ہارون رشید سیاہ لباس میں ملبوس جواہر دار دستہ کی تلوار لٹکائے مسکراتا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کا شاندار گھوڑا اس شان اور وقار سے چل رہا تھا گویا اس کو کان میں بتایا گیا تھا کہ اس کا راکب نوجوان، خوش جمال اور خوش قامت امیر المومنین ہے۔ نیزوں اور تلواروں نے ہارون رشید کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ہارون اپنے بے تاب استقبالیوں سے بہت خوش تھا۔ ابراہیم نے ایسا محسوس کیا کہ گویا ہارون اس کو دیکھ لے گا۔ اس نے شتر مرغ کی طرح اپنے سر کو ہرے ہرے پتوں میں چھپا لیا۔ اس خیال سے کہ اگر وہ ہارون کو نہیں دیکھ رہا تو ہارون بھی اسے نہیں دیکھ سکے گا۔

ہارون کے بعد افسران فوج کی قطاریں، جن کی تلواروں اور نیزوں کی چمک سے تماشائیوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے سنجیدہ چہروں پر درشتی اور شجاعت کی علامتیں لیے بڑی تمکنت سے گھوڑوں کو چلا رہے تھے۔ افسرانِ فوج کے بعد فقہا، قضاۃ، علما اور منصب دارانِ دربار کی سواریاں تھیں، یہ سب خوش اور بشاش تھے۔ ابراہیم کو زمانے کی بے مہری اور بے وفائی پر رونا آ رہا تھا۔ اس کو اہالیانِ بغداد کی بے حسی اور احسان ناشناسی پر غصہ بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا جنہوں نے ہادی جیسی فن شناس اور مردم آگاہ ہستی کو چند گھنٹوں کے اندر ہی اندر اپنے ذہن اور حافظے سے نکال باہر کیا تھا۔ انہی سواریوں میں یحییٰ برمکی بھی دکھائی دیا۔ یہ پچاس سالہ ذہین اور فکر رسا کا حامل برمکی مطمئن اور فاتحانہ شان سے سیاہ گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ کبھی کبھی ادھر ادھر دیکھ کر مسکرا دیتا۔ ابراہیم اس ہجوم میں محمل بردار اونٹوں کی قطاریں تلاش کر رہا تھا جن میں قصرِ ابیض کی کنیزیں قصرِ خلد کی طرف محوِ سفر ہو سکتی تھیں۔ ان میں سے کسی ایک میں کہربا بھی ہو سکتی تھی چنانچہ سب کے آخر میں اونٹوں کی قطاریں نمودار ہوئیں۔ ان پر محمل کسے ہوئے تھے۔ سیاہ اور سفید محمل اونٹوں کی پشت پر کوہان کی طرح ابھرے ہوئے تھے جو اونٹ کی بے ہنگم چال سے جھٹکوں کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ ابراہیم نے ان محملوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اور چند چہرے دیکھ لیے، وہ تڑپ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی قوتِ بینائی سے، ان جھانکتی آنکھوں اور نمودار چہروں میں کہربا کو دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ بہت مایوس ہوا اور بارِ غم سے گردن جھکا لی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا کہ کہیں کہربا ان میں شامل نہ ہو جن پر ہادی کی حمایت اور وفاداری کا الزام عائد کیا گیا ہوگا۔ اس کے خیال میں اگر ایسا ہوا ہوگا تو ان میں کہربا ضرور شامل ہوگی۔

دوپہر کے بعد جب وہ تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا تو وہ اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ اپنی ماں یا بیوی کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر دل بہلاتا، وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اپنے سازوں کو حسرت و یاس سے دیکھنے لگا جو ہادی کی موت کے بعد ابراہیم کی طرح یتیم ہو گئے تھے۔ مایوسی اور جذبات کی شدت نے اسے اس پر آمادہ کر دیا تھا کہ وہ تمام آلات کو توڑ کر پھینک دے تاکہ ہادی کے بعد کوئی دوسرا ان سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ وہ ہارون اور یحییٰ سے بہت ناراض تھا اور اس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ اب وہ کسی دربار سے کوئی تعلق نہ رکھے گا۔ اس تخلیے اور ہجوم حسرت و یاس میں بھی اگر کوئی اس کا ساتھی تھا تو وہ کہربا کا خیال تھا۔ اس کو یہ فکر بھی پریشان کر رہی تھی کہ کہربا

کو خواہ مخواہ دکھ جھیلنا پڑ رہے ہوں گے۔

وہ شام تک کمرے میں بند پڑا رہا۔ دنیا رات کی سیاہ چادر اوڑھ رہی تھی۔ گھروں میں چراغ جل چکے تھے لیکن ابراہیم کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کو رات کی آمد اور کمرے کی تاریکی کا اس وقت علم ہوا جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہوتی رہی اور اس کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتی رہی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کے پاس کھڑے ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

باہر سے جواب دیا گیا۔ ”میں ہوں تیری بیوی۔ یہ اندر اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے؟“

دروازے کی درز سے روشنی کی کرنیں کمرے میں داخل ہونے لگیں۔ ابراہیم نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی بیوی چراغ لیے اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے؟“

ابراہیم نے ہاتھ کے اشارے سے بیوی کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا، بولا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ ان بدلے ہوئے حالات میں اپنی معیشت اور روزی کے لیے کیا کرنا چاہیے؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”میں تمہاری طرح نہ تو مغنی ہوں اور نہ ہی کچھ اور لیکن میں تمہیں یہ رائے ضرور دے سکتی ہوں کہ تم نئے امیر المومنین سے ملو اور اپنے لیے کوشش کرو۔“

ابراہیم تلملا گیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، بولا۔ ”اس شخص سے ملوں جس نے ہادی جیسے مخلص اور ہنر پرور کو سازش سے ہلاک کر دیا۔ ایسا نہیں ہوگا۔“

اس دوران ابراہیم کی ماں بھی وہیں پہنچ گئی۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے کمرے کے دروازے پر کھڑی دونوں کی باتیں سنتی رہی پھر اندر داخل ہو گئی اور پوچھا۔ ”یہاں کون سا مسئلہ زیرِ غور ہے اس وقت؟“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”ماں! میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہادی کے بعد نہ تو میں گاؤں گا اور نہ کوئی ساز بجاؤں گا۔“

ماں نے حقارت سے جھڑک دیا بولی۔ ”یہ عہد عقل و تدبر کے خلاف ہے اور جب کسی عہد کا نبھانا ناممکن ہو تو اس سے پہلو تہی کر لینا ہی بہتر ہے۔ ابراہیم! میری بات ذرا غور سے سن، میں کہتی ہوں کہ تو نے اپنے آپ سے جو عہد کیا ہے اس پر زندگی بھر قائم نہیں رہ سکتا۔“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”لیکن ماں میں اس پر قائم رہ کر دکھاؤں گا۔“

ماں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ”ناممکن، ایسا ناممکن ہے۔

تاریخ کے اوراق سے

رات کا پچھلا پہر تھا۔ دو آدمی اپنی میٹھی نیند قربان کر کے شہر کا گشت لگا رہے تھے، ایسے میں انہیں چوک میں کوئی کھڑا نظر آیا، وہ سرکاری لیمپ کے نیچے کھڑا تھا، یہ اس کے نزدیک پہنچے تو معلوم ہوا وہ دس بارہ سال کا ایک لڑکا ہے اور اپنا سبق یاد کر رہا ہے۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ”تم دن کے وقت مدرسے میں نہیں پڑھتے کہ رات کے وقت یہاں کھڑے سبق یاد کر رہے ہو؟“

اس کی بات سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کہنے لگا۔ ”میرے والد مسلمانوں کے بادشاہ کے ہمراہ جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں، میرے والد ہمارے لیے کوئی سرمایہ نہیں چھوڑ گئے، اس لیے میری والدہ سارا دن ٹوکریاں بناتی ہے میں ان کو بازار میں بیچتا ہوں، اس لیے دن میں میرے پاس پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا، میں روزانہ صبح سویرے فجر کی نماز کے بعد محلے کے قاری صاحب سے سبق لیتا ہوں، رات کو یاد کر کے صبح انہیں سنا دیتا ہوں، میرا اور بادشاہ کا فیصلہ تو اللہ کی عدالت میں ہوگا میں وہاں بادشاہ کا گریبان پکڑ کر عرض کروں گا۔ یا رب العزت اس بادشاہ نے تیرے راستے میں شہید ہونے والے مجاہد کے گھرانے کی ذرا بھی خبر گیری نہیں کی، اس کے محل میں تو ہزار ہا چراغ جلتے تھے لیکن مجھے گھر میں چراغ نہ ہونے کی وجہ سے سرکاری لیمپ کی روشنی میں پڑھنا پڑتا تھا۔

ان دو آدمیوں میں سے ایک خود بادشاہ تھا، وہ بچے کی باتیں سن کر بہت شرمندہ ہوا، اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میں ہی تمہارا بادشاہ ہوں مجھے معاف کر دو۔ اگر تم نے میری شکایت اللہ کے دربار میں کر دی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا، ساتھ ہی بادشاہ نے فرمان جاری کر دیا، اس بچے اور اس کی والدہ کو شاہی محل میں جگہ دی جائے اور بچے کو شہزادوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے مکتب بھیجا جائے۔“

’دنیا اس بادشاہ کو محمود غزنوی کے نام سے جانتی ہے۔‘

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریز دئی،
اورنگی ٹاؤن، کراچی

اگر تو صاحبِ اختیار ہوتا تو میں کسی حد تک تیری بات پر یقین کر لیتی۔"

ابراہیم نے عرض کیا۔" ماں! کیا میں اپنے عہد میں صاحبِ اختیار نہیں ہوں...... آپ نے یہ کیا بات کہہ دی؟"

ماں نے جواب دیا۔" تو میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ صاحبِ اختیار سے میری مراد یہ ہے کہ تو خلافتِ عباسی کا ملازم ہے، حکم خلافت کا چلے گا، وہاں تیرا عہد نہیں چلے گا۔"

ابراہیم نے درشتی سے جواب دیا۔" ماں! میں نے جو عہد کر لیا ہے اس سے خلافت اور امیر المومنین بھی خوف زدہ ہو جائیں گے اور مجھے میری مرضی کے خلاف کسی بھی کام پر مائل نہیں کر سکیں گے۔"

ماں نے طنزیہ کہا۔" ابراہیم! ناتجربہ کاری کی باتیں نہ کر۔ امیر المومنین ہارون اور یحییٰ برمکی تجھ کو جبراً اور حکماً بلوا لیں گے۔ اگر تو انکار کرے گا تو وہ قید کر دیں گے۔"

ابراہیم نے اپنی ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے، بولا۔ "ماں! میں بے حد پریشان ہوں، مجھ کو مزید تنگ نہ کیجیے۔"

ماں نے اپنی بہو کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔" بہو! اس کو سمجھا، اگر یہ اپنے اس حال پر قائم رہا تو خود تو خسارے میں رہے گا ہی، اپنے ساتھ ہمیں بھی پریشان کر دے گا۔ میں واپس جا رہی ہوں لیکن اپنی دوسری ملاقات میں، میں یہ ضرور سننا چاہوں گی کہ ابراہیم نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور خلافت سے تعلق استوار کر لیا ہے۔"

ماں چلی گئی اور ابراہیم اور اس کی بیوی میں بحث و مباحثہ شروع ہو گیا لیکن ابراہیم اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ اگر دربارِ خلافت سے کوئی بلاوا آجائے تو اس کو صاف منع کر دیا جائے کہ میں نہیں مل سکتا۔

بیوی نے جاتے جاتے بیزاری سے کہا۔" اگر ایسا ممکن ہوا تو ورنہ تم خود بات کر لینا۔"

دو دن گزر گئے مگر ابراہیم کمرے سے باہر نہ نکلا۔ ماں اور بیوی اس ضدی انسان کے پاس جاتیں اور آزردہ اور اداس واپس آجاتیں۔ تیسرے دن ایک سوار ابراہیم کے پاس پہنچا اور اس کی بیوی سے کہا کہ استاد ابراہیم کو امیر المومنین کے اتالیق اور خلافتِ عباسیہ کے سیاہ و سفید کے مالک یحییٰ برمکی نے یاد فرمایا ہے۔"

بیوی نے یہ خبر اپنے شوہر کو پہنچا دی۔ ابراہیم نے جواب دیا۔" اس سے کہہ دے کہ استاد ابراہیم تو اسی دن مر گیا جس دن امیر المومنین ہادی نے اس دنیا سے کوچ کیا تھا۔ اس گھر میں اس کا لاشہ رکھا ہے اور لاشے سے یحییٰ کو کوئی کام نہیں ہو سکتا۔"

یحییٰ کے آدمی نے یہ عجیب و غریب جواب اپنے آقا کے گوش گزار کر دیا۔ یحییٰ نے اس کو دوبارہ بھیج دیا اور کہا۔" جا، اس سے کہہ دے ان فضول باتوں سے فائدہ؟ ابھی تو میں تجھ کو بلوا رہا ہوں لیکن اگر امیر المومنین کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ میں نے تجھ کو بلوایا اور تو نے آنے سے انکار کر دیا تو کسی ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے گا جس کا ازالہ ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو چپ چاپ چلا آ اور امیر المومنین ہارون رشید سے تعلقات قائم کر لے۔"

جب یحییٰ کا پیغام ابراہیم کو ملا تو وہ چراغ پا ہو گیا اور یحییٰ کی دھمکی کا جواب دینے خود گھر سے باہر نکل کھڑا ہوا۔ یحییٰ کے آدمی سے کہا۔" اے شخص! میں جانتا ہوں کہ تو یحییٰ کا ادنیٰ ملازم ہے اور میں اس کے جواب میں جو کچھ کہوں گا تو اس کو اسی طرح یحییٰ تک نہیں پہنچا سکے گا لیکن اگر تو مسلمان ہے تو میں خدا، اس کے رسول ﷺ اور خدا کے کلام کا واسطہ دے کر تجھ سے کہوں گا کہ میں جو کچھ کہوں اس کو حرف بہ حرف یحییٰ کے گوش گزار کر دے۔"

یحییٰ کا خادم سمجھا، شاید ابراہیم کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ کوگو انداز میں کہا۔" میں خائن نہیں ہوں، استاد ابراہیم کے جواب کو کسی کتر بیونت، ردو بدل، کمی بیشی کے بغیر آقا کے گوش گزار کر دیا جائے گا۔"

ابراہیم نے زمین سے ایک پتھر اٹھایا اور یحییٰ کے خادم کو دیتے ہوئے کہا۔" یہ پتھر یحییٰ کے حوالے کر کے کہہ دینا کہ ابراہیم پتھر کی طرح جامد اور بے حس نہیں ہے۔ میں انسان ہوں، وفا شعار اور احسان شناس۔ میں نے اپنے فن اور زندگی کو ہادی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اب وہ ہم میں موجود نہیں تو کیا ہوا، میں اس کا مداح اور غم گسار تو موجود ہوں۔ اب میں نہ تو کسی اور کو اپنا گانا سناؤں گا اور نہ کسی اور کے لیے مزامیر بجاؤں گا۔ میں ہندو بیوہ کی طرح زندگی بھر ہادی کا ماتم گسار رہوں گا۔"

یحییٰ کے خادم نے کہا۔" استاد ابراہیم! ہنر مند جذباتی ہوتے ہیں اور جذباتی لوگوں کے فیصلے پائیدار نہیں ہوتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں یہ جواب اپنے آقا تک نہ پہنچاؤں اور تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر چند دن بعد کوئی معقول اور غیر جذباتی جواب دینے کے لائق ہو جاؤ۔"

ابراہیم نے بگڑ کر کہا۔" او حاشیہ بردار انسان، میں ہمیشہ یہی جواب دوں گا اس لیے فضول باتوں میں ہمارا اور اپنا وقت ضائع نہ کر۔"

خادم چلا گیا اور ابراہیم کا جواب یحییٰ کو پہنچا دیا۔ یحییٰ کو غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط و تحمل سے کام لیا، بولا۔" اچھا...... اس مغرور، سرکش اور جذباتی سرپھرے کے پاس میں خود جاؤں گا کیونکہ خوش قسمتی مسلسل دستک دے رہی ہے اور استاد ابراہیم کے کانوں تک اس دستک کی آواز نہیں پہنچ رہی۔"

کئی دن بعد جب یحییٰ، ابراہیم کے پاس جانے والا تھا۔ ہارون رشید نے یحییٰ کو اپنے پاس بلا لیا اور کہا۔" یہ استاد ابراہیم کہاں روپوش ہو گیا؟ وہ ہمارے دربار میں ابھی تک نہیں پہنچا۔ اس کی کمی سے دربار سونا ہو رہا ہے۔ اس کو بلوائیے۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔" امیر المومنین! اس وقت میں اسی کے پاس جا رہا تھا۔ میں یہ کام کسی اور سے بھی لے سکتا تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ ابراہیم ایک جذباتی اور زود رنج ہنر مند ہے۔ وہ کسی معمولی آدمی کو اپنے در پر دیکھ کر مشتعل ہو سکتا ہے۔"

ہارون رشید نے کہا۔" یا ابیؒ واللہ آپ رعایت سے کام لے رہے ہیں ورنہ میں اس کو گدی سے پکڑ کر اٹھوا سکتا ہوں۔ وہ بلی کی طرح ہاتھ پاؤں خلا میں ہلاتا اور چمگادڑ کی طرح پھڑپھڑاتا میرے دربار میں حاضر ہو سکتا ہے۔"

یحییٰ نے عرض کیا۔" امیر المومنین! اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ ہادی کی نوازشات اور عنایات کے بھاری بوجھ نے اس کو بے بس اور مجبور کر رکھا ہے۔ اب ہماری نوازشیں اور مہربانیاں ہی اس کو حرکت میں لا سکتی ہیں۔ میری کوشش ہے کہ میں اس کو آپ کے روبرو ہنستا مسکراتا ہوا پیش کروں۔"

ہارون نے جواب دیا۔" یا ابی! آپ جو چاہے کریں، میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔"

یحییٰ دربار سے چلا آیا۔ اس کے خیال میں اب ابراہیم کی دربار میں حاضری ضروری ہو گئی تھی۔ وہ اپنے قصر میں واپس آگیا اور بڑی دیر تک ابراہیم کو راضی کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ ہارون کے دل میں ابراہیم کے خلاف کدورت پائی جاتی ہے۔ وہ ہارون کی سرشت سے خوب واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ ہارون اپنے مخالفین اور حاسدین کو اپنے ذہن اور حافظے میں کس طرح محفوظ رکھتا ہے اور موقع ملتے ہی ان سے کس طرح نمٹتا ہے۔ وہ ابراہیم کی سادہ لوحی اور بھولپن سے بھی اچھی طرح واقف تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ عظیم اور یگانۂ روزگار ہنر مند کو مسل کر رکھ دیا جائے۔

محل کے کسی حصے سے ساز و آواز کی لہریں اٹھنے اور پھیلنے لگیں۔ یہ کہربا کی آواز تھی۔ اس آواز نے یحییٰ کے جسم میں توانائی اور دماغ و دل میں برنائی پیدا کر دی، وہ مسکرا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ کہربا کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد کہربا اس کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔ احتراماً کھڑی ہو گئی اور ہونٹ بھینچ کر عرض کیا۔" بغیر اطلاع تشریف آوری کا شکریہ۔ خوش آمدید! ارشاد میرے لیے کوئی حکم؟"

یحییٰ نے شوخی سے کہا۔" کہربا! میں پچاس سال کی عمر میں بھی تیری آواز اور شباب کی کہربائیت کا اثر محسوس کرتا رہتا ہوں۔ اس وقت بھی جب میرے کانوں میں تیری آواز کا کوندا لپکا تو میں بے اختیار کھنچا چلا آیا۔ شاید کہربائیت اور مقناطیسیت لازم و ملزوم ہیں ورنہ میں بے اختیار اور غیر ارادی طور پر یہاں تیرے پاس کس طرح آجاتا۔"

کہربا اس پچاس سالہ عقلمند اور زمانہ شناس سے اپنی تعریف سن سن کر پھولی نہ سما رہی تھی۔ اس نے اپنے سر میں بندھے ہوئے سرخ رومال کو کھول کر ہاتھ میں لے لیا اور زلفوں کو جھٹکا دے کر پشت پر بکھیر دیا۔ خوشبو کا بھبکا ناک میں داخل ہوا اور دل و دماغ کو معطر کر گیا۔ کن انکھیوں سے یحییٰ کی طرف دیکھا، بولی۔" اے وہ شخص، جس کو امیر المومنین یا ابی (اے میرے باپ) کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، آپ کی تعریف مجھ کو مغرور کیے دے رہی ہے۔ میں کیا تھی اور اب کیا ہوں۔ ایک ذرہ جو آپ کے طفیل رو شناس ثوابت و سیارہ ہوا۔"

یحییٰ نے اپنا سیدھا ہاتھ کہربا کی طرف بڑھا دیا۔ کہربا نے ہاتھ پکڑ لیا اور ہتھیلی کی پشت کو احتراماً چوم لیا۔ یحییٰ نے کہربا کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔" کہربا! کیا تو جانتی ہے کہ میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟"

کہربا نے جواب دیا۔" نہیں، تو میرے آقا! اے کاش میں علمِ غیب سے آشنا ہوتی۔"

یحییٰ نے کہا۔" کہربا! تجھ کو ایک بار پھر ابراہیم کے پاس جانا ہے۔ وہ بد دماغ گویا جو اپنے ہنر میں یکتا اور بے مثل ہے، ہادی کے غم میں ہندو بیوہ کی طرح ماتم گسار ہے۔ امیر المومنین اس کو اپنے دربار میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ دربار تک پہنچانا میری ذمے داری اور فرض میں داخل ہے لیکن میں یہ کام تیری مدد اور اعانت کے بغیر نہیں انجام دے سکتا۔"

کہربا نے کہا۔ ''برمکی آقا! میں دوسروں کی بہ نسبت اسے زیادہ سمجھتی ہوں۔ قسمت کی برگشتگی اور حالات کی ناموافقت نے اسے چڑچڑا اور ضدی کردیا ہے۔ اسے امیر المومنین کے لیے رضامند کرنا آسان کام نہیں ہے اور یہ کام اگر ممکن بھی ہوا تو دو چار بار کی کوشش سے ہرگز نہ ہوگا۔ بار بار اور مسلسل کوششوں کے بعد شاید ہوجائے۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''بہرحال کوشش تو کر کیونکہ تیری ہی کوششیں بارآور ہوسکتی ہیں۔''

کہربا سوچ میں ڈوب گئی، سر جھکائے سوچتی رہی۔ کچھ دیر بعد سر اٹھائے بغیر ہی بولی۔ ''میں کوشش کروں گی لیکن اس سے پہلے میں آپ سے ایک وعدہ لوں گی۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''کوئی حرج نہیں اگر وعدہ نبھانا دشوار نہ ہوا تو میں وعدہ کرلوں گا۔''

کہربا نے عرض کیا۔ ''سچ بات تو یہ ہے کہ میں پہلے ہی بہت اکتا چکی ہوں۔ وہ مجھ سے عشق کرنے لگتا ہے اور مجھے وہ ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ گانے کے فن میں یکتا ہے میں اس کو ہنرمند ہونے کا احترام تو دے سکتی ہوں لیکن محبت نہیں کرسکتی۔ آپ آقا ہیں جو حکم دیں گے مان لوں گی لیکن آپ مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ مجھ کو اس کے حوالے نہیں کردیں گے۔''

یحییٰ نے نہایت پُر رعب اور بھاری بھرکم لب ولہجہ اختیار کیا، بولا۔ ''کہربا! تو ابراہیم کے پاس جا اور اسے سمجھا دے کہ ہادی مرچکا، اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس لیے مرے ہوئے کے سوگ میں شریف اور زندوں سے دور رہنا معقول بات نہیں۔ اس کو صاف صاف بتادے کہ اگر امیر المومنین ضد کرلیں گے تو تجھے زبردستی بلوالیں گے۔'' اس کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا پھر بولا۔ ''رہی یہ بات کہ میں تجھے ابراہیم کے حوالے کردوں گا تو یہ احمقانہ اندیشہ ہے اور کچھ نہیں۔''

کہربا نے بے چون وچرا کہا۔ ''پھر آج ہی مجھے ابراہیم کے گھر پہنچادیا جائے، میرا خیال ہے کہ میں ناکام واپس نہیں آؤں گی۔''

یحییٰ نے دو اونٹوں پر محافہ کسوادیا۔ کہربا نے مشاطاؤں کی مدد سے سنگھار کیا۔ سر کے بالوں کو لال رومال سے چھپالیا اور قتالہ بن کر ابراہیم کے پاس چل دی۔ اس کے ساتھ دو کنیزیں بھی تھیں۔ ساربان دونوں اونٹوں کی مہار پکڑ کر آگے آگے چلنے لگا۔ محافہ کے دو موٹے موٹے بانس دونوں اونٹوں کی پشت پر ٹکے ہوئے تھے.... کہربا کے دل و دماغ پر ابراہیم مسلط تھا۔ معلوم نہیں کیوں وہ ابراہیم سے بیزار تھی۔ اس نے محافے کے برابر، ساتھ ساتھ چند گداگروں کو بھاگتے اور بھیک مانگتے دیکھا۔ ان میں دو بوڑھے تھے اور ایک لڑکا تھا۔ یہ تینوں کہربا کے محافے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور چند درہموں کا سوال کررہے تھے۔ راہ گیر اس منظر کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کہربا نے ساربان کو آواز دی۔ ''ساربان! اونٹوں کو روک دے۔''

ساربان نے گھبرا کر محافہ کو روک دیا اور محافے کے اٹھے ہوئے پردے کے نیچے کھڑے ہوکر پوچھا۔ ''آقائے برمکی کی معزز خاتون! کوئی خاص بات؟''

کہربا نے تینوں گداگروں کو ساربان کی طرف آتے دیکھا۔ راہ گیر گھڑسوار بھی سڑک کے کنارے، درختوں کے سائے میں اپنے اپنے گھوڑے روک کر ستانے لگے۔ وہ ..... کہربا ہی کو دیکھے جارہے تھے۔ کہربا نے گداگروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''ساربان! ان سے پوچھ یہ بھیک کیوں مانگ رہے ہیں؟''

کہربا کا سوال ساربان نے دہرادیا۔ تینوں گداگر ٹھٹک کر کھڑے ہوگئے پھر ایک بوڑھا گداگر آگے بڑھا اور کہا۔ ''رحم دل ساربان! اپنی مالکہ سے کہہ دے کہ ہم تینوں مسلمان نہیں ہیں جو تیرے سوال سے خوف زدہ ہوجائیں۔ ہم غیر مسلم ہیں اور بڑھاپے کی وجہ سے محنت مشقت نہیں کرسکتے، مجبوراً بھیک مانگ کر گزارہ کرتے ہیں۔''

کہربا نے کہا۔ ''ساربان! ان سے کہہ دو کہ وہ چند دن بعد مجھ سے میرے گھر پر ملیں۔ میں ان کی معاش کا مسئلہ مستقلاً حل کردوں گی۔'' پھر اپنے پاس رکھی ہوئی تھیلی میں سے سو درہم نکالے اور ساربان سے کہا۔ ''انہیں یہ سو درہم دے دے تاکہ ان کا چند دنوں کا انتظام ہوجائے۔''

ساربان نے تینوں کو سو درہم دے کر اور کہربا کا پیغام پہنچا کر چلتا کردیا۔ وہ دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔ کہربا نے دیکھا کہ شوقین گھڑسوار درختوں کے سائے میں اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں پکڑے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں محافے کی چلمن پر گڑی تھیں۔ کہربا نے ساربان سے کہا۔ ''تو نے اور کچھ دیکھا؟''

ساربان نے سادہ لوحی سے جواب دیا۔ ''نہیں تو...... آپ نے کچھ دیکھا ہو تو بتایئے۔''

کہربا نے سواروں کی طرف دیکھے اور اشارہ کیے بغیر کہا۔ ''وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے .... گھڑسوار مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ ان کو میری بابت بتادے کہ میں کون ہوں اور کیاں ہوں اور میں کیا کچھ کرسکتی ہوں...... اور یہ بھی کہہ

دے کہ میں کہاں سے آرہی ہوں اور کہاں جارہی ہوں۔''

ساربان سیدھا ان شوقینوں کے پاس چلا گیا۔ وہ ساربان کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ساربان نے کہا۔ ''اے لوگو! کیا تمہارے دلوں اور دماغوں میں شیطان نے گھر کرلیا ہے؟ یہ تم کس کا پیچھا کررہے ہو اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا کچھ جانتے ہو؟''

ایک نوجوان نے جواب دیا۔ ''ہم کسی کا پیچھا نہیں کررہے۔ ہم نے بغداد کی اس شاہراہ پر ایک بے محابا چاند کو محوِ سفر دیکھا تو اس کی دید میں کھو گئے۔ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ کس آسمان کا چاند ہے، کہاں سے آرہا ہے اور کہاں جارہا ہے۔''

ساربان نے سختی سے کہا۔ ''شیطان کے شاگردو! یہ امیرالمومنین کے اتالیق، حکومت کے سیاہ و سفید کے ذمے دار اور خاندان برآمکہ کے بزرگ یحییٰ بن خالد کی کنیز کہربا کی سواری ہے جو یگانۂ روزگار مغنی ابراہیم موصلی کی خدمت میں کسی خاص کام سے جارہی ہے۔ اگر تم چاہو تو تمہاری خاطر تواضع ہوسکتی ہے۔''

کہربا کے تفصیلی تعارف نے ان کے ہوش و حواس اڑا دیے اور وہ عجلت میں گھوڑوں پر سوار ہوکر فرار ہوگئے۔ کہربا محافہ کے پردے سے ان کی بدحواسی دیکھ کر لطف اندوز ہورہی تھی۔

تینوں کے چلے جانے کے بعد ساربان نے اونٹوں کی مہار پکڑی اور ابراہیم کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

دو اونٹوں پر کسا ہوا محافہ کہربا کو لیے ہوئے ابراہیم کے دروازے پر رک گیا۔ جب ابراہیم کو اطلاع ملی کہ محافے میں کوئی معزز خاتون اس سے ملنے آئی ہے تو وہ خوش ہوا اور پریشان بھی۔ یہ سوچ کر خوش ہوا کہ ممکن ہے کوئی معزز خاتون اس سے فنِ موسیقی سیکھنے آئی ہو اور اس اندیشے نے خوف زدہ بھی کردیا کہ کہیں یہ فتنہ دربارِ خلافت سے نہ بھیجا گیا ہو جو بعد میں خطرناک رنگ لائے۔

کہربا کی ہم سفر کنیزیں محافے سے نکل کر اندر چلی گئیں۔ ابراہیم انہیں دیکھ کر کھڑا ہوگیا اور اہلاً و سہلاً مرحبا کہتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے حافظے پر زور دیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کمرے میں غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ غالیچے کے ایک طرف دیوار کے پاس گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ گاؤ تکیے کے پاس ادھر ادھر چند ساز رکھے تھے۔

ابراہیم نے غالیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بغداد کی معزز خواتین! تشریف آوری کا شکریہ۔ میں یہ نہیں جانتا کہ تم نے کس مقصد سے قدم رنجہ فرمایا ہے مگر ایک بات میں قبل از وقت ہی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ اگر تم لوگ میرے پاس فنِ موسیقی سیکھنے آئی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں کیونکہ میں نے یہ عہد کررکھا ہے کہ امیرالمومنین ہادی کی وفات کے بعد میں نہ خود گاؤں گا اور نہ کسی کو سکھاؤں گا۔''

کہربا کی ساتھی کنیزیں ہنسنے لگیں، وہ غالیچے سے دور ہی کھڑی رہیں۔ ایک نے کہا۔ ''استاد ابراہیم! ہم نہ تو آپ کا گانا سننے آئے ہیں اور نہ ہی آپ سے فنِ موسیقی سیکھنے آئے ہیں اور ہماری اس بات سے تو آپ اور زیادہ حیرت زدہ ہوجائیں گے کہ ہم آپ کے پاس نہیں آئے ہیں۔ آنے والا تو کوئی اور ہی ہے جس سے ابھی تک آپ کی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ہم تو اس کے طفیلی ہیں۔''

ابراہیم نے سوالیہ انداز میں جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں، پوچھا۔ ''کیا مطلب؟ پھر وہ کہاں ہے جس کی تم سب طفیلی ہو؟''

اس کنیز نے جواب دیا۔ ''وہ باہر ہیں ابھی تک محافے میں۔ یحییٰ برمکی کی مشہور کنیز کہربا۔''

کہربا کا نام سنتے ہی ابراہیم اپنے حواس میں نہیں رہا۔ اس نام میں ایک نشہ تھا، ایک کیف، سرور، لذت...... بے اختیار پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟ کہربا کس کی کنیز...... یحییٰ برمکی کی؟ نہیں، وہ امیرالمومنین ہادی کی کنیز تھی، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔''

اس کے بعد ابراہیم تیز تیز قدموں سے باہر پہنچا۔ اس وقت کہربا محافے کے غرفے سے جھانک رہی تھی۔ وہ اس وقت تک محافے سے نہیں اترنا چاہتی تھی جب تک خود ابراہیم اس کی پیشوائی کو نہ پہنچ جاتا۔ ابراہیم نے کہربا کی جھلک دیکھ لی، محافے کے سامنے نہایت عقیدت و احترام سے جا کھڑا ہوا۔ کہربا اس کو دیکھتے ہی مسکرانے لگی۔ عدن کے موتیوں جیسے دانتوں کی چمک اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں کی سحر انگیزی نے ابراہیم کا کام تمام کردیا۔ اس کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وارفتگی میں وہ کیسی عامیانہ حرکتیں کررہا ہے۔ اس نے محافے کے پردے کے قریب کھڑے ہوکر کہا۔ ''کہربا! تو مجھ سے قسم لے لے جو مجھے تیری آمد کی خبر ملی ہو اور میں نے تجھے زحمتِ انتظار دی ہو۔ مجھے تیری آمد کی خبر ابھی ملی ہے۔''

کہربا نے لگاوٹ کی بات کی۔ ''استاد ابراہیم! میں تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ آپ نے مجھ کو بھلادیا ہے۔''

ابراہیم نے جلدی جلدی کہا۔ ''یہ کیسی بات کررہی

ہے تو...... میں اور تجھے بھلا دوں، یہ کس طرح ممکن ہے۔''

کہربا نے کہا۔ ''استاد ابراہیم! آپ نے تو مجھے یاد بھی نہیں کیا میں ہی آپ کو یاد کرتی ہوئی یہاں تک آگئی۔''

ابراہیم نے غمگین آواز میں کہا۔ ''کہربا! سچی بات تو یہ ہے کہ امیرالمومنین کی ناگہانی اور بے وقت رحلت نے مجھے بے حد غمزدہ کردیا تھا۔ اس وقت بھی میرا دل اپنے محسن کے غم میں پارہ پارہ ہورہا ہے لیکن اس کے باوجود میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر تجھے یہ یقین دلارہا ہوں کہ تو اس میرے پارہ پارہ دل کے ہر ٹکڑے میں موجود تھی۔ میں جب بھی آنکھیں بند کرتا تجھ کو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھتا۔ سارے دکھ، جملہ مصائب اور تمام مصیبتیں بھی تیرے خیال اور تیری محبت کو میرے دل سے دور نہ کرسکے۔''

کہربا نے مسکراتے ہوئے شرما کر کہا۔ ''یہ ساری نہ دیکھنے کی باتیں ہیں۔ اگر مجھ کو واقعی چاہتے ہیں تو بتایئے کہ میں آپ سے جو کہوں گی آپ مان جائیں گے؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''بالکل مانوں گا، فوراً مانوں گا۔ کہہ کر تو دیکھ۔''

کہربا نے شوخی سے کہا۔ ''دیکھیے ایک بار پھر سوچ لیجیے۔''

ابراہیم نے پرجوش لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے خوب اچھی طرح سوچ لیا ہے، سوچنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔''

کہربا نے کہا۔ ''تب پھر آپ مجھ سے یہ پوچھیے کہ میں آپ کے پاس اس وقت کیوں آئی ہوں؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''تجھ کو میری محبت کھینچ لائی ہے۔ میرا جذبہ صادق تجھے میرے پاس لے آیا ہے۔ میرا ہنر، میرا فن تجھ کو میرے پاس لے آیا ہے۔''

کہربا نے کہا۔ ''شاید یہ بات بھی ہو لیکن میں آپ کے پاس اور ہی مقصد لے کر آئی ہوں۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''اگر یہ بات نہیں ہے تو بتا کہ تو میرے پاس کیوں آئی ہے؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''میں یہ کہنے آئی ہوں کہ جو مرگیا وہ گیا۔ اس کا غم کرنا فضول ہے کیونکہ وہ واپس آنے سے رہا۔ جو موجود ہے اس کی مدد کرنی چاہیے اور اس کے لیے دعاگو رہنا چاہیے تاکہ وہ مدتوں زندہ رہے اور ہم اس کی نوازشوں کی بارش سے فیض یاب ہوتے رہیں۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''اچھا کہربا! کھڑے کھڑے بہت باتیں کرلیں۔ اب تو محافے سے باہر آ تاکہ اندر چل کر باتیں کرسکیں۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''میں اندر نہیں جاؤں گی اگر آپ ہامی بھرلیں کہ امیرالمومنین ہارون رشید کے دربار سے وابستگی اختیار کرلیں گے تو میں اندر چلی چلوں گی ورنہ یہیں سے چلی جاؤں گی۔''

ابراہیم کچھ دیر کے لیے ماؤف الدماغ ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہربا کیا کہہ رہی ہے۔ جب ذرا ہوش میں آیا تو پوچھا۔ ''کہربا! ایک بات تو بتا؟''

''پوچھیے ضرور بتاؤں گی۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''ابھی تیری ساتھی خواتین نے مجھے بتایا کہ تو یحییٰ کی کنیز ہے، کیا یہ درست ہے؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ درست ہے۔ یحییٰ برمکی میرا آقا ہے۔ وہی یحییٰ برمکی جو خالد کا بیٹا اور امیرالمومنین ہارون رشید کا اتالیق ہے اور جو امیرالمومنین کی ماں خیزران کا سب سے زیادہ معتمد علیہ ہے۔''

کہربا کی ایک ایک بات، ایک ایک لفظ سے ابراہیم کے دل پر چوٹ لگ رہی تھی۔ اس وقت کہربا کا جو روپ اس کے سامنے آرہا تھا اس نے ابراہیم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تو یحییٰ برمکی کی کنیز ہے، حالانکہ میں تجھے ابھی تک مرحوم امیرالمومنین کی کنیز سمجھتا رہا ہوں۔ مجھے دھوکا ہوا، سخت دھوکا۔''

کہربا نے کہا۔ ''اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے، میرے ساتھ چلیے تاکہ میں اپنے آقا یحییٰ برمکی اور ان کے ذریعے امیرالمومنین کے دل میں پائی جانے والی بدگمانیوں کو دور کردوں۔ وہ آپ کو اپنے دربار میں وہی مقام دینا چاہتے ہیں جو چند دن پہلے آپ کو حاصل تھا۔''

ابراہیم ایک دم بجھ گیا تھا۔ اس کے اندر کا دکھ سیاہی بن کر پورے چہرے پر نمودار ہوچکا تھا۔ اس نے بڑی حسرت اور یاس کی نظروں سے کہربا کو دیکھا اور کہنے لگا۔ ''کہربا! افسوس کہ میں نے آج سے پہلے تیرا مکروہ چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ میں مرحوم امیرالمومنین ہادی کی اچانک اور غیر متوقع موت کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا لیکن آج جب مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوئے کہ تو یحییٰ برمکی کی کنیز ہے اور یحییٰ برمکی خیزران کا معتمد علیہ ہے...... اور جس رات امیرالمومنین ہادی نے اس دنیا سے کوچ فرمایا، تو اور خیزران قصرِ ابیض ہی میں موجود تھیں تو ساری باتیں اچانک سمجھ میں آگئیں۔ اب میں سب کچھ سمجھ چکا ہوں۔''

کہربا نے اس کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ ''اب ان فضول باتوں پر غور کرنے سے آپ کو کیا ملے گا؟ ہادی ایک بددیانت اور اپنی ماں کا نافرمان بیٹا تھا جو اس کی بددعا

کی نذر ہو گیا۔ اب آپ امیر المومنین ہارون رشید سے رشتہ جوڑ لیں۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔''ناممکن، ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اگر زیادہ صاف بات کروں گا تو یہ کہوں گا کہ میں اپنے محسن کے قاتلوں کی ملازمت نہیں کر سکتا۔ امیر المومنین ہادی کو قتل کر دیا گیا۔ اور کہربا! میری بات ذرا غور سے سن، میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ امیر المومنین ہادی کے بعد کسی بھی دربار سے وابستگی نہیں اختیار کروں گا۔ چنانچہ میں اپنے اس عہد پر اس وقت بھی قائم ہوں اور زندگی بھر قائم رہوں گا۔''

کہربا نے جل کر کہا۔''استاد ابراہیم! صاف گوئی کی گستاخی معاف، آپ کا عہد عاجلانہ اور احمقانہ ہے۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔''تو آزاد ہے جو چاہے رائے قائم کر...... لیکن میں ہارون کے دربار میں نہیں جاؤں گا۔''

کہربا نے کہا۔''استاد ابراہیم! میں آپ کو دربار تک باعزت طریقے سے لے جانا چاہتی ہوں جبکہ بصورت انکار آپ کو زبردستی جبر سے لے جایا جائے گا جس سے آپ کی عزت خاک میں مل جائے گی اور آپ ایک زمانے کے سامنے رسوا ہو جائیں گے۔''

ابراہیم نے اعتماد سے جواب دیا۔''میں اپنے عہد کو نبھانے کے لیے ہر ذلت سہہ لوں گا، جملہ بے عزتیاں گوارا کر لوں گا۔''

کہربا نے کہا۔''افسوس کہ میں آپ کو عقلمند سمجھتی تھی جبکہ آپ عقلمند نہیں ہیں۔''

ابراہیم نے پوچھا۔''کیا تو میرے پاس ہارون کی سفارش لے کر آئی تھی یا کوئی اور مقصد بھی ہے؟''

کہربا نے جواب دیا۔''میں اسی مقصد سے آئی تھی، اب انکار کی صورت میں یہیں دروازے سے محافے کو چھوڑے بغیر ہی واپس چلی جاؤں گی۔''

ابراہیم نے سرد مہری سے کہا۔''تیری مرضی۔''

کہربا نے محافے کا پردہ ہٹا کر گرا دیا اور زور سے کہا۔''یوں تو میں یہیں سے واپس چلی جاؤں گی، براہ کرم میری ساتھی خواتین کو میرے پاس بھیج دیجیے۔''

ابراہیم نے چند ثانیے کہربا کی صورت دیکھنے کی کوشش کی پھر بولا۔''افسوس کہ تو نے جو کچھ بھی کیا ہو گا اچھا نہیں کیا ہو گا۔ کہربا! میں تجھ سے محبت کرنے لگا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے تک میں تجھ کو دل و جان سے چاہتا تھا مگر شاید اب وہ بات نہیں رہی۔ اب میں تجھ سے محبت نہیں، نفرت کرنے لگا ہوں۔''

کہربا نے مسکرا کر کہا۔''اگر آپ نے مجھ سے محبت کی تو اس محبت سے آپ کو حاصل کیا ہوا؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح اگر مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں تو اس سے مجھ کو کیا نقصان پہنچے گا...... شاید کچھ بھی نہیں۔''

ابراہیم نے نظریں نیچی رکھیں، کہا۔''افسوس کہربا! میں سب کچھ جان لینے کے بعد اپنے ضمیر کے خلاف کوئی قدم بھی نہ اٹھاؤں گا۔''

کہربا نے تیز آواز میں جواب دیا۔''آپ معلوم نہیں کس ضمیر کی بات کر رہے ہیں۔ آپ اس مرحوم شخص سے عقیدت اور محبت کا اظہار کر رہے ہیں جو اپنی ماں کا دشمن اور بے ادب تھا۔ جس نے اپنے بھائی کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا تھا ہم دربار کی روٹیوں پر پلنے جینے والے لوگ ضمیر کی بات کس طرح کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو متنبہ کر رہی ہوں کہ امیر المومنین اور آقا یحییٰ برمکی کے ہاتھ آپ کی گدی کے پیچھے موجود ہیں، وہ جب چاہیں گدی سے پکڑ کر کھینچ لیں گے۔ آپ کی اکڑ اور انکار بیکار چیزیں ہیں۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔''ہو سکتا ہے ضمیر اور جذبۂ احسان مندی تجھ میں مر چکے ہوں لیکن ابھی میں ان سے محروم نہیں ہوا۔ اگر امیر المومنین اور تیرے آقا یحییٰ برمکی کے ہاتھوں نے میری گدی پکڑ بھی لی تو وہ مجھے زبردستی کھینچ کر دربار تک لے جا سکتے ہیں لیکن مجھ سے میرا گانا نہیں سن سکتے۔ میرے فن سے، ہنر سے لطف اندوز تو نہیں ہو سکتے۔''

کہربا نے بے نیازی سے کہا۔''اچھا تو میں واپس جاؤں گی، براہ کرم میرے ساتھ آئی ہوئی عورتوں کو واپس بھیج دیجیے۔''

ابراہیم کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ کہربا محافے سے اتری نہیں اور دروازے سے ہی واپس جا رہی ہے۔ روکنے اور محافے سے اتارنے کی ایک اور کوشش کی۔''کہربا! میں نے تیری خاطر مدارات تو کی ہی نہیں تو مجھے تواضع کی سنت اور ثواب سے کیوں محروم رکھ رہی ہے۔ گھڑی دو گھڑی رک جا۔ یوں بھی تیرے بقول ہم دونوں دربار کی روٹیوں پر پلنے جینے والے لوگ ہیں، ہم میں تو کوئی جھگڑا نہیں۔''

کہربا نے جواب دیا۔''افسوس کہ ہم میں بنائے مخاصمت موجود ہے۔ میں امیر المومنین ہارون کی قدردان اور پرستار جبکہ آپ امیر المومنین کے دشمن بھائی مرحوم ہادی کی محبت کا دم بھر رہے ہیں۔ پھر وہ قدر مشترک کون سی ہے جو ہمیں محبت اور رغبت سے پاس پاس رہنے یا اٹھنے بیٹھنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ ہم دونوں کن بنیادوں پر اپنی دوستی قائم

رکھ سکتے ہیں؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔''غنا، موسیقی۔ پورا زمانہ مجھ کو فن موسیقی میں یکتا و یگانہ سمجھتا ہے اور میں استادِ وقت ہوں۔ تو بھی موسیقی میں ایک خاص مقام رکھتی ہے، یہی چیز ہم دونوں کو متحد اور یکجا رکھ سکتی ہے۔''

کہربا نے سلسلۂ بحث ختم کر دیا۔''براہِ کرم ان خواتین کو بھیج دیجیے۔''

جب کہربا یہ بات کہہ رہی تھی تو کہربا کی ساتھی خواتین باہر نکل رہی تھیں۔ کہربا نے انہیں محافے میں بلا لیا اور... ساربان کو حکم دیا۔''واپس چل، کام ختم ہو گیا۔''

ساربان نے دونوں اونٹوں کو کھڑا کیا اور ان کی مہاریں پکڑ لیں۔

کہربا نے بہ آواز بلند کہا۔''اچھا استاد ابراہیم! خدا حافظ! شاید جلد ہی ملاقات ہو گی۔''

دونوں اونٹ اپنی پشت پر رکھے ہوئے محافے کو لے کر چل پڑے، مست الست ساربان ان کی مہاریں پکڑے نیچی آواز میں حدی خوانی کرتا ہوا آگے آگے چلنے لگا۔ کہربا نے محافے کا غرفہ اٹھا دیا۔ ابراہیم دروازے پر مبہوت، دم بخود کھڑا ہو کر کہربا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہربا اس کو دیکھ کر مسکرائی اور جلانے کی خاطر غرفہ گرا دیا۔ ابراہیم تلملا کر رہ گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا جاتے ہوئے محافے کو دیکھتا رہا بالآخر جب دونوں اونٹ مکانات کی آڑ میں غائب ہو گئے تو ابراہیم کو ہوش آ گیا اور وہ گھر میں واپس چلا گیا۔ جہاں اس کی بیوی جنگ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے ان خواتین کی بابت سوالات کیے جو مکان کے اندر آ گئی تھیں لیکن جب ابراہیم نے اس کو یہ بتایا کہ انہیں امیر المومنین نے بھیجا تھا اور ان کے ذریعے ابراہیم کو دربار میں طلب کیا گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی اور شوہر کو مشورہ دیا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے اور فوراً دربار پہنچ جائے۔

بیوی کے مشورے سے ابراہیم کو بڑا دکھ پہنچا کیونکہ اس کے خیال میں یہ مرحوم خلیفہ ہادی کی روح پر بڑا ظلم تھا جس کی نوازشوں اور مہربانیوں کو بڑی آسانی سے بھلا دیا گیا۔ اس نے بیوی کو کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کمرے میں جا کر دروازے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ رہا۔ یہاں اس نے خیالوں کی ایک محفل جمائی۔ اس محفل میں ہارون اور یحییٰ کے علاوہ سبھی تھے۔ کہربا بھی تھی جو ابراہیم سے متصل بیٹھی ہنس ہنس کر استاد کے فن اور شخصیت کو سراہ رہی تھی اور خود ابراہیم اس کے حسن، شوخی،

مسکراہٹ اور شباب کے شفق زاروں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس وقت جو مناظر بند آنکھوں کے سامنے تھے ان کے نشے نے اس کو خیالوں کی راہ سے خوابوں میں پہنچا دیا۔ وہ خراٹے لینے لگا۔

☆☆☆

کہربا نے جب یحییٰ کو اپنی ناکامی کی خبر دی تو وہ بہت جزبز ہوا۔ ناکامی اور مایوسی اس کی چڑ تھی، بولا۔ ''کہربا! تو نے عجلت سے کام لیا حالانکہ اگر تو دس پندرہ دن اس کے گھر میں رہ جاتی تو شاید وہ راضی ہو جاتا اور تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! آپ کو خدا نے جو سمجھ دی ہے اور جس ادراک اور فہم سے آپ کو ایک زمانے پر فوقیت اور برتری بخش رکھی ہے، اس کی مدد سے آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ابراہیم نرمی اور محبت سے قابو میں نہیں آئے گا۔ اس پر سختی کی ضرورت ہے کیونکہ میں نے اس کو اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لیتا رہتا ہے اور مرحوم ہادی کی شان میں قصیدے پڑھتا رہتا ہے۔ وہ معلوم نہیں کیوں ہادی کو اس عہد کا سب سے بڑا مخیر اور صاحبِ جود و سخا سمجھتا ہے۔''

یحییٰ چپ ہو گیا اور کہربا کے مشورے کو گرہ میں باندھ لیا لیکن وہ اب بھی نہیں چاہتا تھا کہ ابراہیم کسی مصیبت کا شکار ہو جائے۔ اس نے اس مسئلے کو دبا دینے کا ارادہ کر لیا لیکن ہارون نے اس کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ وہ کئی دن تک خاموش رہا اور یحییٰ سے ابراہیم کی بابت کوئی بات نہ کی۔ اس کی ماں خیزران بھی ابراہیم سے خوش نہیں تھی۔ اس کو جب محل کی کنیزوں سے کسی طرح یہ بات معلوم ہوئی کہ ابراہیم اب بھی ہادی کا دم بھر رہا ہے اور ہارون سے نفرت کرتا ہے تو اس کو سخت غصہ آیا اس نے ہارون کو حکم دیا کہ ابراہیم اگر ہنسی خوشی دربار نہیں آتا تو جبراً بلوا لیا جائے۔

ہارون نے جواب دیا۔ ''مادرِ محترم! میں اپنے بزرگ اتالیق یحییٰ کی وجہ سے خاموش ہوں کیونکہ ابراہیم کا سلسلہ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اس کو دربار میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس میں ناکام ہو گئے تو پھر جبر اور طاقت کا حربہ اختیار کیا جائے گا۔''

خیزران نے کہا۔ ''اور اس دوران اگر وہ فرار ہو گیا تو؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''نہیں مادرِ محترم! وہ فرار نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے آس پاس پہرے بٹھا دیے گئے ہیں اور اس کی سخت نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ اپنے گھر سے دس قدم دور بھی نہیں جا سکتا۔''

خیزران کو یہ بات بالکل ناپسند تھی کہ کوئی اس کی مرضی پر نہ چلے یا اس سے اختلاف رکھے۔ وہ ابراہیم سے بہت برہم تھی جو ہادی کا اب بھی قصیدہ خواں تھا اور اس کے چہیتے بیٹے ہارون سے متنفر اور گریزاں تھا۔ وہ یحییٰ برمکی کی منتظر تھی۔ یحییٰ برمکی ہر روز شام کو مغرب کے بعد خیزران کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا اور اہم معاملات میں اس کے مشورے اور رائے لیا کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کام خیزران کی مرضی اور خواہش کے خلاف انجام پائے کیونکہ خیزران ایک عورت نہیں بلکہ ایک طاقت کا نام تھا۔ ایک ایسی اثر انگیز طاقت جس کو نظر انداز کر دینے کے خطرناک نتائج یقینی تھے اور ہادی اس کی سزا بھگت چکا تھا۔

مغرب کے بعد خیزران نے یحییٰ برمکی کو قصرِ خلد میں طلب کیا، یہیں ہارون کو بلا لیا۔ محل کا الف لیلوی ماحول بڑا سحر انگیز تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی اور دھیمی دھیمی موسیقی کی لہروں سے محل کی فضا طلسماتی ہو گئی تھی۔ یحییٰ برمکی کو ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ دیواروں کے حاشیے طلائی پھولوں کے علاوہ نقش و نگار سے آراستہ تھے اور ان کی مینا کاری میں بڑی مہارت اور ہنر مندی سے کام لیا گیا تھا۔ دیواروں کی سطح پر جگہ جگہ مختلف پرندوں کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں جو فضا میں محوِ پرواز تھیں۔ یہاں ایک بڑی سی تصویر ایسی بھی تھی جس میں ایک شیر کے سر پر عقاب کو اس طرح بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا کہ اس کے دونوں خونخوار پنجے شیر کی آنکھوں میں پیوست ہو گئے تھے۔ اس شیر کی آنکھوں سے تازہ تازہ خون بہہ رہا تھا اور عقاب اس کے سر پر سوار غضب ناک نظروں سے شیر کو گھور رہا تھا۔

یحییٰ کو یہ منظر بہت اچھا لگا۔ وہ اس میں گم ہو گیا۔ وہ مصور کے کمالِ فن کا قائل ہو گیا۔ یحییٰ کے کمرے میں خیزران کب داخل ہوئی اور خیزران کے داہنی طرف ہارون کب آ کھڑا ہوا، اس کو کچھ پتا نہ تھا۔ دونوں یحییٰ کی محویت پر مسکرانے لگے۔ ان دونوں کے پیچھے کنیزیں کھڑی تھیں اور وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔

آخر ہارون آگے بڑھا اور کھنکھار کر یحییٰ کو مخاطب کیا۔ ''یا ابی! آپ کس خیال میں محو ہیں؟''

یحییٰ چونک پڑا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سامنے خیزران، ہارون اور کنیزوں کو دیکھ کر بہ عجلت کھڑا ہو گیا اور خیزران سے عرض کیا۔

''افسوس کہ میں آپ کی تشریف سے بے خبر رہا۔ اس

بے خبری میں، میں آپ کا احترام بجا لانے سے قاصر رہا، معذرت خواہ ہوں۔''

خیزران آگے بڑھ کر ایک مرصع چوکی پر بیٹھ گئی۔ یہ کمرے میں بچھے ہوئے دوسرے تختوں اور چھوٹی چھوٹی چوکیوں کے مقابلے میں زیادہ اونچی تھی اور اس پر بچھا ہوا غالیچہ نسبتاً زیادہ قیمتی تھا۔ خیزران نے ہارون کو اپنے برابر ہی بٹھا لیا اور یحییٰ کو اپنے سامنے والی چوکی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

کنیزیں خیزران کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ خیزران نے ریشمی گاؤ تکیے پر داہنی کہنی ٹکا دی اور ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ لی، یحییٰ سے پوچھا۔

''ہاں تو یحییٰ! ابراہیم موصلی کا کیا حال ہے؟ وہ ابھی تک دربار کیوں نہیں آیا؟''

یحییٰ نے ایک بار پھر یہی کوشش کی کہ ابراہیم، خیزران یا ہارون کے عتاب سے محفوظ رہے، جواب دیا۔

''ملکۂ عالیہ! میں نے کئی دن ہوئے جب کہربا کو اس کے پاس بھیجا تھا اور اس کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ جلد از جلد دربار میں حاضر ہو جائے کیونکہ اس کی غیر حاضری کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے اور اس طرح ابراہیم کی وفاداری مشتبہ قرار پا گئی ہے۔''

خیزران نے پوچھا۔ ''پھر اس نے کیا جواب دیا؟''

یحییٰ نے عرض کیا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ ابراہیم ابھی تک ہادی کی فیاضیوں اور نوازشوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہا ہے اور معلوم نہیں کیوں اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہادی کے ساتھ ہی فیاضی اور سخاوت بھی رخصت ہو گئی ہے۔''

خیزران نے سختی سے کہا۔ ''ابراہیم باغی ہے۔ اگر وہ بخوشی نہیں آتا تو اسے جبراً بلوا لیا جائے۔ اس کو ہارون کے پاس آ جانا چاہیے۔ کم از کم میں ان کوتاہیوں اور غلطیوں کو نہیں برداشت کر سکتی۔''

یحییٰ نے ابراہیم کی وکالت کی۔ ''ام امیر المومنین! میرا خیال ہے ابراہیم کی ہادی سے اس درجہ شیفتگی اور وفاداری بڑی اچھی بات ہے۔ انسان کو اپنے محسنوں کا شکر گزار ہونا ہی چاہیے۔ اگر ہم ابراہیم کو دربار تک لانے میں کامیاب ہو گئے اور ہم نے اپنی داد و دہش سے ابراہیم پر یہ ثابت کر دیا کہ ابھی سخاوت اور جود و سخا زندہ ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ امیر المومنین ہارون کا بھی اسی قدر مداح اور پرستار ہو جائے گا جتنا ہادی کا محسوس ہو رہا ہے۔''

خیزران نے کہا۔ ''یحییٰ! تم ابراہیم کی طرف داری کر رہے ہو اور اس کو ہمارے عتاب سے بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''ام امیر المومنین بجا فرما رہی ہیں۔ میں امیر معاویہؓ کا ہم خیال ہوں، وہ کہا کرتے تھے کہ جہاں کوڑے سے کام چل سکتا ہو وہاں تلوار کو کام میں نہیں لانا چاہیے۔ اس طرح جہاں باتوں سے کام نکل رہا ہو، وہاں کوڑے کے استعمال سے بچنا چاہیے۔''

ہارون نے ماں کی طرف دیکھا اور یحییٰ سے کہا۔ ''بہرحال میں اپنی اہانت مزید نہیں برداشت کر سکتا۔ ابراہیم اپنی انا کی تسکین کی خاطر میری انا کو اذیت پہنچا رہا ہے۔ اس لیے میں حکم دیتا ہوں کہ کل ابراہیم کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ میں اس سے خود بات کر لوں گا۔'' اس کے بعد اس نے ایک بار پھر خیزران کی طرف دیکھا اور اپنے فرمان کی تصدیق یا تائید چاہی۔

خیزران نے کہا۔ ''بالکل درست۔ کل ابراہیم کو دربار میں جبراً بلوا لیا جائے اور اس کو اپنے طرزِ عمل کی تبدیلی پر مجبور کر دیا جائے۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے، کل ابراہیم کو جبراً بلوا لیا جائے گا۔''

خیزران خوش ہو گئی اور ہارون سے کہا۔ ''ہارون! جب تک تیری راہنمائی کے لیے یحییٰ موجود ہے تجھ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔'' پھر یحییٰ سے کہا۔ ''اور یحییٰ تم ان لوگوں پر گہری نظر رکھو جو ابراہیم کی طرح اب بھی ہادی کا دم بھرتے ہیں اور مرحوم ماضی میں زندگی کی سانسیں لے رہے ہیں۔''

یحییٰ نے عرض کیا۔ ''ام امیر المومنین، مجھ کو اپنی ذمے داریوں کا کہیں زیادہ احساس ہے۔ ایسے تمام آدمی میری نظر میں ہیں جو دل سے امیر المومنین ہارون کے ساتھ نہیں ہیں مگر خوف سے تائید کر رہے ہیں۔ اسی طرح میں ان لوگوں سے بھی واقف ہوں جو درپردہ فساد کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں اپنے ہر قسم کے دشمنوں سے واقف ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ان سے کسی طرح نمٹا جائے۔''

خیزران نے ہارون سے کہا۔ ''تو نے ہم دونوں کی باتیں سن لیں، اب یہ بتا کہ ہمیں اور کیا کرنا چاہیے تاکہ اس کا بھی انتظام کر لیا جائے۔''

ہارون نے یحییٰ سے کہا۔ ''یا ابی! مادرِ محترم کی باتوں کا میں کیا جواب دوں؟ آپ ہی جواب دے دیجیے۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ تو دیا کہ امیر المومنین کی ذمے داریاں میں اپنی ذمے داریاں سمجھتا ہوں اور ان سے بہر قیمت عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہوں اور

ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا۔"

خیزران نے کہا۔ "بہرحال کل ابراہیم کو زبردستی بلوالینا سب سے اہم ہے، میں اس سے خود بات کروں گی۔ وہ یا تو ہمارا مطیع وفرمانبردار ہوکر دربار سے واپس جائے گا یا پھر زندان کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔"

یحییٰ نے آہستہ سے کہا۔ "گویوں اور مطربوں سے امیر المومنین کا گفتگو فرمانا اچھی بات نہیں ہے۔ یہ کام تو مجھ کو کرنے دیجیے۔ لوگ آپ کو ایک مطرب سے محوِ گفتگو دیکھ کر چہ میگوئیاں کرنا شروع کردیں گے۔"

خیزران، یحییٰ کی باتوں سے خوش ہوگئی، بولی۔ "میں نے ہارون کے لیے تیرا انتخاب کرکے غلطی نہیں کی۔"

اس رات خیزران نے یحییٰ کو کھانے میں بھی شریک کیا۔ ہارون کھانے کے دوران بار بار اس پر زور دیتا رہا کہ مخالفینِ خلافت ہارون کا جلد از جلد خاتمہ کردیا جائے اور یحییٰ اثبات اور تائید میں گردن ہلاتا رہا۔ کافی رات گئے یحییٰ قصرِ خلد سے اپنے محل کے لیے روانہ ہوا تو اس کو خاصی پریشانی لاحق تھی۔ اسے ابراہیم سے ہمدردی تھی کیونکہ ابراہیم اس کی طرح عجمی تھا۔ وہ ابراہیم کو بچانے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ اپنے قصر میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنے بیٹے فضل کو طلب کیا اور اس سے مشورہ طلب کیا۔ فضل نے صاف صاف کہہ دیا کہ ابراہیم کا مسئلہ امیر المومنین کی انا سے تعلق رکھتا ہے اور خیزران بھی اس کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اس لیے ابراہیم کو راضی کرکے امیر المومنین کے دربار میں پیش کردینا چاہیے۔

پوری رات پریشانی میں گزر گئی گو کہ یہ یحییٰ کا مسئلہ نہیں تھا مگر یحییٰ اسے اپنا مسئلہ سمجھ رہا تھا۔

کہربا اپنے آقا کو بار بار یہی باور کروا رہی تھی کہ ابراہیم، ہارون کے دربار میں نہیں آئے گا۔ یحییٰ سختی سے کہتا کہ وہ آئے گا کیوں نہیں۔ امیر المومنین کی انا کا مسئلہ ہے اس کی بہتری اسی میں ہے کہ ماضی کو بھلا کر حال سے تعلقات بحال کرلے۔

علی الصباح دو سپاہی ابراہیم کے گھر پہنچ گئے اور اس کو یحییٰ کا یہ فرمان سنایا کہ وہ جس حال میں ہے، اسی میں قصرالطین چلا چلے۔ ابراہیم نے اپنے بیٹے اسحاق کو ساتھ لیا اور یحییٰ کے پاس پہنچ گیا۔ یحییٰ کا خیال تھا ابراہیم کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر بیٹھ جائے گا اور آنکھیں ملا کر بات نہیں کرسکے گا لیکن وہ اکڑا ہوا سینہ تان کر قصرالطین میں داخل ہوا اور یحییٰ سے آنکھیں ملا کر پوچھا۔ "اے برمکی سردار! تو مجھے خوامخواہ کیوں تنگ کررہا ہے؟"

یحییٰ اس کی جرأت سے بڑا متاثر ہوا، جواب دیا۔ "اور میں تجھ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ آخر تو اپنی اور اپنے کنبے کی دشمنی پر کیوں آمادہ ہوگیا ہے؟"

ابراہیم نے کہا۔ "امیر المومنین اور میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ ایک اشارے میں مجھ کو بلا کر ختم کرواسکتے ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔ میں مرجانا پسند کردوں گا مگر امیر المومنین کی ملازمت نہیں کروں گا۔"

یحییٰ اچھل پڑا۔ "آخر کیوں، کیوں؟ یہ امیر المومنین کی انا کا مسئلہ ہے۔ تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ تیری ضد اور عاقبت نااندیشی سے تیرا خاندان تباہ و برباد ہوجائے گا۔"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "میں خدانخواستہ امیر المومنین سے نفرت نہیں کرتا۔ میں اپنے بیٹے اسحاق کو امیر المومنین کی خدمت کے لیے تیار کررہا ہوں۔" اس کے بعد اسحاق کو یحییٰ کے سامنے کھڑا کردیا۔ "میرا یہ فرزند اتنا ذہین اور ہوشیار ہے کہ اس وقت بھی اس کا مقابلہ کرنے والا دور دور تک نہیں ملے گا اور اس کے لیے میرا یہ آخری اور قطعی فیصلہ ہے کہ ہمیشہ امیر المومنین ہی کی خدمت کرتا رہے گا۔"

یحییٰ نے اسحاق کی طرف دیکھا اور ابراہیم کی باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید وہ کسی حد تک نرم پڑ گیا ہے اور آخر کار یہ خود بھی ہارون کے دربار کی ملازمت پر آمادہ ہوجائے گا۔ اس نے اسحاق سے پوچھا۔ "کیا تجھے راگنیوں کا علم آتا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "بالکل آتا ہے، حکم ہو تو سناؤں؟"

یحییٰ نے کہا۔ "سنا۔"

اسحاق نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، ابراہیم نے کہا۔ "سنا، میں نے اجازت دی۔"

اسحاق نے گانا شروع کیا۔ اس کی دھن میں نرمی تھی، بلا کی نرمی..... ملائم آواز میں اشعار کا سوز یحییٰ کے دل میں آگ لگا چکے تھے، وہ وجد میں آگیا۔ یحییٰ مست و بےخود دنیا و مافیہا سے غافل اسحاق کی آواز، اس کے زیر و بم اور لحن و غناء میں ڈوب گیا۔ ابراہیم کا سر فخر سے تن گیا۔ کچھ دیر بعد جب اسحاق گانا ختم کرچکا تو یحییٰ نے کہا۔ "ابراہیم! جب یہ اس عمر میں اتنا بڑا مغنی ہے تو آگے چل کر کیا بنے گا، میری تو عقل حیران ہے۔"

"میں نے اسے امیر المومنین کی خدمت کے لیے تیار کیا ہے۔"

یحییٰ نے کہا۔ "ممکن ہے امیر المومنین اس سے راضی ہوجائیں اور تیری گستاخی کو معاف کردیں۔"

ابراہیم نے عرض کیا۔ "اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب آپ بھی ہماری سفارش فرمادیں۔"

یحییٰ سوچ میں پڑ گیا، کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔ "لیکن تو خود امیر المومنین کے دربار سے کیوں وابستہ نہیں ہوجاتا؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "آپ مجھ کو امیر المومنین کے پاس لے چلیے مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے، ان کے سامنے عرض کردوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں انہیں مطمئن کردوں گا۔"

یحییٰ نے کہا۔ "تجھے آج امیر المومنین کے دربار میں حاضری تو دینا ہی پڑے گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ تو کسی طرح امیر المومنین کو راضی کرپائے گا کیونکہ میں صاف محسوس کررہا ہوں کہ امیر المومنین نے تیرے مسئلے کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ وہ تیری کسی بات سے بھی راضی نہ ہوں گے۔"

ابراہیم نے آزردگی سے کہا۔ "اگر وہ مجھ سے راضی نہ ہوں گے تو یہ میری قسمت۔ پتا نہیں، امیر المومنین کی برہمی کیا رنگ لائے گی۔"

پردے کے پیچھے کہربا موجود تھی۔ اسحاق کے لحن نے اس کو بےحد متاثر کیا لیکن وہ یحییٰ کی اجازت کے بغیر اندر نہیں آسکتی تھی۔

ابراہیم معلوم نہیں کس طرح کہربا کی بو محسوس کررہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ یحییٰ نے پوچھا۔ "یہ تو کس کو تلاش کررہا ہے؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "برمکی بزرگ! آپ کی وہ کنیز کہاں چلی گئی جو چند دن پہلے مجھے بلانے گئی تھی۔"

یحییٰ نے کہا۔ "ابراہیم! ان فضول باتوں سے کیا حاصل۔ افسوس کہ تو ابھی تک اس خطرے اور نقصان کا اندازہ از خود نہیں کرسکا جس میں تو گھرا ہوا ہے اور جس سے تو عنقریب دوچار ہونے والا ہے۔ اگر تجھے اپنی بدبختی کا ذرہ بھر بھی احساس ہوتا تو اس وقت کہربا کا ذکر نہ کرتا۔"

کہربا خود بھی سامنے آنے کے لیے بےچین تھی، اس نے پردے کے پیچھے سے گنگنانا شروع کردیا۔ ابراہیم بےچین ہوگیا اور اسحاق کے کان کھڑے ہوگئے۔ یحییٰ اٹھ کر اندر چلا گیا اور کہربا کو ڈانٹ دیا۔ "یہ بےوقت کی راگنی بند کر۔ کیا تو ابراہیم کو پسند کرتی ہے؟"

کہربا جھینپ ہوگئی اور آہستہ سے جواب دیا۔ "نہیں، میں ابراہیم کو ذرا بھی پسند نہیں کرتی۔"

یحییٰ نے پوچھا۔ "پھر یہ گنگناہٹ کس کے لیے تھی؟"

کہربا نے جواب دیا۔ "ابراہیم کے بیٹے نوعمر مغنی اسحاق کے لیے۔"

یحییٰ ہنس دیا۔ "تو یہ بات ہے۔ وہی تو میں کہوں کہ جب تو ابراہیم کو پسند ہی نہیں کرتی تو یہ گنگناہٹ کس کے لیے تھی۔"

کہربا نے عرض کیا۔ "میرے آقا! میں نے اسحاق کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہ چکی ہوں لیکن میں یہ کبھی نہ جان سکی کہ اسحاق کے اندر اتنا بڑا ہنرمند، مغنی چھپا ہوا ہے۔"

یحییٰ نے پوچھا۔ "تو تجھے بھی اسحاق پسند آیا؟"

کہربا نے جواب دیا۔ "بےحد پسند آیا۔ اے کاش یہ راز پہلے کھل چکا ہوتا میرے آقا! کیا آپ اسحاق کو دوبارہ بلواسکتے ہیں یہاں؟"

یحییٰ مسکرانے لگا۔ "ویسے میں نے ابھی ابھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسحاق کو ملازم رکھ لوں۔ میں جانتا ہوں کہ ابراہیم پر امیر المومنین کا بھیانک عتاب نازل ہونے والا ہے۔ ان نازک اوقات میں اسحاق اپنے کنبے کی کفالت تو کرسکے گا۔"

اسی وقت یحییٰ کو ایک کنیز نے مطلع کیا کہ قصرِ خلافت کے چند ہرکارے ابراہیم کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آچکے ہیں۔

یحییٰ کہربا کو چھوڑ کر ابراہیم کے پاس پہنچا اور اعلان کیا۔ "ابراہیم! امیر المومنین کی طلبی کا فرمان آچکا ہے۔ دربار چلنے کے لیے کھڑا ہوجا اور دورانِ سفر اپنے معاملے پر اچھی طرح غور کرلے۔"

باہر خلافت کے ہرکارے ان کا انتظار کررہے تھے۔ یہ مختصر سا قافلہ قصرالطین سے قصرِ خلد کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں جو بھی ملا، یحییٰ کو دیکھ کر احتراماً سلام کرتا گزر گیا۔ حاجت مندوں نے راستے میں روک روک کر یحییٰ کے روبرو اپنے معروضات پیش کیے اور خاطر خواہ عنایات حاصل کرکے اپنی راہ ہولیے۔ ابراہیم اور اسحاق، یحییٰ کی اقبال مندی اور اختیارات دیکھ کر حیران ہورہے تھے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ قصرِ خلد کے قریب پہنچ گئے اور جامع مسجد بغداد کے مینار سے اچھی طرح نظر آنے لگے۔

قصرِ خلد کے صدر دروازے پر یحییٰ کے سوا سبھی کو روک لیا گیا۔ یحییٰ اندر چلا گیا۔ وہاں ہارون رشید تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے چند خاص آدمی بیٹھے تھے۔ ہارون نے یحییٰ کو دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گیا، بولا۔ "یا ابی! خیریت؟ آپ تنہا ہیں یا کوئی اور بھی ہے آپ کے ساتھ؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! میرے ساتھ ابراہیم موصلی اور اس کا بیٹا اسحاق دونوں ہی آگئے ہیں۔ وہ صدر دروازے پر کھڑے اذنِ باریابی کے طلب گار ہیں۔''

ہارون نے تیوریوں پر بل ڈال کر پوچھا۔ ''یہ اسحاق کیوں آگیا؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! ابراہیم اس کو آپ کے لیے تیار کر رہا ہے اور میرا خیال ہے، وہ اس وقت بھی بہت بڑا مغنی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ایک دن بیٹا باپ پر سبقت لے جائے گا۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''خود ابراہیم کیا کہتا ہے؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! خود ہی معلوم فرمالیں، اس کی باتیں کم از کم میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔ معلوم نہیں کیا کچھ بکتا رہا۔ میری سمجھ میں تو خاک نہیں آتا کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے؟''

ہارون نے آہستہ آہستہ تین بار تالی بجائی۔ تالی کی آواز پر کئی خدمت گار ہارون کے قدموں میں آکھڑے ہوئے۔

ہارون نے حکم دیا۔ ''دیکھو صدر دروازے پر ایک چھوٹا سا قافلہ کھڑا ہے، انہیں عزت و احترام سے میرے پاس لے آؤ۔''

یحییٰ نے جلدی جلدی عرض کیا۔ ''امیر المومنین! ابراہیم پر سختی نہ کی جائے تو بہتر ہے۔''

ہارون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد حاجب اس طرح حاضرِ خدمت ہوا کہ مہین پردے کے پیچھے ہارون چلا گیا تھا اور یحییٰ اور دوسرے امراء باریک پردوں کے سامنے کھڑے تھے۔

اتنے میں خلافت کے خدمت گار ابراہیم اور اسحاق کو لیے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ ابراہیم نے عرض کیا... ''یا امیر المومنین! غلام حاضر ہے۔ جو سزا چاہیں دے دیں، میں تیار ہوں۔''

ہارون نے پردے کے پیچھے سے... یحییٰ کو مخاطب کیا۔ ''یا ابی! آپ ابراہیم سے میرے سامنے یہ معلوم فرمالیں کہ آخر کیا وجہ ہے جو ابراہیم ابھی تک میرے دربار سے وابستہ نہیں ہوا؟''

یحییٰ نے یہی سوال ابراہیم سے کر ڈالا۔ حاجب کے ذریعے پوچھا۔ ''ابراہیم! امیر المومنین جاننا چاہتے ہیں کہ آخر وہ اب تک دربار سے دور کیوں ہے؟ کیا ابراہیم تاریک دنوں کی پیداوار ہے جو ہمیشہ درخشاں عہد سے راہِ فرار اختیار کرتا رہا ہے۔''

ابراہیم نے دور ہی سے پوچھا۔ ''برمکی سردار! کیا میں اپنی بات برملا ظاہر کردوں؟''

یحییٰ نے امیر المومنین کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''امیر المومنین! ابراہیم کو بولنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''

ہارون نے حاجب کی طرف دیکھ کر اثبات میں گردن ہلا دی۔ حاجب نے بہ آواز بلند کہا۔ ''ابراہیم مغنی کو امیر المومنین نے بولنے کی اجازت مرحمت فرمادی ہے، وہ بول سکتا ہے۔''

ابراہیم اپنی جگہ کھڑا ہوگیا اور پردے کے پیچھے موجود ہارون رشید کی جھلک دیکھ کر لرز گیا، بولا۔ ''حاجب! امیر المومنین سے فرمادیجیے کہ میں بہت زیادہ پریشان ہو رہا ہوں اس لیے مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''

ہارون رشید نے حاجب سے کہا۔ ''حاجب! اس سے کہہ دو کہ پہلے وہ ہمیں چند گانے سنا دے، اس کے بعد ہم سے پروانۂ تقرری وصول کرلے۔''

ابراہیم نے عرض کیا۔ ''امیر المومنین! افسوس کہ میں نہ تو آپ کو کوئی گیت سنا سکوں گا اور نہ ہی اپنے لیے پروانۂ تقرری حاصل کروں گا۔''

''آخر کیوں...... آخر ایسا کیوں؟'' اس کے بعد ہارون چراغ پا ہوگیا، بولا۔ ''ابراہیم سے کہہ دیا جائے کہ وہ میری سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ آج وہ ہمیں گانے سنائے گا اور دربار کے لیے پروانۂ تقرری حاصل کرے گا یا پھر وہ قید خانے میں چلا جائے گا۔ جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ جیتے جی موت کے مزے چکھتا رہے گا۔''

دربار پر سناٹا طاری ہوگیا، ابراہیم کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''امیر المومنین! رحم کیجیے۔''

ہارون رشید نے حاجب سے کہا۔ ''اس گوّیے سے کہہ دو کہ میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ آخر وہ ہادی کو کب تک روتا رہے گا؟''

ابراہیم نے عرض کیا۔ ''جب تک ہادی کے احسانات حافظے میں تازہ رہیں گے۔''

ہارون نے حاجب سے کہا۔ ''اب ابراہیم اپنے گھر واپس نہیں جائے گا۔ کل میں رقہ جا رہا ہوں۔ یہ میرے ساتھ جائے گا۔ یہ بھی اور شاعر ابوالعتاہیہ بھی کیونکہ ابوالعتاہیہ بھی بھائی ہادی کا اتنا ہی مرثیہ خوان ہے جتنا یہ ابراہیم۔ اور میں نے یہ قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ ان دونوں کو راہِ راست پر لے آؤں۔''

یحییٰ نے پوچھا۔ ''امیر المومنین! اسحاق کے لیے کیا حکم ہے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''اس کو، اس کے گھر واپس بھیج دیا جائے۔''

ابراہیم حیران و پریشان ہر اس شخص کی صورت دیکھ رہا تھا جو وہاں موجود تھا لیکن ہر شخص نظریں چرا رہا تھا کیونکہ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ابراہیم سے نظریں ملا کر اپنے دل میں موجود جذبۂ ہمدردی کا دوسروں پر اظہار کردے۔ خدمت گاروں نے آگے بڑھ کر ابراہیم کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور دربار سے کھینچتے ہوئے زنداں میں لے گئے۔ اسحاق کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

یحییٰ نے ایک بار پھر ابراہیم کی سفارش کی۔ ''امیر المومنین! ابراہیم اس عہد کا نامور مغنی ہے اور ہنر مند غیر معمولی حساس ہوتے ہیں۔ زنداں میں ابراہیم اپنے فن سمیت مرجائے گا۔ اگر جسم میں جان باقی بھی رہی تو کیا، ابراہیم مغنی باقی نہیں رہے گا۔''

ہارون نے ترشی سے جواب دیا۔ ''یا ابی! آپ ابراہیم کی سفارش نہ کیجیے کیونکہ میں اس کو بالکل معاف نہیں کروں گا۔''

یحییٰ خاموش ہوگیا۔ ہارون اندر چلا گیا۔ یحییٰ دربارِ خلافت سے اٹھ کر اسحاق سے ملا اور کہا۔ ''اسحاق! تو گھر واپس جا، تیرا ضدی اور عاقبت نااندیش باپ اپنے کیے کی سزا پائے گا لیکن تجھ کو یا تیرے گھر والوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تیری کفالت کروں گا۔''

اسحاق نے شکر گزار نظروں سے یحییٰ کو دیکھا اور دربار سے چلا گیا۔

یحییٰ نے سوچا کیا ابراہیم کے سلسلے میں خیزران سے مل لیا جائے لیکن دل و دماغ نے متفقہ طور پر اس تجویز کو مسترد کردیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ خیزران ہادی کے کسی بھی مداح یا پرستار سے سخت نفرت کرتی ہے اور وہ اس بارے میں اپنے بیٹے ہارون سے ذرا بھی مختلف نہیں۔

یحییٰ فکرمند، گم صم قصرالطین روانہ ہوگیا۔ وہ اپنی عقل و ذہانت کو ابراہیم کے معاملے میں ناکام محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایرانی اور رومی طرز کے مکانات کے درمیان سے گزرتا ہوا الدور میں داخل ہوگیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں برآمکہ نے اپنے متوسلین کو مکانات بنوادیے تھے۔ احاطوں کے اندر بنے ہوئے مکانات اور ان کے خوب صورت رقبے کسی نئے آنے والے کو بہت متاثر کرتے تھے۔ یحییٰ نے سوچا، ابراہیم اگر مان جاتا تو وہ اس کو اپنے دربار میں ملازم رکھ لیتا اور الدور میں اس کے لیے ایک شاندار مکان تعمیر کروادیتا لیکن بدنصیبی

معلوماتِ عامہ

وہ کون سی خاتون ہیں جو ایک نبی کی بیٹی۔ ایک نبی کی بہن۔ ایک نبی کی بیوی اور ایک نبی کی ماں۔ یہ عالمِ اسلام کی پہلی اور آخری خاتون جن کی 4 نبیوں سے رشتہ داری ہے۔

اس عظیم خاتون کا نام حضرت لیلا ہے۔

(1) حضرت یعقوب کی بیٹی
(2) حضرت یوسف کی بہن
(3) حضرت ایوب کی بیوی
(4) حضرت ذوالفقار کی ماں

☆☆☆

قرآن میں چار مسجدوں کے نام ہیں

(1) مسجد حرام
(2) مسجد اقصیٰ
(3) مسجد قباء
(4) مسجد زرار

☆☆☆

قرآن میں 3 شہروں کے نام ہیں۔

(1) مکہ
(2) مدینہ
(3) بابل

☆☆☆

4 دھاتوں کے نام ہیں

(1) سونا
(2) چاندی
(3) تانبا
(4) لوہا

☆☆☆

4 پرندوں کے نام ہیں

(1) ہدہد
(2) ابابیل
(3) کوا
(4) تیتر

مرسلہ۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی

ابراہیم کی پشت پر تھی اور وہ اس کی پشت پناہی میں کسی کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

ہارون کچھ عرصے کے لیے رقہ جارہا تھا، یہ بڑے دھوم دھام کا سفر تھا۔ اس سفر میں خیزران کے علاوہ ہر اہم شخص ساتھ تھا۔ اس کی چہیتی بیوی زبیدہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ یحییٰ نے بھی اپنی کنیزوں کو ساتھ لے لیا اور کہربا ان میں سرفہرست تھی۔ بغداد سے ایک منزل دور جب کاروانِ خلافت نے پڑاؤ کیا تو ویرانہ ایک شاندار بستی میں تبدیل ہوگیا۔

یحییٰ برمکی اور اس کی کنیزوں کے خیمے، محافظوں کے سرے پر تھے۔ اس کے بعد دوسرے امراء کے خیمے تھے۔ امراء کے بعد فوجیوں کے خیمے تھے اور سب کے آخر میں دکانداروں کے خیمے تھے جو ضروریاتِ زندگی کا ذخیرہ لیے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

شام کو جب ان خیموں میں شمعیں اور مشعلیں...... جلیں تو رات گئے تک ایک جھلملاتا حسین و جمیل شہر وجود میں آگیا۔ یحییٰ برمکی نے اپنی کنیزوں کو بننے سنورنے اور محفل موسیقی آراستہ کرنے کا حکم دیا اور یہ حیرت انگیز اعلان کیا کہ آج کی رات امیرالمومنین ہارون رشید اس کے مہمان بنیں گے اس لیے اس کے روبرو ایسے کمال فن کا مظاہرہ کیا جائے کہ وہ اش اش کر اٹھے۔ اس کے بعد یحییٰ کہربا کو ایک گوشے میں لے گیا اور سرگوشی میں کہا۔ ''کہربا! آج تجھے اپنی آواز کا جادو جگانا ہے کیونکہ میں امیرالمومنین سے ایک ایسا کام لینا چاہتا ہوں جو ان کی مرضی کے خلاف ہے۔''

کہربا نے عاجزی سے درخواست کی۔ ''میرے آقا! مجھ کو آزمائش میں نہ ڈالیے کیونکہ میں بھی ایک انسان ہوں جو خطا اور لغزش کے خمیر سے وجود میں لایا گیا ہے۔''

یحییٰ برمکی نے جواب دیا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اگر ہارون خطا اور لغزش کا شکار ہوگیا تو میں اس سے ابراہیم مغنی کے حق میں کوئی اچھا سا حکم حاصل کرسکوں گا۔''

کہربا اداس ہوگئی۔ ''میرے آقا! اس مغرور نادان گوّیے کی خاطر مجھ کو خوار نہ ہونے دیجیے۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''جس طرح ابراہیم مغنی مغرور اور نادان ہے اسی طرح ہارون بھی مغرور اور نادان ہے۔ میں بڑے توسل سے ایک نادان کو دوسرے نادان کے قہر و غضب سے بچانا چاہتا ہوں۔''

کہربا خاموش ہوگئی۔ یحییٰ نے بطورِ خاص ہدایت کی۔ ''ہارون کو تیری آواز بہت پسند ہے۔ اس نے کئی بار اپنی اس پسندیدگی کا ذکر بھی کیا ہے لیکن حزم و احتیاط نے اس کو بے بس کر رکھا ہے۔ اگر تو چاہے تو ہارون تنکے کی طرح تیرے قدموں میں گر جائے گا اور تو اس سے ابراہیم کے لیے امان نامہ حاصل کرسکتی ہے۔''

کہربا پس و پیش میں پڑگئی، پوچھا۔ ''اس سلسلے میں مجھ کو کیا کچھ کرنا ہوگا؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''مشاطاؤں کی مدد سے شاندار آرائش و زیبائش۔ ناز و ادا کی بوچھاڑ سے ہارون کو حواس باختہ کردینا پھر جب وہ گانے کی فرمائش کرے تو ابراہیم کی دھن میں ابوالعتاہیہ کا عبرت انگیز کلام سنانا۔ اس کے بعد ہارون ہار مان لے گا اور تیری مدد سے میں ابراہیم اور اس کے ساتھ ابوالعتاہیہ کو زنداں سے نکلوانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔''

کہربا کو رونا آگیا، سر جھکا کر عرض کیا۔ ''میرے آقا! جو آپ کا حکم، تعمیل کروں گی۔''

مشاطاؤں نے کہربا کو بنا سنوار کر رشکِ حور بنادیا اور رقص و غناء کے خیمے میں ہارون کے لیے ایک شاندار نشست بنادی گئی۔ چند دوسری کنیزوں کے ہاتھوں میں ساز تھمادیے گئے۔ اس کے بعد یحییٰ ہارون کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ ''امیرالمومنین! دورانِ سفر تکان اور کسلمندی نے تو ہلکان کردیا ہوگا؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''بے شک یاابی۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''پھر اس ناچیز غلام نے تکان اور کسلمندی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک محفلِ طرب منعقد کی ہے۔ امید ہے اس طرح ہم سب اپنی تکان اور بدمزگی کو خوشگواری اور فرحت میں بدل دیں گے۔''

ہارون نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ ''یاابی! آپ کی اس کنیز کا کیا نام تھا جس کی آواز اور شکل میں......''

یحییٰ نے اداکاری کی اور کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''کون سی کنیز امیرالمومنین؟''

ہارون نے جھنجلا کر کہا۔ ''ارے وہی جس میں آسمانی بجلی جیسی چمک اور بے چینی پائی جاتی ہے اور جس کی آواز کا کرکرا پن اور گری پتھروں کو پگھلا سکتے ہیں۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین کی مراد غالباً کہربا سے ہے۔''

ہارون نے بے اختیار کہا۔ ''یاابی بے شک، بے شک۔'' اس کے بعد ہارون نے اپنے اردگرد دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ''لیکن افسوس معلوم نہیں کیوں زبیدہ کو کہربا کے نام ہی سے چڑ ہے۔ وہ

کہربا کو ذرا بھی پسند نہیں کرتی۔ معلوم نہیں کیوں؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! میری تو ملکۂ عالیہ زبیدہ تک رسائی ہی نہیں، میں تو انہیں کچھ بتانے سے رہا۔''

ہارون نے کہا۔ ''تب پھر میں چلوں گا، ضرور چلوں گا۔''

شام کو یحییٰ، ہارون کو اپنے ساتھ لے کر اپنے خیمے میں پہنچا جہاں محفلِ طرب آراستہ کی گئی تھی۔ ہارون کو اس کی مخصوص نشست گاہ پر بٹھادیا گیا۔ اس کے سامنے مغنیہ کنیزیں قطاروں میں کھڑی تھیں لیکن ان میں کہربا شامل نہیں تھی۔ ہارون نے اس کو نظروں ہی نظروں میں تلاش کیا اور مایوس ہونے پر... یحییٰ سے پوچھا۔ ''یاابی! وہ آواز کی ساحرہ کہاں ہے؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! جب میں نے اس کو آپ کی تشریف آوری کی خبر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئی مگر جب غلطی سے میں یہ کہہ بیٹھا کہ امیرالمومنین تیری آواز کو بے حد پسند کرتے ہیں مگر ملکۂ عالیہ زبیدہ کو تجھ سے نفرت ہے، بس یہ سنتے ہی وہ یہاں سے چلی گئی۔ جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہہ دیا کہ جب ملکۂ عالیہ زبیدہ مجھے ناپسند کرتی ہیں اور یہ نہیں چاہتیں کہ میں امیرالمومنین سے ملوں تو میں بھی احتیاط کروں گی اور امیرالمومنین کو بھی میری حاضری اور موجودگی پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔''

ہارون نے مایوسی سے کہا۔ ''یاابی! یہ آپ نے کیسی بات کہہ دی؟ جائیے اور اس کو لے کر آئیے۔''

یحییٰ اس خیمے میں چلا گیا جہاں کہربا بنی سنوری، سجی سجائی بیٹھی تھی۔ یحییٰ نے اس سے کہا۔ ''کہربا! میں نے امیرالمومنین کی آتشِ شوق بھڑکادی ہے۔ مجھ کو تیرے پاس اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تجھے منا کر محفلِ طرب میں لے جاؤں لیکن میں یوں ہی واپس جاؤں گا اس کے بعد تیرے پاس امیرالمومنین خود آئیں گے۔ تجھ کو محفلِ طرب میں جانا تو ہے مگر امیرالمومنین کے اصرار اور خوشامد کرنے پر۔ آج میں دیکھوں گا تو یہ بڑا اور نازک کام کس طرح انجام دیتی ہے۔''

کہربا ہنسنے لگی، بولی۔ ''میرے آقا! آپ کی صحیح جگہ وہ ہے جہاں امیرالمومنین تشریف فرما ہیں کیونکہ آپ کو خدا نے علم، عقل اور حکمت سے یکساں نوازا ہے۔ خدا آپ کو نظرِ بد سے بچائے کیونکہ آپ ہر وقت حاسدوں کی نظرِ بد کی زد میں ہیں۔ عروج و اقبال کی اس سربلندی پر جس کی دوسری طرف زوال اور ادبار کی گہرائیاں ہیں۔''

یحییٰ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''کہربا! میں زمانے کو تجھ سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہوں۔ میں حاسدوں اور ان کی نظروں سے بھی آشنا ہوں۔ میں اپنے عروج و اقبال کی بلندیوں کے پیچھے زوال اور ادبار کی گہرائیاں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن تجھ کو ایک بات معلوم ہونا چاہیے۔ میں اپنے عروج و اقبال پر ذرا بھی نازاں نہیں۔ میں اس سے دوسروں کو فائدے پہنچانا چاہتا ہوں۔ اب اگر میں کسی طرح زوال و ادبار اور نکبت و افلاس کی گہرائیوں میں گر بھی گیا تو میں اس سے نہ تو خوفزدہ ہوں اور نہ لرزاں و ترساں۔ میں اپنے حصے کی ہر چیز کو مقدر سمجھ کر ہنسی خوشی اور شکرگزاری سے قبول کرلوں گا۔''

کہربا نے احسان مندی کی نظروں سے یحییٰ کی طرف دیکھا اور مختصراً عرض کیا۔ ''امیرالمومنین کو میرے پاس بھیج دیجیے، میں انہیں سنبھالنے اور اپنی مرضی کی پیروی کرنے پر مجبور کردوں گی۔''

یحییٰ منہ لٹکائے ہارون رشید کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ہارون اس کو تنہا آتے دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ وہ بار بار یحییٰ کے عقب میں کہربا کو دیکھنے کی کوشش کرتا مگر جب کچھ نظر نہ آیا تو پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یاابی! وہ کہاں ہے، وہ آئی کیوں نہیں؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کو منا کر لے آؤں مگر وہ نہیں مانی۔ ابھی بھی کہہ رہی تھی کہ امیرالمومنین کو میری آواز اتنی ہی پسند ہے اور وہ مجھے اپنی محفلِ طرب میں دیکھنا ہی چاہتے ہیں تو میرے پاس آنے کی خود زحمت فرمائیں۔ اس طرح میرے مجروح دل پر گویا مرہم لگ جائے گا اور امیرالمومنین کی تشریف آوری کا اعزاز میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہوگا جس کے سہارے میں زندگی بھر شاداں و فرحاں رہوں گی۔''

ہارون چپ ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ان حالات میں اس کو کیا کرنا چاہیے۔

کچھ دیر بعد ہارون اٹھا اور یحییٰ سے کہا۔ ''یاابی! مجھ کو وہاں تک لے چلیے، میں اس کو منالوں گا۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''بسم اللہ امیرالمومنین! تشریف لائیے۔''

ہارون کو ایک خیمے سے نکل کر دوسرے خیمے میں جانا پڑا۔ اس کا دل ملامت کررہا تھا کہ ایک مغنیہ کی خاطر وہ یہ سبکی برداشت کررہا ہے جو کسی طرح بھی مناسب نہیں لیکن کہربا کی آواز کا سحر ہارون کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ جب وہ یحییٰ کے ساتھ کہربا کے خیمے میں داخل ہوا تو اس نے دور ہی سے کہربا کو خیمے کے در کی طرف پشت کیے بیٹھا دیکھا۔ اس کے بالوں کو لال رومال سمیٹے ہوئے تھا۔ یحییٰ نے اس کی

طرف دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔ منہ پھیر کر خیمے کے در پر ہی رک گیا۔

ہارون نے یحییٰ کو دور کھڑے دیکھا تو اشارے سے پاس بلالیا اور پوچھا۔ ''یا ابی! یہ آپ دور کیوں کھڑے ہیں؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! اس وقت کہربا کی انا اور اس کا احساسِ حسن وفن بیدار ہے جس سے یہ خود بین وخود آرا ہوگئی ہے اور امیرالمومنین کو یہاں تک آنے کی زحمت دے دی ہے۔ اب آگے کیا پیش آنے والا ہے، میں اس سے بھی واقف ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ اس وقت امیرالمومنین میری موجودگی کو شرمندگی اور خجالت سے محسوس فرمائیں۔''

ہارون نے کہا۔ ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا یا ابی؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''کہربا نے آپ کو یہاں تک آنے کی زحمت اس لیے دی ہے کہ وہ آپ کو خوشامد اور منت وزاری پر مجبور کرے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ باتیں میری موجودگی میں ہوں اور آپ اس میں شرم وندامت محسوس فرمائیں۔''

ہارون واقعی شرمندہ ہوگیا، گھبرا کر بولا۔ ''تو گویا مجھ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! میں دوسرے کمرے میں جارہا ہوں، آپ اس سے بات کرلیجیے اور اس الجھن میں نہ پڑیے کہ کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

یحییٰ، ہارون کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔ ہارون ٹھٹکا رہ گیا۔ شرم وندامت نے اس کو جامد وساکت کردیا تھا۔ کہربا منہ پھیرے بدستور بیٹھی تھی...... کسی مجسمے کی طرح خاموش، پرسکون، منجمد۔ ہارون آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور اس کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ وہ کہربا کی زلفوں پر محیط سرخ رومال کو غور سے دیکھتا اور اپنے اندر ہیجان محسوس کرتا رہا۔ اس نے اپنے گردوپیش کا نہایت احتیاط سے جائزہ لیا اور داہنا ہاتھ کہربا کے سر پر رکھ دیا۔

''کہربا! یہ تو نے کیا کیا؟''

کہربا تڑپ کر مڑ گئی۔ ''امیرالمومنین آپ؟''

ہارون نے کہا۔ ''ہاں میں...... تو آئی کیوں نہیں؟ کیا یحییٰ نے تجھ کو یہ نہیں بتادیا تھا کہ میری محفلِ طرب میں تیری شرکت ضروری ہے۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! میری کیا مجال کہ امیرالمومنین مجھ کو طلب فرماتے اور میں نہ آتی۔ میرے نہ آسکنے کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ آج میں امیرالمومنین کو اپنے فن اور آواز سے محظوظ نہ کرسکوں گی، یہی ناکامی کا احساس مجھ سے انکار کروا رہا تھا۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''اس ناکامی کی وجہ؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین پر یہ بات ظاہر ہے کہ میں نے یہ فن جن استادوں سے سیکھا ہے، ان استادوں میں استاد الاساتذہ ابراہیم کا نام سرفہرست ہے۔ میں جب یہ سوچتی ہوں کہ جس محفل طرب میں میں امیرالمومنین، ان کے ندما اور امراء کو اپنے فن اور آواز سے لطف اندوز کررہی ہوں گی تو وہیں کہیں آس پاس استاد ابراہیم قید میں پڑے اپنی تیرہ بختی پر آنسو بہارہے ہوں گے۔ بس یہ احساس مجھے کو پریشان اور مضطرب کردے گا اور میں اپنی کوششوں میں ناکام ہوجاؤں گی۔''

ہارون نے کہا۔ ''کم سے کم لفظوں میں بتا کر تو چاہتی کیا ہے؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''استاد ابراہیم پر رحم کیا جائے، انہیں معاف کردیا جائے۔''

ہارون نے کہا۔ ''اور کچھ...... مزید؟''

کہربا نے عرض کیا۔ ''انہیں اس محفل طرب میں شریک کیا جائے۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''میں تیری دونوں درخواستیں مان لوں گا لیکن ایک کام تجھ کو بھی کرنا ہوگا۔''

کہربا خوشی سے پاگل سی ہوگئی۔ بے چینی سے ہارون کے آگے جھک گئی۔ ''امیرالمومنین! ارشاد، حکم فرمایئے۔''

ہارون نے کہا۔ ''آج جب ابراہیم محفل طرب میں آجائے تو تو اس کو اس پر آمادہ کرلے کہ وہ بھائی ہادی کا خیال اپنے دل سے نکال دے اور میری ملازمت میں آجائے۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''میں استاد کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گی۔''

ہارون نے کہا۔ ''کہربا! جس تدبیر سے تو نے مجھ کو یہاں تک بلالیا ہے اور مجھے منت وخوشامد پر مجبور کردیا ہے، کسی ایسی ہی تدبیر سے تو استاد ابراہیم کو بھی بدل دے۔''

کہربا نے عرض کیا۔ ''یا امیرالمومنین! میں کوشش کروں گی۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''پھر میری معافی مشروط ہے، میں ابراہیم کو محفل طرب میں بلا تو لوں گا لیکن معاف اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک کہ اس کے دل میں بھائی ہادی کی محبت اور مجھ سے نفرت موجود ہے۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین تشریف لے

چلیں، میں لباس بدل کر آرہی ہوں۔''

ہارون نے کہا۔ ''کہربا! میں تیرے پاس بار بار آؤں گا اور تیرے ناز وانداز کی پرستاری کروں گا۔ کیا تو جانتی ہے کہ ایسا کیوں ہوگا؟ میں اپنے مرتبے کا خیال کیے بغیر اتنا عاجز اور حقیر کیوں بن جاؤں گا؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''یا امیرالمومنین! میں نہیں جانتی۔''

ہارون نے کہا۔ ''مجھ کو تیری آواز کے سحر نے بے قابو کردیا ہے۔ تیرا فن ایک طرف، جب تو بولتی ہے تو میں بے چین ہوجاتا ہوں اور میرا پورا وجود تیری آواز کی دلکشی اور سحر آفرینی کا شکار ہوجاتا ہے۔''

کہربا خوشی سے پھولی نہ سمائی، بولی۔ ''امیرالمومنین! میں خود پر نازاں رہوں گی اور اپنی قسمت پر ہمیشہ فخر کرتی رہوں گی۔''

ہارون نے کہا۔ ''میں واپس جارہا ہوں۔ تو لباس بدل کر فوراً آجا۔''

ابھی وقت یحییٰ اندر داخل ہوا۔ ہارون نے مسکرا کر کہا۔ ''یا ابی! کہربا نے محفلِ طرب میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کردی ہے۔ میں واپس جارہا ہوں یہ لباس بدل کر آرہی ہے۔ آپ ابراہیم کو بھی محفل طرب میں شامل کرلیجیے۔''

ہارون کے چلے جانے کے بعد کہربا نے شرب (باریک، از قسم تن زیب) کا لباس پہنا۔ لباس زیریں میں دمیاط کا رنگین چست کرتہ تھا اس کے اوپر شرب کا لباس، جو قیمتی زردوزی کے کام سے مرصع تھا۔ تیاری اور آراستگی کے بعد جب کہربا نے خود کو آئینے میں دیکھا تو خود بھی حیرت زدہ رہ گئی لیکن اس خیال نے ذرا غم زدہ کردیا کہ امیرالمومنین ہارون کو اس کا سراپا نہیں، صرف آواز پسند ہے۔ اس نے سوچا، اگر ہارون اس کے سراپا اور حسن سے متاثر نہیں ہوتا تو نہ ہو، استاد ابراہیم کے دل پر تو بجلیاں گریں گی۔

☆☆☆

محفل طرب میں ابراہیم کو مغنیہ کنیزوں اور ساز بجانے والوں میں نمایاں جگہ دی گئی لیکن ان میں کہربا سب پر چھائی ہوئی تھی۔ ابراہیم نے اس تنالہ جہاں سوز کو دیکھا تو دل پکڑ کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کو یہ بات بھی نہ یاد رہی کہ وہ امیرالمومنین کی محفل طرب میں بیٹھا ہے۔ کہربا بھی اس کو کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔

سامنے باریک کپڑے کا پردہ پڑا ہوا تھا جہاں ہارون رشید بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اور گانے والوں کے درمیان اس باریک پردے کو حائل رکھنا چاہتا تھا۔ یہیں ایک طرف خواتینِ خلافت بھی موجود تھیں۔ یہ بھی پردوں کی آڑ سے گانے سننے کے لیے جمع ہوگئی تھیں۔ ہارون کے سامنے دائیں بائیں ندیموں اور امیروں کی صفیں تھیں۔ ان میں ہارون کا حاجب، یحییٰ اور آل برمک سب سے آگے تھے۔ ابراہیم نے کئی بار ہارون اور اپنے درمیان حائل پردے کی طرف دیکھا اور منہ بنا کر سر جھکا لیا۔

کہربا نے ابراہیم کے پاس جا کر سلام کیا اور مزاج پرسی کی۔ ابراہیم نے سرد آہ بھری اور کہا۔ ''کہربا! میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''ایک استاد کی حیثیت سے۔ میں نے امیرالمومنین سے خواہش کی تھی کہ آپ کو ضرور بلایا جائے ورنہ میں نہیں شریک ہوں گی۔''

ابراہیم خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا۔ ''کہربا! مجھ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تیرے دل پر میری محبت کا اثر ضرور ہوگا لیکن افسوس کہ اب میں امیرالمومنین کا قیدی ہوں اور میرے لیے تیرا عشق فضول ہے۔ نہ میں تجھے حاصل کرسکتا ہوں نہ تو مجھے۔''

کہربا نے ہنس کر جواب دیا۔ ''یہ آپ نے کس طرح سمجھ لیا کہ میں آپ پر مائل ہوگئی ہوں۔ ہاں میرا آقا یحییٰ برمکی آپ پر بہت مہربان ہے اور وہ ہر وقت اسی فکر اور تدبیر میں لگا رہتا ہے کہ آپ کو کس طرح رہائی دلائے اور امیر المومنین کا دل کس طرح صاف کرے۔''

ابراہیم نے بڑے کرب سے کہربا کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ''کیا سچ؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں اس محفل سے اٹھ کر خود زندان میں چلا جاؤں گا۔''

کہربا نے کہا۔ ''آپ عقل سے کیوں نہیں کام لیتے؟ امیرالمومنین کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور مرے ہوؤں کے ماتم سے باز آجایئے۔''

ابراہیم نے ہارون اور گانے والوں کے درمیان حائل پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کہربا! تو نے بھی ہادی کا زمانہ دیکھا تھا۔ کیا وہ ہم سے اس طرح دور رہتا تھا؟ کیا اس وقت بھی یہ پردہ حائل رہتا تھا؟ پھر ہارون نے ہم پر جو احسانات کیے ہیں انہیں بھلایا جاسکتا ہے؟ امیرالمومنین ہمیں احسانوں سے تو اپنی طرف مائل کرسکتے ہیں، احکام اور طاقت سے ہرگز نہیں۔ شاعر ابوالعتاہیہ بھی میری ہی طرح زیرِ عتاب ہے اور اس کا جرم بھی وہی ہے جو

میرا۔ یعنی ہادی کا احسان مند ہونا اور ہادی کے احسانوں کو ہمیشہ یاد رکھنا۔''

کہربا نے کہا۔ ''آپ جو چاہیں سوچیں لیکن یہ طے ہے کہ آپ دونوں اپنی بے جا اور فضول ضد پر قائم رہ کر امیرالمومنین کو قائل اور مائل نہیں کرسکتے۔ آپ امیرالمومنین کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔''

ہارون پردے کے پیچھے سے دونوں کو ہم کلام دیکھ رہا تھا اور انہیں باتیں کرنے کا موقع دے رہا تھا۔ اسے کچھ کچھ امید ہوگئی تھی کہ ابراہیم کو راضی کرلیا جائے گا۔

آخر کچھ دیر بعد یحییٰ نے حکم دیا کہ گانے کا آغاز ہو۔ پہلے تو معمولی گانے والوں نے گانا شروع کیا۔ اس کے بعد کہربا کو موقع ملا اور اس نے گانا شروع کیا۔ وہ پردے کے پاس چلی گئی۔ چنگ کو ہاتھ میں لیا اور نہایت ہوشیاری اور مہارت سے اس کو بجانا شروع کردیا۔ اس کے ہاتھ کی مشاقی اور مہارت نے تقریباً سبھی کو مست و سرشار کردیا۔ اس کے بعد اس نے ابوالعتاہیہ کا کلام لے میں شروع کردیا۔

ابوالعتاہیہ کے کلام اور کہربا کی پرسوز آواز نے سبھی کو متاثر کیا۔ ہارون کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ابراہیم سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ ہارون نے پردے کے پیچھے سے کہلوایا۔ ''کہربا سے کہہ یہ محفل طرب ہے، مجلس تعب نہیں۔ اس نے پوری محفل کو سوگوار اور اشک بار کرکے رکھ دیا ہے۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! عربوں میں مثل مشہور ہے کہ سچا دوست وہ ہے جو سچی بات کہہ کر رلادے۔ کیا میں نے سچی باتیں نہیں کیں اور کیا میں نے اپنی باتوں سے امیرالمومنین کو رلا نہیں دیا؟''

ہارون نے کہلوادیا۔ ''بہرحال میں خوش رہنا چاہتا ہوں۔ اگر تو میرے غمزدہ دل کو خوش نہیں کرسکتی تو اسے مزید آزردہ نہ کر۔''

کہربا ہارون کو آزردہ نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ جو کچھ اس نے کیا تھا، اپنے آقا یحییٰ برمکی کی خواہش اور حکم پر کیا تھا۔ اس نے یحییٰ کی طرف دیکھا۔ یحییٰ نے نظریں چرائیں اور ابراہیم موصلی سے کہا۔ ''استاد ابراہیم! تیرے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ تو امیرالمومنین کو کسی خوشگوار نغمے سے راضی کرلے۔''

ابراہیم موصلی نے یحییٰ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور جواب دیے بغیر ہی منہ پھیرلیا۔

کہربا نے ابراہیم سے سرگوشی میں کہا۔ ''استاد! موقع سے فائدہ اٹھایئے۔ آپ کی سفارش کے لیے میرا آقا یحییٰ برمکی موجود ہے۔''

ابراہیم نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''اگر امیرالمومنین کے دربار سے وابستگی اسی شرط پر ہوسکتی ہے کہ میں اپنے محسن ہادی کو بھلادوں اور اس کے احسانات کو فراموش کردوں تو یہ ناممکن ہے۔''

کہربا نے کہا۔ ''استاد! آپ نے ابوالعتاہیہ کا آخری شعر غور سے سنا یا نہیں؟ جس میں اس نے شاید آپ ہی جیسے لوگوں کو مخاطب کیا ہے کہ اے شخص! اس دنیا سے جو کچھ لے سکتا ہے، لے لے کیونکہ اس کا انجام بہرحال موت ہے۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''کہربا! اگر میرے دل میں تیری محبت جاگزیں نہ ہوتی تو اس وقت میں اس محفل میں ہرگز نہ ہوتا۔ کیا تو نہیں جانتی کہ ابوالعتاہیہ اور ابراہیم موصلی اس وقت ایک ہی کشتی میں سفر کررہے ہیں۔ وہ بھی قید میں ہے اور میں بھی قید میں ہوں۔ جس جرم میں وہ قید ہوا ہے، اسی جرم میں، میں قید کردیا گیا۔ تو ابوالعتاہیہ کے پاس جا اور اس کو اس کا یہ شعر سنا کر ہارون کے دربار سے وابستہ ہوجانے پر مجبور کر...... پھر دیکھ وہ کیا جواب دیتا ہے؟''

ہارون پردے کے پیچھے سے کہربا اور ابراہیم موصلی کی گفتگو کا ماحصل جان چکا تھا۔ اس نے غصے سے یحییٰ برمکی کو حکم دیا۔ ''یا ابی! آپ معلوم نہیں کیوں اس ذلیل گویے پر مہربانیاں کررہے ہیں۔ کہربا سے کہہ دیجیے کہ ابراہیم سے باتیں نہ کرے اور ابراہیم کو اسی وقت دوبارہ قید میں ڈال دیجیے۔ یہ عاقبت نااندیش احمق اسی کا مستحق ہے۔''

یحییٰ نے محفلِ طرب میں موجود خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ابراہیم کو دوبارہ قید کردیا جائے۔ حکم پر فوراً ہی عمل کیا گیا اور ابراہیم دوبارہ قید کردیا گیا۔

اس کے بعد ایک بار پھر محفلِ طرب میں ساز و آواز کا شور اٹھا اور پوری محفل مست و مسرور ہوگئی لیکن ہارون کے دل پر بوجھ آگیا۔ اگر کہربا کی آواز میں ہارون کے لیے ایک خاص دلکشی اور سحر نہ ہوتا تو وہ اس محفل کو فوراً ہی برخاست کردیتا لیکن کہربا کی آواز نے کسی حد تک ہارون کو بے خود اور بے ہوش سا کردیا۔ زبیدہ اس کی بے خودی اور وارفتگی کو بڑی بے چینی اور پریشانی سے محسوس کرتی رہی۔ اس نے ہارون کی نظروں میں وہ شوق اور اشتیاق بھی محسوس کرلیا جو ہارون کہربا کو دیکھ دیکھ کر اور پہلو بدل بدل کر ظاہر کررہا تھا۔

دوسرے دن علی الصباح ہارون نے یحییٰ سے خواہش کی کہ اس کو کہربا کے پاس لے چلے کیونکہ اس کی آواز کا رس کانوں کو مضطرب و بے چین کیے ہوئے ہے۔ یحییٰ ہارون

کو لیے کہربا کے پاس چلا گیا۔ ہارون کہربا کے پاس دیر تک موجود رہا۔ خود کم بولا مگر کہربا کو بولتے رہنے کا حکم دے دیا۔ اس بات کا چرچا ہونے لگا اور جب یہ خبر قید خانے میں ابراہیم کو سنائی گئی تو اس کو بہت غصہ آیا اور اس کو بدگمانی ہوئی کہ شاید ہارون اس کو جلانے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔

☆☆☆

رقہ پہنچ کر ہارون نے ایک بار پھر ابراہیم اور ابوالعتاہیہ کو موقع دیا کہ وہ اپنے دل صاف کر کے دربار سے وابستہ ہو جائیں لیکن دونوں کو ضد سی ہو گئی تھی، صاف انکار کر دیا۔ ہارون نے یحییٰ کو حکم دیا کہ ایک کنواں کھدوایا جائے۔ یحییٰ نے کنویں کی کھدائی شروع کروا دی۔

ہارون رقہ پہنچ کر بھی ہر روز کہربا کے پاس ضرور جاتا تھا۔ اس کی باتوں اور آواز سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ یحییٰ برمکی نے کئی بار یہ فیصلہ کیا کہ کہربا کو ہارون کے حوالے کر دے مگر زبیدہ کی ناراضی کے خیال سے باز رہتا تھا۔

رقہ ہارون کا گرمائی صدر مقام تھا جو فرات کے کنارے آباد تھا۔ یہاں وہ بغداد سے دور عیش و عشرت میں اپنا وقت گزارتا تھا۔ رقہ میں تقریباً ہر روز ہی محفلِ طرب منعقد ہوتی اور ہارون ان سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اس نے کہربا سے بہت کچھ سنا اور اس کا بہت زیادہ اثر لیا۔ لیکن ایک دن کسی مغنیہ کنیز نے اس عہد کے مشہور شاعر ابونواس کا کچھ کلام سنایا اور ہارون کو خوش کر دیا۔ ہارون نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ابونواس کا کلام کہربا سے سنے گا۔

حسبِ دستور صبح فجر کے بعد ہارون کہربا کے پاس جانے لگا تو اس کی چہیتی بیوی زبیدہ نے روکنا چاہا مگر ہارون نہیں رکا۔ اس نے ہارون کے جاتے ہی یحییٰ کو طلب کر لیا۔ یحییٰ کو اپنے سامنے دیکھتے ہی زبیدہ برس پڑی۔ ''یا ابی! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا کہربا بہت زیادہ خوب صورت ہے؟''

یحییٰ نے بات ٹالنا چاہی مگر زبیدہ اپنی بات پر اڑی رہی اور... یحییٰ سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہارون کا ہر روز علی الصباح کہربا کے پاس جانا اس کو ذرا بھی پسند نہیں۔ اس لیے کسی ترکیب سے ہارون کو کہربا کے پاس جانے سے باز رکھا جائے۔

یحییٰ نے وعدہ کر لیا کہ انشاء اللہ ملکۂ عالیہ کو دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا لیکن جب وہ اپنے خیمے میں واپس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہارون کہربا سے باتیں کر رہا ہے۔ ہارون نے یحییٰ پر نظر پڑتے ہی پوچھا۔

''یا ابی! آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''مجھ کو ملکۂ عالیہ زبیدہ نے طلب کر لیا تھا۔''

ہارون نے گھبرا کر پوچھا۔ ''وہ کیوں... کس لیے؟''

یحییٰ نے عرض کیا۔ ''وہ ایک خاص بات تھی، کسی وقت تخلیے میں عرض کر دوں گا۔''

ہارون نے پھر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور ایک کنیز کو حکم دیا۔ ''گانا شروع کیا جائے۔''

کنیز نے کھڑے ہو کر دریافت کیا۔ ''امیر المومنین کس شاعر کا کلام سننا پسند فرمائیں گے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''شاعر ابونواس کا۔''

کنیز نے گانا شروع کر دیا۔

ہارون نے کہربا سے کہا۔ ''دیکھ، کلام یہ ہے جس کا مزہ رگ و پے میں خون کی طرح دوڑنے لگا۔''

یحییٰ نے کہربا کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ کسی بہانے سے اٹھ کر اس کے پاس آ جائے۔ ہارون نے کن انکھیوں سے یحییٰ کا اشارہ دیکھ لیا مگر چشم پوشی اختیار کی۔ یحییٰ باہر چلا گیا، اس کے پیچھے پیچھے کہربا پہنچی۔ یحییٰ نے کہا۔ ''میرے پاس تجھ سے بات کرنے کا زیادہ وقت نہیں ہے، اگر تجھ کو کچھ سنانا ہی پڑے تو ابوالعتاہیہ ہی کا کلام سنانا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ امیر المومنین یہاں سے جب اٹھیں تو ان کے دل میں لہو و لعب کی آگ بھڑک رہی ہو اور زبیدہ کو مزید شکایات کا موقع ملے۔''

کہربا یحییٰ کی بات پوری طرح نہیں سمجھ سکی۔ یحییٰ نے اس کو فوراً ہی واپس بھیج دیا۔ ہارون نے اس کو دیکھتے ہی کہا۔ ''کہربا! کیا بات ہے، تو کہاں چلی گئی تھی؟ کیا میں تیری آواز میں کچھ نہیں سن سکوں گا؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''یا امیر المومنین! میری کیا مجال کہ میں انکار کروں؟''

ہارون نے دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے خس کے پردوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ خشک ہو رہے ہیں، ان پر پانی چھڑکوا دیا جائے۔''

ہارون کی آواز یحییٰ کے کان میں پڑی تو اس نے اسی وقت پردوں پر پانی چھڑکوا دیا۔ اس کے بعد جب ہوائیں بھیگے پردوں سے ٹکرا کر اندر داخل ہوئیں تو خشک موسم نے انہیں مست و سرشار کر دیا۔ ہارون نے کہربا سے کہا۔ ''ہاں کہربا! اس خوشگوار اور خنک موسم میں ابونواس یا اسی جیسے کسی اور شاعر کے کلام سے دل و دماغ کو سرشار

کر دے۔''

کہربا نے عرض کیا۔ ''یا امیر المومنین! مجھے اجازت دیجیے کہ میں ایسا کلام سناؤں جس سے سرشاری دور ہو جائے اور آپ ہوش و حواس میں آ جائیں کیونکہ حکمرانوں کو نشہ یا سرشاری زیب نہیں دیتی۔''

ہارون مسکرا دیا۔ ''میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔ تو ایک بار پھر ابوالعتاہیہ کا کلام سنا کر مجھے غم زدہ کر دے گی۔ خیر سنا، میں تو تیری آواز کا عاشق ہوں۔''

کہربا نے کھنکھار کر پہلے تو گلا صاف کیا، اس کے بعد گنگنا کر دھن بنانے لگی۔ ہارون گنگناہٹ ہی سے وجد میں آنے لگا پھر آہستہ آہستہ کہربا کی آواز بلند ہونے لگی۔ کہربا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں کبھی پوری کھل جاتیں، کبھی نیم وا ہو جاتیں، کبھی بالکل بند ہو جاتیں۔ وہ ابوالعتاہیہ کا کلام گا کر سنا رہی تھی۔

''سوکھی روٹی کا ٹکڑا جس کو تو ایک کونے میں بیٹھ کر کھائے
ٹھنڈے پانی کا پیالہ جسے تو پیے
ایک تنگ کمرا جس میں تو یکہ و تنہا بیٹھا ہو
یا ایک مسجد، جس میں تو تمام دنیا سے علیحدہ بیٹھ کر
ان لوگوں کے حال سے عبرت پکڑ رہا ہو
جو پرانے زمانوں میں گزر چکے
ان چند گھڑیوں کے سایے اور سکون سے بہتر ہے جو
بلند و بالا محلات کے نیچے بیٹھ کر حاصل ہوتا ہے۔''

ہارون نے ایک سرد آہ کھینچی اور شاکی نظروں سے کہربا کو دیکھا، بولا۔ ''کہربا! میں تیرا مطلب سمجھ گیا، اگر... ابوالعتاہیہ کے کلام میں میرے لیے یہ اشارہ موجود ہے کہ میں تیرے پاس نہ آیا کروں تو میں نے تیرا مطلب پا لیا اور کل سے میں نہیں آؤں گا۔''

کہربا گھبرا گئی، جلدی سے بولی۔ ''امیر المومنین! بخدا میری یہ منشا نہیں۔ آپ ہر روز تشریف لائیں، یہ تو میری خوش قسمتی ہے۔''

ہارون چپ ہو گیا۔ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر اچانک سوال کیا۔ ''کہربا! ایک بات تو بتا؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''پوچھیے۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''کیا ابراہیم موصلی تجھ کو پسند کرتا ہے؟''

کہربا نے کراہیت سے جواب دیا۔ ''شاید، ممکن ہے ایسا ہی ہو۔''

ہارون نے مزید سوال کیا۔ ''اور تو..... کیا تو بھی اسے پسند کرتی ہے؟''

کہربا نے جلدی جلدی جواب دیا۔ ''امیر المومنین! یہ بالکل غلط ہے۔ اگر کسی نے ایسی کوئی بات آپ کے گوش گزار کی ہے تو یہ مجھ پر تہمت ہے، الزام ہے۔''

ہارون نے پھر سوال کیا۔ ''تو گویا یہ درست ہے کہ ابراہیم تجھ سے محبت کرتا ہے؟''

کہربا نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔ ''لیکن امیر المومنین! اس پر میرا کیا اختیار؟''

ہارون نے کہا۔ ''میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ تیرا ابراہیم کے دل پر اختیار ہے یا نہیں۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ابراہیم تجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں؟''

کہربا نے سادگی سے جواب دیا۔ ''شاید وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

ہارون نے کہا۔ ''اگر تو یہ کہتی ہے کہ ابراہیم تجھ سے محبت نہیں کرتا تو میں تیری بات نہ مانتا۔ وہ مغنی ہے، اس کا دل مجھ سے زیادہ گداز اور حسن پرست ہوگا۔ میں قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ اہلِ دل اور حسن پرست اگر تجھ سے ایک بار بھی مل لے تو وہ تیرے جادو سے نہیں بچ سکتا۔ تیرے سحر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ تو صید افگن ہے، جس کو چاہے شکار کر لے۔''

ہارون کے احساسات سے وہ پھولی نہیں سما رہی تھی، خاموشی سے سنتی اور مزے لیتی رہی۔

ہارون ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ کہربا کو گمان گزرا شاید ہارون اب نہیں بولے گا لیکن ہارون نے کچھ دیر بعد کہربا کو مخاطب کیا۔ ''کہربا! میں چاہوں تو تجھے تیرے آقا سے لے لوں لیکن غیرت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ابراہیم موصلی تجھ سے محبت کرتا ہے، بس یہ عیب میری غیرت کے حق میں تازیانہ ہے۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''لیکن امیر المومنین میں تو اس سے محبت نہیں کرتی۔''

ہارون نے کہا۔ ''کہربا! میں نہیں چاہتا کہ جب تو میرے قصر میں داخل ہو تو باہر لوگ سرگوشیوں میں یہ کہتے پھریں کہ مغنی ابراہیم موصلی کی محبوبہ امیر المومنین کے قصر میں داخل کر لی گئی۔''

کہربا ابھی جواب بھی نہ دے سکی تھی کہ یحییٰ برمکی ان دونوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ہارون دل برداشتہ افسردہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے قصر روانہ ہو گیا۔ یحییٰ اور ہارون کے ساتھی ندیم اور امرا اس کے ساتھ ہو لیے۔ قصرِ خلد میں زبیدہ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ ہارون کے اندر جانے سے پہلے یحییٰ سے کہا۔ ''یا ابی! آپ ابھی ٹھہریں گے

اور اس وقت تک رکیں گے جب تک کہ میں جانے کی اجازت نہ دے دوں۔''

یحییٰ رک گیا اور ہارون حرم سرا میں چلا گیا۔ وہاں اس کو یہ تشویشناک خبر ملی کہ اس کی چہیتی بیوی زبیدہ کی طبیعت ناساز ہے اور کنیزوں کی ایک فوج اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں مشغول ہے۔ ہارون، زبیدہ کے پاس چلا گیا۔ امیرالمومنین کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کنیزوں کا پراکائی کی طرح پھٹ گیا اور ہارون کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ کنیزیں دورویہ ادب سے سر جھکا کر کھڑی ہو گئیں۔ ہارون ان کے بیچ سے گزر کر زبیدہ کے معطر بستر تک پہنچ گیا۔ زبیدہ اپنے سر کو عقال سے باندھے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ کسی کنیز نے زبیدہ کو مطلع کیا۔ ''ملکۂ عالیہ! آنکھیں کھولیے امیر المومنین تشریف لائے ہیں۔''

زبیدہ نے ادھ کھلی آنکھوں سے ہارون کی طرف دیکھا اور آنکھیں دوبارہ بند کر کے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ وہ ہارون سے بہت ناراض تھی۔ ہارون کو زبیدہ کی سرد مہری اور کج اخلاقی گراں گزری مگر برداشت سے کام لیا۔ کنیزوں کو حکم دیا۔ ''تم سب باہر چلی جاؤ، میں زبیدہ سے بات کروں گا۔''

کنیزیں سامنے سے ہٹ گئیں۔ ہارون زبیدہ کے پاس بیٹھ گیا اور آواز دی۔ ''زبیدہ! ادھر میری طرف دیکھو، طبیعت کیسی ہے؟''

زبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری طرف منہ کیے پڑی رہی۔

ہارون نے زبیدہ کا چہرہ زبردستی اپنی طرف کر لیا اور اس کے چہرے پر جھک گیا۔ ''کیا بات ہے؟ کیا واقعی تمہاری طبیعت خراب ہے یا کوئی اور بات ہے؟''

زبیدہ نے ایک بار پھر دوسری طرف کروٹ بدلنا چاہی لیکن ہارون نے ناکام کر دیا، بولا۔ ''زبیدہ! میرا خیال ہے تو مجھ سے ناراض ہے اور طبیعت کی خرابی محض ایک بہانہ ہے۔''

زبیدہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر یکایک ہارون کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔

ہارون نے زبیدہ کی زلفوں سے کھیلنا شروع کر دیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ ''زبیدہ! کیا بات ہے تو رو کیوں رہی ہے؟''

زبیدہ نے کہا۔ ''امیرالمومنین کے حرم میں ان دنوں کتنی ہی کنیزیں موجود ہیں جو غنا میں لاثانی ہیں؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''شاید تین سو...... مگر کیوں؟''

زبیدہ نے پوچھا۔ ''میں نے کبھی امیرالمومنین پر اشارتاً بھی یہ بات ظاہر کی کہ میں ان کی موجودگی سے خوش نہیں ہوں؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''نہیں تو ایسا تو کبھی نہیں ہوا مگر یہ کیوں؟''

زبیدہ نے کہا۔ ''اگر ان میں اور اضافہ ہو جائے تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں کوئی اعتراض کروں گی؟''

ہارون نے ایک بار پھر اس کی پیشانی چوم لی اور بالوں کی لٹ سے کھیلنے لگا۔ ''نہیں تو اعتراض نہیں کرے گی، میں جانتا ہوں۔''

زبیدہ نے کہا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ امیرالمومنین روزانہ یحییٰ برمکی کے پاس چلے جاتے ہیں؟''

ہارون کی سمجھ میں کچھ کچھ بات آ گئی، مسکرا کر بولا۔ ''ہاں، میں ہر روز یحییٰ کے پاس چلا جاتا ہوں۔''

زبیدہ نے تڑپ کر پوچھا۔ ''میں پوچھتی ہوں آخر کیوں؟ امیرالمومنین ہر روز وہاں کیوں چلے جاتے ہیں؟''

ہارون نے کہا۔ ''لیکن تو یہ سوال کیوں کر رہی ہے؟ اگر میں اس کا جواب نہ دوں تو؟''

زبیدہ نے کہا۔ ''تب پھر میں یہ سمجھوں گی کہ اس میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو ناگفتنی ہے اور امیرالمومنین اس کو ظاہر کر دینے میں کسی قسم کی سبکی محسوس کرتے ہیں۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔ زبیدہ مجھے کہربا کی آواز بے حد پسند ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں اور تو معلوم نہیں کس مغالطے کا شکار ہو گئی۔''

زبیدہ نے کہا۔ ''امیرالمومنین! آپ کو اس کی آواز پسند ہے۔ میں آپ پر اعتبار کرتی ہوں لیکن لوگ سرگوشیوں میں معلوم نہیں کیا کچھ کہتے پھرتے ہیں۔ میں غیرت سے مر جاتی ہوں جب لوگ کہتے ہیں کہ امیرالمومنین مغنی ابراہیم موصلی کی محبوبہ کہربا پر عاشق ہو گئے ہیں اور ابراہیم کو قید خانے میں ڈال کر اس کی محبوبہ پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''واللہ یہ بہت بڑا اور بہت برا اتہام ہے جو کوئی شخص مجھ پر لگا سکتا ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔''

زبیدہ نے کہا۔ ''امیرالمومنین! دلوں کا حال خدا جانتا ہے۔ لوگ تو وہی کہیں گے جو دیکھیں گے یا سنیں گے۔''

ہارون نے ایک بار پھر زبیدہ کو یقین دلایا۔ ''زبیدہ! میں تجھ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں اس کی آواز کا عاشق ہوں، مجھے اس کی ذات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔''

زبیدہ نے ہارون کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''امیرالمومنین! اگر یہ بات ہے تو محض آواز سننے کی خاطر بدنام ہونے سے حاصل؟''

ہارون نے زبیدہ کو آغوش میں لے لیا اور وارفتگی میں کہا۔ ''زبیدہ! اگر تو اس سے خوش ہو جائے گی کہ میں کہربا کے پاس نہ جاؤں تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

زبیدہ نے سر سے عقال کھول دیا اور پرجوش لہجے میں کہا۔ ''تب پھر میں کبھی بیمار نہیں پڑتی۔ میں اچھی ہو گئی۔ اب کسی دوا کی بھی ضرورت نہیں۔''

ہارون کو ہنسی آ گئی اور پھر دونوں ہی بے ساختہ ہنسنے لگے۔ ان کے زور زور سے ہنسنے کی آوازیں کنیزوں نے سنیں تو ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

☆☆☆

اس کے بعد کہربا، امیرالمومنین کا انتظار ہی کرتی رہی۔ اسی دوران یحییٰ نے ہارون کو مطلع کیا کہ ایک گہرا کنواں تیار ہے۔ ہارون نے کہا۔ ''کیا اس کی نچلی سطح پختہ کر دی گئی ہے؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''جی امیرالمومنین۔''

ہارون نے کہا۔ ''یاابی! آپ کنویں کے بیچ میں اس طرح دیوار کھڑی کر دیجیے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''یہ کوئی بڑا اور دشوار کام نہیں ہے۔ دو دن کے اندر ہو جائے گا۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''یہ کنواں کہاں ہے؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''میرے قصر کے ایک حصے میں۔''

ہارون نے فکرمندی سے کہا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ایک بار اور آپ کے پاس آنا پڑے گا۔''

یحییٰ نے تعجب سے کہا۔ ''امیرالمومنین! ایک بار اور آنے کا میں مطلب نہیں سمجھا؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''یاابی! زبیدہ کو یہ بات ناپسند ہے کہ میں کہربا سے ملوں اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ اب میں کہربا کی آواز سننے آپ کے گھر نہیں جاؤں گا۔''

یحییٰ نے عرض کیا۔ ''امیرالمومنین! آپ میرے گھر کہربا کی آواز سننے نہ آئیں، کسی اور غرض سے تو آ ہی سکتے ہیں۔ اس کو میں اپنی بدقسمتی سمجھوں گا کہ آپ میرے گھر محض اس لیے نہیں آسکیں گے کہ وہاں کہربا رہتی ہے۔''

ہارون نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''آج سے تیسرے دن کنویں کے پاس ایک شاندار تقریب ہوگی۔ آپ انتظام کر دیجیے۔ میں اپنے ندیموں اور امراء کے ساتھ آجاؤں گا۔''

یحییٰ نے پرمسرت لہجے میں عرض کیا۔ ''یہ میری خوش قسمتی ہے۔ خدا آپ کو ہم سب پر ہمیشہ سایہ فگن رکھے۔''

یحییٰ چلا گیا اور کنویں کے بیچ میں دیوار تعمیر کروانے لگا۔

کہربا بڑی بےچینی سے ہارون کا انتظار کرتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہارون نے ایک دم آمد و رفت کیوں بند کر دی ہے۔ یحییٰ اس کی بےچینی اور انتظار کو شدت سے محسوس کرتا رہا۔

تیسرے دن صبح ہی سے یحییٰ نے کنویں کے قریب قصر کے احاطے میں شامیانے کھڑے کروا دیے۔ فرش پر خوب صورت اور صاف ستھری چاندنیاں بچھا دی گئیں۔ آخری سرے پر ایک تخت پر پھول دار یمنی چادریں بچھا دی گئیں اور ایک بڑے گاؤ تکیے کے ساتھ دو چھوٹے تکیے بھی رکھ دیے گئے۔ نیچے چاندنیوں پر بھی جگہ جگہ گاؤ تکیے رکھ دیے گئے۔ یحییٰ یہ کام اپنی نگرانی میں انجام دلواتا رہا۔

ظہر کے بعد ہارون بھی اپنے ندیموں اور امیروں کے ساتھ اس شامیانے کے نیچے پہنچ گیا۔ یحییٰ نے ہارون کو وہ کنواں دکھایا جس کے افتتاح کے سلسلے میں یہ محفل منعقد ہوئی تھی۔

ہارون نے کنویں میں جھانک کر دیکھا۔ یہ خاصا چوڑا کنواں تھا اور بیچ کی دیوار سے تقسیم شدہ دونوں حصوں کی نچلی سطح تک جانے کے لیے دونوں طرف زینے بنا دیے گئے تھے اور زینوں کے اوپر انہیں دروازوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ ہارون یحییٰ کے ساتھ باری باری دونوں طرف سے اندر اترا اور پختہ فرش پر بیٹھ کر گردن اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ اوپر قصر کی چھت نظر آ رہی تھی۔

ہارون نے لمبی لمبی سانسیں لیں اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ یحییٰ سے کہا۔ ''یاابی! بہت خوب، بالکل ٹھیک۔ میں آپ کے کام سے مطمئن ہوں۔''

پھر وہ یحییٰ کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ حاضرین نے ہارون کو آتے دیکھ کر کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ ہارون نے یحییٰ کو حکم دیا۔ ''ابراہیم اور ابوالعتاہیہ کو حاضر کیا جائے۔''

وہیں معلوم نہیں کس طرح کہربا بھی پہنچ گئی۔ ہارون اس کو دیکھ کر بہت سٹپٹایا۔ کہربا سر سے پاؤں تک نقش و نگار والی ریشمی چادر اچھی طرح ... اوڑھے کھڑی تھی۔ ہارون نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ یحییٰ گھبرایا ہوا کہربا کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ''کہربا! تو یہاں کیوں آ گئی؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! آپ مجھے یہیں

رہنے دیں، واپسی پر مجبور نہ کریں۔ میں امیر المومنین سے چند باتیں کر کے چلی جاؤں گی۔''

ہارون نے اپنے حاجب سے کہا۔''اس مغنیہ سے کہہ دے کہ میں اس سے بات نہیں کروں گا کیونکہ میں نے زبیدہ سے اس کا عہد کرلیا ہے۔''

کہربا نے عرض کیا۔''امیر المومنین ایک بااختیار انسان ہیں۔ انہیں اس قسم کے عہد کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی جبکہ حرم سرا میں کئی سو کنیزیں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ کیا امیر المومنین نے ان کنیزوں کے خلاف بھی کوئی عہد کیا ہے؟''

ہارون نے حاجب سے کہا۔''اس سے کہہ دے کہ میں اس کے سوالوں کے جوابات کا پابند نہیں۔ ہر چند کہ میں اس کی آواز کا عاشق ہوں مگر میری غیرت اس پر آمادہ نہیں ہوتی کہ میں ایسی کنیز کو اپنی قربت اور محبت بخشوں جو ابراہیم مغنی کی محبوبہ کہلاتی ہے۔ اگر اس کے دامن حسن وذات پر یہ داغ نہ ہوتا تو میں اپنی صدہا کنیزوں میں اس کو بھی شامل کرلیتا۔''

کہربا نے جواب دیا۔''یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں ایک ایسے داغ سے متہم کی جارہی ہوں جس کی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ ویسے مجھے حرم کی کنیزوں میں شامل ہونے کا ذرا بھی شوق نہیں۔''

اتنے میں یحییٰ کے ملازم ابراہیم مغنی اور شاعر ابوالعتاہیہ کو لے کر حاضر ہوگئے۔ ہارون کے حکم پر انہیں اس کے تخت کے سامنے کھڑا کردیا گیا۔ ہارون نے یحییٰ کو اپنے دائیں جانب بٹھالیا۔ کہربا جہاں کھڑی تھی وہیں رہی۔ بقیہ جو جہاں تھا وہیں موجود رہا اور سب کی توجہ ابراہیم مغنی اور شاعر ابوالعتاہیہ کی طرف ہوگئی۔

ہارون نے حاجب سے کہا۔''ان دونوں سے پوچھو کہ انہوں نے اپنے فیصلے بدلے یا نہیں؟''

ابراہیم نے حاجب کے سوال پر جواب دیا۔''امیر المومنین سے کہہ دیجیے کہ عہد شکنی کرنے والوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔ ہم نے امیر المومنین کے بھائی ہادی مرحوم سے یہ عہد کیا تھا کہ ان کے علاوہ کسی کو گانا نہیں سنائیں گے چنانچہ ہم اس عہد کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ورنہ ہمیں امیر المومنین سے بہتر کون ملے گا۔''

ہارون نے حاجب سے کہا۔''شاعر ابوالعتاہیہ سے پوچھو، وہ کیا کہتا ہے؟''

شاعر ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔''انسان فانی ہے۔ آتا جاتا رہے گا لیکن اس کے اعمال اور کردار دنیا کے حافظے اور یادداشت میں محفوظ رہ جائیں گے پھر کیا کوئی بھی دانا و بینا یہ پسند کرے گا کہ موت کے بعد اس کو عہد شکنوں اور فاسقوں میں شامل کردیا جائے۔''

ہارون نے سختی سے کہا۔''حاجب! ان دونوں سے کہہ دو کہ ہادی کی موت نے انہیں ان کے عہدوں کی پابندی سے آزاد کردیا ہے۔ انہیں آج کے دن یہ آخری موقع دیا جارہا ہے۔ یہ چاہیں تو دربار سے وابستگی اختیار کرکے عزت و مقام حاصل کرلیں ورنہ انہیں ہمیشہ کے لیے قید کردیا جائے گا۔ اب کے ان کا قید خانہ نوتعمیر کنواں ہے جس کے دو حصے ہیں۔ اس کے ایک حصے میں شاعر ابوالعتاہیہ رہے گا اور دوسرے میں ابراہیم۔''

ابراہیم کو خوف سے پسینا آگیا، اس نے ابوالعتاہیہ سے پوچھا۔''ابوالعتاہیہ! تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔''میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں، مجھے کنویں کا زنداں خوف زدہ نہیں کرسکتا۔''

ابراہیم نے حاجب کو جواب دیا۔''غالباً میرا جواب تو پہنچ چکا ہوگا، ہمیں عہد شکنی منظور نہیں۔''

ہارون نے درشتی سے کہا۔''انہیں کنویں میں اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک کہ یہ میری پیشکش قبول نہ کرلیں۔''

کہربا ابراہیم کے پاس پہنچ گئی، بولی۔''افسوس کہ آپ دونوں عقل سے عاری ہیں ورنہ امیر المومنین کی پیشکش قبول کرلیتے۔''

یحییٰ نے ان دونوں کو ایک بار پھر موقع دیا۔''نادانو! امیر المومنین کی بات مان لو، ورنہ پچھتاؤ گے۔''

ابراہیم نے کہربا کی طرف دیکھا۔''میں تنہا نہیں ہوں ابوالعتاہیہ کی مستقل مزاجی میرا حوصلہ بڑھا رہی ہے۔''

ہارون نے سختی سے کہا۔''یا ابی! آپ کو تامل کیوں ہے؟ دونوں کو چاہ زنداں میں ڈلوا دیجیے۔''

یحییٰ اٹھا اور چند خدمت گاروں کی مدد سے ان دونوں کو کنویں کی طرف لے چلا۔ ہارون بھی تخت سے نیچے آگیا اور اپنے ندیموں اور امیروں کو ساتھ لے کر کنویں کی طرف چل دیا۔ کہربا اس ہجوم میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ریشمی نقش و نگار والی چادر سر سے ڈھلک کر شانوں پر رک گئی تھی۔ اس کی سیاہ زلفیں چمک رہی تھیں۔ ہارون نے سرسری نظروں سے کہربا کی طرف دیکھا اور خوف زدہ انداز میں نظریں پھیر کر آگے بڑھ گیا۔ ابراہیم بھی اس ہجوم میں صرف کہربا ہی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی بار جی چاہا کہ وہ ابوالعتاہیہ کا ساتھ چھوڑ کر صاف صاف اعلان کردے کہ وہ اپنی ضد سے باز آیا اور امیر المومنین کی ملازمت اختیار کی کیونکہ اس طرح یہ امید پیدا ہوجاتی تھی کہ شاید کہربا حاصل ہوجائے لیکن شاعر ابوالعتاہیہ کا مضبوط کردار اس کے حوصلے پست کر رہا تھا۔

ہارون نے کنویں کے اوپر مقفل دروازوں کو کھلوایا اور ابراہیم مغنی اور شاعر ابوالعتاہیہ کو ان میں دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے زینوں پر پھسلے اور پھر سنبھل کر نیچے اترتے چلے گئے۔ ہارون نے دروازوں کو دوبارہ مقفل کروادیا اور اوپر سے جھانک کر دونوں کو حکم دیا۔''واللہ، تمہیں اس وقت تک یہیں رہنا ہے جب تک تم دونوں مجھ سے راضی نہ ہوجاؤ۔''

اس نے نیچے جھانکا تو ابراہیم اور ابوالعتاہیہ کو اوپر کی طرف دیکھتے پایا۔

یحییٰ نے بہ آواز بلند دونوں سے کہا۔''افسوس کہ امیر المومنین نے رعایتیں دینے کی حد کردی تھی لیکن نادانوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔''

ہارون اتنا مشتعل تھا کہ اس کے چہرے سے وحشت اور انتقام کا جذبہ ٹپکنے لگا تھا۔

دروازے مقفل کردیے گئے اور ہجوم ایک بار پھر اپنی اپنی جگہ پر چلا گیا۔ ہارون کا دل نہیں مانا، اس نے یحییٰ سے کہا۔''یا ابی! اگر زبیدہ نے کہربا سے نہ سننے کا عہد نہ لیا ہوتا تو میں آج کہربا کی دلکش اور خوب صورت آواز ضرور سنتا۔''

یحییٰ نے عرض کیا۔''امیر المومنین کو عہد و معاہدے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ویسے آپ کہربا سے نہ فرمائش کریں، نہ حکم دیں۔ وہ میرے حکم پر اپنی آواز کا سحر بکھیرے گی اور فضا کو ساز و آواز سے لبریز کردے گی۔''

اس کے بعد یحییٰ کہربا کے قریب گیا اور اس کو گانے کا حکم دیا۔ کہربا ہم بخود سکتے کے مریض کی طرح چپ چاپ کھڑی رہی۔ یحییٰ کا حکم اس طرح سنا گویا وہ سن ہی نہیں رہی۔ یحییٰ نے ایک بار پھر کہا۔''کہربا! تو کیا سوچ رہی ہے؟ میں کیا کہہ رہا ہوں، اپنی آواز کا سحر اس فضا میں گھول دے۔''

کہربا تشنج کے مریض کی طرح تھرتھرائی اور آنکھیں بند کرکے چلائی۔''خدا کے لیے انہیں کنویں سے نکال لو۔ ان نازک مزاج اور حساس ہنر مندوں پر رحم کرو۔ میں یہ سب نہیں برداشت کرسکتی۔''

یحییٰ نے اس کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔''کہربا! ہوش میں آ۔ تیرا جو کام ہے وہ کر، فضول باتوں میں نہ پڑ۔''

لیکن کہربا زور زور سے رونے لگی، ہچکیاں لے لے کر۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں، حلق کی بانسری سر بکھیرنے لگی۔ ہارون نے گریہ وزاری میں بھی ترنم محسوس کیا۔ اس نے یحییٰ کو اپنے پاس بلالیا اور کہا۔ ''کہربا کو رونے دیجیے یا اپی۔ میں اس میں بھی ترنم اور دلکشی محسوس کررہا ہوں۔''

یحییٰ نے کھسیانے لہجے میں کہا۔ ''ویسے یہ بہت بری حرکت ہے یا امیر المومنین! مگر کہربا بھی کیا کرے، شاید اس وقت وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے۔ خدا اس پر رحم کرے۔''

کہربا کے رونے کی آواز کنویں کے اندر ابراہیم اور ابوالعتاہیہ تک پہنچ رہی تھی۔ ابراہیم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کہربا کیوں رو رہی ہے؟ وہ بے چین ہوکر ابوالعتاہیہ سے کہنے لگا۔ ''میرے زندانی رفیق! کیا تو کسی کے رونے کی آواز سن رہا ہے؟''

ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ کہربا ہے، معلوم نہیں کیوں رو رہی ہے؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''ہاں، یہ کہربا ہی ہے جو میرے لیے رو رہی ہے...... صرف میرے لیے۔''

کہربا روتی ہوئی کنویں کے قریب پہنچی اور اس کے ایک دروازے کے پاس بیٹھ کر دیر تک روتی رہی۔

☆☆☆

ہارون اور یحییٰ رقہ میں کئی ماہ رہ کر بغداد واپس چلے گئے۔ ابراہیم اور ابوالعتاہیہ کنویں میں قید رہے۔ کہربا بدرجہ مجبوری بغداد چلی گئی۔ اب کہربا میں پہلی جیسی تیز طرازی نہیں رہی تھی۔ یحییٰ نے کہربا کو بار بار یہی سمجھایا کہ امیر المومنین سے گستاخی نہ کر، کیونکہ اگر ان کے دل میں کسی طرح گرہ پڑ گئی تو پھر کھولی نہیں جاسکے گی۔

کہربا نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! میں ابوالعتاہیہ اور ابراہیم کی قید سے بہت غمزدہ ہوں لیکن میں ان کے لیے کچھ کر نہیں سکتی۔ افسوس صد افسوس۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''بہرحال کہربا! میں رقہ جانے والا ہوں تاکہ ان احمقوں کو راضی کرنے کی کوشش کروں۔''

کہربا خاموش ہوگئی۔ ہارون کے ایما پر یحییٰ رقہ گیا اور ابراہیم مغنی اور شاعر ابوالعتاہیہ کو راضی کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر یہ کہہ کر واپس چلا آیا۔ ''تم دونوں اپنی شومئی قسمت کے اسیر ہو۔ میں کیا کرسکتا ہوں؟''

کئی سال کی قید نے ابراہیم کو اداس اور غمگین کردیا۔ ابوالعتاہیہ تو پہلے ہی سے غمگین تھا۔ وہ جھیل گیا اور اپنے کسی انداز یا لفظ سے یہ بات نہیں ظاہر ہونے دی کہ وہ اپنی اس قید سے پشیمان اور کم ہمت ہورہا ہے۔

شب و روز کا سلسلہ جاری رہا۔ موسم آتے جاتے رہے۔ ماہ و سال کا چکر چلتا رہا مگر ابراہیم اور ابوالعتاہیہ اپنے مسقف در و دیوار کے علاوہ کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔ ان کا بہت زیادہ دل گھبراتا تو زینے پر چڑھ کر دروازے تک چلے جاتے اور یک پٹی دروازے میں دیر تک کوئی درز یا سوراخ تلاش کرتے رہتے جس سے وہ کنویں کے باہر کی دنیا کی ہلکی سی جھلک ہی دیکھ سکتے۔ ناکامی سے ان کے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی اور دل اختلاج کا شکار ہوجاتا۔ دونوں طرف کے زینوں کی آخری دو سیڑھیاں ابراہیم اور ابوالعتاہیہ کو آمنے سامنے کردیتیں اور وہ دونوں باتیں کرکے اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے۔

ابراہیم نے حسرت و یاس سے اوپر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابوالعتاہیہ! کیا اس چھت کے اوپر آسمان اب بھی موجود ہے؟''

ابوالعتاہیہ نے سرد آہ بھری۔ بولا۔ ''پہلے تو ہوا کرتا تھا، اب پتا نہیں۔''

ابراہیم نے اس کے چہرے پر چھائی ہوئی مردنی اور جھریوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''ابوالعتاہیہ! تو تو بوڑھا ہورہا ہے۔ دکھوں اور غموں نے جھریوں اور سیاہیوں کی شکل میں بسیرا کرلیا ہے۔ ذرا آئینے میں اپنی شکل تو دیکھ۔'' لیکن پھر فوراً ہی احساس ہوا کہ یہاں آئینہ کہاں۔ بولا۔ ''ہمیں آئینہ کہاں میسر۔ تیرا آئینہ تو میں ہوں۔ آئینے کی طرح میں بھی جھوٹ نہیں بولتا۔''

ابوالعتاہیہ نے ابراہیم کو طنز و طعن سے دیکھا۔ ''جو کچھ تو نے میرے چہرے پر دیکھا ہے، وہی میں تیرے چہرے پر دیکھ رہا ہوں اگر تیری بیوی تجھے اب دیکھ لے تو خوفزدہ ہوجائے۔ تیری ڈاڑھی اور سر کے بالوں پر برف باری ہورہی ہے۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''ابوالعتاہیہ! کنویں کی انتہائی محدود اور تنگ فضا سے میں بہت عاجز آچکا ہوں۔ آخر اس یکسانیت کو کس طرح دور کیا جائے؟''

ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔ ''اے کاش ہم دنیا کا شور و غل ہی سن سکتے۔''

ابراہیم نے حسرت سے کہا۔ ''ہم جب یہاں سے نکلیں گے تو بری بری خبریں سنیں گے۔ ہمارے کتنے ہی ساتھی مرچکے ہوں گے اور کتنے ہی جانے کی تیاریاں کرچکے

ہوں گے۔''

ابوالعتاہیہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ''لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے ہی کیوں؟ کیسے اور کب نکلیں گے؟ ایں خیال است و محال است و جنوں۔''

دونوں بڑی دیر تک مایوسی اور حسرت سے باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرکے جب دوبارہ کنویں کی نچلی سطح پر پہنچے تو دلوں پر ہول کا دورہ پڑا اور دونوں کچھ دیر کے لیے جاں کنی کی اذیت میں مبتلا ہوگئے۔

ابوالعتاہیہ نے اس ہول کا علاج دریافت کرلیا۔ اس نے قوت تخیلہ کے سہارے ماضی کے پرلطف اور حسین واقعات کو کھینچ بلایا اور ان کی محفل سجا کے مزے لینے لگا۔ کچھ دیر کے لیے کنویں کی تنگ و تاریک فضا سے دور چلا گیا۔

ابراہیم نے گنگنانا شروع کیا اور ابوالعتاہیہ کے عبرت آموز کلام سے دل بہلاتا رہا۔

صبح و شام ایک سن رسیدہ سفید ڈاڑھی والا انہیں کھانا پہنچا دیتا۔ شام کو یہی بوڑھا روشنی کا انتظام کرتا۔ پھر ایک دن اس بوڑھے کی جگہ دوسرے نے لے لی۔ ابوالعتاہیہ نے پوچھا۔ ''وہ بوڑھا کہاں چلا گیا؟''

بوڑھے نے جواب دیا۔ ''مرگیا۔''

ابوالعتاہیہ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ آہستہ سے بولا۔ ''ایک دن، ہم بھی مرجائیں گے۔''

لیکن یہی خبر جب ابراہیم نے سنی تو وہ پنجرے میں قید پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ وہ بار بار زینے سے چڑھنے اترنے لگا۔ اس دن دونوں ایک بار پھر زینے کی اوپری آخری سیڑھی پر آمنے سامنے بیٹھ کر دنیا کی فانی باتیں کرنے لگے۔

ابوالعتاہیہ نے کہا۔ ''ابراہیم! میں نے اس تنگ و تاریک فضا سے نکلنے کا راستہ دریافت کرلیا ہے۔''

ابراہیم نے بے چینی سے پوچھا۔ ''وہ راستہ کدھر ہے؟ کہاں سے ہے؟ مجھے بھی تو بتا۔''

ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔ ''میں تو جب گھبراتا ہوں تو خیالوں کی محفل سجا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ماضی کی حسین اور پُرلطف شامیں، بے تکلف اور ہم مشرب و ہم مذاق دوستوں کے ساتھ پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوجاتی ہیں اور میں مسرور و شادماں اپنے رگ و پے میں زندگی دوڑتی محسوس کرنے لگتا ہوں۔''

ابراہیم نے سرد آہ بھری، کہا۔ ''افسوس کہ اب تو ماضی کی حسین یادیں بھی یکسانیت کا شکار ہوگئیں۔ کہربا کا رنگین تصور میرا آخری سہارا تھا۔ اب یہ آخری سہارا بھی فرسودگی کا شکار ہوگیا۔ میں ان سے بھی اکتا گیا۔ اس کنویں کی تنگ و تاریک اور خونخوار فضا حسن اور تغیر کی دشمن ہے۔ یہاں کی سحر گزیدہ فضا روشنی کی ہلکی سی کرن تک کو برداشت نہیں کرسکتی۔''

دونوں اپنے اپنے سروں کو مڑے ہوئے گھٹنوں پر رکھ کر آلام و افکار کی دنیا میں پہنچ گئے۔

ابراہیم نے اس رات خواب میں کہربا کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ہارون کی محفلِ طرب میں ابونو اس کا کلام نہایت دلکش دھن میں سنا رہی ہے۔ ابونو اس نے اپنے اشعار میں معاملہ بندی کا اتنا حسین اور سرور انگیز سماں کھینچا تھا کہ ابراہیم نے ہارون اور یحییٰ برمکی کی پروا کیے بغیر بھری محفل میں کہربا کو سینے سے لگالیا۔ کہربا کے لباس کی خوشبو نے دل و دماغ کو معطر کردیا اور شباب کی گرمی اور مستی نے پورے جسم میں ہیجان اور انتشار پیدا کردیا۔ ہارون نے منہ پھیرلیا اور یحییٰ برمکی نے ان دونوں کو محفل سے نکلوا دیا۔

ابراہیم نے مزید دیکھا کہ وہ کہربا کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے یحییٰ برمکی آیا اور ابراہیم کے دروازے سے ذرا دور کھڑا ہوگیا اور ایک آدمی کو بھیج کر کہربا کو واپس بلوالیا۔ ابراہیم اپنے دروازے پر کھڑا ہوگیا اور کہربا کو یحییٰ برمکی کے ساتھ واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

بیداری کے بعد خواب کا نشہ طاری ہوگیا اور وہ خواب کو خیال اور حافظے میں قید کرکے لطف اندوز ہونے لگا۔ علی الصباح وہ اوپر کے آخری زینے پر بیٹھ کر خوش الحانی میں گانے لگا۔ ابونو اس کا لہو و لعب آمیز کلام، جس میں شاعر نے اپنی ان حسرتوں کا ماتم کیا تھا جو پوری نہ ہوسکیں اور ان بوالہوسیوں پر فخر کیا گیا تھا جو خواب و خیال کی مدد سے روبہ عمل لائی گئی تھیں۔ ابراہیم کی خوش الحانی نے ابوالعتاہیہ کو بیدار کردیا اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اوپر پہنچا، یہ دلچسپ منظر دیکھا کہ ابراہیم آنکھیں بند کیے دنیا و مافیہا سے غافل گانے میں مشغول ہے۔ ابوالعتاہیہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ گا چکنے کے بعد ابراہیم جیسے ہی خاموش ہوا ابوالعتاہیہ نے کہا۔ ''ابراہیم، میرے دوست! اگر تجھ کو گانا ہی تھا تو میرا عبرت انگیز و پُرعظمت کلام گاتا۔ ابونو اس کا کلام تو محفلوں اور وصل کی راتوں میں گائے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔''

ابراہیم نے ٹھنڈی سانس بھری اور مایوسی سے کہا۔ ''ابوالعتاہیہ! سوچ تو سہی ہم دونوں کب تک یہاں قید رہیں گے؟''

ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔ ''جب تک ہارون راضی نہیں ہوجاتا۔''

ابراہیم نے دل جلے لہجے میں کہا۔ ''ابوالعتاہیہ! واللہ وہ ہمیشہ ناراض رہے گا اور ہم دونوں ہمیشہ یہیں سڑتے رہیں گے۔''

ابوالعتاہیہ نے سرد آہ بھری۔ ''آہ، شومئ قسمت کا کوئی علاج نہیں۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''مگر میں نے اس کا علاج تلاش کرلیا ہے۔''

ابوالعتاہیہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا..... واقعی؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''ابوالعتاہیہ! میں نے عہد کیا تھا کہ ہادی کی موت کے بعد میں کبھی نہیں گاؤں گا۔ مگر آج رات کے ایک حسین اور پرکیف خواب نے مجھے بے اختیار گانے پر مجبور کردیا اور میں نے نادانستگی اور بھول میں اپنا عہد توڑ دیا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ جو عہد نادانستگی میں ٹوٹ گیا، اس کو جوڑنے سے فائدہ؟ کیوں نہ ہارون کو راضی کرلیا جائے۔''

ابوالعتاہیہ نے مایوسی سے کہا۔ ''تو نے عہد توڑ دیا، میں نے تو نہیں توڑا۔ افسوس کہ اب تو بھی یہاں سے چلا جائے گا، میں تنہا رہ جاؤں گا۔''

ابراہیم نے عربی کا ایک شعر پڑھا۔ ''جتنا ہوسکے دنیا سے فائدہ اٹھالے کیونکہ بالآخر موت کے ذریعے آرام و آسائش کے سب اسباب چھن جانے والے ہیں۔'' پھر ابوالعتاہیہ سے پوچھا۔ ''یہ کس کا شعر ہے؟''

ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔ ''یہ میرا شعر ہے۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''تب پھر اپنے اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتا؟''

ابوالعتاہیہ نے پوچھا۔ ''میں اس پر کس طرح عمل کروں؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''تو ہارون کی شان میں ایک قصیدہ لکھ۔ میں اس کے لیے ایک دھن تیار کردوں گا اور پھر ان کے توسط سے ہم دونوں ہارون کے دربار میں پہنچ جائیں گے اور ہم دونوں تیرے شعر کے مصداق ممکنہ حد تک دنیا سے فائدے اٹھاتے رہیں گے کیونکہ وہ دن دور نہیں جب موت تمام آرام و آسائش چھین لے گی۔''

ابوالعتاہیہ خاموش ہوگیا اور کچھ دیر کشمکش کا شکار رہا۔ پھر جیسے نفی کی شکست ہوگئی اور اثبات نے فتح پائی۔ ابوالعتاہیہ صبح کی طرح تازہ اور خوشگوار کیفیت میں اوپر کے آخری زینے پر ہی ہارون کی شان میں قصیدہ کہنے لگا۔ دو شعر موزوں کرچکنے کے بعد ابراہیم کو سنا دیے تاکہ وہ ان کے لیے ایک بہترین دھن بنالے۔

اب وہ دونوں ہی اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ ابوالعتاہیہ بہترین خیال، اعلیٰ مضمون، شاندار اور پرکیف لفظوں کی فکر اور انہیں شعر کے وزن میں قید کردینے کی کوشش میں لگ گیا اور ابراہیم انہیں اپنی اثرانگیز اور کانوں میں رس گھول دینے والی دھن اور آواز میں ڈھال رہا تھا۔

☆☆☆

رقہ سے بغداد تک یہ خبر مشہور ہوگئی کہ مشہور شاعر ابوالعتاہیہ اور مغنی ابراہیم نے اپنے اپنے عہد توڑ دیے اور وہ ہارون کے دربار سے وابستگی پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ ہارون نے ان دونوں کے لیے ایک وفد رقہ بھیج دیا جس نے انہیں نہایت عزت و احترام سے قید سے نکالا۔ باہر کی آزاد فضا نے ان دونوں کو مدہوش کردیا اور وہ لڑکھڑا کر گر گئے لیکن کچھ دیر بعد جب ہوش میں آئے تو ان کے دل خوشی سے لبریز تھے اور ان کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

قصرالذہب میں ایک شاندار دربار لگا۔ ہارون مشجر ریشمی پردے کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک طرف شہزادے اور دوسرے خونی رشتے دار بیٹھے تھے اور دوسری طرف یحییٰ، حاجب اور چند ندیم تھے۔ پردے کے باہر دوسرے امراء اور منصب دار موجود تھے۔ ابوالعتاہیہ اور ابراہیم کو ہارون سے اتنا قریب رکھا گیا کہ وہ انہیں اچھی طرح دیکھ سکے اور ان کی آوازیں بھی سن سکے، دربار میں غضب کا سناٹا تھا۔ یکایک اس سناٹے کو دربار کے ایک منصب دار نے توڑ دیا اور اعلان کیا۔ ''عہدِ حاضر کے دو ہنرمند اپنی غلطیوں پر نادم و شرمسار دربار میں حاضر ہیں، دونوں ہنرمند یگانۂ روزگار اور عدیم المثال ہیں۔ ان میں سے ایک تو شاعر ابوالعتاہیہ ہے اور دوسرا بے مثل مغنی ابراہیم موصلی۔ ان دونوں نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر ندامت کا اظہار کیا ہے۔ شاعر ابوالعتاہیہ نے اپنی ندامت کو اپنے اشعار میں قید کردیا اور ابراہیم مغنی نے اپنی عفوطلب... معذرتانہ دھن اور اثرانگیز آواز میں بارگاہ خلافت میں پیش کرنے کی درخواست کی۔ حاضرین گوش برآواز ہوجائیں۔''

ہارون نے اشارے سے حکم دیا کہ ابراہیم شروع کرے۔ ابراہیم نے ابوالعتاہیہ کا قصیدہ اپنی خاص دھن

میں گانا شروع کردیا۔

''خدا نے انسانوں کو خاص خاص صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

خوش قسمت ہے وہ شخص، جس نے خود کو پہچان لیا اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کیا۔

اور بدقسمت ہے وہ جو زندگی بھر لاعلمی میں رہا اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔

اے ابوالعتاہیہ! خدا نے تجھے شاعرانہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

تیرے اشعار عبرت آمیز ہوتے ہیں۔

تو چاہے تو اپنے اشعار سے سوئے ہوؤں کو بیدار کردے۔

اور نہیں تو غافلوں کو غافل ہی رہنے دے۔ تیری صلاحیتیں خدا کا قرض ہیں۔

اپنی صلاحیتوں سے انسانوں کی اصلاح کر اور انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کردے۔

جب تو نے ہادی کی موت کے بعد شاعری سے توبہ کرلی تو خدا کے نیک بندے اور خلیفۃ المسلمین اور امیرالمومنین ہارون نے تجھ کو توبہ توڑنے کا حکم دیا۔

کیونکہ روشن ضمیر خلیفہ کو القا ہوچکا تھا کہ خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام نہ لینا، خدا سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دینے کے مترادف ہے۔

میں نے نادانی اور جہالت کے زیراثر امیرالمومنین کا کہنا نہیں مانا اور قید کردیا گیا۔

یہاں تک کہ آخر زنداں سے مجھے ملہمِ غیبی نے بتایا کہ امیرالمومنین ہارون کی بات مان لے۔

اور شاعری سے عبرت و عظمت کا کام لے کر خدا سے کیے ہوئے عہد کو استوار کرلے۔

میں نے اپنی غلطی مان لی اور امیرالمومنین کے روبرو نادم و شرمسار کھڑا ہوگیا۔

اے امیرالمومنین! یوں تو آپ پر ہر بات عیاں ہے مگر چند نصیحتیں مجھ سے بھی سن لیں۔

آپ کہہ دیں کیا گناہوں سے توبہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں؟

دلوں کی اصلاح کس طرح ہوگی، وہ تو پھوڑے بن چکے ہیں۔

عنقریب آدمی کا جسم روح سے خالی ہوجائے گا اور ہر زندہ شخص اپنی آنکھوں کے سامنے موت کا جھنڈا لہراتا ہوا دیکھ لے گا۔

ہم سب غفلت میں ہیں لیکن موت صبح و شام چکر کاٹتی رہتی ہے۔

جب نزع کا وقت آپہنچے گا اور سانس سینے کے اندر گڑگڑائے گی۔

اس وقت تجھے اس بات کا علم ہوگا کہ اب تک تو اندھیرے اور دھوکے میں رہا۔''

پردے کے پیچھے سے ہچکیوں کی آواز آنے لگی۔ ہارون زاروقطار رو رہا تھا۔ ابراہیم کی پرسوز لے اور ابوالعتاہیہ کے درد و اثر میں ڈوبے ہوئے اشعار نے ہارون کے دل کو پگھلا دیا تھا۔ یحییٰ برمکی کا بیٹا فضل، ابراہیم کے پاس پہنچا اور کہا۔ ''کیا تو اس لیے یہاں آیا تھا کہ امیرالمومنین کو رلا دے؟ تجھ کو تو اس موقع پر کوئی خوشی کا نغمہ چھیڑنا چاہیے تھا۔''

ہارون نے دور ہی سے فضل کو ڈانٹا۔ ''فضل! ابراہیم کو کچھ نہ کہہ، کیونکہ اس کی تو بس آواز اور لے ہے، کلام تو ابوالعتاہیہ کا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ابوالعتاہیہ نے جو کچھ کہا، سچ کہا۔''

اس دن ہارون نے دونوں کو ایک ایک لاکھ درہم نقد اور ایک ایک سو خلعتیں انعام میں دے دیں۔

ابراہیم درہموں اور خلعتوں سے لدا پھندا گھر پہنچا تو در و دیوار سے خوشیاں ٹپکنے لگیں۔

☆☆☆

قید کی پریشانیوں اور محرومیوں نے حریص ابراہیم کو اور زیادہ حریص کردیا تھا۔ یحییٰ برمکی نے اس کو مبارک باد دی کہ وہ راہِ راست پر آگیا لیکن نقد کچھ بھی نہ دیا۔ ابراہیم کو خوب معلوم تھا کہ یحییٰ اگر چاہے تو ہارون سے زیادہ نواز سکتا ہے۔ وہ مغرب کے بعد، رات کے اندھیرے میں قصرالطفین روانہ ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو اتنی دولت اور مل جائے کہ ایک شاندار قصر کا مالک ہوجائے اور اس میں امیرانہ شان سے رہے۔

دکانوں میں شمعیں ٹمٹما رہی تھیں۔ مکانات کے اندر سے کہیں کہیں روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ راستے ہی میں اس نے مسجد سے عشا کی اذان سنی، مسجد کے بلند و بالا میناروں میں روشنیاں ہورہی تھیں۔

یحییٰ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ابراہیم مغنی اس سے ملنے آیا ہے تو اس نے فوراً ہی شرفِ باریابی بخشا اور دارالضیافت میں عزت و احترام سے بٹھایا۔ اس نے

ابراہیم کے مرجھائے ہوئے چہرے اور تباہ حال صحت کو غور سے دیکھا اور کہا۔ ''ابراہیم! قسمت میں جتنی پریشانیاں لکھی تھیں بھگت لیں۔ اگر تو نے میری بات مان لی ہوتی تو آج تیری حیثیت ہی کچھ اور ہوتی۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''بہرحال میں نے بہ دیر سہی لیکن آپ کی بات مان لی۔ اب آپ بھی میری تالیفِ قلب کے لیے کچھ کیجیے اور میری دعائیں لیجیے۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''اگر تو نے میری بات مانی ہوتی تو اتنے دن رقہ کے کنویں میں نہ رہنا پڑتا۔ میں تالیفِ قلب کیوں کروں؟ امیر المومنین سے درخواست کر، ممکن ہے کچھ اور مل جائے۔''

ابراہیم کو یحییٰ سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔ وہ حسرت و یاس سے یحییٰ کی صورت دیکھنے لگا۔ کمرے میں کئی شمعیں روشن تھیں اور ان کی تیز روشنی میں اس نے یحییٰ کے چہرے پر طمانیت اور مضبوط ارادوں کی جھلک محسوس کی۔ ابراہیم کو یہ یقین کرنے میں دیر نہیں لگی کہ یحییٰ نے جو کہہ دیا، اس میں ترمیم نہیں کرے گا۔ بڑی حسرت سے بولا۔ ''برمکی بزرگ! میں تو اس یقین کے ساتھ یہاں آیا تھا کہ بامراد اور شادمان واپس جاؤں گا لیکن اب سوچتا ہوں کہ انسانی اندازے کتنے غلط اور بے بنیاد ہوتے ہیں۔''

یحییٰ نے درشتی سے جواب دیا۔ ''ابراہیم! اگر تو نے میری بات مان لی ہوتی تو شاید میں بہت مہربان ثابت ہوتا اور پھر تیرا تو یہ عقیدہ رہا ہے کہ سخاوت، دریا دلی اور الطاف و اکرام کا ہادی پر خاتمہ ہوگیا۔''

ابراہیم نے عرض کیا۔ ''برمکی سردار! آپ کے انکار سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ سخاوت اور بخشش کا ہادی پر خاتمہ ہوگیا۔ میں نے تو آپ کے در پر یوں حاضری دی تھی کہ اللہ نے مجھ جیسوں کے لیے آپ جیسوں کو تالیفِ قلب کا حکم دیا ہے۔ سو اگر آپ اللہ کے اس حکم کی تعمیل میں کچھ کر گزریں گے تو میں دعائیں دوں گا ورنہ کوئی شکوہ نہیں۔''

یحییٰ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ خدا نے کس کو کیا حکم دیا ہے۔ اگر میں تمہارے لیے کچھ کر سکا تو ضرور کروں گا لیکن سردست میں مجبور ہوں۔''

ابراہیم بحالتِ مجبوری کھڑا ہوگیا، بولا۔ ''اچھا میں چلا، اجازت دیجیے۔''

لیکن یحییٰ نے خوش اخلاقی سے ابراہیم کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ''ابراہیم! ایسی بھی کیا جلدی، آئے ہو تو کچھ دیر رکو اور مجھے خاطر تواضع کی عزت بخشو۔''

ابراہیم انکار نہ کرسکا اور دوبارہ بیٹھ گیا۔

رات کا کھانا دونوں نے ایک ساتھ کھایا۔ پھر نبیذ کا دور چلا اور یحییٰ نے فرمائش کی کہ وہ کچھ سنائے، نبیذ کے سرور نے ابراہیم میں ترنگ پیدا کردی تھی۔ اس نے گانا شروع کردیا۔ گانے کی آواز اندر پہنچی تو ابراہیم کے آس پاس قصر کے دوسرے لوگ بھی جمع ہوگئے۔ کہربا بے قابو ہوکر دروازے سے جھانکنے لگی۔ ابراہیم اس کو دیکھتے ہی اپنے حواس کھو بیٹھا اور گانا بھول گیا۔ یحییٰ نے بے چینی سے کہا۔ ''استاد ابراہیم! اور اور..... خاموش کیوں ہوگئے۔''

ابراہیم نے کہربا کی طرف اشارہ کیا۔ ''برمکی بزرگ! اس سے کہیے کہ میرے سامنے نہ آئے۔ جس چیز کو میں حاصل نہیں کرسکتا، اس کے خیال تک سے بچنا چاہیے۔''

یحییٰ نے کہربا کو حکم دیا۔ ''تو اندر جا اور خبردار جو بغیر اجازت پھر کبھی ادھر آئی۔''

کہربا غصے میں اندر چلی گئی۔ اس کے بعد ابراہیم خلجان، ہیجان اور انتشار کا شکار ہوگیا اور وہ کوشش کے باوجود کچھ اور نہ سنا سکا۔ یحییٰ نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔ رات زیادہ ہوگئی تھی، اس لیے یحییٰ نے ابراہیم کو روک لیا اور صبح فجر کی نماز کے بعد رخصت کردیا۔

☆☆☆

یحییٰ کے پاس مصر سے کچھ لوگ اس لیے آئے ہوئے تھے کہ وہ خلافت سے اعلیٰ مناصب حاصل کریں اور یہ کام یحییٰ کی مرضی اور منظوری کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ قصر الطین ہی کے ایک حصے میں ٹھہرے ہوئے تھے مگر یحییٰ کو راضی نہ کر پا رہے تھے۔

ان میں ایک احمد نامی شخص بہت چالاک تھا۔ معلوم نہیں کس طرح اس کو یہ معلوم ہوگیا کہ یحییٰ ابراہیم مغنی کو بہت مانتا ہے۔ اس نے ابراہیم سے ملاقات کی اور کہا۔ ''استاد ابراہیم! اگر تم یحییٰ سے میرا یہ کام کرادو تو میں اس کے عوض تمہیں پچیس ہزار درہم پیش کروں گا۔''

ابراہیم کے منہ میں پانی بھر آیا اور جی نہ چاہنے کے باوجود وہ یحییٰ سے ملا اور احمد کی سفارش کردی۔ یحییٰ نے پوچھا۔ ''تم اس کو کس طرح اور کہاں سے جانتے ہو؟''

ابراہیم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بات بنانے کی کوشش کی مگر بن نہ سکی۔ یحییٰ نے حقارت سے کہا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ احمد نے تمہیں رشوت کی پیشکش کی ہے۔''

ابراہیم نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں برمکی بزرگ۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''اگر ایسی کوئی بات نہیں تو میں یہ کام نہیں کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے فائدہ اٹھالو۔ اس کام کے عوض احمد سے کچھ حاصل کرلو۔''

لیکن ابراہیم کو شبہ گزرا کہ شاید یحییٰ اس طرح اس سے سچی بات اگلوانا چاہتا ہے بولا۔ ''میں ایسا کام نہیں کرسکتا برمکی بزرگ۔ آپ یقین کیجیے۔''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''ابراہیم! تم نے کچھ عرصہ پہلے تالیفِ قلب کے نام پر کچھ مانگا تھا۔ اگر تم چاہو تو احمد سے اپنی سفارش کے عوض کچھ حاصل کرلو۔''

ابراہیم اب بھی شک و شبے میں مبتلا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ رہا۔

یحییٰ کچھ دیر تو ابراہیم کے جواب کا منتظر رہا اس کے بعد کہا۔ ''اس سلسلے میں، میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ میں احمد سے کہوں گا کہ استاد ابراہیم کے پاس کہربا نامی ایک کنیز ہے۔ اگر تو اس کو خرید کر میرے حوالے کردے تو میں تیرا کام کردوں گا اور تم کہربا کے عوض پچاس ہزار درہم طلب کرلینا۔''

ابراہیم نے مایوسی سے عرض کیا۔ ''لیکن اے برمکی سردار! کہربا میرے پاس ہے کہاں؟ میں احمد کے ہاتھ اس چیز کو کس طرح بیچ سکتا ہوں جو میرے پاس ہے ہی نہیں۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''میں تیری خاطر، محض تیری خاطر کہربا کو تیرے گھر بھجوا دوں گا۔ پھر جب احمد رقم دے کر کہربا کو لے جائے تو تم خاموش ہی رہنا اور رقم اپنے کام میں لانا۔ کہربا دوبارہ میرے پاس آجائے گی۔''

اب ابراہیم کو یحییٰ کی باتوں پر کچھ کچھ یقین آچلا تھا۔ وہ جب رخصت ہونے لگا تو یحییٰ نے اس کو روک لیا اور بطور تنبیہ کہا۔ ''اور ابراہیم دیکھو! میری طرف سے یہ بات بھی ذہن نشین رکھنا کہ کہربا تمہارے گھر میں میری امانت ہوگی۔ اگر مجھ کو بددیانتی یا خیانت کا شبہ بھی ہوگیا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔''

ابراہیم نے امانت اور دیانت کا وعدہ تو کرلیا مگر وہ اندر سے بہت خوفزدہ تھا۔

چند ساعتوں بعد جب ابراہیم گھر پہنچا تو وہاں کہربا کو دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن دونوں ہی ایک دوسرے سے کھنچ رہے تھے۔ رات کو ابراہیم عود لے کر بیٹھ گیا اور طربیہ گیت گانے لگا۔ کہربا اس کی آواز سن کر اس کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد ابراہیم نے یہ محسوس کرلیا کہ کوئی اس کے پیچھے موجود ہے چنانچہ جب وہ مڑا تو کہربا کو دیکھ کر لڑکھڑا گیا۔ ابراہیم نے آنکھیں بند کرلیں اور کہربا سے کہا۔ ''کیا تو جانتی ہے کہ تو یہاں کیوں بھیجی گئی ہے؟''

کہربا نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''جانتی ہوں، خوب اچھی طرح جانتی ہوں اور میرے آقا برمکی سردار نے مجھے بطور خاص تنبیہ کی ہے کہ میں تم سے دور دور اور بے تعلق رہوں اور میں اس پر عمل کروں گی۔''

کہربا چلی گئی مگر ابراہیم کا صبر و سکون لے گئی۔ اس نے اپنے کمرے کو اندر سے بند کرلیا اور بدقسمتی پر آنسو بہاتی رہی۔

کہربا چار دن ابراہیم کے گھر میں رہی اور ابراہیم کے ارمانوں کو آگ لگاتی رہی۔ پانچویں دن احمد آگیا اور ابراہیم سے پوچھا۔ ''بھائی! کیا کہربا نامی کوئی کنیز بھی آپ کے ساتھ رہتی ہے؟''

ابراہیم نے اداکاری سے جواب دیا۔ ''ہاں رہتی تو ہے، کیوں؟''

احمد نے گھبرا کے پوچھا۔ ''استاد! اگر اس لڑکی کو تم میرے ہاتھ فروخت کردو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ یحییٰ اس لڑکی کو پسند کرتا ہے اور رشوت میں کہربا کو طلب کیا ہے۔''

ابراہیم نے بے غرضی سے جواب دیا۔ ''میں کہربا کے عوض پچاس ہزار درہم لوں گا۔''

لیکن احمد نے منہ بنایا اور قیمت کم کرانا چاہی۔ ابراہیم سختی سے ڈٹا رہا اور آخر احمد نے پچاس ہزار درہم ادا کرکے کہربا کو حاصل کرلیا اور وہاں سے چلا گیا۔ ابراہیم کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ ایک کونے میں جا کر دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ اس نے یحییٰ کے پاس جانا بھی چھوڑ دیا لیکن ایک ہفتے کے بعد یحییٰ ابراہیم کے پاس خود ہی پہنچ گیا اور پوچھا۔ ''استاد ابراہیم! میں نے احمد کا کام کردیا، کہربا کو کتنے میں فروخت کیا تھا؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''پچاس ہزار درہم میں۔'' اس کے بعد ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ درہم اس کوٹھری میں رکھے ہیں اگر فرمائیں تو نکلوا دوں۔''

یحییٰ نے ہنس کر کہا۔ ''وہ رقم تالیفِ قلب کے حساب میں اپنے پاس ہی رکھو، اس وقت تو میں اس لیے آیا ہوں کہ احمد نے کام ہوجانے کی خوشی میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا ہے۔ وہاں محفلِ طرب بھی ہوگی جس میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔''

ابراہیم نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''برمکی سردار! افسوس کہ میں شریک نہیں ہوسکوں گا۔''

لیکن یحییٰ نے اصرار کیا۔ ''استاد ابراہیم! تمہاری شرکت بہت ضروری ہے۔ میں زبردستی بلوالوں گا۔''

اس دوران ابراہیم پاگلوں کی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا، کہربا کا گھاؤ گہرا ہو گیا تھا جو کسی پہلو کسی پل چین ہی نہ لینے دیتا تھا۔

تقریباً دو ہفتے بعد ایک شاندار قصر میں احمد نے ضیافت اور بزم طرب کا اہتمام کیا۔ یحییٰ نے استاد ابراہیم کو زبردستی بلوالیا۔

اس میں ابراہیم کو مہمان خصوصی کا درجہ دیا گیا۔ شاید پہلی بار یحییٰ نے ابراہیم کو وہ عزت بخشی جو پہلے کبھی نہیں دی گئی تھی۔ احمد نے بھی اس کا بار بار شکریہ ادا کیا کہ اس کی سفارش پر یحییٰ نے اس کا کام کر دیا تھا۔

بہترین اور لذیذ کھانوں کے بعد نبیذ کا دور چلا اور اس کے بعد محفلِ طرب شروع ہو گئی۔ ابراہیم نے کہربا کی مفارقت میں گداز اور شکستہ دل سے ایسے گیت سنائے کہ محفل جھوم جھوم گئی۔ رات کے پچھلے پہر تک ہر کوئی تھک کر چور ہو چکا تھا۔ یحییٰ برمکی نے جب محفل کے اختتام کا اعلان کیا تو لوگوں نے بھاگنا شروع کیا۔ لیکن یحییٰ نے ابراہیم کو وہیں روک لیا اور اس کو شانوں سے پکڑ کر قصر کی سیر کر ڈالی۔ قصر کے پیچھے ایک پائیں باغ تھا جس میں فوارے چل رہے تھے۔ ابراہیم نے سوچا کہ اگر دنیا میں کہیں جنت ہے تو یہی وہ جگہ ہے۔ ابراہیم اس رات اسی قصر میں سورہا۔ صبح جب بیدار ہوا تو اپنے اردگرد سناٹا محسوس کر کے پریشان ہو گیا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ قافیر کے ایک ٹکڑے پر کچھ لکھا رکھا تھا۔ ابراہیم نے اس کو اٹھالیا اور پڑھنے لگا۔

''استاد ابراہیم! تو نے ایک دن تالیفِ قلب کے نام پر مجھ سے کچھ طلب کیا تھا، مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری وہ مدد نہیں کر سکا جس کے تم مستحق ہو۔ تم نقد کے علاوہ ایک شاندار قصر کی تمنا بھی رکھتے ہو، چنانچہ یہ قصر جس میں تم اس وقت موجود ہو، تمہارا ہی ہے۔ اس کو میں نے خرید کر تمہیں دے دیا۔ اب اس میں جو کچھ بھی ہے وہ تمہارا اپنا ہے۔''

ابراہیم نے قافیر کے اس ٹکڑے کو بار بار پڑھا اور اس کو اس کی سچائی پر یقین نہ آیا۔ آخرکار وہ اٹھا اور قصر کے سازوسامان کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے سارے کمرے سازوسامان سے آراستہ تھے۔ اس کو اب ایک ہی خیال بار بار ستا رہا تھا کہ یحییٰ جب یہ سب دے سکتا ہے تو کہربا کو بھی بخش سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ڈھٹائی سے کہربا کو مانگ لے گا۔ وہ ایک کمرے سے نکل کر دوسرے میں اور دوسرے سے نکل کر تیسرے میں گیا۔ یہاں تک کہ وہ جب خواب گاہ میں داخل ہوا تو اس نے ایک جملہ (چھپر کھٹ) کو باریک اور نازک کپڑے کے پردوں میں ڈھنپا ہوا دیکھا۔ وہ جملہ کے قریب گیا تو بستر پر کسی کو لیٹے ہوئے دیکھا۔ اس نے چھپر کھٹ کا پردہ اٹھا دیا اور چادر میں لپٹی ہوئی شے کو گدگدا کر بیدار کر دیا۔ وہ ایک دم گھبرا کر چادر سمیت اٹھ کر بیٹھ گیا ابراہیم گھبرا کر کھڑا ہو گیا، اس کے سامنے چھپر کھٹ پر کہربا بیٹھی ہوئی تھی۔ ابراہیم نے حیرت سے پوچھا۔ ''کہربا! تو...... تو یہاں کیا کر رہی تھی؟''

ایک دوسرے کمرے سے یحییٰ نمودار ہوا اور کہربا کے بجائے بولا۔ ''ابراہیم! کیا تمہیں قافیر کا وہ ٹکڑا نہیں ملا، جس میں اس قصر اور اس کے سازوسامان کے بارے میں وضاحت کی گئی تھی؟''

ابراہیم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''قافیر کا مذکورہ ٹکڑا مل گیا۔'' وہ اس وقت بھی مٹھی میں ہی دبا تھا۔ اس کو یحییٰ کی طرف بڑھا دیا۔ ''برمکی سردار! یہ رہا وہ قافیر کا ٹکڑا۔''

یحییٰ نے وہ ٹکڑا لے لیا اور اس کو پڑھتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس میں یہ نہیں لکھا کہ اب اس میں جو کچھ بھی ہے، وہ تمہارا اپنا ہے۔''

ابراہیم نے بے چینی اور سوالیہ نظروں سے کہربا کی طرف دیکھ کر یحییٰ کو دیکھا اور دبے لفظوں میں پوچھا۔ ''اور یہ؟''

یحییٰ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہاں یہ بھی۔''

ابراہیم کے دل و دماغ پر خوشی کا جھٹکا لگا اور وہ بے ہوش ہونے لگا۔ اس نے نیم خوابیدہ نظروں سے یحییٰ کی طرف دیکھا اور بہ مشکل اٹک اٹک کر کہا۔ ''برمکی سردار! سخاوت، الطاف و عنایات اور انعام و اکرام کا تیری ذات پر خاتمہ ہو گیا۔ آج ہادی کا زور ٹوٹ گیا اور یحییٰ برمکی نے اس کی جگہ لے لی۔ امیرالمومنین ہارون نے نہیں۔ آلِ برمک کے بزرگ یحییٰ نے۔''

کہربا شوخ و شریر نظروں سے ابراہیم کو دیکھ رہی تھی اور یحییٰ نیم مدہوش ابراہیم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کہانی کے تاریخی مآخذ

کتاب	مصنف
تاریخ بغداد	خطیب بغدادی
تمدن عرب	ڈاکٹر گستاؤلی بان
تاریخ ایران	مقبول بیگ بدخشانی
المامون	شبلی نعمانی
معجم البلدان	یاقوت حموی
تاریخ اسلام	معین الدین احمد ندوی
طبقات ناصری	منہاج سراج

خود غرض معاشرے میں ایک جانور کی محبت اور فہم و فراست کا قصہ

اگرچہ انسانی معاشرے اور جنگل کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے مگر حسیات میں کہیں کہیں پائی جانے والی مطابقت کبھی کبھی ایک الگ ہی داستان رقم کردیتی ہے۔ جیسے کہ یہاں... حالانکہ وہ ایک جانور تھا لیکن انسان دوستی نبھانے میں اس نے اشرف المخلوقات کو بھی مات دے دی۔ زندگی کس قدر خوفناک دوراہے پر آگئی تھی مگر ایک چھوٹے سے ستائشی جملے نے اس جانور کو آخری لمحات تک مثالی کردار نبھانے پر مجبور کردیا... کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خود کو اور اپنے قبیلے کو ویسا ثابت نہ کرپاتا جیسا کہ انہیں سمجھا گیا تھا۔

بے ساتھی

کاشف زبیر



یہ ایک مرد، ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکی پر مشتمل چھوٹا سا خاندان تھا۔ عورت خوب صورت تھی۔ لمبا قد اور رنگ ہلکا سانولا تھا مگر وہ دیکھنے میں اچھی لگ رہی تھی۔ مرد کا رنگ سفید تھا۔ اس کا جسم مضبوط اور نقوش اچھے تھے۔ لڑکی بہت پیاری سی تھی۔ مرد اور عورت اپنی سفاری جیپ کے باہر موجود تھے اور اس کے بونٹ پر لیپ ٹاپ رکھ کر اس پر وائلڈ لائف کی ڈاکیومینٹری دیکھ رہے تھے۔ یہ ڈاکیومینٹری انہوں نے خود تیار کی تھی۔ اسکرین پر لگڑ بھگوں کا ایک خاندان

دکھایا جا رہا تھا۔ اس میں کوئی درجن بھر بالغ اور کوئی تین درجن بچے لکڑ بھگے تھے۔ وہ آپس میں کھیل رہے تھے اور شرارتیں کر رہے تھے۔ مرد عورت سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ سب کس قدر خوب صورت ہے۔ اس جانور میں ایک خاندان ہونے کا کتنا احساس ہے۔''

''جو ہم انسانوں میں ختم ہو گیا ہے۔'' عورت نے برجستہ کہا اور لڑکی کی طرف دیکھا جو جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھی بے نیازی سے اپنے ٹیب میں گم تھی۔ اس نے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا رکھا تھا اور میوزک پر سر ہلاتے ہوئے گیم کھیل رہی تھی۔ مرد نے کہا۔

''یہ جانور مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور اگر ایک لکڑ بھگا مشکل میں ہو تو باقی سب اسے چھوڑ کر نہیں جاتے۔ حد یہ کہ اگر ایک ماں کہیں شکار پر گئی ہو اور اس کے بچے بھوکے ہوں تو دوسری مادہ اس کے بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔''

''اس کے باوجود لکڑ بھگا ایک خطرناک جانور ہے اور خطرے کے وقت یہ حملہ کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ اس کے پنجے خطرناک ہوتے ہیں مگر اس کا اصل ہتھیار اس کا جبڑا ہے۔ اس سائز کے جانوروں میں کسی جانور کا جبڑا اتنا مضبوط نہیں ہوتا جتنا کہ لکڑ بھگے کا ہوتا ہے۔ حد یہ کہ بھیڑیے کا جبڑا بھی اتنا مضبوط نہیں ہوتا۔''

مرد بہت جوش سے کہہ رہا تھا۔ عورت اس کی تائید کر رہی تھی اور دونوں اس ڈاکیومینٹری کے حوالے سے بہت خوش تھے کیونکہ وہ اسے تیار کر رہے تھے جبکہ میں دور جھاڑیوں سے انہیں بہ غور دیکھ رہا تھا۔ انسان ہم لکڑ بھگوں کے لیے نامانوس نہیں ہیں۔ ہم ہزاروں سال سے ساتھ ساتھ رہتے آئے ہیں۔ جس صحرا میں ہم رہتے ہیں اس میں جگہ جگہ انسانی آبادیاں بھی ہیں مگر ہم ایک دوسرے کی حدود کا احترام کرتے ہیں۔ جیسے انسان بلاوجہ ہماری حد میں آنے سے گریز کرتے ہیں، اسی طرح ہم بھی انسانی حدود میں جانے سے گریز کرتے ہیں لیکن انسانوں کی طرف سے کبھی کبھی ہماری حدود کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے اور وہ غیر قانونی شکار کے لیے جب جنگل میں آتے ہیں تو ان جانوروں کو مارتے ہیں جو ان کے لیے نفع بخش ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ان جانوروں کو بھی مار دیتے ہیں جن کی انہیں ضرورت نہیں ہوتی۔

شروع میں ہم تمیز نہیں کر پاتے تھے کہ کون سے انسان ہمارے درپے ہیں اور کون سے ہمارے لیے.... بے ضرر ہیں اس لیے ہم دھوکے میں مارے جاتے تھے۔ اصل میں جانوروں کا غیر قانونی شکار کرنے والے جو جانور مارتے تھے ان کی باقیات چھوڑ جاتے تھے۔ خاص طور سے ہاتھی اور گینڈوں کو مار کر ان کے صرف دانت اور سینگ لیتے تھے۔ اسی طرح دوسرے جانوروں کی کھال اور سر وغیرہ لے جاتے اور باقی جسم چھوڑ جاتے تھے جو ہمارے کام آ جاتا تھا۔ ہم لکڑ بھگے جنگل کے مہتر ہوتے ہیں۔ صفائی کرنا اور سڑنے والی لاشوں کو کھا کر ماحول کو صاف رکھنا ہمارا اصل کام ہے۔ پھر رفتہ رفتہ تجربے نے ہمیں سمجھا دیا کہ کون سے انسان خطرناک ہیں اور کون سے بے ضرر ہیں۔

یہ تین افراد جو یہاں موجود تھے، وہ بے ضرر تھے۔ اگرچہ ان کے پاس بھی رائفل تھی مگر میں جانتا تھا، وہ یہاں شکار کرنے نہیں بلکہ جنگلی حیات کو دیکھنے آئے ہیں۔ میری توجہ کا مرکز لڑکی تھی۔ عورت مرد کے پاس سے ہٹ کر اس کی طرف آئی اور اس نے کھڑکی سے کہا۔ ''جولی! تم نیچے کیوں نہیں آتی ہو؟''

''میں کیوں نیچے آؤں؟'' جولی نے بدتمیزی سے کہا تو مجھے اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا۔ ہم لکڑ بھگوں میں حفظ مراتب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ بڑوں کا احترام کیا جاتا ہے۔

''جولی، میں تمہاری ماں بھی ہوں۔''

''تم میری ماں نہیں ہو۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''تم صرف میرے ڈیڈ کی بیوی ہو۔''

وہ دونوں بہت آہستہ سے بول رہی تھیں تاکہ مرد نہ سن سکے۔ مگر میں سن رہا تھا۔ ہم لکڑ بھگوں کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لڑکی اس عورت کی بیٹی نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس سے درشت اور اجنبی انداز میں پیش آ رہی تھی۔ عورت تحمل سے کام لے رہی تھی۔ مرد نے آواز دی تو عورت اس کی طرف چلی گئی۔ آج صبح جب میں اپنے خاندان کے ساتھ آرام کر رہا تھا میری چھٹی حس نے اشارہ دیا کہ کچھ لوگ یہاں آئے ہیں اور میں اس سمت چل دیا جس طرف سے مجھے اشارہ مل رہا تھا۔ میری چھٹی حس درست ثابت ہوئی جب میں نے ان تین انسانوں کو جھاڑیوں کے ساتھ موجود پایا۔ یہ جھاڑیاں ہمارا مسکن تھیں اور ہمیں شیر، چیتے اور ان جیسے دوسرے بڑے جانوروں سے بچاتی تھیں۔ میں نے مرد اور عورت کی گفتگو سنی تو مجھے اچھا لگا۔ اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ جب انسان ہمیں نہایت برا جانور خیال کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے انسانوں کی دنیا میں ہم لکڑ بھگوں کو ایک منفی کردار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ چالاکی، مکاری، چاپلوسی اور سفاکی ہم لکڑ بھگوں کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ خصوصیات واقعی ہم میں ہوں مگر دوسرے جانوروں کے مقابلے میں ہم لکڑ بھگے نہایت گھٹیا اور گرے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے جب اس جوڑے نے ہمیں اچھا کہا تو مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں ان کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا لیکن چونکہ وہ مجھے اچھے لگ رہے تھے، اس لیے میں جانے کے بجائے وہیں رک کر انہیں دیکھنے لگا۔

میں اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا مگر میں گھنی جھاڑیوں میں تھا اس لیے وہ میری موجودگی سے بے خبر تھے۔ لڑکی جواب تک جیپ میں بیٹھی تھی، اچانک نیچے اتر آئی اور اس نے ان جھاڑیوں کا رخ کیا جہاں میں تھا۔ وہ میوزک سنتے ہوئے بے خیالی میں ٹہلتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی۔ میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اگر وہ میرے پاس آ جاتی تو میری حیوانی جبلت مجھ پر غالب آ سکتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ مشکل میں پڑیں۔ اس لیے میں دبے قدموں پیچھے ہٹنے لگا مگر لڑکی کی رفتار خاصی تیز تھی اور وہ کچھ ہی دیر میں ان جھاڑیوں کے پاس آ گئی جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ اب میں حرکت کرتا تو اس کی نظروں میں آ جاتا۔ جھاڑیوں کا رنگ میں دبا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ لڑکی مجھے نہیں دیکھ سکے گی مگر اتنے قریب سے اس کی موجودگی میری حیوانی جبلت پر ناگوار گزر رہی تھی۔ اگر مجھے یہ مرد اور عورت اچھے نہیں لگے ہوتے تو شاید میں غراتا اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتا۔ لڑکی بالکل پاس آ گئی تھی اور اس نے ناک سکیڑی۔

''اف کتنی گندی بو ہے۔''

میں جانتا تھا یہ بو میرے جسم سے اٹھ رہی تھی۔ جیسے ہمیں انسانوں اور دوسرے جانوروں کی بو ناگوار گزرتی ہے، اسی طرح انسانوں اور دوسرے جانوروں کو ہماری بو ناگوار گزرتی ہے۔ اسی لمحے مرد کی آواز آئی۔ ''جولی تم کہاں ہو؟''

میں لیٹے ہونے کی وجہ سے مرد و عورت کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر ان کی ہلچل اور بے چینی کی لہریں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ اب عورت کی آواز بھی مرد کی آواز میں شامل ہو گئی تھی۔ جولی نے زیرِ لب کہا۔ ''شٹ۔''

پھر وہ واپس جانے لگی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ آگے گئی تھی کہ مرد نے اسے دیکھ لیا اور لپک کر اس کے پاس آیا۔ ''تم بتائے بغیر جیپ سے کیوں اتریں؟''

''میں [illegible]

''تو ہمارے پاس آتیں۔'' عورت تیز لہجے میں بولی۔ ''ان جھاڑیوں میں جانے کتنے خطرے چھپے ہوتے ہیں۔''

مرد نے نرمی سے کہا۔ ''جولی میری بات سنو، جنگل میں آدمی کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ وعدہ کرو اب بتائے بغیر کہیں نہیں جاؤ گی۔''

''اوکے پراس۔'' جولی نے بیزاری سے کہا اور جیپ میں جا کر بیٹھ گئی۔ مرد و عورت باہر تھے۔ عورت بولی۔ ''کرس یہ بہت مشکل لڑکی ہے۔''

''میں جانتا ہوں این مگر یہ میری بیٹی ہے۔''

اب میں اٹھ گیا تھا اور ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ عورت کے چہرے کے تاثرات رفتہ رفتہ نرم پڑ گئے پھر اس نے مسکرا کر کہا۔ ''ہاں یہ تمہاری بیٹی ہے اس لیے مجھے بھی عزیز ہے۔''

کرس نے یوں سکون کا سانس لیا جیسے کوئی تنازعہ ٹل گیا ہو۔ اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں کیمپ چلنا چاہیے۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ لوگ یہاں رکنے کے ارادے سے آئے تھے۔ یہاں ایک مستقل کیمپ تھا جو اسی قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ عام طور سے اس کیمپ میں کم ہی لوگ ٹھہرتے تھے اور بیشتر وقت یہ خالی پڑا رہتا تھا۔ میں خود کئی بار اس کا پورا معائنہ کر چکا تھا مگر وہاں ہمارے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے میں نے کسی چیز کو کبھی چھیڑا نہیں تھا۔ کیمپ کو چاروں طرف سے خاردار تاریں لگا کر محفوظ کیا ہوا تھا مگر ان میں ایسے رخنے تھے جن سے میں اور میری جسامت کا جانور اندر گھس سکتا تھا۔ انہوں نے اپنا سامان سمیٹا اور جیپ میں رکھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ انہیں جیپ کے لیے مخصوص راستے سے جانا تھا جو خاصا طویل اور گھوم پھر کر جاتا تھا۔ میں ایک شارٹ کٹ کے ذریعے ان سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔

کیمپ تین خیموں پر مشتمل تھا۔ ایک بڑا پیلے رنگ کا موٹے کپڑے کا بنا ہوا خیمہ تھا۔ یہاں تمام اہم چیزوں کا ذخیرہ تھا اور یہاں وہ آلات تھے جن سے انسان دور کے لوگوں سے بات کرتے تھے۔ باقی دو خیمے رہائش کے لیے تھے۔ کچھ دیر بعد جیپ آئی اور کرس نے اتر کر تاروں سے بنا ہوا دروازہ کھولا اور جیپ اندر لے جا کر دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ مجھے اندر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں باہر سے ہی سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ کرس اور این سامان اتارنے اور اندر رکھنے لگے جب کہ جولی اتر کر ایک درخت تلے موجود کرسی پر آ بیٹھی اور اپنے ٹیب میں مگن رہی۔ اس

نے ان لوگوں کی مدد کی قطعی کوشش نہیں کی۔ جانے کیوں اس ناخلف لڑکی پر میرا غصہ بڑھ رہا تھا اور اگر وہ کسی دوسرے لکڑ بھگے کی اولاد بھی ہوتی تب بھی میں اسے سزا دے چکا ہوتا۔ مگر میں مجبور تھا کہ وہ انسان تھی اور میں اس کے پاس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سارا سامان اندر رکھ کر اور سیٹ کر کے کرس نے کھانے کا سامان نکالا اور آگ جلا کر پکانے لگا۔ این آلات والے خیمے میں کچھ کر رہی تھی پھر وہ باہر آئی اور اس نے آئس بکس میں رکھی ہوئی بوتلیں نکالیں اور ایک خود لے کر دوسری کرس کو دی۔ جولی نے کہا۔

''مجھے بھی چاہیے۔''

''تم ابھی سولہ سال کی ہو اور اس میں الکحل ہے۔'' کرس نے انکار کیا۔ ''تم کولڈ ڈرنک لے لو۔''

جواب میں جولی نے منہ بنایا اور خاموش ہو گئی۔ اس نے کولڈ ڈرنک نہیں لی تھی۔ کرس گوشت کے پارچے بھون رہا تھا اور اس کی خوشبو سے مجھے کچھ ہونے لگا تھا۔ ہم... لکڑ بھگوں کو بہت کم کھانے کو ملتا ہے اس لیے ہم ہر وقت ہی بھوکے رہتے ہیں۔ دو دن پہلے ہمیں ایک مردہ ہاتھی ملا تھا اور ہمارے جھنڈ نے اسے دل کھول کر کھایا تھا مگر جھنڈ بڑا تھا اور پھر دوسرے جانور بھی آ گئے تھے اس لیے نصف دن سے بھی پہلے سوائے ہاتھی کی ہڈیوں کے اور کچھ نہیں بچا تھا۔ اس کے بعد سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب میری آنتیں میں شکن سے پڑ رہے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ منت میں وقت ضائع کرنے کے بجائے یہاں سے کھسک لوں اور جا کر کھانے کو کچھ تلاش کروں۔ مجھے اپنے بچوں کا خیال آ رہا تھا۔ میری مادہ نے بھی دو دن پہلے کھایا تھا۔ ان دو دنوں میں اس نے ہمارے بچوں کو خوب دودھ پلایا تھا مگر اب اس کا بھی پیٹ خالی تھا۔ واپس اپنے ٹھکانے کی طرف جاتے ہوئے میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ مجھے کھانے کو کچھ مل جائے اور شاید یہ وقت قبولیت کا تھا۔ مجھے نزدیک ہی کسی بھینسے کے ڈکرانے کی آواز آئی۔ نزدیک سے مراد کوئی نصف میل یا اس سے بھی زیادہ دوری سے آ رہی تھی۔ میں اس طرف بڑھا مجھے امید تھی کہ بھینسے کا کسی جانور نے شکار کیا ہوگا۔ بھینسے کا شکار عام طور سے شیر ہی کرتے ہیں اور وہ بھی کئی شیر مل کر ایک بھینسے کو گراتے ہیں۔ یہ تنومند اور خوفناک سینگوں والا جانور ایک شیر کے بس کی بات نہیں تھی۔ میرا اندازہ درست نکلا مرتے ہوئے بھینسے کو کوئی نو دس شیر اور شیرنیاں چمٹے ہوئے تھے اور اس کی کھال اتارنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک شیرنی نے بھینسے کا منہ اپنے منہ میں دبوچا ہوا تھا تا کہ اس کا دم گھٹ جائے اور وہ جلدی مر جائے۔ شیروں کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور بھینسے کے مرتے ہی وہ اسے کھانے میں لگ گئے۔

میں شیروں سے خاصے فاصلے پر جھاڑیوں میں تھا۔ اگر میرے ساتھ جھنڈ ہوتا تو ہم بھینسے کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے اور.... شیروں کو اتنا تنگ کرتے کہ وہ پیٹ بھرنے کے بعد وہاں سے چلے جاتے اور باقی شکار ہمارا ہوتا۔ لوگ لکڑ بھگوں کو بزدل قرار دیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ شیروں سے شکار چھیننا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور یہ کام ہم جان پر کھیل کر کرتے ہیں۔ اس وقت میں اکیلا تھا اور شیروں کے سامنے جانا خودکشی ہوتی۔ اس لیے میں صبر سے انتظار کر رہا تھا۔ شیروں کو بھی شاید بہت دنوں بعد شکار ملا تھا وہ کھائے جا رہے تھے۔

نصف رات کے قریب جا کر انہوں نے شکار کی جان چھوڑی۔ اس کے بعد بھی بھینسے میں بہت کچھ بچا ہوا تھا اور شاید اسی کی حفاظت کے لیے وہ آس پاس لیٹ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں، پیٹ بھرنے کے بعد شیر زیادہ بھاگ دوڑ والا کام نہیں کر پاتے۔ وہ مجھے ڈراتے مگر میرے پیچھے بھاگنے سے گریز کرتے۔ یہی سوچ کر میں بھینسے کے پاس آیا جس کا سارا اوپری گوشت غائب تھا اور پنجر نظر آ رہا تھا۔ میرے نزدیک آتے ہی شیر غرانے لگے اور میں فوراً سر جھکا کر اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ جب شیر ذرا دھیمے ہوئے تو میں منمناتی آواز میں ان سے درخواست کرنے لگا کہ مجھے کھانے دیا جائے میں بھوکا ہوں۔ درخواست کے ساتھ ہی میں دبے قدموں شکار کی طرف بھی جا رہا تھا۔ اس پر ایک شیرنی اٹھ کر میری طرف آئی اور میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

جب شیرنی واپس اپنی جگہ بیٹھی تو میں دوبارہ شکار کی طرف بڑھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی شیر یا شیرنی کی مداخلت پر مجھے واپس جانا پڑا۔ مگر بالآخر ان پر غنودگی طاری ہو گیا اور انہوں نے مجھے اجازت دینا ہی مناسب سمجھا۔ میں شکار کے پاس آیا اور خوش قسمتی سے مجھے اس کی کلیجی مل گئی۔ میں جلدی جلدی کچھ آسان کھانا حاصل کرنے کے چکر میں تھا اور سب سے آسان کھانا کلیجی ہوتی ہے جو جانے ان شیروں سے کیسے بچ گئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کلیجی کے ٹکڑے نگلنا شروع کیے۔ لکڑ بھگا ایک وقت میں پانچ سے چھ کلوگرام گوشت کھا سکتا ہے اور یہ کلیجی اتنی ہی وزنی تھی۔ آخر میں میں نے دل پر جبر کر کے کھایا کیونکہ میرا پیٹ پھٹنے والا ہو رہا تھا اور مجھے خوف تھا کہ اگر کسی شیر کو میرا خیال آ گیا تو میں بھاگ بھی

نہیں سکوں گا۔ اس لیے کلیجی ختم کرتے ہی میں وہاں سے دبے قدموں پیچھے ہٹا اور شیروں سے دور آتے ہی پوری رفتار سے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

لکڑ بھگے سرکنڈوں اور اونچی گھاس کے ہموار میدانوں میں گڑھے کھود کر ان میں رہتے ہیں۔ اگر جھنڈ شکار پر گیا ہو تب بھی پیچھے بچوں کی حفاظت کے لیے کچھ بڑے چھوڑ جاتے ہیں اور ان کے لیے کھانا بھی لے کر آتے ہیں جیسے بڑے ہونے والے بچوں کے لیے لاتے ہیں۔ میں ٹھکانے کے پاس پہنچا تو میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ میری مادہ میری فکر میں گڑھے کے نزدیک ایک اونچی جگہ کھڑی تھی۔ اس نے مجھے آتے دیکھا تو خوشی سے ہنسنے جیسی آواز نکالی۔ یہ آواز سن کر میرے بچے بھی باہر آ گئے تھے۔ میں ان کے نزدیک آیا اور انہیں پیار کیا، میری مادہ آ گئی تھی اور وہ بے تابی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بے تابی محسوس کرتے ہوئے میں شروع ہو گیا اور ابکائی لے کر کلیجی کے ٹکڑے جو ابھی ہضم نہیں ہوئے تھے وہ باہر نکال دیے۔

مادہ جلدی جلدی انہیں کھانے لگی اور بچے اس کے تھنوں کے پاس منڈلانے لگے۔ ہم لکڑ بھگے پیچھے رہ جانے والوں اور بڑے ہوتے بچوں کو اسی طرح کھانا دیتے ہیں جو ابھی خود شکار پر جانے کے قابل نہیں ہوتے۔ میں نے تقریباً سارا ہی گوشت نکال دیا تھا بس جو ہضم ہوا تھا وہی رہ گیا تھا مگر میں خوش تھا کہ میری مادہ نے کھا لیا تھا اور اب میرے بچوں کو کئی وقت دودھ ملے گا۔ میں نے اسی لیے اپنی جان کا خطرہ مول لیا تھا اور کامیاب رہا۔ اسی سرشاری میں، میں لیٹا تو مجھے خبر نہیں ہوئی اور میری آنکھ اگلی صبح سورج کی تیز روشنی سے کھلی تھی۔ میری آنتوں میں ایک بار پھر اینٹھن ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس بھینسے میں کچھ بچا ہو جسے کل شیروں نے مارا تھا مگر جب میں وہاں پہنچا تو شیر جا چکے تھے اور بھینسے کے پنجر کو چاروں طرف سے بڑے خطرناک گدھوں نے گھیر رکھا تھا۔

ان گدھوں کی چونچ میرے جبڑے سے کم مضبوط اور خطرناک نہیں ہوتی۔ یہ چونچ مار کر مضبوط ترین ہڈی میں سوراخ کر دیتے ہیں تا کہ اندر موجود گودا کھا سکیں۔ درجنوں کی تعداد میں ان گدھوں کے ہوتے ہوئے میرے لیے کوئی موقع نہیں تھا کہ میں پنجر کے نزدیک بھی جا سکوں۔ اب مجھے کھانے کی کسی اور چیز کی تلاش تھی۔ مایوس ہو کر ابھی میں واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ان تینوں کا خیال آیا۔ میں کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا اور جب وہاں پہنچا تو کرس اور این ایک بار پھر بے تابی سے جولی کو تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے شاید پورا کیمپ کھنگال لیا تھا اور اب وہ باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے جب کہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کہاں تھی؟ وہ جیپ کی چھت پر لیٹی ہوئی کانوں سے ہیڈ فون لگائے میوزک سن رہی تھی۔ اس نے کرس اور این کی پکاریں سنی ہی نہیں تھیں۔ وہ باہر نکلنے والے تھے کہ این کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے غصے سے کرس سے کہا۔

''یہ رہی۔''

این اندر چلی گئی تھی اور کرس جولی کے پاس آیا، اس نے جیپ کی باڈی پر ہاتھ مارا تو جولی چونکی، اس نے ہیڈ فون اتارا۔ ''یس ڈیڈ؟''

''تم سے کہا تھا کہ خاموشی سے ادھر ادھر مت ہوا کرو۔''

''لیکن میں تو یہاں دھوپ لے رہی تھی۔'' جولی نے کہا۔ کرس اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جولی نیچے اتر آئی اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مام نے مجھے یہاں کیوں بھیجا ہے۔''

''کیونکہ اسکول کی چھٹیوں میں تمہاری سرگرمیاں مشکوک ہو گئی تھیں، تمہاری دوست نشے کی گولیاں استعمال کرتی تھیں۔''

''میں نے تو نہیں کیں۔''

''آدمی صحبت سے زیادہ دیر بچتا نہیں ہے۔''

''میں یہاں بور ہو رہی ہوں۔''

''میں ہوں، این ہے تم ہم سے بات کر سکتی ہو۔''

''مجھے اس سے بات نہیں کرنی۔''

''تب مجھ سے بات کرو، میں تمہارا باپ ہوں اور تم مجھ سے سب کہہ سکتی ہو۔''

جولی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ''آپ اور مام کیوں الگ ہوئے؟''

''تم جانتی ہو ہمارے مزاج میں فرق ہے تمہاری ماں سمجھوتا کرنے والی عورت نہیں ہے اس لیے ہم الگ ہو گئے۔''

''آپ دونوں نے میرا نہیں سوچا صرف اپنا سوچا۔''

جولی کا انداز الزام دینے والا تھا۔

''ہم نے تمہارا ابھی سوچا تبھی اتنے عرصے ساتھ رہے ورنہ بہت پہلے الگ ہو جاتے۔ اب تم میچور ہو رہی ہو اور چند سالوں بعد تمہاری اپنی زندگی ہوگی جس کا ہم سے بہت کم تعلق ہوگا۔ اس لیے اب ہمیں اپنی اپنی زندگی گزارنے کا حق ہے۔''

جولی سمجھنے والے بچوں میں سے نہیں تھی وہ پاؤں پٹختی ہوئی اندر اپنے خیمے میں چلی گئی۔ کرس اور این بھی اب اندر

تھے۔ ان کے لحاظ سے گرمی تھی لیکن میرے لحاظ سے موسم بہت شاندار تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے نکلا ہوا تھا اور ہلکی سی ہوا جیسے نیند کے جھونکے لا رہی تھی۔ میں وہیں جھاڑیوں میں لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد سو گیا۔ پھر میری آنکھ کھلی تو رات... ہو چکی تھی۔ وہ لوگ خیموں کے درمیان آگ جلا کر بیٹھے تھے۔ جولی نے کرس سے کہا۔ ''مجھے مام سے بات کرنی ہے۔''

''او کے۔'' کرس نے ایک آلہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ سیٹلائٹ فون ہے جلدی بات کرنے کی کوشش کرنا۔''

جولی آلہ لے کر اس طرف آئی جہاں میں زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جولی نے ماں کو کال کی۔ اس کی ماں نے کال ریسیو کی تو مجھے اس کی آواز بھی صاف سنائی دی تھی۔ جولی نے کہا۔ ''ہائے مام۔''

''جولی تم کیسی ہو؟''

''مام میں بور ہو رہی ہوں، مجھے یہاں سے بلا لیں۔''

عورت نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں بلا لوں تاکہ تم پھر ان ہی لڑکیوں کے ساتھ رہو جو منشیات استعمال کرتی ہیں۔''

''مام میں وعدہ کرتی ہوں اب میں ان سے نہیں ملوں گی، میں گھر میں رہوں گی۔ پلیز مجھے بلا لیں۔''

''او کے اپنے باپ سے بات کراؤ۔''

جولی نے خوشی خوشی آلہ لے جا کر اپنے باپ کو دیا اور وہ اس کی ماں سے بات کرنے کے لیے اٹھ کر اندر خیمے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے جولی سے کہا۔ ''میں تمہیں کل لے جاؤں گا اور طیارے پر بٹھا دوں گا۔ میا تمہیں ائرپورٹ سے لے لے گی۔''

جولی خوش ہو گئی اور اچھلتی کودتی اپنے خیمے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد این نے کہا۔ ''میں بھی چلوں؟''

''نہیں تم رکو۔۔۔ اور آرام کرو۔ بلا وجہ سفر سے فائدہ، کسی ہنگامی صورت حال میں تمہارے پاس سیٹلائٹ فون ہے تم ایمرجنسی کو کال کر کے مدد طلب کر سکتی ہو۔''

این نے سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اٹھ کر خیمے میں چلے گئے۔ کرس خیمے سے نکلا اور اس نے ایک شاپر تاروں کے باہر پھینکا۔ اس میں بچا ہوا کھانا تھا اور میں نے شکریے کے ساتھ یہ شاپر قبول کر لیا۔ اس میں کچھ گوشت، بچی ہوئی ہڈیوں کے ساتھ دوسری چیزیں بھی تھیں مگر سب ہی کھانے والی تھیں اور میں نے سوائے شاپر کے سب ہی کھا لیا تھا۔ اب مجھے کھانے کی تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں وہیں لیٹ گیا۔ نصف رات کے قریب اچانک جولی کی تیز آواز آئی۔ ''ڈیڈ...... ڈیڈ......''

کرس اور این سو چکے تھے۔ جولی کی آواز پر وہ اٹھ بیٹھے۔ کرس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''ڈیڈ یہ بند ہو گیا ہے۔'' جولی نے اپنا ٹیب دکھایا۔

''اس کا چارج ختم ہو گیا ہے۔''

''ڈیئر سو جاؤ صبح دیکھیں گے۔'' این نے نرم لہجے میں کہا مگر اس کی تہ میں چھپی جھنجلاہٹ دکھائی دے رہی تھی۔

''مجھے ابھی اور اسی وقت چاہیے۔''

''او کے تم جیپ میں جاؤ۔'' کرس نے اپنی قمیص پہنتے ہوئے کہا۔

جولی جیپ کی طرف گئی تو این نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ کیا حماقت ہے۔ اب تم آدھی رات کو اس کے پیچھے جاگو گے۔''

''تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی کیونکہ ابھی تم ماں نہیں بنی ہو۔'' کرس نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کر خیمے سے نکل آیا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور جولی کا ٹیب اس کے چارجر سے لگا کر چارج کرنے لگا۔ جولی اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی اور کچھ شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''سوری ڈیڈ۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' کرس نے اسے پیار سے دیکھا۔ ''تم میری بیٹی ہو۔ تمہارا ہر مسئلہ میرا ہے۔''

جولی نے اس کے شانے سے سر لگا دیا۔ ''آئی لو یو ڈیڈ۔''

''می ٹو جولی۔'' کرس نے اس کے سر پر پیار کیا۔ ''کوشش کرنا آج جلدی سو جاؤ۔ کل طویل سفر کرنا ہے۔''

جولی نے سر ہلایا۔ جب اس کا ٹیب چارج ہو گیا تو وہ جیپ سے نکل کر اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ کیونکہ مجھے ایک بار یہاں سے کھانا مل چکا تھا اس لیے میں نے فی الحال یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ لوگ یقیناً اپنا بچ جانے والا کھانا باہر پھینک دیتے ہوں گے اور اس سے میرا گزارہ ہو جاتا۔ صبح کے قریب میں نے مزید کھانا تلاش کیا مگر انہوں نے اگر کوئی شاپر پھینکا تھا تو اسے کوئی دوسرا جانور لے گیا تھا۔ میرے نصیب میں جو تھا مجھے وہی ملا۔ روشنی ہوتے ہی کیمپ میں سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ ناشتے کے بعد جولی اپنا سامان باندھ کر جیپ کے پچھلے حصے میں رکھنے لگی اور اس کے انداز میں خوشی نمایاں تھی۔ اس سارے عرصے میں پہلی بار میں نے اسے کچھ کرتے دیکھا تھا۔ البتہ این اور کرس اداس تھے۔ کرس اس لیے اداس تھا کہ اس کی بیٹی جا رہی تھی اور این کرس کے جانے سے اداس تھی۔ ساری تیاری کے بعد وہ لوگ جیپ کی طرف آئے۔ کرس نے این سے کہا۔

''اپنا خیال رکھنا اور کوئی بھی مشکل ہو مجھے یا ایمرجنسی کو فوراً کال کرنا۔''

''تم فکر مت کرو۔'' این بولی۔ ''میں بہت بار جنگل میں اکیلی رہی ہوں۔''

''میں تمہیں رائفل دے جاتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے تمہیں راستے میں مشکل ہو سکتی ہے، یہاں میں محفوظ ہوں۔ اگر کوئی خطرہ ہوا تو میں ٹاور پر چلی جاؤں گی۔''

کیمپ میں ہی ایک لکڑی سے بنا ہوا اونچا اور مضبوط ٹاور تھا۔ یہ یقیناً جانوروں سے محفوظ رہنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔'' کرس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ پرسوں تک آ جاؤں۔''

این نے سر ہلایا اور جولی سے بولی۔ ''بائے تم بھی اپنا خیال رکھنا۔''

جولی نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا تھا۔ کرس نے جیپ آگے بڑھا دی۔ جیپ نکلنے کے بعد این نے گیٹ بند کر دیا۔۔۔ آج گرمی زیادہ تھی۔ جیپ چلی گئی اور میں وہیں رہا تھا۔ مجھے اس عورت کے حوصلے پر رشک آیا جو اکیلی اس جنگل میں رہ گئی تھی۔ میں جھاڑیوں میں آرام کر رہا تھا کہ میرے حساس کانوں نے فائر کی آواز سنی۔ فائر بہت دور ہوا تھا اور میں بھی بس معمولی سی آواز سن سکا تھا۔ این کے سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری چھٹی حس اشارہ کرنے لگی کہ اس فائر کا کرس اور اس کی جیپ سے کوئی تعلق ہے۔ اگرچہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا بلکہ ہم لکڑ بھگے اس جگہ سے مخالف سمت بھاگتے تھے جہاں فائر ہوا ہو مگر جولی کا خیال آیا تو میں بے چین ہو گیا اور میں نے اس طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

جھاڑیوں میں دوڑتا ہوا میں سوچ رہا تھا کہ اگر کرس اور جولی کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو گا تو میں ان کی مدد کیسے کروں گا؟ خاصی دور نکلنے کے بعد ایک ویرانے میں مجھے جیپ الٹی نظر آئی۔ وہ پہلو کے بل گری تھی اور صاف لگ رہا تھا اس نے متعدد قلابازیاں بھی کھائی تھیں۔ اس کا حلیہ بگڑ گیا تھا اور ڈھانچا بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا تو سیٹ بیلٹ سے لٹکا ہوا کرس یقیناً مر چکا تھا کیونکہ اس کے ماتھے میں سوراخ تھا اور میں نے جو فائر سنا تھا وہ اسی پر کیا گیا تھا۔ جیپ میں اس کا خون بکھرا ہوا تھا۔ ونڈ اسکرین میں گولی کا سوراخ بھی تھا۔ فی الحال یہاں کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جولی کو دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ کم سے کم پچھلی سیٹ پر نہیں تھی۔ تب میں پیچھے کی طرف آیا اور یہاں میں نے اسے سامان میں دبے پایا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا مگر اس کی سانس چل رہی تھی اور وہ بے ہوش تھی۔

اچانک ہی پاس سے انسانوں کی آواز آئی اور میں بھڑکا.... میں فوراً نزدیکی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ تب میں نے ایک نشیب سے دو مسلح آدمیوں کو نمودار ہوتے دیکھا۔ ان میں سے ایک شکل سے سفاک مجرم نظر آ رہا تھا، اس کے ہاتھ میں رائفل تھی جبکہ دوسرا کسی قدر معقول تھا۔ اس کے پاس بھی پستول تھی اور وہ رائفل والے سے کہہ رہا تھا۔ ''تم نے بلا وجہ کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اب اس کی لاش ملے گی تو یہاں پولیس آئے گی۔''

''کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' مجرم صورت نے کہا۔

دوسرا اسے کچھ دیر گھورتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''اپنا کام مکمل کرو، ہمیں ابھی آگے بھی جانا ہے۔''

وہ دوبارہ اسی نشیب میں اتر گئے جو راستے کے ساتھ تھا مگر الٹی جیپ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ میں جھاڑیوں سے ہوتا ہوا ان کے نزدیک جانے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر میں ان کے اتنے نزدیک پہنچ گیا کہ دیکھ سکوں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ میری توقع کے عین مطابق وہ غیر قانونی شکاری ثابت ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی خوفناک رائفلوں سے فائرنگ کر کے ایک گینڈے کو ہلاک کر دیا تھا اور اب اس کا سینگ کاٹ رہے تھے۔ معاملہ میری سمجھ میں آنے لگا۔ جب انہوں نے گینڈے کو ہلاک کیا تو اسی وقت کرس جولی کے ہمراہ یہاں سے گزرا اور انہوں نے اپنا جرم چھپانے کے لیے اسے بھی ہلاک کر دیا۔ کرس ہلاک ہوا تو اس کی جیپ بے قابو ہو کر الٹ گئی اور جولی بھی زخمی ہوئی تھی۔ انہوں نے اب تک سامان میں دبی جولی کو دیکھا نہیں تھا یا پھر اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی، وہ جلد از جلد یہاں سے اپنا کام کر کے فرار ہونا چاہتے تھے۔

ان کے پاس سینگ کاٹنے کے لیے مشینی آری تھی۔ اس کی مدد سے انہوں نے کچھ ہی دیر میں گینڈے کے دونوں سینگ جڑ سے کاٹ لیے اور انہیں بیگ میں ڈال کر اپنی جیپ میں روانہ ہو گئے۔ جیپ کے جاتے ہی میں جولی کے پاس آیا وہ بدستور بے ہوش تھی اور اپنی مدد خود نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ گینڈے کی لاش کی صورت میں کھانے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مجھے بلا رہا تھا۔ اگر میں اپنے جھنڈ کو لے آتا تو ہم کئی وقت کا کھانا کھا سکتے تھے۔ مگر اس صورت میں یہ لڑکی بغیر مدد کے مر جاتی۔ یہ صورتِ حال میرے لیے ایک

آزمائش سے کم نہیں تھی۔ ایک طرف میری برادری اور میرے بیوی بچے تھے اور دوسری طرف یہ ایک انسان کی بچی تھی۔ میں انسانوں سے زیادہ مانوس تھا اور مجھے رہ رہ کر اس مرد کا خیال آرہا تھا جس نے ہم لکڑ بھگوں کو اچھا جانور قرار دیا تھا۔ یہ اس کا ہماری برادری پر احسان تھا اور میں اس کا احسان اسی طرح اتار سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کی مدد کروں۔ مدد ایک ہی جگہ سے آسکتی تھی۔ میں واپس کیمپ کی طرف روانہ ہوا اور جھاڑیوں میں بھاگتا ہوا کیمپ تک پہنچا تو این ٹاور پر چڑھی ہوئی دوربین سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ میں یہاں تو آ گیا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس عورت کو اس گاڑی تک کیسے لے کر جاؤں۔ ظاہر ہے میں اس کے سامنے آ نہیں سکتا تھا اور اگر سامنے جاتا تو وہ محتاط ہو جاتی اور میری بات نہیں سمجھ سکتی تھی۔ میں خاردار تاروں کی باڑ میں موجود رخنے سے اندر گھسا اور آلات اور ذخیرے والے خیمے میں آیا۔ یہاں سب کچھ تھا کھانے کا سامان بھی، پانی بھی اور وہ آلہ بھی جس سے یہ باہر رابطہ کرتے تھے۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے اپنے طاقتور جبڑوں سے پانی کے کین توڑنا شروع کیے۔ یہ چار عدد خاصے بڑے کین تھے۔ میں نے باری باری سب کو توڑ کر ان کا پانی بہا دیا۔ پھر میں نے رابطہ کرنے والے آلے کو جبڑے میں دبا کر توڑا تو مجھے عجیب سا جھٹکا لگا مگر میں اسے توڑنے میں بھی کامیاب رہا۔ اب اس کیمپ میں کہیں پانی نہیں تھا۔ احتیاطاً میں نے دوسرے خیمے اور جگہیں بھی دیکھ لیں۔ اب پانی یہاں سے کئی میل دور ایک کنویں سے ملتا جس کے اوپر ہوائی چکی لگی ہوئی تھی۔ یہ ہوا سے چلتی اور نیچے سے پانی کھینچتی تھی۔ اصل میں یہ ہم جانوروں کے لیے لگائی گئی تھی جب یہاں خشک سالی ہوتی اور بارش کے پانی سے بھرے تالاب خشک ہو جاتے تھے تو اس ہوائی چکی کو چلا دیا جاتا جو پانی کھینچ کر ایک بڑے سے گول تالاب میں جمع کرتی تھی اور ہم جانور یہاں سے پانی پینے آتے تھے۔ ہوائی چکی کی طرف جانے کا راستہ اس جگہ سے گزرتا تھا جہاں جیپ الٹی پڑی تھی اور مجھے امید تھی کہ این پانی کے لیے اس طرف جائے گی تو وہ جیپ دیکھ لے گی اور جولی کی مدد کرے گی۔ اس کی روانگی کو مزید پکا کرنے کے لیے میں نے کھانے کی چیزیں بھی تباہ کر دیں۔ ہر چیز کو الٹ پلٹ دیا اور یوں برباد کیا جیسے لکڑ بھگوں کے پورے جھنڈ نے یہاں حملہ کر دیا ہو۔

☆☆☆

این اداس تھی مگر جب کرس اور جولی جانے لگے تو اس کا دل عجیب سا ہونے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ انہیں روک لے یا پھر ان کے ساتھ ہی چلی جائے مگر وہ کچھ نہ کر سکی۔ بس انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے پاس کرنے کو کچھ خاص نہیں تھا۔ یہاں بجلی نہیں تھی اور وہ برقی لالٹینیں اور دوسرے آلات چارج کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا شمسی پینل استعمال کرتے تھے۔ دوسرا ذریعہ جیپ کا انجن تھا۔ جیپ جا چکی تھی اس لیے این نے تمام چارج ہونے والے آلات وہ شمسی پینل کے سرکٹ سے لگا دیے..... ان کے پاس دو بڑی تیز روشنی والی لالٹین، دو چھوٹی لالٹین اور دو دیر تک روشن رہنے والی طاقتور ٹارچیں تھیں۔ اسی سے وہ لیپ ٹاپ بھی چارج کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد این دوربین لے کر ٹاور پر چڑھ گئی۔ آج گرمی شدید تھی اور وہ آس پاس کا نظارہ کرنا چاہ رہی تھی مگر گرمی کی وجہ سے جانور بھی غائب تھے۔

نصف گھنٹے بعد وہ نیچے آئی تو فوراً ہی اسے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اوپر ہوا کی رفتار تیز اور پرشور تھی اس لیے اسے سنائی نہیں دیا کہ نیچے کیا ہوا تھا۔ پورا کیمپ تہس نہس ہو گیا تھا۔ وہ سامان والے خیمے میں آئی تو یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا کہ پانی کے سارے کین توڑ دیے گئے تھے اور فرش پر لکڑ بھگے کے پیروں کے نشانات نمایاں تھے۔ اس نے کھانے پینے کی ساری چیزیں برباد کر دی تھیں اور سب سے اہم چیز یعنی سیٹلائٹ فون بھی توڑ دیا تھا۔ وہ سکتے میں رہ گئی تھی۔ صرف آدھے گھنٹے میں صورت حال نارمل سے خوفناک ہو گئی تھی۔ وہ بالکل نہیں جان سکی کہ لکڑ بھگے کب کیمپ میں گھسے اور یہ تباہی پھیلا کر چلے گئے۔ وہ انہیں آتے جاتے نہیں دیکھ سکی تھی۔ پانی کے بغیر وہ یہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے فوری طور پر دوسری جگہوں پر دیکھا تو اسے اپنی دھات کی بوتل میں مشکل سے نصف لیٹر رہ جانے والا پانی ملا تھا۔

این عملی عورت تھی اور اس قسم کے حالات سے گزرتی رہی تھی اس لیے اس نے افسوس کرنے یا رونے دھونے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اس کے پاس ایک نقشہ تھا جس میں اس علاقے کی تمام اہم جگہوں اور آبادیوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ این نے اپنا بڑا بیگ لیا جو آسانی سے اس کے شانے پر آ جاتا۔ اس نے تمام ضروری چیزیں اور لیپ ٹاپ کی... ایس بی نکال کر اس میں رکھی۔ کچھ اہم آلات جیسے ایک شکاری چاقو اور دوربین بھی رکھی تھی۔ اس نے پہلے ہی مکمل لباس اور مضبوط جوگرز پہن رکھے تھے۔ پانی کے لیے اس

نے بوتل اور پولی تھین سے بنی ہوئی بڑی چھاگل ساتھ لی۔ اس میں ایک وقت میں بیس لیٹرز پانی آسکتا تھا جو تین چار دن کے لیے کافی ہوتا۔ پانی کا کنواں یہاں سے کوئی چار میل شمال مشرق میں تھا۔

افریقا میں تنزانیہ کا یہ علاقہ نیم صحرائی اور نیم سبز تھا۔ یہاں گھنے جنگل نہیں تھے مگر وسیع رقبے پر گھاس اور جھاڑیاں موجود تھیں جو یہاں کی جنگلی حیات کی پرورش کے لیے کافی تھیں۔ وہ کیمپ سے نکلی اور دروازہ بند کر کے شمال کی طرف چل پڑی.... اس نے عام گزرگاہ کے بجائے شارٹ کٹ اختیار کیا تھا یوں وہ جلدی کنویں تک پہنچ سکتی تھی۔ دھوپ شدید تھی اور ذرا سی دیر میں اس کا گلا خشک ہو گیا۔ اس نے بوتل میں بچا ہوا پانی ایک گھونٹ پیا۔ اگرچہ وہ کنویں کی طرف جا رہی تھی مگر جب تک پانی حاصل نہ کر لیتی وہ محتاط رہنا چاہتی تھی۔ اب کنویں کے اوپر لگی ہوائی چکی نظر آرہی تھی۔ مگر وہ اب بھی کئی میل دور تھی۔ اس تک پہنچتے پہنچتے این نہ چاہتے ہوئے بھی بوتل کا نصف پانی پی چکی تھی۔

جب وہ چکی کے پاس پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو کام ہی نہیں کر رہی ہے۔ اس کا پنکھا گھوم رہا تھا مگر کسی خرابی کی وجہ سے وہ کنویں سے پانی کھینچنے والے میکنزم کو حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ این کے منہ سے بے بسی سے بھرپور آہ نکل گئی۔ اس نے آس پاس تالاب کی چار دیواری سے اندر جھانکا کہ شاید اس کی تہ میں کچھ پانی ہو مگر وہاں مٹی تھی۔ پانی کی ایک بوند اور نمی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ چکی کے نیچے موجود پانی کی چھوٹی ٹنکی کا نل کھلا ہوا تھا اور اگر اس میں پانی جمع ہوا تھا تو وہ کب کا بہہ چکا تھا۔ این تالاب کی چار دیواری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی.... یہاں پانی نہیں ملا تھا اس کا مطلب تھا کہ اسے آگے جانا تھا۔ اچانک اسے کسی کی نزدیک موجودگی کا احساس ہوا اور ایک غرغراتی ہوئی ہلکی آواز آئی۔ وہ دبے قدموں اٹھی اور تالاب کی چار دیواری سے گھومتے ہوئے دوسری طرف آئی۔ تب اسے دور مشرق میں کسی چیز کی چمک دکھائی دی۔

اس طرف گزرگاہ تھی اور شاید وہاں کوئی گاڑی موجود تھی۔ اس کی ونڈ اسکرین کا شیشہ سورج کی روشنی منعکس کر رہا تھا۔ گاڑی کا مطلب تھا انسان اور انسان کا مطلب تھا مدد... وہ دبے قدموں کنویں سے دور ہٹی اور پھر جھاڑیوں میں سے ہوتی ہوئی گزرگاہ کی طرف جانے لگی۔ راستے میں اسے کئی بار چمک محسوس ہوئی۔ ایک جگہ پہنچ کر اس نے دوربین لگائی تو اسے الٹی ہوئی جیپ نظر آ گئی اور جب اس نے جیپ کو

شناخت کیا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بے تحاشا اس کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اب اسے سمجھ میں آیا کہ اس کے دل پر عجیب سا بوجھ کیوں آ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کرس کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی مگر جب وہ جیپ کے پاس پہنچی تو اس کی حالت دیکھ کر اس کی امیدیں دم توڑ گئیں۔ وہ بھاگتی ہوئی ڈرائیونگ کمپارٹ تک آئی اور... دھڑام سے گھٹنوں کے بل گری اور کرس کے جسم سے سر ٹکا کر رونے لگی۔ اس کا دل ہلکا ہوا تو اسے جولی کا خیال آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے عقبی سیٹ پر جھانکا مگر جولی وہاں نہیں تھی۔ این پیچھے آئی اور یہاں اسے سامان میں دبی ہوئی جولی مل گئی۔ وہ زندہ اور نیم بے ہوش تھی۔ اس کے سر پر چوٹ آئی تھی مگر باقی جسم سلامت تھا۔ این نے اس پر سے سامان اٹھایا اور پھر اس کے منہ میں چند قطرے پانی کے ٹپکائے۔ ردعمل میں وہ ہوش میں آنے لگی۔ این نے پانی ٹپکانے کا عمل جاری رکھا حتیٰ کہ وہ ہوش میں آ گئی۔ چند لمحے وہ اسے خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے باپ کے بارے میں پوچھا۔ ''ڈیڈ کہاں ہیں؟''

این کے بہتے آنسوؤں نے اسے ساری کہانی سنا دی اور وہ بھی رونے لگی۔ کچھ دیر بعد این نے اٹھ کر عقبی حصے میں موجود سامان دیکھا۔ اس میں کھانے پینے کا معمولی سا سامان تھا۔ وہ اس نے نکال کر ٹرالی میں رکھا۔ ٹرالی جیپ میں موجود تھی۔ پانی کا ایک چھوٹا کین تھا جس میں تین لیٹر پانی تھا۔ دوسری بوتل کھل گئی تھی اور اس کا پانی ضائع ہو گیا تھا۔ این نے کام کی اور چیزیں بھی ٹرالی میں رکھیں۔ پھر وہ آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس کی چھٹی حس نے اشارہ کیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دور اسے دھول اڑتی دکھائی دی۔ کوئی گاڑی اس طرف آ رہی تھی۔ اس نے جولی کو بتایا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''یہ وہی ہوں گے۔''

یہ سنتے ہی این تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس نے جولی سے کہا۔ ''ٹرالی یہاں کھائی میں لے جاؤ۔''

خود این نے جھاڑی سے ایک شاخ توڑی اور ریت پر بنے اپنے قدموں کے نشانات مٹانے لگی۔ جولی ٹرالی دھکیل کر نیچے کھائی میں لے گئی۔ یہ زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس کے نیچے خلا تھا جس میں وہ چھپ سکتی تھیں۔ این جھاڑو مارتی اور نشان مٹاتی کنارے تک آئی اور نیچے اتر گئی۔ اس نے جولی کی مدد سے ٹرالی کو خلا میں زیادہ سے زیادہ اندر کر دیا اور خود اس کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''آواز مت نکالنا۔''

جولی نے سر ہلایا اور اسی لمحے دوسری گاڑی آ کر وہاں رکی۔ انجن کی آواز بند ہوئی اور وہی دونوں افراد نیچے اترے جو کرس کے قتل میں ملوث تھے اور اس سے پہلے انہوں نے ایک گینڈے کا غیر قانونی شکار کیا تھا۔ ان میں مجرم صورت اس وقت برافروختہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے اترتے ہی کہا۔ ''ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''تاکہ تم نے جو کیا ہے اسے ٹھکانے لگاؤ۔'' معقول صورت والے نے سرد لہجے میں کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' مجرم صورت والا غرایا۔ ''پڑے رہنے دو کل تک اسے جانور کھا جائیں گے۔''

''میری بات سنو، یہ ایک انسان ہے۔ تم نے اسے قتل کر دیا ٹھیک ہے مگر یہ اس کا مستحق ہے کہ اسے دفن کیا جائے۔ جانوروں کی خوراک بننے کے لیے نہ چھوڑا جائے۔''

معقول صورت والے نے کہتے ہوئے اپنی جیپ سے کھدائی کے اوزار نکال کر اس کے سامنے پھینک دیے۔ مجرم صورت کچھ دیر اسے زہریلی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے جیپ سے رسی نکالی اور کرس کی الٹی جیپ میں گھس گیا۔ معقول صورت سمجھا نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد مجرم صورت جیپ سے نکل کر اپنی جیپ تک گیا اور رسی اس کے پیچھے بمپر سے باندھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ معقول صورت والا چلایا۔ ''اسے یہ کیا کر رہے ہو؟''

جواب میں اس نے قہقہہ مارا اور جیپ چلا دی۔ کرس کی لاش ایک جھٹکے سے باہر آئی اور زمین پر گھسٹتی ہوئی چلی گئی۔ این ہمت کر کے کھائی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ جب کرس کی لاش باہر آئی اور گھسٹتی ہوئی جانے لگی تو اس نے بہ مشکل اپنی سسکیاں روکیں۔ کرس اس کا صرف شوہر نہیں محبوب بھی تھا۔ ان کی شادی کو چھ مہینے ہی تو ہوئے تھے اور وہ یوں اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اب اس کی لاش کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے مجرم صورت شخص سے شدید نفرت محسوس ہوئی اور اس کا دل چاہا کہ کاش وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر سکے۔ مجرم صورت والا صرف اپنی سفاک اور گھٹیا طبیعت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ ایک چکر لگا کر لاش اس جگہ لے آیا جہاں معقول صورت والا قبر کھود رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا ساتھی اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ جیپ روک کر اس نے ڈیک پر بلند آواز سے میوزک لگا دیا اور خود بیئر پینے لگا۔ جب تک معقول صورت والے نے قبر کھود کر کرس کو اس میں دفن کیا اس کا یہی شغل جاری رہا تھا۔ معقول صورت نے زمین بالکل ہموار کر دی تھی تاکہ کسی

کو قبر کا پتا نہ چلے۔ اس کے بعد اس نے کرس کی الٹی جیپ پر ڈیزل چھڑکا۔ مجرم صورت نے کہا۔

''اگر وہ لڑکی مل جاتی تو مزہ آ جاتا۔''

''وہ بچی تھی۔''

''وہ کہیں سے بچی نہیں تھی۔'' مجرم صورت والے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اسے تلاش کرتے ہیں شاید وہ آس پاس ہی ہو۔''

معقول صورت والے نے ماچس کی تیلی جلا کر کرس کی جیپ پر پھینک دی اور اس نے آگ پکڑ لی۔ معقول صورت نے کہا۔ ''وہ بہت دیر پہلے یہاں سے جا چکی ہے۔ اس علاقے میں کوئی اکیلا انسان زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکتا، اس لیے اس کا خیال چھوڑ دو اور اس کام پر توجہ دو جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ جارج نے بتایا ہے کہ ہاتھیوں کا ایک جھنڈ عنقریب اس علاقے میں آنے والا ہے۔''

مجرم صورت کا منہ بن گیا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ معقول صورت والے نے اوزار جیپ میں ڈالے اور وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جب تک وہ وہاں رہے این اور جولی کی جان پر بنی رہی۔ جولی تو شاک میں تھی اور پھر نیچے تھی، وہ ان لوگوں کی باتیں نہیں سن سکی تھی مگر این نے سنی تھیں۔ یہ لوگ مجرم ہی نہیں بہت گھٹیا بھی تھے خاص طور سے جو صورت سے مجرم نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ جانوروں کا غیر قانونی شکار کرنے والے کسی بڑے ریکٹ کا حصہ تھے۔ کاش کہ کرس اس وقت یہاں نہ آتا۔ رات ہونے والی تھی اور بڑھتی تاریکی میں جیپ کے بھڑکتے شعلے اور نمایاں ہو رہے تھے پھر اس کا ایندھن کا ٹینک پھٹا تو شعلے بہت بلندی تک گئے تھے مگر کچھ دیر بعد وہ بجھ گئے کیونکہ انہوں نے ہر ایسی چیز کو جلا دیا تھا جو جل سکتی تھی اور اب جیپ کا مڑا تڑا دھاتی پنجر رہ گیا تھا۔ این قبر تک آئی، اس نے سرہانے کی نشانی کے لیے ایک پتھر اس پر لگایا اور کچھ دیر کھڑی رہی۔ جولی بھی اوپر آئی مگر وہ ابھی تک شاک میں تھی۔ وہ خاموش تھی۔ این نے اس سے کہا۔

''ہمیں یہاں سے آگے جانا ہوگا۔''

''کہاں؟''

این نے نقشہ نکالا اور ٹارچ کی روشنی میں واضح کرنے لگی۔ ''ہم یہاں ہیں۔'' اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ''اور ہمیں یہاں جانا ہے۔'' اس نے دوسری جگہ انگلی رکھی۔ ''یہ ایک آبادی ہے۔''

جولی نے غور سے دیکھا۔ ''یہ جگہ یہاں سے کم سے کم ساٹھ میل دور ہے۔''

''ہاں مگر ہمیں جانا ہوگا۔''

''اس خوراک اور پانی کے ساتھ ہم وہاں پہنچ جائیں گے؟''

''کوشش کر سکتے ہیں۔'' این بولی۔ ''اگر ہم اسی وقت چل دیں تو شاید دو دن میں وہاں پہنچ جائیں۔ کیا تم چل سکو گی؟''

جولی نے سر ہلایا۔ ''میں چل لوں گی۔''

اس نے اسکرٹ بلاؤز کے ساتھ لیدر کے ٹخنوں سے اوپر آتے جوتے پہن رکھے تھے اور ان میں کسی قدر ہیل تھی اس لیے یہ آسان نہیں تھے۔ مگر جولی نوجوان تھی وہ چل سکتی تھی۔ ٹرالی این نے سنبھال لی۔ اس نے اب تک جولی سے اس واقعے کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اسے کچھ وقت دینا چاہتی تھی۔ وہ جھاڑیوں سے گزر رہے تھے اور کبھی کبھی انہیں لگتا کہ ان کے آس پاس کوئی چل رہا ہے۔

☆☆☆

میں ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میری حکمت عملی کامیاب رہی۔ جب این گزرگاہ کے بجائے مختصر راستے سے ہوائی چکی تک آئی تو مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ گزرگاہ کی طرف سے آئے اور الٹی جیپ دیکھ لے۔ مگر وہ جیپ سے بہت دور تھی، میں اس کی نظروں میں آئے بغیر پانی کے تالاب کے ساتھ تھا۔ مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ ان دنوں یہاں پانی نہیں تھا۔ میری حکمت عملی سے این نے کرس اور جولی کو پالیا۔ میں نے این کی جو گفتگو سنی تھی اس کے مطابق انہیں طویل سفر پر روانہ ہونا تھا۔ میں اس سفر کی سمت سے آگاہ تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنا اور اپنی برادری کا بھی کچھ بھلا کرنا چاہیے، اس سے پہلے کہ مارے جانے والے گینڈے کی لاش دوسرے جانوروں کے ہتھے چڑھ جائے۔ میں نے ذہن میں سارا حساب کتاب لگایا اور بہت تیزی سے اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا مگر میں نے دور سے آواز لگا کر اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر لیا۔ بڑے شکار کا سن کر تقریباً پورا جھنڈ ہی دوڑا آیا تھا جس میں میری مادہ بھی شامل تھی۔ ان کو آتے دیکھ کر میں درمیان سے ہی واپس ہو لیا۔ کچھ ہی دیر بعد میری برادری گینڈے کی لاش کو کھانے میں مصروف تھی۔ کیونکہ مجھے ابھی این اور جولی کے پیچھے جانا تھا اس لیے میں نے جلدی جلدی کھایا۔ مادہ نے میری عجلت محسوس کر لی تھی۔ اس نے پوچھا۔

''تم جلدی کیوں کر رہے ہو؟''

''مجھے جانا ہے۔'' میں نے کہا اور اس سے جھوٹ

بولا۔ ''یہ گینڈا غیر قانونی شکار کرنے والوں نے مارا ہے۔ ان کا مزید شکار کا پروگرام ہے اور میں ان کے پیچھے جاؤں گا۔''

مادہ فکرمند ہوگئی۔ ''لیکن اس میں خطرہ ہے۔''

''خطرہ تو ہماری زندگی کو ہے اب۔ پرسوں میں نے تمہیں جو کھانا دیا تھا، وہ میں شیروں کے درمیان سے لے کر آیا تھا۔''

یہ بات مادہ سمجھتی تھی مگر وہ فکرمند رہی۔ ''اچھا تم ان لوگوں کے زیادہ نزدیک مت جانا یہ ہر جانور پر گولی چلا دیتے ہیں۔''

''میں احتیاط کروں گا۔'' میں نے عجلت میں ایک بڑی بوٹی نگلتے ہوئے مادہ سے وعدہ کرلیا۔ اچھی طرح پیٹ بھر کر میں روانہ ہوا تو میں نے کوشش کی کہ کوئی اور لکڑ بھگا میری طرف متوجہ نہ ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرے پیچھے آئے اور اسے ان دونوں عورتوں کے بارے میں پتا چلے۔ اگر لکڑ بھگوں کو پتا چل جاتا کہ یہاں دو بے بس عورتیں ہیں تو ممکن ہے وہ ان کے پیچھے جاتے اور میں انہیں روک نہیں سکتا تھا۔ اس لیے بہتر تھا ان کے بارے میں کسی کو علم نہ ہو۔ پیٹ بھرنے کے بعد زیادہ تیز رفتاری سے دوڑنا تو ممکن نہیں تھا مگر میں نے ایک رفتار طے کرلی۔ اس سے مجھے امید تھی کہ میں صبح تک ان دونوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ذرا آگے جانے کے بعد میں نے ان کے قدموں اور ٹرالی کے پہیوں کے نشانات دیکھ لیے تھے اور میں ان کی راہنمائی میں چلنے لگا۔ وہ بھی جان بوجھ کر جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھیں تاکہ ان خطرناک لوگوں سے سامنا نہ ہو۔ انہیں یقیناً جانوروں سے زیادہ انسانوں سے خطرہ تھا، ورنہ وہ کبھی ان جھاڑیوں میں نہ گھستیں۔

دوڑتے ہوئے میں تھک جاتا تو کچھ دیر آرام کرلیتا تھا۔ ہوتے ہوتے صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی اور اب تک میں ان دونوں تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا ویسے تو ہم لکڑ بھگے جھنڈ کی صورتوں میں سیکڑوں میل دور بھی چلے جاتے ہیں مگر اکیلے لکڑ بھگے کے لیے حدود متعین ہوتی ہیں اور اس سے باہر جانا خود کو خطرے میں ڈالنے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ میں اس حد سے بہت دور نکل آیا تھا۔ اگر میں یہاں کسی مشکل میں پڑ جاتا تو میری مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ جب دونوں عورتیں نظر نہیں آئیں تو مجھے لگا کہ میں نے شاید ان کا سراغ کھو دیا ہے۔ روشنی اب تیز ہو رہی تھی۔ یہ علاقہ زیادہ تر خشک چٹانوں اور کہیں کہیں جھاڑیوں پر مشتمل تھا۔ اچانک میں رک گیا کیونکہ کچے راستے پر گاڑی کے ٹائروں کے نشانات واضح تھے۔

یہاں سے کچھ وقت پہلے ہی کوئی گاڑی گزری تھی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید ان دونوں نے بھی گاڑی یا اس کے نشانات دیکھ لیے ہوں اور وہ راستے سے ہٹ گئی ہوں۔ اس صورت میں ذرا دور کھنڈر نما چٹانوں میں ہوسکتی تھیں۔ میں سونگھتے ہوئے چٹانوں میں گھس گیا اور اس بار میری تلاش رنگ لائی۔ وہ دونوں ایک کمرے نما جگہ پر بے سدھ لیٹی ہوئی تھیں۔ جولی سو رہی تھی مگر این جاگ رہی تھی۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس نے ساری رات جاگتے رہنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اچھی بات تھی کیونکہ ان چٹانوں میں خطرات بہت زیادہ تھے اور اصل خطرہ تو انسانوں سے تھا۔ ان کو ہوشیار کرنا ضروری تھا تاکہ وہ آگے روانہ ہوں۔ میں نے سامنے آتے ہوئے ہلکی سی غراہٹ بھری آواز نکالی۔ این چونک گئی اور جولی نے ہلکی سی چیخ ماری۔ دونوں جلدی سے کھڑی ہوگئیں۔ این نے چاقو نکال لیا تھا۔ میں نے ان کے سامنے بے تابی سے چند چکر لگائے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ان کا ردعمل میری توقع کے عین مطابق تھا۔

''یہاں سے نکلو۔'' این بولی۔

''یہ خطرناک ہے۔'' جولی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''اکیلا لکڑ بھگا عام طور سے حملہ نہیں کرتا۔'' این نے چادر سمیت کر ٹرالی میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ اس نے اچھا کیا کہ ہمیں ہوشیار کردیا۔ ابھی ہمیں بہت دور جانا ہے۔''

وہ آگے چل پڑیں۔ جولی نے پوچھا۔ ''اب ہمارے پاس پانی کتنا ہے؟''

''مشکل سے ایک لیٹر۔'' این نے جواب دیا۔ ''اگر ہمیں راستے میں کہیں پانی نہ ملا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

جب میں نے این کو کیمپ سے نکالنے کے لیے پانی کا ذخیرہ تباہ کیا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گا اور انسانوں سے زیادہ پانی کی کمی ان کے لیے خطرہ بن جائے گی مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ این ٹھیک کہہ رہی تھی، انہیں آج کے دن کہیں پانی کے ذخیرے تک پہنچنا تھا ورنہ ان کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ سورج نکلتے ہی گرمی کی شدت بڑھ گئی۔ ایسے میں پانی کی طلب زیادہ ہوجاتی تھی۔ میں ان سے کچھ پیچھے تھا تاکہ وہ میری موجودگی محسوس نہ کرسکیں۔ کچھ دیر بعد جولی نے پانی مانگنا شروع کردیا مگر این اسے کہہ رہی تھی کہ انہیں پانی بچانا ہے۔ اس پر جولی کو غصہ آگیا اور وہ این کو برا بھلا کہنے لگی۔ غصے میں آکر این نے اسے پانی کی بوتل تھمادی۔ ''لو تم نے جتنا پینا ہے پی لو چاہو تو سب پی جاؤ۔''

اس پر جولی کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ اس نے بوتل سے ایک گھونٹ لیا اور اسے این کو واپس کردیا۔ ''سوری، میں کیا کروں مجھ سے پیاس برداشت نہیں ہورہی تھی۔''

این بھی نرم پڑگئی، اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''جولی اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو پیاس برداشت کرنا ہو گی ورنہ پیاس ہمیں وقت سے پہلے ہلاک کردے گی۔''

''میں نے کبھی پیاس برداشت نہیں کی۔''

یہاں چٹانوں کے درمیان خشک جھاڑیاں تھیں۔ سبز جھاڑیاں صرف نشیب میں تھیں جہاں بارش کا پانی زیادہ عرصے تک رہتا تھا۔ دوپہر تک وہ سارا ہی پانی ختم کرچکی تھیں۔ ان کے چہرے مرجھا گئے تھے اور چال میں لڑکھڑاہٹ آگئی تھی۔ اس وقت وہ ایک وادی کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ اچانک ان کو نیچے چمک سی دکھائی دی۔ جولی نے کہا۔ ''وہاں کچھ چمک رہا ہے۔''

''شاید پانی ہے۔'' این نے امید سے کہا اور وہ دونوں نیچے کی طرف بڑھیں مگر میں نے دیکھ لیا تھا وہاں پانی تھا مگر پینے کے قابل نہیں تھا۔ اس میں کسی جانور کی گل سڑ جانے والی لاش پڑی تھی۔ جولی نے جب پانی دیکھا تو بے تاب ہو کر بھاگی۔ اس نے جانور کا ڈھانچا بھی نہیں دیکھا تھا مگر این نے دیکھ لیا۔ اس نے بروقت جولی کو روکا۔ وہ پیاس سے پاگل ہورہی تھی اور یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ پانی سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ اسے پینے سے قاصر تھی۔ این اسے وہاں سے لے جانا چاہتی تھی مگر وہ اس کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے مداخلت کرنی چاہیے اور میں نیچے اتر کر تالاب کے پاس آیا۔ میں نے غرا کر جارحانہ انداز میں دانت نکالے تو جولی کا رویہ بدل گیا اور وہ ڈر کر این کے پیچھے چھپنے لگی۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور بولی۔

''یہاں سے چلو اس سے پہلے کہ یہ حملہ کردے۔''

جولی اس کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے اوپر چلی گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے پانی پیا۔ اس سے بدبو آرہی تھی اور انسانوں کے لیے یہ پانی کسی بھی صورت ٹھیک نہیں تھا مگر ہم لکڑ بھگوں کے لیے بالکل ٹھیک تھا۔ اب میں ان کا شکر گزار تھا کہ ان کی وجہ سے مجھے پینے کو پانی ملا ورنہ مجھے کئی دن سے پانی نہیں ملا تھا۔ میں پانی پینے کے دوران ان پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا اور وہ اب اس وادی کے اوپری کناروں پر سفر کرتی ہوئی مشرق کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک تہائی فاصلہ طے کرلیا تھا اور ابھی اپنی منزل سے خاصے فاصلے پر تھیں۔ جب وہ مشرقی سمت جا کر آگے روانہ ہوئیں تو میں بھی وادی سے نکلا اور ان کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ وہ اس وقت تک خاصی آگے جاچکی تھیں اور شاید انہوں نے میرے خوف سے تیزی سے سفر کیا تھا۔ وہ دونوں ٹرالی سمیت ایک چٹان پر چڑھ رہی تھیں۔ اچانک وہ رک گئیں۔ انہوں نے آپس میں کچھ بات کی اور این ایک جھاڑی تلے بیٹھ گئی۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے کیا دیکھا تھا جو رک گئی تھیں۔

☆☆☆

یہ ایک کیمپ تھا جو ٹیلے کی بلندی سے دور نشیب میں دکھائی دے رہا تھا۔ کئی بڑی چھولداریوں پر مشتمل اس کیمپ میں خاصا سامان اور ایک بڑے سائز کی جیپ بھی تھی مگر وہاں کوئی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ این اور جولی نے دیکھا تو جولی پرجوش ہوگئی۔ اس نے این سے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے مدد مل سکتی ہے۔''

''ہم نہیں جانتے کہ یہاں کون ہے اس لیے ہمیں محتاط ہوکر آگے جانا ہوگا۔''

''وہ کیسے؟''

''پہلے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہاں کون لوگ ہیں اور جب اطمینان ہوجائے گا تو ہم یہاں جائیں گے۔''

جولی نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ایسا کرو تم آرام کرو، میں دیکھتی ہوں اگر کوئی نظر آیا تو میں تمہیں بھی بتاؤں گی۔''

این ٹرالی کھینچ کر تھک گئی تھی اس لیے وہ ایک جھاڑی تلے لیٹ گئی۔ چھاؤں میں سکون ملا تو اسے چند لمحے کے لیے اونگھ آگئی اور پھر وہ چونکی تو جولی اپنی جگہ نہیں تھی۔ این نے اٹھ کر دیکھا تو وہ اسے دور کیمپ کے پاس نظر آئی، وہ تیزی سے ... آگے جارہی تھی۔ این نے زیر لب کہا۔ ''بے وقوف لڑکی یہ تم نے کیا کیا؟''

جیسے ہی جولی کیمپ کے پاس پہنچی ایک خیمے سے ایک لمبا تڑنگا اور عمر رسیدہ شخص نکلا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود وہ بہت مضبوط جسم کا مالک تھا۔ جولی اس کی طرف گئی اور وہ اسے بازو سے پکڑ کر کیمپ میں لگی میز اور کرسیوں کی طرف لے آیا۔ اس نے جولی کو کرسی پر بٹھایا اور اسے منرل واٹر کی

بوتل دی۔ جولی جلدی جلدی پانی پینے لگی۔ پھر اس نے جولی کو سینڈوچز کھانے کو دیے تھے۔ اسی لمحے این کی توجہ فاصلے سے آتی جیپ کی طرف گئی اور یہ دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا کہ جیپ میں وہی دو افراد تھے جو کرس کے قتل کے ذمے دار تھے۔ اس کا مطلب ہے یہ کیمپ بھی ان ہی لوگوں کا تھا۔ جیپ کیمپ میں داخل ہوکر رکی تو جولی نے ان لوگوں کو دیکھا اور چیخ مار کر بھاگی مگر لمبے آدمی نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔ این سمجھ گئی کہ جولی اور وہ بھی بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ جلد جولی اس کے بارے میں بھی بتا دے گی اور یہ اس کی تلاش میں نکلیں گے۔

☆☆☆

میں جولی کو کیمپ کی طرف جاتے دیکھ چکا تھا اور اس کے پیچھے تھا۔ وہ این کو دھوکا دے کر خاموشی سے گئی تھی۔ میری کوشش تھی کہ اسے ڈرا کر واپس لے آؤں مگر وہ پہلے ہی کیمپ تک پہنچ گئی تھی اور میں جھاڑیوں میں رکنے پر مجبور ہو گیا۔ میری چھٹی حس نے بتایا کہ آگے جانا میرے لیے خطرناک ہوسکتا تھا۔ جولی آگے گئی تو ایک لمبا آدمی خیمے سے باہر آیا اور بہ ظاہر وہ جولی سے بہت نرمی سے پیش آرہا تھا مگر مجھے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آئی جو ہم جانوروں کی آنکھوں میں شکار دیکھ کر آتی ہے۔ وہ بہت بھوکی نظروں سے جولی کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اسے پانی اور کھانے کو دے رہا تھا اور اس سے سوالات کر رہا تھا۔ جولی نے اسے بتایا کہ اسے پر کیا گزری تھی۔ وہ جولی کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ یہاں بالکل محفوظ ہے مگر میں جانتا تھا وہ محفوظ نہیں ہے۔ جلد اس کی تصدیق بھی ہوگئی جب وہی دو افراد جیپ میں یہاں آئے جن سے بچ کر جولی اور این بھاگے تھے۔ جولی نے دہشت زدہ ہوکر بھاگنے کی کوشش کی مگر لمبے آدمی نے اسے پکڑ لیا اور درشت لہجے میں اپنے آدمیوں سے پوچھا۔

''جیڈ تم بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟''

جیڈ نے مجرم صورت کی طرف اشارہ کیا۔ ''میش سے پوچھو اسی نے گولی چلائی تھی۔''

میش آرام سے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تو کیا اسے جانے دیتا؟ وہ ہمارے خلاف عینی گواہ بن گیا تھا۔''

لمبا آدمی آگے آیا اور اس نے میش کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ''تم نے کسی انسان کو قتل نہیں کیا تھا جو تمہیں عینی گواہ کی فکر لگ گئی تھی۔''

''اب تو ہو گیا اور اچھا ہوا یہ لڑکی بھی یہاں آگئی ہے۔'' میش نے کہا۔ ''اسے بھی ختم کر دیتے ہیں۔''

''یہ بچی ہے۔'' جیڈ نے مداخلت کی۔

''تم دونوں غلط کہہ رہے ہو۔ اسے مارنا ضروری نہیں ہے اور جیڈ غور سے دیکھو، یہ بچی نہیں ایک خوب صورت نوجوان لڑکی ہے، یہ ہمارے کام آئے گی اسے قتل کرنا ضائع کرنے کے برابر ہے۔''

میش سوچ رہا تھا اس نے کہا۔ ''کیا یہ اکیلی ہے؟''

جولی نے اب تک این کے بارے میں نہیں بتایا تھا مگر جب میش نے پوچھا تو اس نے بے ساختہ اوپر ٹیلے کی طرف دیکھا۔ لمبا آدمی بھانپ گیا اس نے کہا۔ ''میش اوپر جا کر دیکھو اور جیڈ اسے اندر جھونپڑی میں پہنچا دو، خیال رکھنا یہ بھاگنے نہ پائے۔''

جیڈ جولی کو خیمے میں لے گیا اور میش ٹیلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ سورج مغرب کی طرف ڈھل گیا تھا اور کچھ دیر میں رات ہونے والی تھی۔ میش ٹیلے کے اوپر پہنچا اور اس نے وہاں اچھی طرح دیکھا۔ ایک جگہ اسے جھاڑی ہلتی محسوس ہوئی اور وہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ دوسری جھاڑی ہلی اور وہ اب اس کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک جھاڑی سے ایک لکڑ بھگا نکل کر بھاگا اور میش ہڑبڑا کر گر گیا۔ جب تک وہ سنبھل کر اٹھتا لکڑ بھگا غائب ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں میں وہی گھسا ہوا تھا۔ میش اسے گالیاں دیتا ہوا واپس آیا۔ اس نے لمبے آدمی سے کہا۔ ''اوپر کوئی نہیں ہے۔''

''پھر بھی ہوشیار رہنا۔''

''جارج۔'' میش نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''اس لڑکی کا کیا کرنا ہے؟''

''آرام سے، پہلے اپنا کام نمٹا لو اس کے بعد اسے بھی دیکھنا۔'' جارج معنی خیز انداز میں بولا۔ ''پائلٹ نے اطلاع دی ہے کہ ہاتھیوں کا جھنڈ کل تک یہاں پہنچ جائے گا۔''

جارج اپنے خیمے میں گیا تو میش موقع پا کر جولی والے خیمے میں آیا۔ یہ ایک طرح سے ان کا کنٹرول روم بھی تھا۔ یہاں ایک ایل سی ڈی پر چاروں طرف لگے سی سی ٹی وی کیمروں کی ویڈیو آرہی تھی۔ یہاں بڑے بڑے باکس رکھے ہوئے تھے۔ جولی ایک کرسی پر یوں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جیڈ اسے باندھ کر باہر چلا گیا تھا۔ میش کو دیکھ کر جولی کانپنے لگی تھی اس کے عزائم بہت واضح تھے۔ میش نے چاقو نکال لیا اور ایک کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا... اس نے چاقو کی نوک جولی کی ران سے لگائی تو وہ رونے لگی۔

☆☆☆

این نے عجلت میں ٹرالی ایک گھنی جھاڑی کے اندر کر دی اور خود وہ ایک دوسری جھاڑی میں چھپ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے تلاش کیا جائے گا۔ وہ یہاں سے جا سکتی تھی مگر وہ جولی کو ان درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا اور کچھ ہی دیر میں تاریکی چھا جاتی۔ وہ دعا کر رہی تھی تاریکی ہونے تک یہاں کوئی نہ آجائے مگر ابھی روشنی تھی کہ ایک شخص وہاں آگیا۔ این کو نیچے سے اس کے جوتے نظر آرہے تھے اور اس کا اندازہ تھا کہ یہ وہی مجرم صورت والا تھا جس نے کرس کی لاش کو بے دردی سے جیپ سے نکالا تھا۔ این ساکت تھی کہ اچانک ہی کوئی کیڑا اس کی گردن پر گرا اور اس نے بے ساختہ ہاتھ مار کر اسے گرایا۔ اس دوران میں جھاڑی ہلی اور آنے والا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جھاڑی کی طرف آنے لگا اور این کی جان پر بن گئی۔ وہ پکڑی جاتی اور پھر اسے بھی جولی کی طرح قید کر دیا جاتا۔ این کو معلوم تھا کہ یہ لوگ انہیں مار دیں گے اور مارنے سے پہلے ان کی عزت سے بھی کھیلیں گے۔

اس سے پہلے کہ وہ اس جھاڑی تک آتا، دوسری جھاڑی ہلی اور وہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ اس سے وہی لکڑ بھگا نکل کر بھاگا جو بہت دیر سے ان کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ آدمی بوکھلا کر گرا اور اس نے گالی دی اور پھر اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ این نے سکون کا سانس لیا۔ لکڑ بھگے نے ایک بار پھر اس کی مدد کی تھی۔ وہ جھاڑی سے نکلی، اس نے دوسری جھاڑی سے ٹرالی نکالی اور اس جگہ سے دور جانے لگی۔ اسے جولی کو ان کے چنگل سے نکالنا تھا مگر وہ اندھا دھند کیمپ میں نہیں جا سکتی تھی، اس طرح وہ خود بھی پھنس جاتی۔ چٹانوں کے درمیان ایک مناسب جگہ ٹرالی چھپا کر اس نے اپنا شکاری چاقو نکالا اور واپس آگئی۔ جب تک روشنی پوری طرح ختم نہیں ہوگئی، وہ اوپر ہی رہی۔ سورج ڈوبتے ہی نیچے ایک جنریٹر آن ہو گیا جو اب کیمپ کو بجلی دے رہا تھا۔ روشنی ایسی تھی کہ کوئی اس سے بچ کر کیمپ تک نہیں آسکتا تھا۔

این نیچے تک آئی۔ اس نے کیمپ کا جائزہ لیا۔ لمبا آدمی اور اس کا ساتھی ایک طرف بیٹھے تھے۔ این گھوم کر اس خیمے تک آئی جس میں جولی تھی۔ اس نے سامان کی پیٹیوں کے پیچھے سے دیکھا جولی کرسی پر بندھی ہوئی تھی اور مجرم صورت شخص اسے چاقو سے ڈراتے ہوئے اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ جولی روتے ہوئے خود کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک باہر سے لمبے آدمی کی آواز آئی اور مجرم صورت والا برا سا منہ بناتا ہوا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی این ایک طرف سے خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر آئی اور اشارے سے جولی کو چپ رہنے کو کہا پھر اس نے چاقو سے جولی کی بندشیں کاٹیں اور آہستہ سے کہا۔ ''یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''انہوں نے کیمرے لگائے ہوئے ہیں۔'' جولی نے ایل سی ڈی کی طرف اشارہ کیا۔

''فکر مت کرو، یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔''

وہ دونوں خیمے سے باہر آئیں اور این اسی راستے سے کیمپ سے باہر جانے لگی۔ جولی اس کے پیچھے تھی۔ عجلت میں اس کا پاؤں ایک خالی ٹین کے ڈبے سے ٹکرایا۔ آواز بہت بلند تھی اور جنریٹر کے شور کے باوجود ان لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی۔ این جولی کو لے کر خالی پیٹیوں کے پاس دبک گئی کیونکہ وہ تینوں اب پھیل کر دیکھ رہے تھے کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ میش خیمے میں گیا اور جولی کو غائب پا کر اس نے جلدی سے دور مار رائفل نکالی اور باہر آکر نگرانی کرنے والے ٹاور پر چڑھ گیا۔ جارج اور جیڈ باقی جگہوں پر دیکھ رہے تھے۔ جس وقت میش ٹاور پر چڑھ رہا تھا۔ این اور جولی اس کے نیچے سے ہوتے ہوئے ذرا آگے جھاڑیوں تک پہنچ گئیں اور اسی لمحے سرچ لائٹ آن ہوکر چاروں طرف گھومنے لگی۔ این نے جولی کو گرایا اور خود بھی گر گئی۔ روشنی ان کے سر کے اوپر سے گزری تھی۔ جیسے ہی سرچ لائٹ آگے گئی وہ اٹھ کر بھاگیں۔

مگر اس بار ان کی جھلک دیکھ لی گئی اور فائرنگ ہوگئی۔ گولیاں ان کے قریب ہی زمین پر لگیں مگر وہ بچ گئی تھیں۔ جلد وہ سرچ لائٹ اور رائفل کی زد سے نکل گئی تھیں۔ عقب میں جارج چلا چلا کر ان کا پیچھا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ این اور جولی بے تحاشا بھاگ رہی تھیں۔ این پہلے اس جگہ پہنچی جہاں اس نے ٹرالی چھپائی تھی۔ اب ٹرالی لے جانا ممکن نہیں رہا تھا اور نہ ہی ان میں اتنی طاقت تھی کہ ٹرالی کھینچ سکتیں۔ اس لیے اس نے دواؤں کے بیگ سمیت کچھ اہم چیزیں اپنے بیگ میں رکھیں اور جولی کو کھینچتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ وہ جھاڑیوں سے گزر رہی تھیں اور یہاں چھپنے کی گنجائش زیادہ تھی۔ دو گھنٹے تک مسلسل بھاگنے کے بعد ان کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ جھاڑیوں میں ہی ڈھیر ہو گئیں۔ عقب میں آتے دشمن سمیت اور بھی خطرات تھے مگر تھکن، پانی کی کمی اور نیند ایسی حاوی ہوئی کہ وہ سو گئیں۔ ان کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ایک لکڑ بھگا ان کے آس پاس منڈلا رہا

ہے۔ این کی آنکھ کھلی تو سورج کی روشنی نمودار ہوگئی تھی۔ اس نے بہ مشکل جولی کو اٹھایا۔ اس سے اٹھا نہیں جارہا تھا۔ وہ بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ اب مجھ سے نہیں چلا جائے گا۔''

''تم چل لوگی۔ تم بہادر ہو اور ایک بہادر باپ کی بیٹی ہو۔'' این نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''اگر ابھی نہیں چل سکو گی تو ہم کچھ دیر بعد روانہ ہوں گے۔''

وہ دونوں جھاڑی تلے اس کے تنے سے ٹکی بیٹھی تھیں۔ پہلی بار این نے پوچھا۔ ''تم لوگوں کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''ڈیڈ گاڑی چلا رہے تھے اور میں آئی پیڈ دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اچانک گاڑی روکی تو میں وجہ نہیں جان سکی۔ انہوں نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور خود نیچے اتر گئے۔ وہ سمجھے کہ شاید ان لوگوں کو مدد کی ضرورت ہے مگر جب وہ ان کے قریب گئے تو میش نامی شخص نے ان سے کہا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ تب ڈیڈ کو پتا چلا کہ وہ غیر قانونی شکار کر رہے تھے۔ ڈیڈ تیزی سے واپس آئے اور جیپ کو ریورس میں لے جانے لگے۔ پھر ایک فائر ہوا اور......'' جولی جملہ ادھورا چھوڑ کر رونے لگی اور اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب تمہارا قصور ہے' اگر تم ساتھ ہوتیں تو ڈیڈ کو نیچے اترنے سے روک لیتیں۔ تم سمجھدار تھیں مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ میں ڈیڈ کو کیسے روکتی۔''

این نے جولی کو کھینچ کر سینے سے لگالیا۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں کا دل ہلکا ہوا تو جولی کھڑی ہو گئی۔ ''چلو، مجھے معلوم ہے تم میرے بغیر نہیں جاؤ گی۔''

وہ دونوں چل پڑیں۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جولی نے حسرت سے کہا۔ ''وہاں اتنا سارا پانی تھا کاش کہ ہم ایک بوتل ہی لے آتے۔''

''اس وقت ہمیں جان بچانے کی فکر تھی' پانی کے چکر میں پڑتے تو مارے جاتے۔'' کہتے ہوئے این کو ہلکی سی گنگناہٹ سنائی دی۔ اس نے آس پاس دیکھا مگر اسے گنگناہٹ کا مخرج سمجھ میں نہیں آیا۔ اچانک جولی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''طیارہ......''

این نے پلٹ کر ایک چھوٹی پہاڑی کے عقب سے چھوٹا سا طیارہ نمودار ہوتے دیکھا اور جولی کا ہاتھ پکڑ کر بھاگی۔ اب انہیں طیارے سے تلاش کیا جارہا تھا مگر وہ کچھ آگے گئی ہوں گی کہ جھاڑیاں ختم ہوگئیں اور ایک بڑا سا چٹیل میدان سامنے آگیا۔ طیارہ نزدیک آگیا تھا، اس لیے وہ جھاڑیوں میں ہی دبک گئیں۔ طیارہ ان کے اوپر سے گزرا تو وہ اٹھ کر میدان میں دوڑنے لگیں۔ ان کی کوشش تھی کہ طیارے کے دوبارہ گھوم کر آنے سے پہلے میدان عبور کر لیں مگر بدقسمتی سے وہ ابھی درمیان میں تھیں کہ طیارہ آگیا اور جب وہ میدان عبور کرکے دوسری طرف جھاڑیوں میں پہنچیں تو دور سے اڑتی دھول گاڑیوں کی نشان دہی کر رہی تھی۔ این نے جولی سے کہا۔ ''وہ گاڑیوں میں بھی آرہے ہیں۔ ہمیں چھپنا ہوگا۔ طیارے سے ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔''

''اگر ہم اس طرف چلیں تو شاید ان سے بچ جائیں۔'' جولی نے ایک طرف اشارہ کیا اور این نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ اس طرف چل پڑیں۔ کچھ دیر بعد دھول اڑاتی گاڑیاں کسی اور طرف نکل گئیں۔ سورج رفتہ رفتہ سر پر آکر آگ برسانے لگا تھا۔ اس حالت میں سفر کرنا آسان نہیں تھا، وہ بس پاؤں گھسیٹ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا ٹیلا عبور کیا تو دوسری طرف نشیب میں انہیں ایک چھوٹی سی کیمپ نما آبادی دکھائی دی۔ اس میں لکڑی اور دھات سے بنے ہوئے مکانات تھے جیسا کہ عام طور سے غیر ملکی بناتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اینٹوں سے بنے مکانات بھی تھے۔ مگر وہاں ویرانی دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی گاڑی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی جاندار تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک امید کے سہارے اس طرف بڑھیں کہ شاید انہیں یہاں پانی مل جائے۔ مکانات کے ساتھ پانی کی ٹنکیاں لگی تھیں مگر وہ جس ٹنکی کا وال کھولتیں وہ خشک نکلتی تھی۔ یہ جگہ عرصے سے ویران تھی اس لیے پانی بھی خشک ہوچکا تھا۔

''یہاں کہیں پانی نہیں ہے۔ ہم پیاس سے مر جائیں گے۔'' جولی نے رونے والے انداز میں کہا۔

''پانی ہوگا۔ آؤ اندر دیکھتے ہیں۔'' این کہتے ہوئے ایک ہٹ میں داخل ہوئی۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے اور اندر ملبا اور ٹوٹی پھوٹی اشیا پڑی تھیں۔ وہ دیوانہ وار پانی تلاش کرنے لگیں۔ مگر وہاں کہیں پانی نہیں تھا۔ جولی ملبا ہٹا کر دیکھ رہی تھی' اچانک اس نے چیخ ماری۔ این اس کی طرف لپکی۔ ''کیا ہوا؟''

جولی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور اس نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں ایک درمیانے سائز کا سیاہ سانپ لہراتا ہوا ہٹ سے باہر جارہا تھا۔ ''اس نے میری پنڈلی پر ڈسا ہے۔''

این نے فکر مند ہوکر اس کی پنڈلی دیکھی اور جلدی سے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے دواؤں کی کٹ نکالی۔ اس میں سانپ کے کاٹے کا انجکشن تھا۔ انجکشن سرنج فری تھا۔ انگلی کے برابر انجکشن کا اگلا حصہ زور سے جسم پر مارا جاتا

تو دوا خود بہ خود انجکٹ ہو جاتی تھی۔ این نے جولی کا اسکرٹ اوپر کرتے ہوئے اس کی ران پر انجکشن مارا پھر اس نے ایک شیشی سے چند گولیاں نکال کر اسے دیں۔ "یہ کھالو۔"

"پانی کے بغیر؟"

"ہاں یہ لازی ہے۔ میں پانی کی تلاش میں جا رہی ہوں۔" این نے کٹ واپس بیگ میں رکھی۔ "تم یہیں رکو اور جاگتی رہنا۔ اگر نیند آئے تو کھڑی ہو جانا۔"

جولی نے سر ہلایا.... این نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے بال سنوارے اور کھڑی ہو گئی۔ وہ باہر آئی اور اس آبادی سے آگے کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

میں بدستور ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ این کو بچانے کے بعد میں خود جان بچانے کے لیے بھاگا تھا کیونکہ مشتعل مسلح مجرم صورت والا لازی مجھ پر گولی چلا دیتا۔ بہرحال میں بھی مسلسل ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا اور ان سے مکمل آگاہ رہا۔

این پانی اور مدد کی تلاش میں چلی گئی اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد میں نے مشینی انجن کی آواز سنی۔ وہ لوگ آن پہنچے تھے۔ میں عقب سے گھوم کر نکلا اور باہر دیکھا تو دو گاڑیوں میں وہ تینوں آن پہنچے تھے۔ جارج نے گاڑی سے اترتے ہوئے میش اور جیڈ کو دوسری طرف کے مکانات دیکھنے کو کہا اور خود اس مکان کی طرف آنے لگا جہاں جولی موجود تھی۔ اس نے رک کر سگریٹ سلگایا اور کش لینے لگا۔ بہ ظاہر اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میش اور جیڈ نے منٹوں میں ان سارے مکانوں کو دیکھ لیا اور جارج کو رپورٹ دی کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ اس نے حکم دیا۔ "تم لوگ آگے جاؤ، میں یہاں یہ چند مکان دیکھ کر آتا ہوں۔"

وہ اپنی جیپ میں بیٹھے اور آگے بڑھ گئے۔ جارج نے چند کش لینے کے بعد سگریٹ پھینکا اور مکان کی طرف بڑھا۔ میں گھوم کر اندر آیا تو جولی سامنے والے کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے بھی ان لوگوں کی آوازیں سن لی تھیں اور اٹھ کر پیچھے کہیں چلی گئی تھی مگر گرد آلود فرش پر ان کے قدموں کے نشانات واضح تھے۔ انہیں چھپانا لازی تھا۔ میں تیزی سے فرش پر لوٹنے لگا اور نشانات مٹانے لگا۔ اسی لمحے جارج دروازے سے اندر آیا اور میں بہت تیزی سے اس کے برابر سے نکل کر باہر چلا گیا۔ اس کے منہ سے گالی نکلی تھی اور وہ مشتعل ہو کر پیچھے آیا تھا مگر میں گلی پار کر کے ایک اور مکان میں گھس گیا تھا۔ میں نے وہاں سے جھانک کر دیکھا۔ جارج باہر آ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جس مکان میں لکڑ بھگے ہوں وہاں کوئی انسان پناہ نہیں لے سکتا۔ اس نے بے دلی سے باقی رہ جانے والے مکانات دیکھے اور گاڑی میں بیٹھ کر آگے روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں دوبارہ جولی والے مکان میں گھسا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں ٹوٹی ہوئی الماری میں نظر آ گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ سہم گئی اور میں جارحانہ انداز میں غرانے لگا۔

☆☆☆

این بستی سے آگے نکلی تو اسے کوئی نصف میل کی دوری پر بہت ہری جھاڑیاں دکھائی دیں۔ ان کی تازگی بتا رہی تھی کہ وہاں پانی ہے۔ این تیزی سے اس طرف بڑھی۔ اگرچہ اس کا بھی پیاس سے برا حال تھا مگر اسے جولی کی فکر تھی۔ وہ اس کی سوتیلی بیٹی تھی اور اس کا رویہ این سے اچھا نہیں تھا مگر اسے کرس کے حوالے سے وہ پیاری تھی اور وہ خود سے زیادہ اس کی فکر کر رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں تک پہنچی اور انہیں عبور کر کے دوسری طرف موجود چھوٹی سی جھیل کو دیکھا تو اس کا خوشی سے برا حال ہو گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی کنارے تک آئی۔ شدید پیاس کے باوجود اس نے پہلے ہاتھ میں لے کر ذرا سا پانی چکھا کہ یہ پینے کے قابل ہے یا نہیں۔ پانی بہ ظاہر صاف تھا۔ اس نے بے تابی سے گھونٹ گھونٹ پینا شروع کیا۔ پھر اس نے رک کر اپنی بوتل بھری اور دوبارہ پانی پیا۔ پھر اس نے ہاتھ روک لیا اس سے زیادہ پینا خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ مڑی اور ساکت رہ گئی کیونکہ میش سامنے رائفل لیے کھڑا تھا، اس نے چہک کر کہا۔

"لڑکی کہاں ہے۔"

"پلیز۔" این نے التجا کی۔ "ہمیں جانے دو۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے اسے جانے دو۔" جیڈ نے کہا وہ بھی جھاڑیوں سے نکل آیا تھا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو، اب ہمارے پاس دو عورتیں ہوں گی اور ہم انہیں بعد میں قتل کریں گے۔"

میش دیکھ نہیں سکا کہ جیڈ نے پستول نکال لیا اور اس نے اچانک میش کو عقب سے گولی ماری تو این بھی اچھل پڑی۔ میش کراہ کر گرا اور ساکت ہو گیا۔ جیڈ نے این کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میرے بھی بچے ہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیا میں جا سکتی ہوں؟" این نے پوچھا۔

جیڈ نے سر ہلایا اور این نے میش کی رائفل اٹھائی اور دوڑ کر جھاڑیوں میں گھس گئی۔ اسی لمحے وہاں جارج آ گیا اور شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ جیڈ نے میش کو مارا ہے۔ اس نے کہا۔ "یہ تم نے کیا ہے؟"

"ہاں۔" جیڈ کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "ہم یہاں جانوروں کا شکار کرنے آئے ہیں انسانوں کا نہیں۔"

"ہم شکاری ہیں اس سے قطع نظر کہ شکار جانور کا ہو یا انسان کا۔"

"تب یہ شکار تم ہی کرو۔" جیڈ نے کہا اور وہاں سے جانے لگا۔ جارج نے پستول نکال لیا۔

"تم ایسے نہیں جا سکتے۔"

"تم مجھے مار سکتے ہو، روک نہیں سکتے۔" جیڈ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تو جارج نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا۔ ایک فائر ہوا تو جارج کراہ کر جھکا اس کے سفید کوٹ پر سرخ دھبا نمودار ہوا تھا۔ پھر دوسرا فائر ہوا تو وہ گھوم کر گر گیا۔ جیڈ نے مڑ کر دیکھا۔ جھاڑیوں کے پاس این کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں موجود رائفل سے دھواں نکل رہا تھا۔ جیڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ "شکریہ۔"

جیڈ جا کر اپنی جیپ میں بیٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔ این کو جارج کی جیپ مل گئی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ کر تیزی سے روانہ ہوئی۔ اسے جولی کی فکر تھی اسے جس سانپ نے کاٹا تھا وہ بہت زہریلا ہوتا ہے اور اس کے زہر کے اثر سے آدمی سو جاتا ہے اور ایک بار وہ سو جائے تو پھر یہ نیند موت میں بدل جاتی ہے۔ اس نے گاڑی مکان کے سامنے روکی اور بھاگتی ہوئی اندر آئی مگر جولی اس کمرے میں نہیں تھی جہاں اس نے اسے چھوڑا تھا۔ اس نے چلا کر اسے آواز دی۔ "جولی تم کہاں ہو؟"

مگر کوئی جواب نہیں آیا وہ آگے آئی تو جولی کا ٹیب والا بیگ گرا ہوا تھا۔ ذرا آگے اس کا اپر بھی گرا ہوا تھا اور اسے بری طرح نوچا گیا تھا۔ این کا دل رک گیا۔ اس نے پھر جولی کو پکارا تو اس بار ہلکی سی آواز آئی تھی۔ وہ اس کمرے کی طرف لپکی اور اس نے اندر جاتے ہی ایک لکڑ بھگے کو سوراخ سے نکل کر بھاگتے دیکھا۔ جولی بہت خوفزدہ حالت میں دیوار سے لگی کھڑی تھی، اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ این نے بے تابی سے اسے ٹٹولا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیا، جولی کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ "اس نے صرف مجھے دھمکایا اور میرے کپڑے پھاڑے۔"

این نے سوچا کہ کیا لکڑ بھگا جولی کو جگائے رکھے ہوئے تھا۔ اس نے پہلے اسے پانی دیا۔ یہ تالاب کا پانی نہیں تھا بلکہ جارج کی گاڑی میں موجود منرل واٹر کی بوتل تھی۔ پھر وہ جولی کو سہارا دے کر گاڑی تک لائی اور نزدیک ترین آبادی کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

ان کے جاتے ہی میں بھی روانہ ہو گیا۔ ابھی مجھے طویل مسافت طے کرنا تھی، تب میں اپنے علاقے پہنچ پاتا اور درمیان میں جانے کتنے خطرات تھے جن کا مجھے سامنا کرنا تھا مگر میں مطمئن تھا میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ میں نے اس شخص کی بیٹی اور بیوی کو بچانے میں اپنا پورا کردار ادا کیا جو ہم لکڑ بھگوں کو اچھا سمجھتا تھا۔ اب مجھے اپنے بچے یاد آ رہے تھے لیکن انسانوں کے برعکس مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ اگر میں نہ رہا تو میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ کیونکہ ہم لکڑ بھگوں میں بچے سانجھے ہوتے ہیں۔

☆☆☆

دو دن بعد جولی ایک اسپتال میں تھی اور تقریباً صحت یاب ہو گئی تھی، اس کے جسم سے زہر کے اثرات زائل کر دیے گئے تھے۔ میا جنوبی افریقا سے وہاں پہنچ گئی تھی اور اس وقت جولی کے ساتھ تھی۔ این کمرے میں آئی تو میا اس کے گلے لگ گئی وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ این کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ حوصلہ مند عورت تھی۔ اس نے جولی کی خیریت دریافت کی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "میں ٹھیک ہوں۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" وہ بولی۔ "ابھی تک مقامی حکام کے ساتھ ان علاقوں میں گئی تھی جہاں غیر قانونی شکاری موجود تھے۔ ان کی لاشیں مل گئی ہیں اور ان کے کیمپ سے بے شمار مارے جانے والے جانوروں کے جسموں کے حصے ملے ہیں وہاں بہت سارا اسلحہ بھی تھا۔"

میا نے اس سے کہا۔ "یہ تمہاری ہمت اور کوشش ہے جو جولی آج زندہ ہے۔ میں اسے آج ہی واپس لے جاؤں گی۔"

"مام میں این کے ساتھ جاؤں گی۔" جولی نے اچانک کہا۔

وہ دونوں حیران رہ گئیں۔ میا نے تڑپ کر کہا۔ "ساتھ کیوں نہیں چل رہیں؟"

"مام اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں اب تک بچی بنی ہوئی تھی مگر میں بچی نہیں ہوں۔ میں این کے ساتھ جاؤں گی اور پاپا کے ادھورے رہ جانے والے پروجیکٹ میں اس کی مدد کروں گی۔ ان کی وارث ہونے کی وجہ سے یہ میری ذمے داری ہے۔"

"اگر تم اجازت دیتی ہو تو میں جولی کو ساتھ رکھوں گی۔"

میا نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ "جیسی تمہاری خوشی۔"

سودائے جنوں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

آخری حصہ

عرصۂ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس ربِّ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظرنامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالمِ اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارضِ مقدس میں صیہونی یلغار، ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کرکے ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش دیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...

جلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر



لپکا یک ڈاکٹر کمال احمد کے اندر خوش امیدی کی مسرت چمکی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً ان کی مدد کرنا چاہتا تھا ...... لیکن سوال یہ تھا کہ یعقوبہ کے اس دور دراز ریگ زار میں ان کا یہاں کون ہمدرد پیدا ہو گیا تھا؟

مدھم مدھم سی روشنی میں، کمال احمد کی دم بہ خود نظریں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں اور تب ہی اس نے دیکھا کہ اس پراسرار سائے نے راہزنی ڈشکرے پر جھپٹتے ہی بڑی پھرتی کے ساتھ کوئی عجیب سی شے اس کی کمر میں بھونک دی تھی اور دوسرے ہی لمحے اس نے بہ سرعت اپنے گرتے ہوئے شکار کے منہ پر ہاتھ بھی دھر دیا تھا کہ اس کی چیخ بلند نہ ہونے پائے۔ ہیولے نے ایک اور وار کیا۔ اس کے بعد وہ اسی جانب بڑھا ...... کمال نے بھی گویا موقع غنیمت جان کر سلاخوں کے پیچھے سے اپنا ہاتھ لہرا دیا۔ یوں بھی فاصلہ کم تھا۔ وہ پُراسرار ہیولا بڑی پھرتی کے ساتھ اسی کی جانب لپکا۔ قریب آیا تو بے اختیار ڈاکٹر کمال احمد کے منہ سے مسرت بھری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

وہ حماد اندال تھا......

''تم ...... میرے دوست ...... حماد ...... تم ......؟''

فرطِ جوش سے کمال کے منہ سے نکلا تھا۔ دونوں دوست درمیان میں آہنی سلاخوں کے حائل ہونے کے باوجود اپنے بازوؤں کو حائل کر کے بڑی دوستانہ محبت اور وارفتگی کے ساتھ، ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

''دوست ......! وقت کم ہے ...... احمد کدھر ہے؟'' ...... حماد نے کسی قدر ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ...... ادھر ہی ہے ......'' کمال نے جواب دیا اور پلٹ کر احمد حمادی کو اشارہ کیا، اسے بھی شاید سلاخ دار دروازے کی طرف سے کسی ''گھڑ بڑ'' کا احساس ہو چلا تھا' یہی سبب تھا کہ وہ بھی اسی طرف کھسکا چلا آرہا تھا اور پھر حماد کو دیکھتے ہی، ایک لمحے کو اس کے پژمردہ چہرے پہ حیرت آمیز مسرت پھوٹی۔

حماد کے ایک ہاتھ میں خون آلود ''قرولی'' تھی جو یقیناً اس نے ڈیرے کی طرف ہونے والے ''الاؤ جشن'' میں کسی ڈشکرے سے ہی چھینی تھی۔ اس نے قرولی پھینک کر اپنی جیب سے ایک موٹی لمبی اور عجیب ساخت کی چابی نکالی اور اس منحوس پتھر یلے گپھا کے سنگی طاقچے میں لگے قفل میں ابھی ڈالنے ہی لگا تھا کہ اچانک ...... وہ ٹھٹکا ...... ایک جانب سے کسی کے زور زور سے بولنے اور بہ آوازِ بلند قہقہے لگانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید اس طرف سے راہزنی ڈشکروں کا کوئی ٹولا آرہا تھا۔

کمال کے چہرے پر تشویش اور حماد کے بشرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے۔

وہ جلدی جلدی اپنا کام کرنے لگا لیکن کمال احمد نے خطرہ تاڑ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے حماد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں کہا۔

''حماد ......! پرے ہٹ جاؤ ...... وہ آرہے ہیں۔ تم ان کی نظروں میں آگئے تو صورتِ حال خراب ہو جائے گی ...... خدارا ...... ہٹ جاؤ یہاں سے ......''

حماد کی بھی شاید یہ بات سمجھ میں آگئی تھی۔ ڈاکٹر کمال کی طرح اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وقت بہت کم ہے، لہٰذا اپنی سی کوشش ترک کر کے وہ تیزی سے پلٹ کر ایک طرف تاریکی میں سنگی آڑ کے پیچھے جا چھپا۔

اثنائے راہ، ڈاکٹر کمال اور احمد حمادی بھی دروازے سے فوراً ہٹ کر گپھا کے بعید ترین گوشے کی طرف کھسک گئے ...... کمال اب اندر ایسے رخ پر کھڑا تھا کہ دروازے کے پار بھی دیکھ سکے۔

وہ تین تحیم شحیم راہزنی ڈشکرے تھے، جو بدمست چلتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ ان کے نیم برہنہ جسموں پر رائفلوں کی جھلک نمایاں تھی۔ ان کے ہاتھوں میں صراحی نما چرمی چھاگلیں بھی تھیں جنہیں وہ وقفے وقفے سے اپنے منہ سے لگاتے تھے۔ دوسرے ہاتھ میں بھنے ہوئے گوشت کے پارچے دبے ہوئے تھے، وہ وحشیوں کی طرح شرابیں پیتے بھنے ہوئے گوشت کے پارچے بھنبھوڑتے ہوئے ..... گپھا کے قریب آن رکے۔

حماد نے یہ عقل مندی کی تھی کہ ...... پہرے دار ڈشکرے کی لاش کو ایک طرف کہیں چھپا کر ڈال دیا تھا۔

وہ تینوں ...... گپھا کے سلاخ دار دروازے کے قریب پہنچ کر، پاگل اور غیر متمدن وحشیوں کی طرح جھک جھک کر، اندر جھانکنے لگے۔ ایک نے غرا کر عربی زبان میں انہیں قریب آنے کا حکم دیا۔

کمال اور احمد آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دروازے کے قریب آگئے۔ کمال نے دیکھا ان میں دو ڈشکرے اپنے دائیں بائیں بھی نظریں دوڑا رہے تھے۔ ان کے انداز سے بے چینی ہویدا تھی۔ اور کمال کو اس بے چینی کی وجہ جاننے میں چنداں دشواری نہ ہوئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے مذکورہ وہ دونوں ڈشکرے اپنے ساتھی کو پکارنے لگے۔ جو بلاشبہ وہی پہرے دار ..... جو یہاں متعین تھا اور جسے حماد تختۂ مشق بنا چکا تھا۔

کمال کا دل سینے میں تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اول تو وہ یہ سوچ کر پریشان سا ہو رہا تھا کہ یہ لوگ انہیں یہاں سے نکال کر کہاں لے جانا چاہتے تھے؟ ان سے کچھ بھی تو بعید نہ تھا۔ دوسرے، اسے حماد کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی کہ کہیں اس کا پول نہ کھل جائے۔ ان کے خلاف صورتِ حال بگڑ بھی سکتی تھی۔

اسی اثناء میں پہلے والے ڈشکرے نے باری باری اپنی خوں خوار نظروں سے کمال اور احمد کا سرتاپا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف گردن موڑ کے دیکھا اور بولا۔

''تم کیا کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے ہو؟ دروازہ کھول کر باہر نکالو ان دونوں کو......''

ان دونوں میں سے ایک نے قدرے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''یہ زنجال پتا نہیں کدھر چلا گیا ...... ہے......؟''

''اسے چھوڑو ...... وہ بھی اس میلے میں کہیں مزے لے رہا ہو گا ...... چابی تو تمہارے پاس بھی ہو گی ...... کھولو دروازہ، ان دونوں کو سردار کے پاس چھوڑ کر ہم بھی جشن کا مزہ لیں گے ......'' اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

ایک نے جلدی سے اپنی ڈانگری نما قمیص سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور پھر ...... پتھریلے طاقچے میں قدرے جھک کر قفل کھول دیا۔

ایک نے خاص قسم کی دیسی ساختہ زنجیر نما ہتھکڑی نکال کر اس طرح کمال اور احمد کے دونوں ہاتھوں میں پہنا دی کہ وہ دونوں ایک ساتھ جڑے، آگے بڑھنے پر مجبور ہو گئے۔

دونوں آگے تھے اور وہ تینوں راہزنی ڈشکرے، ان کے پیچھے چل پڑے۔ صرف ایک نے پیچھے سے ان دونوں پر اپنی گن تانے ہوئے تھی۔

مختصر سے راستے کو طے کرنے کے بعد میدان سا آگیا یہاں وہ جشن جاری تھا جو ایک بھڑکتے ہوئے الاؤ کے گرد بدمستی کا کھیل، عجیب و غریب اور وحشیانہ ہڑبونگ کی غمازی کرتا دکھائی دیتا تھا ...... گویا ایک طوفان بدتمیزی تھا جو فحاشی کو سرِ عام کیے ہوئے تھا۔ کیونکہ بدمست مردوں کے ساتھ ان کی عورتیں بھی ان کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھیں اپنے مردوں کی طرح وہ بھی نیم عریاں تھیں۔ شراب، کباب ... میں گم اور خود سراپا نمونۂ شباب، اس ہڑبونگ سے ...ن کو دوآتشہ کیے ہوئے تھیں۔

یہ ان کے قریب سے گزرنے لگے۔ احمد حمادی خاصا پریشان دکھنے لگا تھا جبکہ ڈاکٹر کمال کے اندر دھکڑ پکڑ سی مچی ہوئی تھی۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر اس جشن ابلیس میں ان کا اس طرح ''بلاوا'' کیا اہمیت رکھتا تھا؟ ...... یا پھر اس ''موقع خاص'' میں ان کی ''بلی'' تو نہیں چڑھانے کا ارادہ کیا گیا تھا...... ؟

ایسے میں اس کا تیزی سے سوچتا ذہن حماد کے بارے میں بھی الجھا ہوا تھا ...... کہ اب یہ عقدہ تو وہ ہی سلجھا سکتا تھا کہ آخر وہ ...... ابن قیصی کی قید سے کس طرح نکل کر یعقوبہ کے اس دور دراز اور ویران صحرا تک کا پرکٹھن سفر کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا؟ نیز اس کی بدنصیب بیوہ والدہ ...... حاجراں کا کیا بنا؟ وہ بھی اس کے ساتھ قیصی کی قید میں تھی۔ اگر حماد کسی طرح ابن قیصی کے چنگل سے نکل آنے میں کامیاب ہو گیا تھا تو وہ کہاں تھی؟ انہی سوچوں میں الجھا ہوا کمال میدان کے اس حصے میں پہنچا جدھر دو صحرائی ٹیلوں کے وسط میں مہارت سے کٹائی کی گئی تھی۔ وہ ایک بڑی سی کوٹھڑی میں داخل ہوا۔

اندر روشنی تھی اور یہاں کا منظر خاصا چونکا دینے والا تھا۔ جھکی جھکی چھت والی یہ کوٹھڑی بیک وقت رہائش اور نشست گاہ کے طور پر بھی مستعمل معلوم ہوتی تھی۔ چھت پر بڑے بڑے گول روزن تھے۔ دیواروں پر مشعلیں بھی روشن تھیں۔ ایک طرف چھوٹے پایوں والی مسہری دھری تھی اس پر دیبا و حریر کا بستر لگا ہوا تھا۔ وسط میں مرگ چھالا قسم کی اشیاء بچھا کر فرشی نشست کا بندوبست کر رکھا تھا۔ دو تین کرسیاں بھی تھیں۔ عجیب الف لیلوی ماحول تھا۔ خود راہزنی ٹولے کا سردار ...... رشید بڑے مغرور انداز میں ایک کرسی پر براجمان تھا۔ وہاں اس کے دو تین مسلح ڈشکرے بھی مستعد کھڑے نظر آئے جبکہ دوسری اور تیسری کرسی پر دو عورتیں بھی خاصے زرق برق لباس میں موجود تھیں ...... چونکانے ... والی بات یہی تھی کی ان دونوں مذکورہ خواتین میں ایک تو احمد حمادی کی ہونے والی دلہن یعنی منگیتر ...... حبیبہ تھی، جبکہ دوسری جینی تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر کہیں سے بھی یہ نہیں لگتا تھا کہ یہ بے کس قیدی ہوں ...... البتہ یہ الگ بات تھی کہ ان دونوں کے چہروں سے خوف، پژمردگی اور تشویش نمایاں طور پر عیاں تھی۔ وہ بھی متوحش نگاہوں سے کمال اور احمد کو دیکھنے لگیں ...... ان کے متوحش چہروں سے لگتا تھا کہ ان دونوں کو بڑی خوفناک دھمکیاں دے کر اس طرح چپ چاپ بیٹھنے پر مجبور کیا گیا تھا۔

وہاں ام کلثوم نظر نہیں آرہی تھی جس کے بارے میں انہیں تشویش ہونے لگی، تاہم اپنی منگیتر کو اس طرح یہاں دیکھ کر احمد حمادی پر ایک بار پھر ہیجانی دورہ پڑنے لگا لیکن اس بار اس دورے کی نوعیت جارحانہ نہیں تھی، اسے بےبسی اور بےکسی کی انتہائی مجبور حد ضرور کہا جا سکتا تھا۔ اس نے پہلے اس شیطان سے اپنی ماں ام کلثوم کے بارے میں پوچھا...... تو بے اختیار حبیبہ کی سسکی گپھا میں ابھری...... کمال اور احمد اس سسکی کا کرب محسوس کر کے دھک سے رہ گئے۔ بعد میں رمشید نے بتایا کہ وہ یہ سب کچھ نہ سہہ کر اس جہان سے کوچ کر چکی تھی...... اس پر کمال کو از حد دکھ ہوا اور ساتھ ہی اس بے رحم انسان رمشید پر طیش بھی آنے لگا جو بڑے آرام سے ام کلثوم کی کسمپرسی میں موت واقع ہونے کی خبر سنا رہا تھا، جیسے اس میں اس کا کوئی قصور ہی نہ تھا...... احمد حمادی کی اپنی ماں کے اس طرح انتقال کر جانے پر حالت غیر سی ہونے لگی۔ اس پر مستزاد اس کی منگیتر حبیبہ کی جان اور عزت الگ داؤ پر لگی ہوئی تھی...... وہ بے اختیار فرطِ غم واندوہ سے تڑپ اٹھا۔

''تمہیں خدا کا واسطہ...... ہمیں چھوڑ دو...... ہم نے بھلا تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟'' احمد رسن بستہ ہونے کے باوجود اس شیطان رمشید سے داد فریاد کرنے لگا...... حبیبہ کی آنکھیں جو پہلے ہی رو رو کر متورم ہو رہی تھیں، اپنے منگیتر کو یہ گریہ وزاری کرتے دیکھ کر سسکی، مگر کچھ بول نہ سکی۔

رمشید بڑی وحشت بھری نظروں سے گھورتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدم چلتا ہوا ان کے بالکل قریب آ کھڑا ہوا۔

پہلے تو وہ باری باری ان دونوں کی طرف گھورتا رہا، اس کے بعد...... وہ اتنے ہی قدم چلتا ہوا واپس ہوا اور دوبارہ اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ احمد نے پھر اس کی منت کرنی چاہی تھی کہ دفعتاً ہی رمشید نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ پھر اس کے ساتھ ہی رسن بستہ کمال نے بھی احمد کو ہولے سے اپنی کہنی کا ٹہوکا دیا کہ وہ پہلے اس کی بات سن لے۔

احمد بے چارہ خاموش ہو گیا مگر اس کی یاس زدہ نظریں حبیبہ پر جمی رہ گئی تھیں......

کمال کو شبہ ہوا تھا کہ یہ بد بخت ابلیس صفت شخص...... رمشید ان سے کچھ ایسا کہنا چاہتا تھا جو یقیناً ان کے لیے ناقابلِ قبول بھی ہو سکتا تھا۔ بہر طور...... وہ اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ ساتھ ہی اس کا دھیان بار بار حماد کی طرف بھی جا رہا تھا کہ معاً ہی کوٹھڑی کے بے حس ماحول میں رمشید کی بیل جیسی ڈکراتی ہوئی آواز ابھری۔

''میں بہت کم اپنے قیدیوں سے رعایت برتنے کا عادی ہوں۔ وہ بھی صرف اس صورت میں جب دونوں طرف کے فائدے کی بات ہو...... یا آسان لفظوں میں یوں کہہ لو کہ ایک معاہدے کی بات ہو...... خوبصورت عورتیں میری کمزوری ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ خبیث تھما...... اور اسی دوران اس نے اپنی گردن گھما کے اپنے قریب کرسیوں پر مغموم سی بیٹھی، حبیبہ اور جینی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا اس کے اس خباثت بھرے انداز نے احمد کو ہی نہیں بلکہ کمال کو بھی اندر سے ہولا کے رکھ دیا تھا کہ نہ جانے یہ ہوس کا پجاری شیطان اب ان پر کون سا نیا ستم ڈھانے والا تھا...... تاہم دونوں سر دست خاموش ہی رہنے پر مجبور تھے۔ ایسے میں رمشید دوبارہ ان کی طرف اپنا مکروہ چہرہ موڑ کے آگے بولا۔

''میں چاہتا تو تم دونوں کو ہلاک بھی کر سکتا تھا، حالانکہ میں اپنے قیدیوں کو غلام بنانے کا قائل ہوں، انہیں جان سے مارنے کا نہیں۔ بشرطیکہ وہ...... کوئی مداخلت نہ کریں، تو انہیں ہلاک کر کے...... ان کی لاشیں گدھوں سے نچوانے کے لیے صحرا میں پھنکوا دیا کرتا ہوں......'' وہ اتنا کہہ کر پھر رکا۔ اس کے لہجے کی سفاکیت کو محسوس کر کے ایک لمحے کے لیے تو کمال اور احمد کے وجود میں موت کی پھریری سی اتر گئی...... تاہم کمال کو کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ خبیث شیطان ان سے کسی قسم کا کوئی معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر کون سا؟ اور کیوں؟...... جبکہ یہ لوگ اس وقت اس کے رحم و کرم پر تھے اور مجبور اور بے بس...... تو پھر...... ایسی آخر کیا بات ہو گئی تھی کہ جس نے ایک وحشی صحرائی لٹیروں کے ''با اختیار'' سرغنہ کو بے بس قیدیوں سے کسی ''معاہدے'' پر مجبور کر ڈالا تھا......؟

وہ شیطان اب کی بار اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''بات اگر معاہدے کی ہو تو پھر ہم بھی اس کی پاسداری کرنا پسند کرتے ہیں، نیک نیتی کے ساتھ...... تمہاری ان دونوں عورتوں سے ہم زبردستی کر سکتے تھے...... اور ایسا ہم کرتے بھی آئے ہیں، لیکن پتا نہیں کیا بات ہے کہ اس بار لگتا ہے ہمیں واقعی کسی سے دلی و جذباتی وابستگی ہو گئی ہے۔ ہمارا اس سے زبردستی کرنے کو جی نہیں چاہتا...... ہم اسے اس کی مرضی سے حاصل کر کے اس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اسے اپنے دل کی ملکہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور آج کا جشن اسی سلسلے میں ہی منایا جا رہا ہے۔ ہمارے لیے سب سے بڑی خوشی کی بات

یہی ہے کہ وہ حسین اپسرا ابھی ہم سے اس معاہدے پر بالآخر رضامند ہو گئی ہے...... مگر اس شرط کے ساتھ کہ تم دونوں کو تمہاری اس فرنگن ساتھی لڑکی جینی کے ساتھ جاں بخشی کر کے رہا کر دیا جائے......''

''نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا...... تم...... تم...... کتے...... ذلیل آدمی ایک مجبور اور بے کس، معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا گھناؤنا کھیل نہیں کھیل سکتے...... میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

احمد حمادی یک دم ہی غصے اور غیرتِ جنوں کے جوش تلے پاگل سا ہو گیا اور اس قدر زوردار بھڑکتی ہوئی آواز میں چیخ کر بولا تھا کہ اس کی گردن کی رگیں تک ابھر آئی تھیں۔

کمال کی طرح وہ بھی اس ابلیس صفت رمشید کا اشارہ سمجھ چکا تھا کہ یہ بد بخت شیطان معصوم اور نوخیز دوشیزہ...... حبیبہ کے ساتھ شادی کے نام پر کیا کرنا چاہتا تھا......

اپنے محبوب منگیتر کے یک دم یوں جوشِ جنوں میں پاگل ہو جانے کی شاید بدنصیب حبیبہ کو بھی توقع تھی۔ وہ...... بے چین ہو گئی اور اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تو قریب کھڑے رمشید نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جگہ سے ہلنے سے بھی منع کر دیا۔

ڈاکٹر کمال پریشان ہو گیا۔ وہ فطرتاً متحمل مزاج کا انسان تھا۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کے مطابق سوچنے کا قائل...... اس کے بعد ہی وہ کوئی قدم اٹھاتا تھا۔ یہاں بھی وہ رمشید کی بات کو بہ غور سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا...... یہی نہیں معصوم حبیبہ سے متعلق وہ اس خبیث کا اشارہ بھی سمجھ گیا تھا، لیکن وہ پہلے صبر سے رمشید کی بات مکمل ہونے دینا چاہتا تھا کہ آخر وہ اب آگے ان لوگوں کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ اچانک احمد درمیان میں بھڑ گیا۔ اس کا یوں جوش میں آ کر رمشید کے لتے لے ڈالنا، کم خطرناک بات نہ تھی۔ کمال کے مطابق رمشید جیسا وحشی انسان، جو ابھی ان کے ساتھ انسانوں ہی کی طرح مخاطب تھا تو یہ بھی معمولی بات نہ تھی۔ ورنہ تو یہ سب اس کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ ان کے ساتھ کوئی بھی سلوک کر سکتے تھے......

جوش کمال کو بھی آتا تھا مگر وہ ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دیتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب اس نے احمد کے برا بھلا کہنے پر رمشید کی طرف دیکھا تو وہاں اس کے چہرے پر بڑے بھیانک تاثرات پیدا ہونے لگے تھے اور وہ بڑی طیش بھری نظروں سے احمد کو پہلے تو گھورتا رہا۔ اس کے بعد اس نے بغل سے جھولتے ہولسٹر سے ایک لمبی نال والا پستول نکال لیا اور اس کی نال کا رخ احمد کی طرف...... کر دیا...... اس سے پہلے کہ کمال اسے روکتا یا مخاطب کرتا اسی لمحے حبیبہ اپنی جگہ بیٹھی بیٹھی چیخ پڑی اور رمشید سے داد فریاد کے سے انداز میں بولی۔

''نن...... نہیں۔ نخ...... خدا کے لیے نہیں...... اسے مت مارو...... تم...... میں...... میں نے کہا نا...... میں...... تمہاری ہر بات مانوں گی، اگر تم نے اسے ہلاک کر دیا تو پھر یاد رکھنا...... میں بھی پھر زندہ نہیں رہوں گی......''

رمشید کا پستول والا ہاتھ یکدم نیچے گر گیا...... اور ڈاکٹر کمال کو ایک جھٹکا سا لگا۔ حبیبہ کی گریہ وزاری نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا...... پھر پل کے پل اس کے سوچتے ذہن نے ایک ارادہ باندھا، حماد کو بھی دشمن سمجھا تھا۔ لہٰذا رمشید کے پستول والا ہاتھ جھکتے ہی اس نے اسے فوراً مخاطب کرتے ہوئے بہ ظاہر مصالحانہ انداز میں کہا۔

''رمشید...... ! میں تمہاری بات کا مطلب اور حبیبہ کی تم سے درپردہ مفاہمت کا مطلب سمجھ چکا ہوں...... اور میرا خیال ہے کہ تمہارا فیصلہ درست ہے۔ کیا تم مجھے ایک موقع دو گے؟ تاکہ میں احمد حمادی کو اعتماد میں لے کر کچھ سمجھانے کی کوشش کروں؟...... تمہاری بات اور ہے، جو فطرتاً اس نوجوان کو بھڑکانے کا ہی سبب بن سکتی ہے......''

وقت، حالات اور موقع محل کی ساری داخلی و خارجی جزئیات کا ادراک کرتے ہوئے کمال نے رمشید سے جو کہا تھا، وہ تیر بہ ہدف ثابت ہوا کہ اس میں اس کا اپنا بھی مفاد وابستہ تھا۔

اب تک ڈاکٹر کمال کی سمجھ میں جو کچھ آ سکا تھا، وہ شاید اب کسی سے بھی چھپا نہیں رہ سکا تھا۔

رمشید لاکھ عیاش پرست، جابر اور سنگ دل لٹیرا سہی...... نیز اس وحشی آدمی نے اب تک نہ جانے کتنے بے گناہوں...... کو اپنی بربریت اور سفاکی کا نشانہ بنایا ہو گا اور کتنی ہی معصوم، مجبور لڑکیوں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھایا ہو گا...... مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ جہاں بڑے بڑے بادشاہ اور مطلق العنان لوگ عورتوں کی اک جنبشِ ابرو سے مار کھا گئے، اب ان میں رمشید بھی شامل ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر کمال کے مطابق ہر انسان میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی ''پیچ'' موجود...... ہوتی ہے...... اور جو ایک ذرا اشارے پر اُمڈ پڑتی ہے، یقیناً...... حبیبہ کی بھی کوئی ایسی ادا اسے بھا گئی تھی، جس نے اسے با اختیار ہونے کے باوجود، اس کے اپنے ہی قیدیوں سے...... معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور کمال اسی ''موقع'' سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اس کی بات پر رشید کے مکروہ چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھری تھی اور اس نے ایک زہر آلود نگاہ، احمد حمادی پر ڈالنے کے بعد...... ڈاکٹر کمال کی طرف دیکھ کر کھر کھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہوں ... تم خاصے سمجھدار دکھائی دیتے ہو...... جاؤ ... اسے ایک طرف لے جا کر سمجھا دو اچھی طرح کہ ہم کیا... چاہتے ہیں اور جو چاہتے ہیں اسی میں تم سب کی بھلائی ہے۔''

...... یہ کہتے ہوئے اس نے کمال کو اشارہ کیا...... کمال فوراً قریب کھڑے احمد حمادی کی طرف بڑھا ...... جواب کمال کی طرف بھی بڑی کینہ توز اور نفرت بھری نظروں سے گھورنے لگا تھا ...... شاید اسے کمال کا یہ مفاہمانہ انداز پسند نہیں آیا تھا ...... صاف لگتا تھا کہ وہ اس کی بھی کوئی بات سننے یا سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا...... یہی سبب تھا کہ کمال کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے فوراً اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا......

''بے وقوف ......! اس نازک گھڑی میں ...... نہ صرف ہم سب کی جان بلکہ عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔''

...... ڈاکٹر کمال نے اس کے قریب آکر سرگوشی میں کہا......

''لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب مت لینا کہ ہم خدانا خواستہ تمہاری عزت کو داؤ پر لگانا چاہتے ہیں...... اگر میرا بس چلتا تو...... میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں، سب سے پہلے میں خود کو آگے کرتا لیکن یہ بھی ایک تائید ایزدی ہی ہے کہ یہ موقع حبیبہ بہن کو ملا...... بات تلخ ہے مگر اس وقت ہمیں عارضی طور پر یہ کڑوی گولی نگلنا ہوگی...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ حبیبہ بہن کی عزت پر ایک ذرا بھی آنچ نہ آنے دوں گا۔ اس لیے کہ وہ میری بہنوں کی طرح ہے۔ بس...... مجھے ذرا اس موقع سے فائدہ اٹھانے دو...... رشید کی عقل کل کہاں آن اٹکی ہے، یہ میں جان چکا ہوں اور اسے آسانی سے بے وقوف بنا سکتا ہوں...... اور مت بھولو کہ حماد بھائی بھی ہماری مدد کو آن پہنچے ہیں...... خدارا مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانے دو...... نادان......! تم کیا سمجھ رہے ہو کہ ہم اپنی آزادی کی خاطر حبیبہ بہن کی عزت کو داؤ پر لگا رہے ہیں ...... استغفر اللہ...... ہرگز نہیں، یہ حقیقت تمہیں بتانے اور سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ...... یہ مردود رشید صرف اپنے ایک ذلیل معاہدے کے تحت حبیبہ بہن کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے...... ہمیں اس کی آنکھوں کے سامنے آزاد کرنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ یہ ہمیں پھر بھی زندہ نہیں چھوڑے گا...... کیا تم میری بات سمجھ گئے ہو؟ اگر سمجھ گئے ہو تو خدارا...... اب خود کو سنبھالے رکھنا، یہ خبیث ہمارے ساتھ جو گھناؤنی چال چلنا چاہ رہا ہے، وہ میں اسی پر ہی الٹنا چاہتا ہوں......''

احمد حمادی نے بہ ظاہر اکھڑی اکھڑی خاموشی سے اس کی بات سنی تھی اور اس کا ذہن اور عقل بھی ڈاکٹر کمال کی .. پُرتوجیہہ بات کو سمجھنے لگا...... وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کمال نے اسے یہی تلقین کی کہ وہ صرف اس کا وعدہ یاد رکھے اور اس پر بھروسا کرے.. ..

پھر احمد حمادی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ دوبارہ رشید کی طرف پلٹا......

رشید کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ ڈاکٹر کمال کو بے شک یقین کی حد تک، رشید کی بدطینتی پر شبہ تھا کہ رشید جیسا بے رحم اور مکار شخص ان کے ساتھ ڈیل کرایس کرنے کی کوشش کر رہا تھا، ضرور اس میں اس کی کوئی چال تھی۔

''میں نے اسے سمجھا دیا ہے...... اب تم کیا کہتے ہو؟ تمہاری بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی......'' ڈاکٹر کمال نے اس سے کہا۔ اس نے کن انکھیوں سے غمزدہ حبیبہ کی طرف بھی دیکھا تھا اور حسب توقع اس کے چہرے پر ایک غم کی تہ میں چھپی مسرت کی جھلک ابھری تھی۔

''حبیبہ ہم سے شادی پر رضامند ہے، مگر اس کی شرط یہی ہے کہ وہ اس کے بدلے میں تم سب کی رہائی چاہتی ہے۔'' رشید نے بالآخر اصل بات کہہ ڈالی، وہ بھی اس موضوع کو ختم کرنے کے لیے بے چین تھا۔ ڈاکٹر کمال کا سینہ دکھ سے بھر گیا۔ وہ بھی بہنوں والا تھا اور اس نے احمد حمادی کو ایسے ہی وعدہ نہیں دیا تھا۔ اب اسے حتمی طور پر یہ جان کر کہ...... معصوم حبیبہ نے اپنی عزت کی قربانی دے کر رشید جیسے ابن شیطان سے ان سب کی اور بالخصوص...... اپنے محبوب منگیتر کی رہائی مانگی تھی۔ پل کے پل یہ سب سوچ کر ڈاکٹر کمال کے اندر جوار بھاٹا سا اٹھنے لگا تھا...... مگر ابھی اس نے احتیاط کا دامن تھامے رکھا تھا، جانتا تھا کہ اس وقت وہ سب ایک خطرناک سازش کے شکنجے میں جکڑے جانے والے تھے۔

''تو کیا ہم اب آزاد ہیں؟'' اس نے بڑے سرسراتے ہوئے لہجے میں قریب کھڑے رشید سے پوچھا تھا...... اس کی بات پر رشید اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

لیلیٰ کے پاس فوری طور پر اس خطرے سے بچنے کے لیے دوسرا کوئی ''آپشن'' نہیں تھا، بجز اس کے کہ وہ ...... دیوار چھوڑ دے اور اس نے ایسا ہی کیا...... دائرہ اس کے سر کے قریب دیوار کی منڈیر پر مسابلا ہوتے ہی لیلیٰ نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی اور اس نے دیوار چھوڑ دی۔ نیچے تاریکی میں چھپی کھڑی بانو کو اس کا علم تب ہوا جب قریب ہلکی سی ''دھپ'' کی آواز ابھری تھی...... وہ چونکی۔ لیلیٰ نے اتنی بلندی سے خود کو گرانے کے فوراً بعد پیراٹروپنگ کا انداز اختیار کر لیا تھا جو ظاہر ہے اس کی کمانڈو تربیت کا ایک حصہ ہی تھا...... یہی سبب تھا کہ لیلیٰ کو اس سے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو اتنی بلندی سے خود کو گرانے سے وہ کسی خطرناک ممکنہ چوٹ سے بچ گئی تھی اور دوسرے اس کے زمین پر گرنے کی آواز بھی...... زیادہ نہیں ابھری تھی۔

زمین پر گرتے ہی لیلیٰ فوراً وہیں دبکی رہی...... اور تیزی سے دھڑکتے دل اور دم بہ خود سماعتوں کے ساتھ ...... اوپر کی سن گن لیتی رہی...... کہ اب تب میں گولیاں چلنے کی کربناک انگیز آوازیں ابھریں گی...... لیکن سب خیریت رہی تو لیلیٰ کے حلق سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہو گئی۔

اس نے اپنا سر اٹھا کر دیکھا منڈیر پر روشنی کا وہ منحوس گردشی دائرہ بغیر موت اگلے آگے کو سرک چکا تھا۔

''بال بال بچی ہوں......'' لیلیٰ نے بانو کے قریب آنے کے بعد ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا اور پھر اسے ساری حقیقت بتا دی۔ بانو نے بھی خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ واقعی ایک بڑے خطرے سے بچ گئے تھے۔

بہرطور...... آگے کی کامیابی اور خیریت کی دعائیں مانگتے ہوئے دونوں نے پیش قدمی کی...... یہاں بھی ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ کہیں کہیں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہاں دو رویہ بڑی بڑی اقامت گاہیں اور مکان بنے نظر آرہے تھے...... جن کے گیٹ کے موٹے چوڑے ستونوں پر گلوب روشن تھے...... ایک گن مین ہر گیٹ پر تعینات دکھائی دے رہا تھا۔

گردوپیش کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد، یہ محسوس کر کے لیلیٰ کو خوش امیدی ہوئی تھی کہ یہاں سیکیورٹی کا کچھ خاص یا زیادہ بندوبست نظر نہیں آتا تھا...... شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسرائیلیوں کو اپنی بیرونی سیکیورٹی پر کچھ زیادہ ہی زعم تھا، شاید اس لیے انہوں نے صرف اسی پر زیادہ توجہ دی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی لیلیٰ کو اپنا خیال بدلنا پڑا...... جب دفعتاً ہی اس نے کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس چمکتی دیکھیں۔ پہلے تو وہ یہی سمجھی تھی کہ یہ معمولاً کسی پروجیکٹ افسر کی گاڑی... ہوگی ...... لیکن ایسا نہیں تھا...... جب وہ ہلکی رفتار کے ساتھ ان کے قریب سے گزرنے لگی ...... وہ ایک بغیر ہڈ کا بڑا سا کھلے تنگے والا فوجی ٹرک تھا ... اور اس کے اندر دس بارہ مسلح وردی پوش اسرائیلیوں کا چاق وچوبند دستہ موجود تھا۔

ان سب کے ہاتھوں میں طاقتور ٹارچیں بھی تھیں اور لیزر گائیڈ گنیں بھی۔ یقیناً یہی، جب وہ گاڑی ان کے قریب سے ایک چکر کاٹ کر گزر گئی اور ...... لیلیٰ اپنی ساتھی بانو کے ساتھ اپنے تاریک گوشے سے ابھی باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی ...... کہ اچانک ایک طرف سے دو تین گشتی گارڈز برآمد ہوئے...... انہیں دیکھ کر دونوں ہی دوبارہ اپنی جگہ دبک گئیں......

انہیں اس حقیقت کا پوری طرح اندازہ تھا کہ وہ دونوں اس وقت بھیڑیوں کے بھٹ میں گھس بیٹھی تھیں اور دشمنوں کی نظر میں آنے کا مطلب ہی یقینی موت تھا...... یہی سبب تھا کہ لیلیٰ کسی بھی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتی تھی۔ پھر بانو بھی اس کے ہمراہ تھی...... جس کا محبوب شوہر محسن بھی انہی دنوں ایک اہم مشن میں مصروف تھا......

تینوں گشتی گارڈز کے غائب ہوتے ہی لیلیٰ نے ایک بڑے سے مکان کی عقبی دیوار کی آڑ میں خود کو کیا تاکہ ڈیجیٹل میپ کا جائزہ لے سکے...... اس نے وہاں مارک کر رکھا تھا جو امریکی تعمیراتی کمپنی ''بلڈ اپ گروپ'' کے ڈائریکٹر مائیکل مچل کی رہائش گاہ کی نشاندہی کرتا تھا۔

میپ کلوز کرنے کے بعد لیلیٰ، بانو کے ساتھ ایک طرف کو ہولی...... لیلیٰ نے اپنے منصوبے سے بانو کو آگاہ کر رکھا تھا۔

بانو کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا۔ جبکہ لیلیٰ نے اپنی دونوں آستینوں کے اندر ''فائیو کونیکل اسٹار'' چھپا رکھے تھے...... دونوں کے پاس ایک طرح سے یہ خاموش ہتھیار تھے، جو کمانڈو مشن کے لیے ازبس ضروری سمجھے جاتے تھے۔

یہ دونوں مکانوں کے عقب میں بنے ایک تنگ سے راستے کو اپنی خفیہ گزرگاہ بنائے ہوئے، نہایت محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں...... جبکہ ان دو رویہ اقامت گاہوں کے درمیان سڑک نما جو راستہ تھا، وہاں گاہے بگاہے انہیں کسی گشتی اسرائیلی دستے کی نقل وحرکت نظر آجاتی تھی، تاہم وہ ان کی نظروں سے خود کو قدرے محفوظ سمجھے ہوئے تھیں......

مائیکل مچل کا بنگلا اب صرف دو مکانوں کے فاصلے پر رہ گیا تھا کہ ایک مکان کی عقبی دیوار سے دبے پاؤں گزرتے ہوئے ...... اچانک کسی کتے کے زور سے بھونکنے کی کربیہ

آواز ابھری۔ دونوں ٹھٹک کر رک گئیں اور سن ہو کر رہ گئیں۔ رات کے دم بہ خود سناٹے میں اس کتے کے بھونکنے کی آواز کسی دھماکے سے..... کم نہیں تھی ..... وہ شاید کوئی تربیت یافتہ اور ''بوگیز'' شکاری کتا تھا اور سوئے اتفاق مکان کے پچھواڑے کسی گوشے میں کہیں ٹہل رہا تھا، اس نے شاید ان کی بو پالی تھی۔

لیلیٰ فوراً ہی خود بھی رک گئی تھی اور بانو کو بھی آگے قدم بڑھانے سے روک دیا تھا۔ کیونکہ جانوروں کی حسِ شامہ ہی تیز نہیں ہوتی بلکہ یہ جب ٹھٹک جاتے ہیں تو ..... فوراً ہی اپنے کان بھی کھڑے کر لیتے ہیں.....

لیلیٰ نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ تمام تر احتیاط کے باوصف ..... کھیل بگڑنے لگا تھا۔ اور اس وقت ان دونوں کی جانیں بھی ہتھیلی پر تھیں ..... دشمن کو اس بات کی ذرا بھی بھنک پڑ جاتی کہ ان کی کچھار میں دو اہم دشمن گھس آئے ہیں تو بیک وقت ہی سب کے سب حرکت میں آ جاتے .....

لیلیٰ کا دل جیسے ایکا ایکی سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ بانو کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ لیلیٰ اسی طرح دبکی رہی۔ کتا دو تین بار بھونکا تھا ..... اب خاموشی چھا گئی تھی۔ لیلیٰ کو خوش گمانی ہوئی کہ ..... شاید کتے کے بھونکنے پر کسی نے یا تو توجہ ہی نہیں دی... ہو گی یا پھر سنی ہی نہیں ہو گی۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی نکلی ..... کیونکہ اسی وقت جب لیلیٰ نے آگے بڑھنے کا ارادہ باندھا تھا کہ اچانک اسے ایک تیز روشنی سی اسی جانب پڑتی دکھائی دی، جدھر وہ دونوں دبکی کھڑی تھیں ..... لیلیٰ کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا ..... اس طرف خودرو جھاڑیاں تو اگی ہوئی تھیں لیکن وہ اتنی نہیں تھیں کہ ان کے بیچ یا ان کی آڑ لے کر فوری طور پر چھپا جا سکتا ..... ابھی وہ کوئی راہ مفر کے بارے میں سوچ ہی رہی تھیں کہ اچانک لیلیٰ کی ٹھٹکی ہوئی... نگاہوں نے اسی جانب دیکھا ..... جدھر سے تیز روشنی کی لکیر ابھری تھی۔ کوئی بیرونی دیوار کی طرف سے ہاتھ میں ٹارچ لیے اسی طرف آ رہا تھا ..... لیلیٰ نے بے اختیار طمانیت کی سانس لی۔ اس کے خیال میں یہ اکیلا وکیلا چوکیدار تھا ..... جو اندر سے کتے کی آواز پر متوجہ ہوا تھا اور اسی طرف آ رہا تھا ..... لیلیٰ کے لیے اس پر قابو پانا کیا مشکل تھا مگر قسمت ہر وقت ہی ساتھ نہیں دیتی ..... لیلیٰ کے ساتھ بھی یہی ہوا ..... چوکیدار اپنے ہاتھ میں ٹارچ لیے جیسے ہی اس کے ذرا قریب آیا، لیلیٰ اس پر بجلی بن کر کڑکی ..... چوکیدار عام سا ہی آدمی نکلا جو ایک تربیت یافتہ لیڈی کمانڈو کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ لیلیٰ شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی تھی ..... اور بانو اس کی ممکنہ مدد کے لیے آگے بڑھی ..... چوکیدار کو اس نے دبوچ لیا ..... مگر اسی وقت چوکیدار نے گرنے کے دوران ہی بڑی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ موقع پاتے ہی حرکت کی۔ اگرچہ لیلیٰ جیسی تربیت یافتہ لیڈی کمانڈو کے آگے وہ نہ ٹھہر سکا تھا لیکن اس ''مشکل'' وقت میں اسے جو ہدایت دی گئی ہو گی ..... اس پر عمل پیرا ہونے کا اسے ایک قلیل موقع مل ہی گیا ..... اس نے لیلیٰ کے شکنجے میں پھنس کر گرتے ہی نہ جانے کیسے ایک عجیب ساخت کی روشنی کا گولہ پھینکنے والی گن نکال کر چلا دی ..... وہ اس کی موٹی نال کا رخ آسمان کی طرف تو نہیں کر سکا، جیسا کہ کیا جاتا ہے لیکن نال سے ''شائیں'' کی ہلکی آواز کے ساتھ جلتا شیل نکلا، وہ سیدھا اوپر آسمان کی طرف تو اتنا نہیں اٹھا تھا لیکن اتنا ضرور بلند ہوا کہ قریب کسی مکان میں گرتے گرتے بھی وہ دھماکے سے پھٹا تھا اور اس کی روشنی بھی کسی حد تک پھیلی تھی ..... لیلیٰ کے چہرے پر بیک وقت تشویش اور طیش کے گہرے تاثرات ابھرے تھے اور اسی جوش غیظ میں آ کر اس نے چوکیدار کی کنپٹی پر آہنی کلپ چڑھا گھونسا رسید کر دیا، جو وہ پہلے ہی اپنی آستین سے نکال چکی تھی۔ اسرائیلی چوکیدار بغیر آواز پیدا کیے وہیں ڈھیر ہو گیا، مگر اس نے جو گل کھلانا تھا، وہ کھلا چکا تھا۔

''ہمیں دیر کیے بغیر ٹارگٹ کی طرف بڑھنا ہو گا، لیٹس گو .....'' لیلیٰ نے بانو سے کہا اور پھر تیزی سے آگے بڑھی۔

آگے بڑھنے کے دوران لیلیٰ کے کان کسی ممکنہ شور شرابے کی بھی سن گن لیتے رہے، تاہم ابھی تک ایسی کوئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی، یہ دونوں اپنے مطلوبہ بنگلے کے پچھواڑے پہنچیں۔ جب یہ اس کی دائیں جانب کی دیوار سے چپکی بیرونی گیٹ کی طرف بڑھنے لگیں، تو دفعتاً انہیں ..... کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی لیلیٰ کی ٹھٹکی ہوئی نگاہوں نے سامنے نظر آتے کنکریٹ کے مختصر راستے پر تیز روشنی پڑتے بھی دیکھ لی۔ یقیناً کوئی گاڑی تیزی سے اسی طرف آ رہی تھی ..... لیلیٰ کو سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ یہ وہی گشتی ٹرک تھا جو تھوڑی دیر پہلے ہی انہیں نظر آیا تھا۔ شاید ان میں سے کسی کی نگاہ پھوٹتی روشنی پر پڑ گئی تھی جو انہیں چونکانے کا سبب بنی ہو گی۔ ایسی صورت میں ان کا مشن کھٹائی میں پڑتا نظر آنے لگا تو ..... بانو نے لیلیٰ کو سرگوشی میں مشورہ دیا کہ مائیکل چکل کو اب ہلاک کر دینا ہی کافی... ہو گا....

''نہیں ...... ابھی اس کی ہلاکت سے ہمیں اتنا زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ جبکہ اسے یرغمال بنا کر ہم بہت سے اہم مقاصد حاصل کر سکتے ہیں ......'' لیلیٰ نے پُرخیال لہجے میں کہا تو بانو نے ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

لیلیٰ حالات کا جائزہ لینے کے لیے چند قدم آگے بڑھی، بانو اس کے پیچھے تھی۔ لیلیٰ جیسی بہادر اور نڈر مجاہدہ کے ساتھ اسے کوئی ڈر نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ مشن کی تکمیل کا جوش اس کے اندر بھی ابل رہا تھا ...... لیلیٰ دیوار کی آڑ لیتی ... ہوئی بیرونی سمت چلی اور رک گئی۔ اسے وہی ٹرک دکھائی دیا۔ دوسرے ہی لمحے لیلیٰ کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ وہ ٹرک اسی سمت کو مڑ رہا تھا جدھر چوکیدار سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی ...... یعنی ان کی خفیہ آمد کا بھانڈا پھوٹنے والا تھا۔ لیلیٰ نے تیزی سے کچھ سوچا اور پھر جیسے ہی ٹرک اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوا، اس نے مطلوبہ بنگلے کے مین گیٹ کی طرف پیش قدمی کی، جدھر ایک مستعد گن مین اپنے گارڈ کیبن سے باہر نکلا ہوا تھا۔ شاید اسے بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ گشتی ٹرک کو اس نے بھی مڑتے ... ہوئے دیکھا تھا، مگر لیلیٰ کے لیے یہ موقع اچھا تھا۔ بانو نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''لیلیٰ بہن ......! کہو تو اسے اپنے خاموش پستول سے موت کی نیند سلا دوں ......؟''

''نہیں ......'' لیلیٰ نے صرف اتنا کہا اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو مخصوص حرکت دی اور ...... اب اس کے ہاتھ میں نائیو کونیکل اسٹار چمک رہا تھا، وہ اس نے ایک خاص تکنیک سے اس مسلح گارڈ کی طرف اچھال دیا۔ پانچ نکیلے کونوں والا یہ مختصر مگر مہلک ہتھیار اس کے ہاتھ سے گولی کی طرح نکلا اور کسی پنکھے کی طرح فضا میں گھومتا ہوا گارڈ کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ وہ کھڑے کھڑے لہرایا اور پھر پٹ سے گر پڑا ...... اس کے ڈھتے ہی لیلیٰ اور بانو نے اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ حرکت کی اور جھکے جھکے گیٹ کے بغلی دروازے سے جو کھلا ہوا تھا، اندر داخل ہو گئیں ......

ان کے دائیں بائیں مختصر سا باغیچہ تھا۔ وہاں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ سامنے مرکزی دروازہ تھا، دونوں بلاخیز پھرتی کے ساتھ اسی جانب کو لپکیں ...... ابھی وہ دروازے کے قریب ہی پہنچی تھیں کہ اچانک ایک خوفناک غراہٹ کی آواز ابھری۔ بلڈاگ کے سر اور بڑے بڑے شکاری دانتوں والا ایک کتا ان کے بائیں جانب کے باغیچے سے اچانک ہی نمودار ہو کر لیلیٰ پر جھپٹا تھا، اس نے اپنے خونخوار جبڑوں میں لیلیٰ کا ایک بازو چباڈالنے کی سعی چاہی تھی کہ ایسے میں بانو نے، جو پہلے ہی اس کی غراہٹ پر ٹھٹک گئی تھی، اپنے سائلنسر لگے پستول سے اس پر گولی چلا دی۔ گولی کھا کر وہ لیلیٰ سے ٹکرایا، اس کے بعد دھپ سے زمین پر گر پڑا۔

لیلیٰ نے وقت ضائع کیے بغیر دروازے کو لات رسید کر دی، وہ ایک زبردست دھڑاکے سے کھلا۔ اندر داخل ... ہوتے ہی، ان دونوں نے اپنی مہیبا آتشیں گنیں اب ہاتھوں میں پکڑ لی تھیں ......

لیلیٰ کی معلومات کے مطابق یہاں اکثریت ایسے افسران اور ملازمین کی تھی جو ابھی اپنی فیملی نہیں لائے تھے مائیکل بگل بھی تنہا رہتا تھا۔ نیز یہ رہائش گاہیں زیادہ وسیع رقبے پر محیط نہیں تھیں۔ بہ مشکل دو یا تین ہی کمرے تھے۔ باری باری سارے کمروں کی تلاشی کے بعد ایک بیڈروم میں انہیں اپنا ''شکار'' مل گیا، مگر اس طرح کہ اس کے اپنے پہلو میں بھی ایک ''خوب صورت'' شکار دبا ہوا تھا، وہ کوئی کم عمر حسین یہودن دوشیزہ تھی۔ دونوں ہی برہنہ حالت میں بے ڈھب انداز میں سوئے ہوئے تھے اور ان کے کشادہ آرام دہ بیڈ سے نیچے بچھے دبیز قالین پر شراب اور خالی بلوریں پیگ گرے پڑے نظر آتے تھے، جو ان کی شب بیتی کی داستان سنا رہے تھے ...... ایسے میں لیلیٰ کو ایک عجیب خیال سوجھا اور اس کے لبوں پہ زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی چست شرٹ کی ایک پاکٹ کیپ کو اونچا کیا، جہاں سے اب ایک اسپائی قلم کا اوپری حصہ جھانک رہا تھا۔ جس کے سرے پر ایک بہت چھوٹا لینس لگا ہوا تھا۔ لیلیٰ نے اپنی ایک انگلی کی پور سے اسپائی پن کے کیپ کو ہولے سے دبایا، اب وہ خفیہ کیمرا دھیرے دھیرے ...... سامنے کے منظر کی ساری ویڈیو فلم بنا رہا تھا۔

لیلیٰ نے بانو کو اشارہ کیا اور پھر اپنی گنوں کی آہنی نالوں کے ٹہوکے مار کر ان دونوں بدمستوں کو جاگنے پر مجبور کر دیا ...... یہودن دوشیزہ کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات نمودار ہو گئے۔ اس نے بے اختیار اپنا منہ کھول کے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کے چیخنے کی سعی چاہی مگر بانو نے اس کا دہن وا ہوتے ہی اپنی گن کی نال اس میں گھسیڑ دی جو شاید اندر حلق تک کو چھو گئی تھی، کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ اذیت ناک اور گھٹی گھٹی کراہیں لینے پر مجبور ہو گئی ...... لیلیٰ اپنی گن مائیکل بگل کی گردن میں چبھوتے ہوئے شیرنی جیسی غراہٹ سے تہدیداً بولی۔

''خبردار ......! اسی طرح خاموشی سے پڑے

رہو ...... ورنہ موت تم سے زیادہ دور نہیں۔''

اس کی دھمکی کارگر رہی۔ چربیلے جسم اور بھاری چہرے والے مائیکل بگل کی چھوٹی گول آنکھوں میں خوف اور تشویش کی پرچھائیں مترشح ہونے لگی تھیں۔ جبکہ بانو نے اس کے ساتھ لیٹی ہوئی یہودن دوشیزہ کو بھی اسی طرح دھمکی دے کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

دونوں کے پاس وقت کم تھا اور صورتِ حال بھی نازک ہو گئی تھی۔ لہٰذا لیلیٰ اور بانو تیزی سے حرکت میں آئیں۔ بانو نے یہودن دوشیزہ کو تو وہیں ہاتھ پیر باندھ کر اور منہ پر اسکاچ ٹیپ چپکا کر کونے میں ڈال دیا جبکہ بگل کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا۔ البتہ اسے نہ کونے میں ڈالا گیا اور نہ ہی اس کے پاؤں باندھے گئے ...... تاہم اس کے دونوں ہاتھوں کو ضرور رسن بستہ کر دیا گیا تھا اور منہ پر اسکاچ ٹیپ لگا دی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ وہ خود اپنے پیروں پر چل سکے۔ ورنہ اتنے موٹے اور چربیلے جثے والے بگل کو اٹھانا آسان کام نہ تھا۔

اس دوران مائیکل بگل نے ان سے خوف کے عالم میں متعدد سوالات کر ڈالے تھے، جن کا لب لباب یہی تھا کہ وہ کون ہیں؟ اور اسے کیوں اغوا کیا جا رہا ہے وغیرہ۔ اس پر لیلیٰ نے صرف اسی قدر اس سے کہا تھا کہ ان کا مقصد اسے صرف یرغمال بنانا ہے، بشرطیکہ وہ کوئی گڑبڑ نہ کرے ... بصورت دیگر اسے بلا تامل گولی مار دی جائے گی ......

ٹھیک اسی وقت جب یہ دونوں اپنے شکار کو دبوچے پلٹ رہی تھیں ...... کہ اچانک تیز سائرن کی سمع خراش آواز سنائی دی۔ لیلیٰ اور بانو ٹھٹک گئیں۔ بگل کے خوف زدہ چہرے پر البتہ کچھ خوش امیدی کے تاثرات ابھر رہے تھے۔

''تم ادھر رکو ...... مگر محتاط رہنا ...... میں ذرا باہر کے حالات کا جائزہ لے کر آتی ہوں۔'' لیلیٰ نے بانو سے کہا اور تیزی کے ساتھ بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی اور گیٹ کا بغلی دروازہ کھول کے ذرا باہر کو جھانکا ...... اسے کچھ افراتفری کا عالم تو نظر آیا مگر وہ ایسا نہیں تھا کہ یہ بگل کے بنگلے سے باہر نہ نکل سکیں۔ اسرائیلی گشتی دستے ...... ابھی تک اسی مقام پر ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے، جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ دونوں موجود تھیں۔ جبکہ لیلیٰ کے اندازے کے مطابق انہیں جلد سے جلد بگل کا بنگلا چھوڑ دینا چاہیے تھا ...... لہٰذا وہ بہ سرعت واپس پلٹی۔

اگلے چند سیکنڈوں میں لیلیٰ اور بانو اپنے شکار کو دبوچے ...... بنگلے کے ایک عقبی چور دروازے سے نکل رہی تھیں۔ یہاں ان دونوں کو ایک، دو گھروں کے عقبی گوشے پار کرنے کے بعد رکنا پڑا ...... اس کی وجہ یہ تھی کہ آگے تقریباً چالیس، پچاس گز کے فاصلے پر اس چہار دیواری کے کارنر کے اوپر مچان تھی، جدھر مسلح گارڈز سرچ لائٹس کے ذریعے چاروں طرف کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ جبکہ عقب میں وہ گشتی دستہ موجود تھا، جنہیں اب تک کسی گڑبڑ کا شبہ بلکہ یقین ہو گیا تھا۔

لیلیٰ، چند ثانیے کے لیے پرسوچ انداز میں اپنے... ہونٹ بھینچے کھڑی رہی، ان کے پاس زیادہ وقت نہ تھا خطرے کا الارم مسلسل چیخ رہا تھا اور ... کسی بھی وقت ...... آفیسر کالونی کا چپا چپا چھان مارنے کے لیے ...... مسلح گارڈز پھیل سکتے تھے۔ کالونی کے چاروں کارنرز پر لگی سرچ لائٹس اب بیرونی سمت کے بجائے اندر پڑنے لگی تھیں۔ اس چوکیدار کی وجہ سے صورت حال کافی مخدوش ہو گئی تھی۔ اب سوچنے کا نہیں صرف عمل کرنے کا وقت تھا، لیلیٰ نے چند قدم مزید آگے سرک کر، دو بنگلوں کے درمیان بنے گلیارے میں قدم رکھ دیا۔ بانو اس کے عقب میں، شکار دبوچے چلی آ رہی تھی۔ مائیکل بگل رسن بستہ تھا، اس کے منہ پر اسکاچ ٹیپ تھی جبکہ اس کے پاؤں آزاد تھے، اس طرف سے خطرہ تھا کہ وہ کسی بھی وقت اپنا بازو، بانو کی گرفت سے چھڑا کر دوڑ لگا سکتا تھا ...... اسی وجہ کے تحت لیلیٰ بانو کو اس سلسلے میں خاص طور پر محتاط رہنے کی تلقین کر چکی تھی اور خود بھی اس کی طرف سے محتاط تھی۔

گلیارے کے سرے پر پہنچ کر لیلیٰ نے ذرا باہر جھانکا ...... اسرائیلی مسلح گارڈز ...... اب ان کی تلاش میں، چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر ادھر ادھر بکھرنے لگے تھے ...... گویا صورت حال بتدریج حوصلہ شکن ہوتی جا رہی تھی۔ مفر کی راہ مسدود ہوتے پا کر لیلیٰ کو کچھ اور سوچنا پڑا ...... اسے سامنے بھی مکانوں اور بنگلوں کی ایسی ہی قطاریں نظر آ رہی تھیں ...... یہ درمیانی راستے سے دوسری طرف کا حصہ تھا، جدھر نسبتاً کم کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

ابھی لیلیٰ اس راستے کو محفوظ طریقے سے پاٹنے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک ان کے عقب سے ایک پاٹ دار آواز بلند ہوئی۔

''ہالٹ ......'' لیلیٰ اور بانو نے بری طرح ٹھٹک کر پیچھے گردنیں موڑ کر دیکھا۔ تین وردی پوش گارڈز ...... ان پر عقب سے اپنی گنیں تانے کھڑے تھے۔ نہ جانے وہ کس وقت بنگلوں کے عقبی گلیاروں سے دبے پاؤں چلتے ہوئے

ان کے سروں پہ آن پہنچے تھے۔

یہ ان دونوں کی تربیت کا حصہ تھا کہ ایسے کسی نازک موقع پر اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر صرف نظروں کے ذریعے خاموش پیغام رسانی کو کیسے سمجھا جاتا ہے اور ..... لیلیٰ نے بانو سے ایک نگاہ ملاتے ہی اسے اپنی ایک ابروئے جنبش سے خفیف اشارہ کیا اور دوسرے ہی لمحے بانو نے اپنے شکار مچل کو ڈھال بناتے ہوئے اپنے سامنے کردیا تینوں اسرائیلی گارڈز ان کی چالا کی نہ سمجھ پائے اور ایک نے اپنی گن سے ہوائی برسٹ فائر کردیا، مقصد یہی تھا کہ ان کے دیگر ساتھی اس طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوجاتے اور ان کے گرد گھیرا مزید تنگ ہوجاتا۔ لیلیٰ کی اب تک کی زندگی کا یہ سب سے اہم اور خطرناک موڑ تھا جب اس نے خود کو لمحے بھر کے لیے بے بس محسوس کیا تھا اور تب پھر اس نے بھی اپنی اب تک کی تربیت اور چابک دستی کو بروئے کار لاتے ہوئے ..... ایک خطرناک فیصلہ کیا اور پل کے پل اس پر عمل بھی کر ڈالا۔

ایک گارڈ کے فضا میں برسٹ چلاتے ہی لیلیٰ نے اس موقع کو حرکت پذیر ہونے کا لمحہ سمجھا اور بہ سرعت اس نے خود کو زمین پر گرادیا۔ اسے یقین تھا کہ تینوں گارڈز مچل کو سامنے پاکر فوری طور پر فائرنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے ..... مگر ایسا صرف چند سیکنڈوں کے لیے ہوتا، اس کے بعد وہ لیلیٰ کو بہ آسانی گولیوں سے بھون ڈالتے ..... لیکن بھلا لیلیٰ اب انہیں یہ موقع کہاں دینے والی تھی۔ لیلیٰ نے گرتے ہی زمین پر صرف ایک لڑھکنی کھائی تھی اور تینوں گارڈز، اس پر اپنی مہیب گنوں کی خوں ناک بوچھاڑ کرنے کے لیے ان کا زاویہ بدلتے رہے تھے کہ لیلیٰ نے دوبارہ پیٹ کے بل پر ہوتے ہی اپنی گن کا رخ ان کی طرف کرکے لبلبی دبادی۔

بے شک یہ آر یا پار ..... والا ہی معاملہ تھا ..... نتیجتاً رات کے دم بہ خود اور ٹھٹکے ہوئے مہیب سناٹے میں ..... لیلیٰ کی ایم پی فائیو اوور ریتا ونڈر گن (یہ تلے اوپر دو نالوں والی مہلک گن تھی، جس کی نچلی اور نسبتاً بڑے میگنم کی نال سے بہ وقتِ ضرورت راکٹ بھی داغا جاسکتا تھا) بڑے زور سے گرجی۔ تینوں گارڈز کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ وہ کربیہ انگیز چیخوں کے ساتھ رقص اجل کرتے ہوئے زمین بوس ہوگئے۔

''شکار کو لے کر اس طرف بھاگو ..... جلدی۔'' لیلیٰ نے قدرے چلا کر کہا تو بانو حرکت میں آئی، لیلیٰ نے سامنے کا رخ کیا تھا۔ یہ بہت بڑا اور ایک خطرناک رسک تھا، مگر اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں بچا تھا۔ لیلیٰ نے اندھیرے کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی سعی کی تھی اور کافی حد تک کامیاب بھی رہی تھی۔ پھر تازہ معرکہ آرائی کے دوران دیگر مسلح گارڈز بھی دوسری جانب متوجہ ہوگئے تھے۔ وہ دوسری جانب، وہی جگہ تھی جہاں سے ان دونوں اور بعد میں وہ تین جہنم واصل اسرائیلی گارڈز نے فائرنگ کی تھی۔

بانو لیلیٰ کی تقلید میں اس کے پیچھے لپکی اس نے مچل کا بازو دبوچ رکھا تھا، اس کے دل و دماغ میں اچھی خاصی وحشت بیٹھ چکی تھی، یوں بھی وہ کچھ زیادہ ہی ''تھڑدلا'' واقع ہوا تھا ..... یقیناً، یہاں کا ''ٹھیکا'' سنبھالنے کے بعد اسے یہودیوں نے اس تلخ حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہوگا کہ ..... اس یہودیوں کی غاصبانہ آبادکار بستیوں کے تعمیراتی ... پروجیکٹ ..... میں اسرائیلیوں کو شدید مخالفت اور مزاحمت کا بھی سامنا ہے ..... وغیرہ۔ ظاہر ہے بڑی رقم کے لالچ اور اسرائیلیوں کی حوصلہ افزاء ڈینگوں میں آکر مچل یہاں آتو گیا تھا ..... مگر اب اسے پتا چل رہا تھا کہ ..... اسرائیلیوں نے اسے اس کام پر مجبور کرنے کے لیے جو لمبی ڈینگیں ماری تھیں وہ سب غلط ثابت ہوئی تھیں ......

بانو ..... جب اسے لے کر بھاگی تو ..... اچانک ایک موقع پر مائیکل مچل نے وہی کیا جس کا ڈر تھا ..... اس نے اس ہڑبونگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ..... بانو کی گرفت سے خود کو آزاد کرنے کے لیے پہلے تو اسے کاندھے کی ٹھوکر رسید کی، مگر بانو بھی محتاط تھی ..... اس نے اپنی گن کا رخ اس کی طرف کیا۔ اتنا تو اب تک مچل بھی جان چکا تھا کہ ..... ان سے فوری طور پر اسے جان کا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ یہ اسے صرف اغوا کی نیت سے ہی کسی نامعلوم مقام تک لے جانا چاہتی تھیں۔ اسی لیے جیسے ہی بانو نے اس کی حرکت پر اپنی گن کا رخ اس کی طرف کیا، اس نے اس کی بھی پروا کیے بغیر، اپنے دونوں رسن بستہ ہاتھوں کو نصف دائرے کی صورت گھما کر دوسری ٹھوکر بانو کے لگائی۔ اس بار بانو کا ہاتھ بھی لمحے بھر کو بہکا تھا ..... مچل کے لیے اتنا ہی کافی تھا، اس نے یک دم دوڑ لگادی ..... بانو پریشان ہوگئی۔ اس نے لیلیٰ سے چلا کر کہا۔

''شکار فرار ہورہا ہے .....'' یہ کہتے ہی اس نے بھی اپنی گن بھاگتے ہوئے ..... مائیکل مچل پہ تان لی تاکہ ضرورت پڑنے پر اس پر گولی چلا سکے ..... مچل اسی سمت کو دوڑ رہا تھا، جدھر ..... اسرائیلی گارڈز کا مسلح جتھا موجود تھا ..... لیلیٰ نے جو بانو کی آواز پر پلٹ کر یہ سب دیکھا تو ..... اس کا چہرہ فق ہوگیا ..... اسے اپنی جاں گسل محنت ضائع

جاتی محسوس ہوئی تھی ......

☆☆☆

زبیدہ اور عابد شیکھری، ہینڈلر کے بتائے ہوئے محلِ وقوع کے مطابق اب جس سمت پیش قدمی کررہے تھے ...... وہ ایک تنگ سی راہداری تھی ...... جس میں دو دو افراد ایک ساتھ صرف قطار کی صورت میں ہی آگے بڑھ سکتے تھے۔

زبیدہ اور ہینڈلر ..... ان دونوں کا شکار اب ایک ہی تھا یعنی ..... اسرائیلی ریئر ایڈمرل ارووت یعو ..... یہ دونوں مل کر اب اسرائیلی بحریہ کے اس اہم افسر کو سب سے پہلے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔

اس تنگ سی راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے اچانک ہینڈلر رک گیا ..... زبیدہ اس کے شانہ بشانہ تھی، پھر عابد اور ہینڈلر کے تین ساتھی تھے۔

''کیا ہوا .....؟ تم رک کیوں گئے؟'' زبیدہ نے قدرے چونک کر پوچھا۔ ہینڈلر کوئی جواب دیے بغیر ..... خاموشی سے کن گن لیتا رہا ..... وہ شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا ..... اور پھر یک دم اس نے بغیر کچھ کہے قدم آگے بڑھادیے۔

''شاید تم کچھ بھول رہے تھے .....؟'' اس کے عقب میں چلتے ہوئے زبیدہ نے پھر کہا۔

''نہیں، بھولا تو کچھ نہیں تھا۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ ایک ایسی ہی راہداری سے ایک خفیہ راستہ ..... ان کی بیسمنٹ تک جاتا ہے ..... مگر وہ راہداری یہ نہیں ہے۔'' ہینڈلر نے جواب دیا۔ زبیدہ پرخیال لہجے میں بولی۔

''ممکن ہے یہاں سے بھی کوئی ایسا راستہ عمارت کے اہم گوشوں کی طرف نکلتا ہو .....؟''

''میں یہی اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا۔'' ہینڈلر نے بے اختیار کہا۔

''ان حالات میں یہاں ایک ایک دشمن ہماری تلاش میں کونا کونا چھان رہا ہے، ہمیں ایسے خفیہ راستوں کو تلاش کرکے دشمن کو بھاری نقصان پہنچانا چاہیے .....'' اس بار عابد شیکھری نے کہا تو ہینڈلر سنجیدگی سے بولا۔

''ہمارے کمپیوٹر نقشہ نگار جاسوسوں نے اس سلسلے میں اپنا جو کام باس (چیک ڈوکر) تک پہنچایا تھا، میں اس کے مطابق ہی عمل پیرا ہوں ..... یہاں ایسا کچھ نہیں ہے ..... یہ وقت ضائع کرنے والی بات ہوگی۔ ہمیں اس راہداری کو پار کرنا ہوگا۔ مجھے لگتا ہے اپنی مطلوبہ راہداری ..... اس راہداری کے اختتام میں ہمیں مل سکتی ہے۔''

''لیٹس گو .....'' اس کی بات سن کر زبیدہ نے یکدم ... پُرجوش سی عجلت میں کہا اور ایک بار پھر یہ سب، گنیں سنبھالے تیزی سے آگے بڑھے مگر ابھی چند قدم آگے بڑھتے تھے کہ انہیں اچانک عقب سے تیزی سے قریب آتی ''گھوں گھوں ..... گھرررر .....'' جیسی آوازیں ابھرتی سنائی دیں۔ یہ سب بری طرح ٹھٹک کر رکے۔ زبیدہ اور عابد تو کچھ اندازہ قائم نہ کرسکے بجز اس کے یہ کسی چھوٹی مشینری کی آواز تھی، لیکن مافیائی ایجنٹ ..... ہینڈلر ان آوازوں کو فوراً پہچانتے ہی چلا کر بولا۔

''ہوشیار ..... دشمن فور وہیل بائیکس میں ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں ..... بھاگو .....''

''نہیں۔ ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہوگا ..... پوزیشنیں سنبھال لو۔'' زبیدہ نے کہا اور خود تیزی سے پلٹی۔ اس کی دیکھا دیکھی ہینڈلر بھی اپنی گن سنبھالے پلٹا۔ زبیدہ نے زخمی عابد کو پیچھے کرلیا، ٹھیک اسی وقت ان کے عقب میں دو فور وہیل بائیک نمودار ہوئیں۔ ان میں دو دو مسلح افراد براجمان تھے۔ ہینڈلر کے تینوں ساتھی ان کے نشانے پر تھے۔ ان بے چاروں کو پلٹ کر ان پر فائر کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا ... بائیک سواروں نے آناً فاناً اپنی آٹومیٹک گنوں کے منہ کھول دیے تھے، گولیوں کی بھیانک تڑ تڑاہٹ نے اعصاب تک جھنجھنا ڈالے۔

وہ تینوں بدنصیب کرب انگیز چیخوں کے ساتھ گرے تو اب زبیدہ اور ہینڈلر موت کے ان ہرکاروں کی زد میں آگئے مگر اپنے تین ساتھیوں کی قربانی کو وہ بھلا کب ضائع ... جانے دیتے۔ اگرچہ وہ بھی اب یقینی موت کی زد میں ہی تھے۔ اس بھیانک خطرے کو محسوس کرتے ہی تینوں نے خود کو گرالیا تھا اور جیسے ہی ہینڈلر کے تینوں ساتھی رقص اجل کرتے تلے اوپر گرے، زبیدہ اور ہینڈلر نے اپنی گنوں کے منہ بھی کھول دیے ..... سب سے آگے والی بائیک کے دونوں دشمن چھلنی ہوکر ڈھے گئے اور ان کی بائیک بے قابو ہوکر اچھلی اور پھر الٹ گئی۔ ان کے پیچھے والی بائیک کے دونوں دشمن، خطرہ بھانپ کر پیچھے کو پلٹے۔ انہیں فرار ہوتا دیکھ کر ہینڈلر اپنے تینوں ساتھیوں کا انتقام لینے کے جوش تلے اٹھا، مگر اسی وقت زبیدہ کی عقابی نگاہوں نے دیکھا۔ ہینڈلر ایک خطرناک غلطی کرچکا تھا، کیونکہ دشمنوں کی بائیک پلٹ تو گئی تھی، مگر اس کے ساتھ بیٹھے دوسرے دشمن نے بیٹھے بیٹھے گھوم کر اپنی گن کا رخ ہینڈلر کی طرف کردیا۔ ٹھیک اسی وقت جبکہ زبیدہ اس خطرناک صورت حال کو پہلے ہی بھانپ چکی تھی اس نے لیٹے لیٹے

بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ، آگے کو سرک کر ہینڈلر کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ وہ پٹ سے اپنے ہی ساتھیوں کی لاشوں پر گرا۔ اسی وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری، مگر اس کی زد میں کوئی نہ آیا۔ زبیدہ نے سنبھل کر جوابی فائرنگ کی مگر بائیک سوار دونوں دشمن بل کھاتی راہداری کے موڑ میں غائب ہو چکے تھے۔

''میں ...... میں ...... ان کتوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا ......'' ہینڈلر جوش انتقام سے چیخا اور اٹھ کر دشمنوں کے تعاقب میں دوڑنا چاہا تھا کہ عقب سے زبیدہ نے اسے دبوچ لیا۔

''بے وقوفی مت کرو ...... ہمارا ان سے دوبارہ سامنا ہو گا، ابھی ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہو گا۔ انہیں ہماری یہاں موجودگی کا پتا چل گیا ہے ......''

ہینڈلر نے اپنے جوش جنوں پر بہ مشکل قابو پایا اور پھر یہ تینوں دوڑنے لگے۔ ساتھ ہی اپنے عقب سے بھی محتاط تھے کہ کہیں پھر وہ بائیک سوار موت کے ہرکارے ان کے پیچھے نہ آ جائیں۔

آگے راہداری کا اختتام تھا۔ جب یہ تینوں راہداری کے سرے پر پہنچ کر رکے تو سامنے بڑا سا حصہ ایک ہال کا گمان دیتا تھا۔ وہاں غیر معمولی سناٹے میں انہیں موت کی بے رحم سرگوشیوں کا احساس ہوا۔ زبیدہ خطرے کو بھانپتے ہی سرسراتی سرگوشی میں بولی۔

''خبردار ...... راہداری سے باہر ایک قدم بھی مت نکالنا، باہر چاروں طرف موت ہماری گھات لگائے بیٹھی ہے ......''

ہینڈلر اور عابد شیکھری، زبیدہ کی بات کا اشارہ سمجھ گئے۔

ابھی وہ متذبذب ہی تھے کہ وفعتاً ...... گھات میں بیٹھے دشمنوں کو بھی شاید ان کی غیر معمولی محتاطی کا اندازہ ہو گیا اور اگلے ہی لمحے ٹھٹکی ہوئی فضا میں ...... تیز سی گھوں ...... گھوں ...... گھرررر ...... کی وہی مخصوص آواز ابھری اور دائیں بائیں سے چار پانچ فور وہیل بائیکرز، اچانک ہی نمودار ہوئے۔ ان کے پاس پلٹنے کا وقت نہیں بچا تھا، اور کم از کم ہینڈلر تو بالکل بھی نہیں پلٹنے کے موڈ میں نظر آتا تھا، اس نے راہداری کی سرے والی دیوار کے ساتھ پشت چپکا کر اپنی گن دشمنوں پر تان لی ...... زبیدہ کو اس کی درانہ وار دلیری کا معترف ہونا پڑا۔ پھر اس نے بھی منہ نہ موڑا۔ دوسری سمت کی دیوار کی آڑ اس نے بھی سنبھال لی ادھر ہینڈلر نے اپنی گن کا منہ کھول دیا، جبکہ زبیدہ نے سچویشن کو بھانپتے ہی ...... خود کو راہداری کے چکنے فرش پر گرا دیا اور اپنی گن کا ٹریگر دباتی چلی گئی ...... سامنے ہال کے چکنے فرش پر دشمن نے بھی موت کا یہ کھیل ...... بڑی مہارت سے کھیلا تھا۔ وہ اپنی فور وہیل بائیکس کو ڈریفٹنگ کے انداز میں سامنے لائے تھے۔ یعنی گول گھماتے ہوئے۔ انہوں نے اس طرح خود کو بھی دشمنوں کی ممکنہ فائرنگ کی زد سے بچانے اور ان پر موثر حملہ کرنے ...... کی ٹھانی تھی۔ موت کا یہ کھیل حتمی نتائج کی غمازی کرتا تھا۔

ہینڈلر نے تو ان پر سیدھی گولیاں داغی تھیں جبکہ زبیدہ نے خود کو فرش پر گرا کر دشمنوں کو نشانہ بنانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ان کی لٹو کی طرح گھومتی بائیکس کے غیر معمولی موٹے اور چوڑے ٹائروں کو نشانہ بنایا تھا، جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔

فور وہیل بائیکس کے ٹائر زوردار دھماکوں سے برسٹ ہونے لگے اور وہ آپس میں ٹکرا کر اپنے سواروں سمیت الٹنے لگیں ...... ان کی تعداد چار پانچ تھیں، ہر بائیک پر دو افراد سوار تھے۔ وہ سب فرش بوس ہونے لگے تو ہینڈلر کو زبیدہ کی اس دانش مندی کا احساس ہوا، کیونکہ ابھی تک اس کی کوئی گولی ایک دشمن کو بھی نہیں چاٹ سکی تھی، جبکہ خود وہ ان کے سیدھے نشانے پر آ چکا تھا، لیکن زبیدہ کی بروقت حاضر دماغی نے کایا ہی پلٹ ڈالی۔ اب سارے دشمن ان کے نشانے پر تھے۔ پھر کیا تھا، انہیں اب سنبھلنے کا موقع دینے کا مطلب یقینی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لہٰذا پھر یہ نہیں رکے، دشمن ایک ایک کر کے چھلنی ہونے لگے ......

زبیدہ اور عابد، ہینڈلر کی راہنمائی میں آگے بڑھنے لگے۔

یہ تینوں اب بلند چھت والے ہال سے گزرنے لگے ...... بلندی پر ریلنگ کے پیچھے کمرے نظر آ رہے تھے، وہاں پر دس بارہ کے قریب مسلح افراد نمودار ہوئے ...... عابد کی ہی ان پر پہلے نگاہ پڑی تھی۔ اپنی حفاظت کے لیے اس کے پاس بھی ہلکی رائفل تھی۔ اس نے چلا کر پہلے زبیدہ اور پھر ہینڈلر کو خبردار کیا جبکہ وہ خود بھی محتاط تھے لیکن ان پر فائرنگ کی ابتدا عابد نے ہی کر ڈالی۔ ایک دو کی چیخیں ابھری تھیں۔ باقیوں نے فوراً پوزیشن سنبھالی۔ ایک بار پھر دوبدو فائرنگ کا تبادلہ شروع ہوا۔

زبیدہ اور ہینڈلر کی باہمی حکمت عملی خاصی کامیاب جا رہی تھی، اسی دوران ان کے بیچ ایک اور معاملہ طے پایا۔ زبیدہ نے عابد کو ایک موثر آڑ تک محدود رہنے کی تلقین کرتے ہوئے، دشمنوں کو مصروف رکھنے کا کہا اور پھر زبیدہ اور ہینڈلر دونوں طے شدہ حکمت عملی کے مطابق دائیں بائیں ...... بنے آہنی زینوں کی طرف دوڑے ...... ہینڈلر کے پاس دو

ہینڈ گرینیڈ تھے، وہ اس نے تلے اوپر اچھال دیے۔ سماعت شکن دھماکوں کے ساتھ ہی کئی اسرائیلی، آہنی ریلنگ والی بالکونی سے چیختے چلاتے ہوئے نیچے آ رہے ......

زبیدہ بھی فائرنگ کرتی ہوئی بالکونی میں آ گئی ......

ہینڈلر بڑی دلیری کے ساتھ ان سے نبرد آزما تھا، زبیدہ اس کا ساتھ دینے لگی ...... نیچے عابد ان کی مشکل کافی حد تک کم کرنے میں بڑی جانفشانی سے مصروف تھا ......

دشمنوں کا کافی حد تک صفایا کیا جا چکا تھا، چند ایک نے اندرونی گوشوں کی جانب راہ فرار اختیار کر لی تھی ...... اسی لمحے زبیدہ کے تیزی سے سوچتے ذہن میں ایک خیال، ممکنہ خدشے کی صورت ابھرا۔ اس نے فوراً اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر پر خالد بن جنید سے رابطہ کیا اور اب تک کی صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد اپنے متوقع خدشے کے بارے میں کہا۔

''یہاں اسپائی اسٹیشن میں دشمن پسپائی کے نزدیک پہنچ چکا ہے، لیکن ابھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ...... خدشہ قوی ہے کہ وہ اسرائیل سے کمک منگوا سکتے ہیں ...... آپ لوگ جلد سے جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ مشن کو آخری شکل دی جا سکے۔ ایک خدشہ یہ بھی متوقع ہے کہ اسرائیلی بحریہ کا ریئر ایڈمرل اردوت یعوو فرار ہونے کی کوشش کر سکتا ہے اور عمارت کے بیرونی گوشے ہماری نظروں سے اوجھل ہیں ...... اوور۔''

زبیدہ نے مختصراً ہینڈلر وغیرہ کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔

دوسری جانب سے خالد بن جنید کی جوش سے لبریز آواز ابھری، بولا۔ ''عزیزی زبیدہ ......! انشاء اللہ فتح مبین ہمارا مقدر ہو گی۔ ہم بھی زیادہ دور نہیں ہیں، ہم نے بھی راہ میں آنے والی دشمنوں کی متعدد چوکیاں تباہ کر ڈالی ہیں اور اب مطلوبہ عمارت کے بالکل قریب ہی ہیں ...... اندر ہونے والے دھماکوں اور فائرنگ کی آوازوں کو ہم بھی سن رہے ہیں ...... اب ہم بھی باہر سے دشمنوں پر ہلا بولنے والے ہیں۔ دشمن کمک کی طرف سے بے فکر رہو ...... اسرائیلیوں کے اس خفیہ اور غیر ملکی منصوبے میں ...... اس طرح کی کمک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اردوت یعوو کے لیے فرار کی تمام راہیں مسدود کی جا چکی ہیں۔ بہت جلد ملتے ہیں۔ وش یو بیسٹ آف لک۔ اوور اینڈ آل۔'' دوسری جانب سے خالد بن جنید کی جوش سے لرزتی ہوئی آواز آنا بند ہو گئی۔ زبیدہ کا دل بھی اتنی بڑی اور متوقع کامیابی پر خوشی سے معمور ہونے لگا تھا۔ ٹھیک اسی وقت اسے ہینڈلر کی چیخ سنائی دی ......

☆☆☆

زبیدہ سے بات کرنے کے بعد اب خالد، سونپے گئے اپنے اس اہم مشن سے کافی پرامید نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت ...... اسپائی اسٹیشن کی عمارت کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ دشمنوں سے مقابلے کے دوران اسے ایک حوصلہ افزا حقیقت کا اندازہ ہوا تھا۔ یہاں دشمن اگرچہ اپنی بھرپور عسکری طاقت کے ساتھ موجود تھے لیکن ان کی افرادی قوت کم تھی۔ خالد بن جنید اور اس کے ساتھیوں نے اسرائیلیوں کی قریباً تین عسکری چوکیوں کو تباہ کر ڈالا تھا اور متعدد دشمن ہلاک کر ڈالے تھے، اگرچہ اس میں آنجہانی مافیائی چیف چیک ڈوکر کی نوجوان حسین بیوہ ...... ڈیبورا مرسیانو اور اس کے ''معاہدہ بند'' حلیف، ڈریگون کے سربراہ رچرڈلی کی مشترکہ کوششوں کا بھی دخل تھا لیکن خالد اور زبیدہ وغیرہ نے بھی یہاں دشمنوں کی کمر توڑ ڈالی تھی۔ سب سے بڑا نقصان یہاں کوانڈو آئی لینڈ کو عابد شیکھری اور نائمہ نے ان کی ایک اہم ترین آبدوز کو تباہ کر کے پہنچایا تھا۔

اس آبدوز کی وجہ سے ہی یہاں اسرائیلیوں کے خفیہ اسپائی اسٹیشن کا مقصد بھی تقریباً ختم ہو کر رہ گیا تھا، اسرائیلیوں کی بحیرۂ روم میں غاصبانہ اجارہ داری ختم کر دی گئی تھی ...... اب فلسطینیوں کو پہنچنے والی کمک اور امداد نیز عابد اور نائمہ کے نیک مقصد، جس میں جلاوطن فلسطینی مسلمانوں کو ان کے اپنے وطن فلسطین میں آباد کرنا تھا، وہ بھی بہ آسانی انجام دیا جا سکتا تھا ......

خالد بن جنید کو اب اس مشن کی کامیابی قریب نظر آ رہی تھی مگر بہ قول زبیدہ کے، اسے یہ خدشہ بھی دامن گیر تھا کہ اسرائیلی اپنے اس خفیہ اسپائی اسٹیشن کو بچانے کے لیے کوئی کمک بھی روانہ کر سکتے تھے لیکن ابھی یہ بات بعید از قیاس ہی سمجھی جا رہی تھی۔

زبیدہ اندر دشمنوں کی صف میں جس طرح کھلبلی مچائے ہوئے تھی ...... خالد نے بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ عمارت سے باہر اسرائیلیوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے، اب ان کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح ...... عمارت کے اندر داخل ہو کر تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی جائے ...... کیونکہ عمارت تباہ کرنے کے لیے زبیدہ کے پاس کوئی خاص بارودی ایمونیشن نہیں تھا، جبکہ خالد اور اس کے ساتھی اس سے لیس تھے۔

دشمنوں پر اندرونی اور بیرونی دباؤ نے ان کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ زیادہ دیر نہ ٹک سکے اور بالآخر خالد اپنے ساتھیوں سمیت اندر داخل ہوگیا اور زبیدہ کو بھی کال کر کے اپنی اس کامیابی کی اطلاع دے ڈالی......

عمارت کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی......خالد اور اس کے ساتھی......تیزی کے ساتھ عمارت کے اہم گوشوں اور کنٹرول رومز میں ٹائم بم فٹ کرنے میں مصروف ہوگئے۔

☆☆☆

ہنڈلر کی چیخ میں، زبیدہ کو ایک کرب کا تاثر محسوس ہوا تھا......وہ طوفانی بگولے کی طرح اپنی گن تھامے اس کی طرف پلٹی تو دیکھا دو اسرائیلیوں نے اسے دبوچ رکھا تھا اور پھر زبیدہ کے دیکھتے ہی دیکھتے......ایک اسرائیلی فوجی نے، جو اپنا ایک بازو ہنڈلر کی گردن کے گرد شکنجے کی طرح کسے ہوئے تھا، ایک زوردار جھٹکا دیا اور ہنڈلر کی گردن ڈھلک گئی......زبیدہ کو افسوس ہوا کہ وہ بروقت ہنڈلر کی جان نہ بچا سکی مگر اب وہ اس کے قاتلوں کو بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی......جب تک ان دونوں خونی اسرائیلیوں کی نگاہ اس پر پڑتی، زبیدہ کی گن گرجی اور وہ دونوں جہنم واصل ہوگئے۔

زبیدہ عابد کی طرف آئی اور اسے ساتھ لیے......مختلف کمروں میں گردش کرتی رہی......مگر اسے ایڈمرل اردوت یعو نظر نہ آیا۔ اسی دوران......خالد بن جنید اپنے ساتھیوں سمیت عمارت کے اندر ہی ان سے آن ملا......نائمہ اور عابد ایک دوسرے کو زندہ سلامت پا کر اللہ کا شکر بجا لائے......وہ بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے......مگر نائمہ، عابد شکیھری کی زخمی حالت پر تشویش زدہ بھی ہوگئی......اس پر خالد نے اسے تسلی دی کہ اب مشن اپنے کامیاب اختتام پر ہے......وہ فکر نہ کرے......انہیں......قبرص پہنچانے کا خاطر خواہ بندوبست کر دیا جائے گا۔

اسپائی اسٹیشن پر اب مجاہدوں کا قبضہ ہوگیا تھا......لیکن انہیں اپنا اصل شکار اردوت دکھائی نہیں دیا تھا......جلد ہی ان پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ایک خفیہ سرنگ کے ذریعے......بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

عمارت کو مکمل تباہ کرنے کے بعد ان سب نے جزیرے کے ساحل کا رخ کیا......جدھر......چند ایک تیز رفتار ربوٹس لنگر انداز تھیں......وہ سب اس میں سوار ہوگئے......غرضیکہ انہوں نے پورا جزیرہ بھی چھان مارا......مگر لگتا یہی تھا کہ اردوت اسی خفیہ سرنگ کے ذریعے بہت پہلے ہی اپنی متوقع شکست کو دیکھتے ہوئے......بزدلوں کی طرح راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا......مگر انہیں اس کے زندہ بچنے کا زیادہ غم نہ تھا۔ اس لیے کہ......انہوں نے اسرائیل کے ایک بڑے منصوبے کا قلع قمع کر ڈالا تھا۔

سسلی کے ساحل پر پہنچ کر......خالد بن جنید نے اپنے خفیہ ہمدرد گروپس کے ذریعے سب سے پہلے عابد کو ایک اسپتال میں شفٹ کیا......نائمہ اس کے ساتھ تھی۔

چند ہی روز میں طبیعت کچھ سنبھلتے ہی......نائمہ اور عابد نے......قبرص کا رخ کیا......اس عزم کے ساتھ کہ وہ آئندہ بھی اپنے فلسطینی مسلم بھائیوں کے مشن میں پیش پیش رہیں گے اور......عابد نے تو بہت پہلے سے ہی مختلف ممالک میں موجود، جلا وطنی کی زندگی گزارنے والے بے گھر فلسطینیوں کو ان کے اپنے وطن میں لا کر بسانے کا عزم صمیم کر رکھا تھا......اور......اب تو اس کے اس دیرینہ مشن میں نائمہ بھی شامل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے اپنے تاریک سفر سے سپیدۂ سحر کی جانب گامزن تھی۔ محسن اپنی ''سات چھاتہ بردار'' گوریلا فورس کے ساتھ اسرائیلیوں پر آخری اور کاری ضرب لگانے کے لیے، ان کے ٹریننگ کیمپ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ہگانہ اور وائٹ کیسل پر ہلا بولنے اور اسرائیل کے موروثی باپ شیطان ابن شیطان......آئزر مین بیری جونیئر کو جہنم واصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے......ان کا یہ اہم سینٹر تباہ کیا جاتا......ایک مربوط حکمت عملی اس سلسلے میں ترتیب پا چکی تھی، اور اب یہ اسی کے مطابق اپنا مشن آگے بڑھائے ہوئے تھے، مگر یہ سب کچھ تیزی کے ساتھ انجام پذیر ہونے کا متقاضی تھا۔

ایک حوصلہ افزا اشارہ انہیں مل رہا تھا کہ دشمن اپنی طاقت کے زعم میں یہاں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ یوں بھی جس قوم کی قسمت میں تباہی مقدر کی جا چکی ہو......وہ خواب غفلت میں پڑ ہی جاتی ہے۔

ٹریننگ کیمپ کی عمارت پر بھی سناٹے کا راج نظر آتا تھا۔ محسن اپنے جری ساتھیوں کے ہمراہ......خاردار باڑھ کے قریب آن پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر محسن نے اپنے ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ اب اکا اکی ان سب کے ہاتھوں میں crossbow نظر آنے لگے۔ یہ ایک بظاہر تیر کمان کے انداز کا ہتھیار تھا۔ مگر یہ ایک جدید طرز کا خودکار تیر کمان تھا۔ اس سے کافی دور تک نشانے پر تیر پھینکے جاتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ چھوٹی سطح کا راکٹ بھی اچھالا جا سکتا تھا۔

crossbow کمانڈوز کا ایک من پسند ہتھیار سمجھا جاتا تھا۔ ہتھیار تھامے اور گرد و پیش پر نگاہ رکھے یہ آگے سرکنے لگے۔ پھر ایک مقام پر رک کر محسن کے مخصوص اشارے پر انہوں نے عمارت کے سامنے والے میدان نما احاطے میں منزگشت کرتے ہگانہ فوجیوں کا نشانہ لے کر تیر اچھالنے شروع کر دیے۔ پلک جھپکتے میں ہی ہگانہ آرمی کے آٹھ، دس فوجی خاموشی سے لقمۂ اجل بن گئے۔ ان ساتوں نے اپنی جگہ سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی تھی......اور چشم زدن میں یہ ہگانہ آرمی کے ٹریننگ سینٹر کی عمارت کے بیرونی احاطے والی دیوار کی......آڑ میں آن پہنچے۔

محسن نے لئیقہ شیریں، ہیا حبیب اور نعمان کو عمارت کے عقبی گوشے کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ عمارت کے اندر ہیے......سات منکال کے یونٹ کی بیرکس میں اپنی رسائی ممکن بناتے ہوئے وہاں گھات لگا کر بیٹھ جائیں، اور ٹرانسمیٹر پر رابطے میں رہتے... ہوئے، اس کے اگلے حکم کا انتظار کریں۔

وہ تینوں مذکورہ......مجاہد......تین کی ٹولی میں بٹ کر دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے......جبکہ محسن اپنے باقی تین ساتھیوں نغمانہ بنت مریم، ابن طلحہ اور قاسم کے ساتھ، اس دیوار کے پھاٹک کی طرف سرکنے لگا۔ وہاں موجود چار گارڈز کی لاشوں کو پہلے جھاڑیوں میں گھسیٹ کر......چھپا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ جیسے ہی گیٹ کے قریب پہنچے، محسن ٹھٹک کر یک دم رکا۔ ساتھی پیچھے تھے۔ وہ بھی رک گئے......محسن کے ذہن رسا میں ایک محتاط خیال بہ سرعت آیا تھا......اس کی چھٹی حس تھی یا پھر......اس کی غیر معمولی زود فہمی کہ......اسے پل کے پل کسی خطرے کا احساس ہوا تھا......یہ خیال، گیٹ کے کھلے دروازے کو دیکھ کر ہی اچانک اس کے دل میں ابھرا تھا۔ اس نے فوراً اپنی کمانڈو کٹ سے ایک گائیگر ٹائپ آلہ نکالا۔ اس کے سینسر سے ان دیکھی شعاع نکلتی تھی......مگر وہ سامنے کی چھپی ہوئی شے کو پل بھر میں واضح کر دیتی تھی۔ تاریکی میں کھلے گیٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک......تین رویہ شعاعی......لہریں تھرکتی ہوئی دیکھ کر محسن کے پورے وجود میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی......ایک ذرا سی غفلت ان تینوں کو پل کے پل موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی......اس نے اسی وقت اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر پر لئیقہ شیریں سے رابطہ کیا اور بولا۔

''حد درجے محتاط رہ کر پیش قدمی کرو......اور ریزر ڈیٹیکٹر کو بروئے کار لائے بغیر عمارت کی حد پار کرنے کی کوشش نہ کی جائے......یہاں نظر نہ آنے والی شاک ویوز......پل بھر میں موت سے ہمکنار کر سکتی ہے......اور......''

دوسری طرف سے لئیقہ شیریں نے اثبات میں جواب دیا تھا، اس کے بعد محسن نے......ریزر ڈیٹیکٹر راڈ کو اپنے ہاتھ میں تھامے رکھتے ہوئے، پہلے باری باری اپنے دونوں ساتھیوں کو گیٹ پار کروا دیا۔ اس کے بعد......وہ دوسری طرف کھڑے اپنے تینوں میں سے ایک ساتھی کو وہ تھمانے کے بعد خود بھی......ان ''شاک ویوز'' کے اوپر سے گزر کر گیٹ پار کر گیا۔

اب عمارت تک ان کی رسائی آسان ہوگئی، لیکن پھر بھی محسن نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا، کیونکہ وہ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھی بھی جانتے تھے کہ وہ اس وقت اپنے سب سے خطرناک دشمن شیطان ابن شیطان......آئزر مین بیری جونیئر......کی کچھار میں در انداز ہو چکے تھے، ان کی ذرا سی بھی بھنک پڑتے ہی وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑتا......اور یہی سبب تھا کہ ان کی کوشش تھی ابتدائی مراحل اسی طرح خاموشی اور کامیابی سے طے کر لیے جائیں اتنا ہی اچھا تھا......اس سے آئزر مین کی نصف طاقت متاثر ہو جاتی۔ اس کے بعد براہ راست وائٹ کیسل پر ہلا بول کر یہودیوں کے اس بڑے ملعون و مکروہ شیطان کا خاتمہ آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔

گیٹ پار کرتے ہی وہ تیزی کے ساتھ مرکزی دروازے کی طرف بڑھے......وہ بند تھا......عمارت کی دیوار کے ساتھ ساتھ مختلف کھڑکیاں نظر آتی تھیں، جو اندر بنی بیرکس کا پتا دیتی تھیں......محسن نے یہاں بھی غیر معمولی احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے، مرکزی دروازہ ایک کمانڈو ٹرک کے ساتھ بہ آسانی کھول لیا......وہ اندر داخل ہوئے۔ اندر نیم تاریکی تھی اسی وقت، محسن کو اپنے واچ ٹرانسمیٹر پر لئیقہ شیریں کی کال موصول ہوئی اس نے قدرے دبے دبے جوش سے بتایا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت اس وقت......ایک بیرک کے سامنے گھات لگائے بیٹھی ہے، جس کی پیشانی پر سات منکال کا مخصوص مونوگرام کندہ ہے۔

محسن نے اسے ابھی مزید کسی کارروائی سے روک دیا اور خود اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ......عمارت کے ایک ایسے اندرونی گوشے کی سمت بڑھ گیا......جدھر الیکٹرک سپلائی کا مین بورڈ نصب ہونا چاہیے تھا۔

محسن کی اب تک کی حکمت عملی خاصی کامیاب جا رہی تھی، کیمپ پر ہلا بولنے کے وقت کا انتخاب اس نے سوچ

سمجھ کر ہی کیا تھا، یعنی رات کا آخری پہر۔ کیمپ کی عمارت کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے... دن بھر ٹریننگ کرنے والے تمام زروپس، کیمپ کی چوکیداری کی ذمے داری اپنے مسلح گارڈز کے سپرد کر کے اس وقت تھکے ہارے، سب لمبے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

جلد ہی محسن کی یہ کوشش بھی کامیاب ثابت... ہوئی۔ ایک جگہ انہیں مختصر سے بیسمنٹ میں ایک بڑا سا الیکٹرک سپلائی کا مین سوئچ بورڈ دکھائی دے گیا۔ یہاں ہلکی روشنی تھی۔ پھر بھی محسن نے ٹارچ جلا کر اس کا مین سوئچ دیکھا، پھر وہیں کھڑے کھڑے لئیقہ شیریں سے رابطہ کیا اور کہا۔

''ایکشن فائنل اسالٹ کے لیے تیار ہو جاؤ... اور لیزر گائڈڈ گنز نکال لو...... جو نظر آئے گولیوں سے بھون ڈالو...... سات منکال کی بیرک سے کوئی زندہ بچ کر جانے نہ پائے......''

یہ ہدایت دینے کے بعد محسن نے مین سوئچ آف کر دیا...... نہ صرف پوری عمارت، بلکہ اس کے اندر جو بھی خفیہ الارمنگ سسٹم وغیرہ تھا، وہ سب پل بھر میں فیل ہو کر رہ گیا...... مین سوئچ آف کرتے ہی محسن نے قاسم کو ہدایت کی کہ اس مین الیکٹرک باکس میں ایسی خرابی بھی پیدا کر دے کہ...... اگلے چند گھنٹوں تک بھی یہ درست نہ ہونے پائے۔ قاسم اس میں ایکسپرٹ تھا، وہ اپنے کام میں جت گیا...... محسن اسے وہیں چھوڑ کر اپنے باقی دو ساتھیوں نعمانہ اور طلحہ کے ساتھ اس سمت بڑھ گیا جدھر لئیقہ شیریں وغیرہ گھات لگائے ہوئے موجود تھے...... کہ اچانک ہی گولیوں کی... تڑتڑاہٹ ابھری...... محسن جان گیا کہ شیریں وغیرہ کا ٹکراؤ سات منکال سے ہو چکا تھا...... اس نے اسی جانب دوڑ لگا دی۔

نعمانہ اور طلحہ اس کے پیچھے تھے...... انہوں نے لیزر گائیڈڈ گنز، دشمنوں پر تان رکھی تھیں، روشنی کے تقریباً ڈیڑھ انچ ہالے کے درمیان تھرکنے والا...... سرخ رنگ کا نقطہ تیزی سے حرکت کرنے لگا اور جس پر وہ پڑتا، ان کی گنیں گرجنا شروع ہو جاتیں...... اور شکار آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو جاتا...... جلد ہی یہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ جو سات منکال سے نبرد آزما تھے...... یہی وہ سات منکال تھی جس نے تیونس آپریشن میں...... ابو جواد اور خلیل الوزیر کو گھیر کر اس وقت شہید کیا تھا جب وہ اپنے...... اہل خانہ کے ساتھ اپنے گھر میں موجود تھے...... اور وہاں اس یہودی گروپ نے اچانک ہلا بول کر سب تہس نہس کر دیا تھا...... آج یہی سات منکال...... فلسطینی کمانڈوز...... کے گروپ سات چھاتہ بردار کے نرغے میں تھے...... جیسے ہی

وہ بوکھلا کر اپنی بیرکس سے باہر نکلے...... محسن نے بآوازِ بلند اور پورے جوش سے نعرہ مارا۔

''نعرۂ تکبیر!''

''اللہ اکبر!'' اس کے ساتھی ہم آواز ہو کر بولے۔ پوری عمارت ان کے اسلامی سرفروشانہ نعروں سے گونج اٹھی... اور دشمنوں پر ایسی دہشت بیٹھی کہ وہ بری طرح خوف زدہ ہو کر رہ گئے۔

گولیوں کی گھن گرج میں سات منکال کے کمانڈوز کی کریہہ انگیز چیخیں بھی شامل تھیں۔ خود کو دنیا کی سپر طاقت سمجھنے والے...... اور گریزازم کے داعی...... ان یہودیوں کو آج صحیح معنوں میں اپنی اوقات یاد آ گئی تھی کہ وہ تو آج تک نہتے فلسطینیوں پر اپنی طاقت کا زور چلاتے رہے ہیں۔ آج ان کے مقابلے پر آنے والے جاں فروش فلسطینی گوریلاز تھے...... موت سے بے پروا، جذبۂ ایمان و حریت سے سرشار، مٹھی بھر تعداد کے باوجود، خود سے زیادہ طاقت ور دشمنوں کو کیسے ناکوں چنے چبواتے ہیں۔

سات منکال کے ساتوں کمانڈوز کو...... بالکل اسی طرح پلک جھپکتے میں ہلاک کر ڈالا تھا جیسا انہوں نے تیونس آپریشن میں فلسطینی راہنما...... ابو جواد کے ساتھ کیا تھا۔ دشمنوں سے بھرپور انتقام لینے کے بعد...... ٹریننگ سینٹر کی پوری عمارت کو ٹائم بم لگا کر اڑا دیا گیا...... وہ جلتے ہوئے ملبے کا منظر پیش کرنے لگی تھی...... اس سے پہلے...... سات چھاتہ بردار نے...... وائٹ کیسل کی جانب پرواز کے لیے...... ٹریننگ سینٹر سے ہی ایک ہیلی کاپٹر کا بندوبست کر لیا تھا۔ نیز مالِ غنیمت کے طور پر محسن نے جانے کیا سوچ کر ایک کاندھے سے فائر کرنے والا میزائل بھی اچک لیا تھا، جسے تین حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ زمین سے فضا میں داغنے والا شوٹر بھی اٹھا کر محسن نے اپنی کٹ میں ڈال لیا تھا۔

مشن کا ایک ابتدائی اور اہم مرحلہ کامیابی کے ساتھ سر کیا جا چکا تھا...... سات منکال سمیت آرز مین بیری جونیئر کے ہی قائم کردہ ٹریننگ سینٹر کا قلع قمع کر کے، سات چھاتہ بردار نے بلاشبہ اسرائیل کی کمر توڑ دی تھی...... جیسا کہ مذکور ہوا، یہ اہم مشن بہت تیزی اور کم سے کم وقت میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا متقاضی تھا، تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جا سکیں، اسی لیے سینٹر کی عمارت کو اسی طرح جلتا سلگتا چھوڑ کر...... یہ ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر پوپھٹے...... وائٹ کیسل کی طرف پرواز کر گئے۔

محسن کا دل و دماغ اس وقت جوشِ جنوں سے بھرا ہوا

تھا......وہ آئزر مین بیری جونیئر کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا ......یہ وہ یہودی شیطان تھا جس نے نہ صرف فلسطین، بلکہ... پوری مسلم امہ کو اپنی مکروہ سازشوں میں جکڑ رکھا تھا......اسی لیے اس نے اس کا نام شیطان ابن شیطان رکھا تھا۔

ہیلی کاپٹر......کو نغمانہ بنت مریم پائلٹ کر رہی تھی، وہ کو پائلٹ رہ چکی تھی......اس کے برابر میں محسن براجمان تھا اس کی نظریں سامنے یعوم کی سب سے بلند پہاڑی پر جمی ہوئی تھیں، جہاں وائٹ کیسل کے ٹاور نظر آرہے تھے ......محسن، بنت مریم کو ضروری ہدایات بھی دیتا جارہا تھا ......کہ اس نے ہیلی کاپٹر کو کس مقام پر اتارنا تھا......

جلد ہی یہ لوگ مذکورہ پہاڑی کی ایک عمودی ڈھلان کے قدرے مسطح قطعے کے قریب اتر گئے......نغمانہ نے بڑی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے......ہیلی کاپٹر کو اس مختصر مقام پر اتارا تھا۔

یہ ساتوں تیزی کے ساتھ نیچے اترے اور محسن کی راہنمائی میں ایک طرف کو تقریباً دوڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگے......

یعوم کی پہاڑیوں سے سورج جھانکنے لگا تھا......یہ ساتوں چھاتہ بردار......اس خاردار باڑھ کے قریب پہنچ چکے تھے......جو وائٹ کیسل کی عمارت سے محض چند فرلانگ دوری پر تھی......یہاں بھی انہیں......ان دیکھی شاک ویوز کا سامنا تھا......لیکن ڈیٹیکٹر ڈیوائس کے ذریعے یہ اس باڑھ کو بہ آسانی پار کر گئے تھے۔

کچھ منٹوں بعد یہ لوگ کیسل کی عمارت کے بالکل قریب کھڑے تھے......محسن جانتا تھا کہ وائٹ کیسل اسرائیلیوں کا کوئی عسکری ہیڈ کوارٹر یا فوجی کیمپ نہیں تھا، بلکہ اس سے زیادہ یہ آئزر مین کی عشرت گاہ تھی......اگرچہ یہاں بھی اس کے مسلح باڈی گارڈ موجود تھے، مگر محسن کے لیے سب سے زیادہ خدشہ اس بات کا تھا کہ حملے کی ذرا سی بھنک پڑتے ہی......آئزر مین کسی وقت بھی فوجی امداد طلب کر سکتا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو ان کے مشن کی تکمیل نہ صرف مشکل ہو جاتی بلکہ یہ مہم کھٹائی میں بھی پڑ سکتی تھی......یہی سبب تھا کہ ان کے لیے، وائٹ کیسل پر حملے سے زیادہ یہ ضروری تھا کہ وہ سب سے پہلے عمارت کے کنٹرول روم میں خاموشی کے ساتھ دھاوا بولیں......لیکن اس پر بھی محسن نے پہلے ہی سے ایک مربوط لائحہ عمل ترتیب دے رکھا تھا......

یاسر العربی کے دیے گئے میپ کے مطابق ......کنٹرول روم، وائٹ کیسل کی عمارت کی بیسمنٹ میں تھا ......اور وہاں صرف آئزر مین بیری کے سوا کسی کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی......اسی لیے محسن کے لیے وائٹ کیسل میں داخل ہونا بڑی بات نہ تھی، اس کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ......سب سے پہلے عمارت کے کنٹرول روم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن یہاں انہیں دو اہم مراحل بیک وقت طے کرنے ضروری تھے۔ ایک تو کنٹرول روم تک کامیاب رسائی اور دوسرے آئزر مین بیری پر موثر انداز میں ہاتھ ڈالنا......بے حد سریع الحرکت کے ساتھ اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا اور اسے کم سے کم وقت میں سبوتاژ کرنا، ان سات چھاتہ بردار کمانڈوز کی تربیت کا حصہ تھا، اور وہ اسی پر اب تک بڑی کامیابی کے ساتھ عمل پیرا تھے۔

وائٹ کیسل کی عمارت کی برجی سے انہیں مسلح گارڈز نظر آرہے تھے......کئی برجی، عمارت کے چاروں طرف بنی ہوئی تھیں......محسن نے ایک بار پھر لئیقہ شیریں، ہیا حبیب اور نغمان کی الگ ٹولی بنا کر عمارت کے دوسری طرف روانہ کردی جبکہ خود وہ بنت مریم وغیرہ کے ساتھ ''کراس بو'' تھامے......برجی میں تعینات گارڈز کا خاتمہ کرنے کی تیاری کرنے لگا......

بیک وقت تین کراس بو سے تیر نکلے اور وہ تینوں گارڈز خاموشی سے وہیں ڈھیر ہو گئے۔

مزید تین گارڈز کو اسی طرح جہنم واصل کر کے......محسن نے عمارت کے مرکزی دروازے کی طرف پیش قدمی کی۔ دروازہ اندر سے خود کار لاک سسٹم کے تحت بند تھا۔

محسن نے پہلے تو اسے بم مار کر توڑ گرانے کا سوچا اور اسی طرح ہلا بول کر اندر گھس جانے کا ارادہ کیا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر اپنا یہ جارحانہ ارادہ بدل دیا......اور پھر سب سے نیچے والی برجی پر نقب لگا کر، یہ تینوں اندر داخل ہو گئے ......ٹرانسمیٹر پر محسن کا لئیقہ شیریں سے بھی بدستور رابطہ تھا ......اور انہیں بھی وہاں اپنے شکار گرانے کے بعد پیش قدمی کرنے پر ایک خفیہ دروازہ نظر آیا تھا، جو ظاہر ہے اندر سے بند تھا، لیکن محسن نے شیریں کو بھی اسی طریقے سے اندر داخلے کی ہدایت کی تھی۔

اندر داخل ہونے کے بعد محسن نے نغمان اور قاسم کو ہدایت کی کہ وہ عمارت کے اندرونی و بیرونی گوشوں میں ٹائم بم کے بجائے......وائرلیس بم فٹ کرتے چلے جائیں ......جبکہ لئیقہ شیریں اور ابن طلحہٰ کو......عمارت کے تہ خانے میں واقع کنٹرول روم کو تباہ کرنے کا مشن سونپ کر خود ہیا حبیب کو ساتھ لے کر......آئزر مین بیری کی خواب گاہ کی

طرف رخ کیا......اندر غلام گردشوں، ننگی ستونوں اور زینوں، لمبی چوڑی راہداریوں کی بھرمار تھی......محسن کو آئزر مین بیری کی خواب گاہ سے متعلق بھی خطرہ لاحق تھا کہ اس مکار انسان نے وہاں بھی اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کچھ کر رکھا ہوگا......اس کی خواب گاہ کے قریب پہنچ کر انہیں شدید حیرت اور تشویش کا جھٹکا لگا......جس کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور اندر کرا بھائیں بھائیں کر رہا تھا......ایکا ایکی کسی بھیانک اور خفتہ خطرے کی بو محسوس کر کے محسن کے پورے وجود میں سنسنی کی تیز لہر سرایت کرتی چلی گئی......

☆☆☆

لئیقہ شیریں اور ابن طلحہٰ نے تیزی کے ساتھ اپنے ہدف کی جانب پیش قدمی کی تھی اور......اس لفٹ کے قریب جا پہنچے جس سے صرف آئزر مین بیری ہی نیچے بیسمنٹ تک جاتا تھا......لئیقہ شیریں نے لفٹ کو اسٹارٹ کرنے کی سعی چاہی، مگر عبث۔ وہ نہ چلی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر اس کے ساتھ مزید چھیڑ چھاڑ کی تو آئزر مین بیری کی خواب گاہ میں ایک تیز سیٹی کی آواز ابھری......اس کے ساتھ جہازی سائز کے بیڈ پر اس کی وہی سیاہ نیگرو حسینہ، بلیک کوئین دراز تھی ......جو خود بھی ایک تربیت یافتہ اور چلتا پرزہ تھی......آئزر مین بیری ''گھنٹے'' کی نیند سونے کا عادی تھا مگر اس وقت جانے کیوں وہ اس قدر خواب غفلت کی نیند میں غرق تھا کہ خواب گاہ میں ابھرنے والی اس تیز سیٹی کی آواز پر بھی اس کی آنکھ نہ کھلی تھی۔ مگر اس کے ساتھ لیٹی، مہین سی نائیٹی میں ملبوس، وہ نیگرو حسینہ بلیک کوئین فوراً جاگ گئی......وہ اس سیٹی کا مطلب جان کر پہلے تو......یکدم وہشت زدہ سی رہ گئی اور پھر اس نے بری طرح جھنجوڑ کر آئزر مین بیری کو جگا دیا ......بیدار ہوتے ہی سیٹی کی اس آواز نے اس کا چہرہ بھی ایک دم مسخ کر ڈالا تھا......اور پھر دھواں دھواں چہرے کے ساتھ وہ بیڈ پر سے یوں اچھلا جیسے بستر کے اندر سے اسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

بیڈ سے اترتے ہی اس نے......سب سے پہلے قدرے جھک کر بیڈ سائڈ ٹیبل کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک سوئچ بٹن پش کر کے الارم آف کیا پھر جتنی جلدی ہو سکا، اس نے کوئین کو پستول نکالنے کی ہدایت کرتے ہوئے ایک دراز سے اپنا پستول بھی نکال لیا......اس نے ایک دیوار کیبنٹ کو کھول کر کسی مائک نما آلے پر اپنے گارڈز سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ بے سود رہی۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ خطرہ سر پہ تھا۔

اگلے چند سیکنڈوں بعد وہ دونوں اسی طرح سلیپنگ سوٹ میں ملبوس، خواب گاہ سے تیر کی طرح نکلے تھے کہ اپنے پیچھے انہیں دروازہ بند کرنے کا بھی یارانہ رہا تھا۔

وہ بلیک کوئین کے ساتھ تیزی سے ایک طرف کو دوڑتا چلا گیا اور راہداری عبور کرتا ہوا، ایک دوسرے کمرے میں آگیا......یہ وہ کمرا تھا۔ جہاں اس نے اسی طرح کے حالات کو فیس کرنے کے لیے کچھ اضافی بندوبست کر رکھے تھے مگر صرف اس حد تک کہ وہ یہاں سے ایک خفیہ راستے کے ذریعے فی الفور اپنی مطلوبہ جگہ تک پہنچ سکے، لہٰذا اب اس کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ وہ کسی طرح......بیسمنٹ میں بنے اپنے کنٹرول روم تک پہنچ جائے تاکہ وہ اپنے ٹریننگ کیمپ (سات منکال فورس) یا اسرائیلی اعلیٰ حکام سے مدد طلب کر سکے۔ اپنی فورس کے بارے میں اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ لقمۂ اجل بنادی گئی تھی۔

خواب گاہ میں بجنے والے الارم نے اسے یہ باور تو ضرور کرا دیا تھا کہ اس وقت لفٹ کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں۔ یقیناً، وہاں دشمنوں کی کوشش یہی ہوگی کہ وہ کسی طرح بیسمنٹ تک اس سے پہلے رسائی حاصل کرلیں۔ اس سے ملعون آئزر مین کو حالات کی خرابی اور دشمنوں کی سوچی سمجھی ''کارکردگی'' کا بھی اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے ایک مربوط پلاننگ اور اوورسیپ ریکی کر کے ہی اس کے ''عشرت کدے'' پر دھاوا بولا تھا۔

اس نے لفٹ کی طرف جانے کی غلطی کرنے کے... بجائے......اسی کمرے سے ملحقہ ایک دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہاں سے ایک زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا اور اسی زینے کی دوسری سمت میں ایک اور زینہ نیچے جاتا تھا ......اس نے اسی زینے کا رخ کیا تو کوئین چونکی۔ اس کا خیال تھا کہ آئزر مین خطرے کو بھانپ چکا ہے اور اب یہاں سے بہر صورت فرار کو ہی ترجیح دے گا، کیونکہ کیسل کے ٹاپ پر ایک چھوٹا چاپڑ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ جس میں صرف دو ہی افراد سما سکتے تھے۔

''ڈارلنگ......! اب نیچے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ......دشمن کے یہاں داخلے کا واضح مطلب ہے کہ کوئی فلسطینی مجاہد گروپ یہاں بڑی کامیابی کے ساتھ دھاوا بول چکا ہے، اب صرف فرار ہی ہمارے پاس واحد راستہ ہے'' ......آئزر مین بیری جونیئر، اپنی قریبی مشیر نما محبوبہ کا یہ مشورہ رد نہ کر سکا......اور پھر اس نے وہی کیا، یعنی بجائے نیچے جانے کے اس نے فرار کو ترجیح دیتے ہوئے......اور بیری

زینے کا رخ کیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر کمال کو جانے کیوں ملعون رشید کی آنکھوں سے جھلکتی عیارانہ چمک میں ایک سفا کی دبی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے ابھی تک اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا، جبکہ ڈاکٹر کمال اس کے جواب کا ہی منتظر رہا۔

''تم لوگ آزاد ہو......'' معا رشید کی کھرکھراتی آواز ابھری۔ ''بلکہ ہم اپنی ہونے والی بیوی...... حبیبہ کی خواہش کے مطابق تمہیں خود وہاں چھوڑ آنے کا بھی بندوبست کردیں گے جہاں تم لوگ جانا چاہتے ہو...... اور تمہاری یہ ساتھی بھی آزاد ہے۔'' اس نے اپنی بات پوری کرتے ہی جینی کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔

جینی کا چہرہ بھی اب خوف سے زیادہ غم ناکی میں گھلا ہوا نظر آتا محسوس ہورہا تھا۔ یقینی طور پر اس کا یہ دکھ حبیبہ سے ہی منسوب تھا۔ بلکہ اس نے تو اسے اپنی سہیلی بنالیا تھا۔

بہر طور...... رشید کی طرف سے ایسا اشارہ پاکر وہ فوراً کرسی سے اٹھ کر ڈاکٹر کمال کی طرف بڑھ گئی۔

پھر رشید نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور تحکمانہ اس سے بولا۔

''ان لوگوں کو جہاں یہ کہیں، چھوڑ آؤ...... باہر گاڑی موجود ہے......'' اس کا ڈشکرا اپنے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ لیے ان کی طرف بڑھا اور انہیں اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر کمال کے اندر اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر سامنے غمزدہ بیٹھی حبیبہ کی طرف دیکھا اور پھر آگے قدم بڑھائے، جبکہ احمد حمادی ایک ذرا نگاہ اٹھا کر بھی حبیبہ کی طرف دیکھنے کی نہ ہمت کرسکا تھا اور نہ ہی یہ ہمت خود حبیبہ میں ہوئی تھی۔

کمال، جینی اور احمد حمادی اس ڈشکرے کے ساتھ کوٹھری نما گپھا سے باہر آگئے۔

سامنے اونچے چوڑے اور مخصوص ٹائروں والی جیپ کھڑی تھی اور اس کے اندر...... پچھلی سیٹ پر دو اور ڈشکرے براجمان نظر آئے...... یہ تینوں مسلح تھے۔ کمال کی چھٹی حس بتارہی تھی کہ ان کا منصوبہ کچھ اور تھا...... اور یہی وہ خدشہ تھا جو بہت پہلے سے ڈاکٹر کمال کے اندر بار بار کوڑیالے سانپ کی طرح سر اٹھاتا رہا تھا...... وہ تو اسی وقت ہی اندر سے کھٹک گیا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ رشید حبیبہ سے شادی کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے انہیں آزاد کرنے پر راضی ہوگیا تھا۔ اتنا تو ڈاکٹر کمال سمیت احمد حمادی اور جینی بھی سمجھ ہی چکے تھے کہ حبیبہ نے رشید کی بات یقیناً اسی شرط پر ہی مانی ہوگی...... کہ وہ کمال وغیرہ، بالخصوص...... اپنے محبوب منگیتر کی، رشید جیسے سفاک انسان کے ہاتھوں سے جان بچانا چاہتی تھی۔ مگر کم از کم ڈاکٹر کمال کو رشید جیسے فریبی شیطان سے اس ''خیر'' کی بالکل توقع نہ تھی کہ وہ حبیبہ کی شرط کو تسلیم کرتے ہوئے ایسا ہی کرتا۔ وہ انہیں راستے میں کہیں مروا بھی سکتا تھا...... اور بعد میں رذیل صفت رشید، حبیبہ کو یہی بتاتا کہ اس کے ساتھیوں کو اس نے وعدے کے مطابق چھوڑ دیا ہے، وغیرہ۔

جیپ میں بیٹھے ہوئے اس کے مزید دو مسلح ساتھیوں کو تو دیکھ کر ڈاکٹر کمال کو اپنے اس یقینی نوعیت کے خدشے پر...... پورا یقین ہو چلا تھا......

معاملہ چونکہ بہ ظاہر خوش اسلوبی سے نمٹتا ہوا ہی نظر آرہا تھا، اسی لیے، وہاں ان کے اریب قریب، ان لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا...... ڈاکٹر کمال کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، جیسے ابھی یہاں کسی بھی وقت خوں ریزی چھڑنے والی ہو...... یہ سب جیپ میں سوار ہونے لگے تو کمال کی نظریں غیر محسوس انداز میں اطراف کا طواف کرنے لگیں...... اسی وقت جب یہ تینوں جیپ میں سوار ہوگئے اور ان کا تیسرا ساتھی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف سے سوار ہونے لگا تو کمال کا دل ایک منظر دیکھ کر یکبارگی زور سے دھڑکا۔

کسی نے عقب سے اس ڈشکرے پر حملہ کیا تھا...... یہ حماد ہی تھا، اس نے قرولی اس کی پشت میں گھونپ دی تھی...... اور چشم زدن میں پھرتی کے ساتھ اس کی گن اپنے قبضے میں کرلی تھی...... عقبی سیٹ پر براجمان اس کے دونوں ساتھی ڈشکرے بری طرح بدکے اور جب تک سنبھلنے کی کوشش کرتے...... حماد نے باہر ہی سے کھڑے کھڑے اپنی گن کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے ایک برسٹ فائر کردیا...... اس کی اس متوقع حرکت کو پہلے ہی بھانپ کر کمال جینی اور احمد نے بیک وقت اپنے سر نیچے جھکالیے تھے۔

گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ میں ان دونوں ڈشکروں کی کریہہ انگیز چیخیں بھی شامل تھیں۔

''حماد......! اندر چلو...... حبیبہ بہن ابھی اس شیطان کے قبضے میں ہے......''

کمال چلایا۔ اسے خدشہ تھا کہ معاملہ اب یا تو بالکل بگڑ گیا تھا یا پھر سب کچھ ٹھیک ہو چلا تھا...... احمد حمادی تو پہلے ہی جوش میں تھا۔ لہٰذا اس نے عالم طیش میں اپنے دانت بھینچتے ہوئے...... مردہ دشمنوں کی گن اٹھائی...... اور دیوانہ وار رشید کی گپھا کی طرف دوڑا۔ کمال نے بھی اس کی تقلید کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی...... اگرچہ آتشیں ہتھیاروں سے اسے عرصہ ہوا کوئی یارانہ رہا تھا مگر کالج میں نیشنل کیڈٹ کور ٹریننگ اور پھر شکار کے شوق میں اس نے گن چلانا سیکھ لی تھی۔ وہ آج کام آہی گئی۔

یوں بھی جشن اور ہلا گلا کا سماں تھا، جس میں بدمست قہقہوں کے ساتھ گاہے بگاہے ہوائی فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ ان سب نے آناً فاناً رشید کی گپھا کا رخ کیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی احمد حمادی کی خوں ناک متلاشی نظروں نے رشید کو دیکھا اور اس وقت اس کا خون ابل کر جیسے آنکھوں میں سمٹ آیا جب اس نے...... اس رذیل کو اپنی منگیتر حبیبہ کے قریب بیٹھے اسے لبھاتے ہوئے دیکھا، حبیبہ یہ منظر دیکھ کر چونکی جبکہ رشید کی آنکھیں حیرت و تشویش کے باعث پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... اسی وقت حبیبہ نے جیسے کایا پلٹتے دیکھ کر ایک ہوشیاری دکھائی، وہ پھرتی کے ساتھ...... رشید جیسے شیطان کے پاس سے ہٹ کر دور ہوگئی۔ اسی وقت...... رشید کے وہاں موجود ڈشکروں نے اسے نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی مگر ڈاکٹر کمال اور حماد اندال نے اپنی گنوں سے انہیں بھون کر رکھ دیا اور پھر حمادی کی گن بھی گرجی...... رشید اس کی رائفل کا برسٹ کھا کر گرا تھا...... مگر حمادی پر جیسے جنون سوار تھا...... اس نے لبلبی سے انگلی نہیں ہٹائی۔ کمال نے ہی اسے سنبھالا دیا تھا کہ ابھی یہ سب لوگ خطرے میں ہیں، اسی لیے یہاں سے نکلنے کی کرو۔

حبیبہ...... فرط خوشی سے ان کے ساتھ آن ملی تھی بلکہ اپنے بھائی حماد اندال کو بھی زندہ سلامت دیکھ کر خدا کا شکر بجالائی تھی...... یہ لوگ باہر نکلے تو چند مسلح ڈشکرے جنہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا، ڈیرے سے انہوں نے یہاں کا رخ کیا تھا...... مگر اب کمال اور حماد وغیرہ انہیں کہاں اپنے سامنے ٹکنے دیتے، ایک بار پھر دوبدو مقابلہ ہوا جو محض چند سیکنڈوں پر ہی محیط رہا۔ فتح انہی کی ہوئی تھی...... پھر اس سے پہلے کہ مزید ان کے ساتھی اس طرف متوجہ ہوتے، یہ پانچوں اسی جیپ میں سوار ہوکر...... آندھی طوفان کی طرح وہاں سے فرار ہوگئے۔

ان سب نے اس مصیبت سے چھٹکارا پانے پر خدا کا

شکر ادا کیا تھا، پھر حماد سے اس کی کہانی دریافت کرتے ... ہوئے ان کی والدہ کا پوچھا تو ...... حماد نے پہلے احمد کو گاڑی ایک مطلوبہ سمت کی طرف موڑنے کا کہا ...... وہاں پہنچے تو ...... یہ دیکھ کر سب ٹھٹک گئے کہ اس طرف ...... ابن قصی کی وہی کار کھڑی تھی، جس میں وہ حماد اور اس کی والدہ حاجرہ کو یرغمال بنا کر روانہ ہوا تھا مگر اب کار میں صرف حاجرہ ہی موجود تھی۔

اسے بھی جیپ میں سوار کروایا گیا ...... اور یہ قافلہ اربل کی طرف گامزن ہو گیا ...... راستے میں حماد اندال نے بتایا کہ اس نے کسی طرح راستے ہی میں قصی کو چکما دے کر اس سے رہائی حاصل کر لی تھی اور ...... پھر اسی کی کار لیے وہ اپنی والدہ سمیت فرار ہو کر ان لوگوں کی تلاش میں یہاں تک آن پہنچا تھا۔ تاہم اسے ام کلثوم کے انتقال کا سن کر بے حد رنج ہوا تھا۔

پو پھٹنے لگی تھی۔ دور صحرائی افق سے سورج طلوع... ہونے لگا تھا ...... راستے میں ...... احمد حمادی کو حبیبہ سسکیوں کے درمیان بتا رہی تھی کہ اس نے ان کی جان بچانے کی ہی غرض سے اگرچہ رشید جیسے شیطان کی بات مانی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ بعد میں اس نے بھی اپنی جان ختم کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا تھا بھلا کہ تم میری جان بچا کر اپنی جان قربان کر دو گی ......؟''

اس کی بات سن کر احمد نے ہولے سے شکوہ کیا۔ ''میں کیسے تمہارے بغیر چین سے رہ سکتا تھا ......؟ تمہارے بغیر تو میں ایک زندہ لاش ہی بن کر رہ جاتا ......''

''اللہ نہ کرے ...... اب اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دو ...... حمادی ......!'' حبیبہ نے ہلکی سرگوشی میں اس سے کہا ......

ان کا سفر جاری تھا ...... اربل سے یہ لوگ موصل پہنچے ...... وہاں کے حالات نسبتاً بہتر تھے۔ احمد حمادی کے دونوں ماموں ابو شیرازی اور رضا شیرازی انہیں دیکھ کر آنسوؤں سے لبریز چہروں سے ملے پھر اپنی بہن کی رحلت اور ان کے حالات جان کر رو پڑے ...... بڑی مشکل سے یہ طوفان آہ و فغاں تمام ہوا تو ...... حماد اندال کو اپنے دونوں مہمان دوستوں یعنی ڈاکٹر کمال احمد اور جینی کی فکر ہوئی۔ ان سے متعلق اس نے مدد چاہی تو ...... ابو شیرازی اور رضا نے ان کو تسلی دی کہ وہ ان دونوں کو اردن یا ایران کے ذریعے ...... برطانیہ پہنچانے کی کوشش کریں گے ...... وہاں یو این او کا ایک ذیلی ادارہ ...... عراق میں پھنسے ایسے افراد کی ضروری جانچ پڑتال کے بعد ان کے اپنے ممالک تک پہنچانے ۔۔ کا خاطر خواہ بندوبست کرنے میں مصروف تھا۔

یہ معاملہ بھی اگلے چند دنوں میں ...... بہ حسن و خوبی انجام پا گیا ...... رخصت ہونے کا یہ عمل بہت رقت انگیز تھا۔ حماد نے بہت دکھ، رنج اور شرمساری کے ساتھ انہیں رخصت کرنے کے دوران بولا تھا۔

''دوستو ......! مجھے سخت شرمندگی ہے کہ ...... میں نے آپ کو محض اپنے ایک شوق اور فضول خواہش کی خاطر ...... اتنی بڑی مصیبت میں پھنسا دیا تھا ...... یقین کرو مجھے سب سے زیادہ فکر تم دونوں ہی کی تھی۔ کاش ......! یہ سب نہ ہوا ہوتا ...... کاش ......'' حماد کی بات، اس کی آواز اور اس کے لہجے میں حقیقی تڑپ کو محسوس کر کے ...... ڈاکٹر کمال اور جینی دونوں ہی رنجیدہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر کمال نے دوستانہ سی مسکراہٹ سے حماد کے شانے پر اپنا ایک ہاتھ رکھ کر اسے ہولے سے تھپتھپا کر کہا۔

''نہیں حماد ......! ایسا کہہ کر ہمیں شرمندہ نہ کرو ...... تم جس سچے جذبے اور سچی محبت کے ساتھ مجھے اور جینی کو اپنے ساتھ عراق لائے تھے اور ہم نے تمہارے والدین اور بہن حبیبہ کے ساتھ جتنا بھی مختصر وقت گزارا وہ ہمیں بالکل ایسا ہی لگا تھا جیسے ہم اپنوں میں، اپنے پیاروں میں بیٹھے ہوں ...... مگر افسوس کہ تمہارے محبت کرنے والے والد... اب اس دنیا میں نہیں رہے، ہم ان کی مغفرت کی دعا ہی کر سکتے ہیں اور ان کا ہم سے پیار اور شفقت بھرا انداز بھی ہم کبھی نہیں بھول سکتے ...... بہر حال ہماری دعائیں آپ لوگوں کے ساتھ ہیں، اس کے علاوہ ہم اللہ سے دعا بھی کرتے ہیں کہ وہ تمہارے وطن کے حالات جلد بہتر کرے ......''

کم و بیش جینی نے بھی وفورِ جذبات کے ساتھ اسی طرح کے الفاظ حماد اور بالخصوص حبیبہ سے بھی کہے ...... اس کے بعد دونوں ...... یو کے کی طرف پرواز کر گئے۔

لندن پہنچ کر ہی ڈاکٹر کمال پر کئی انکشافات ہوئے ...... پہلا انکشاف تو اس کی ...... ائرپورٹ پر ...... گرفتاری کی صورت میں پیش آیا کہ جینی کے باپ جان نسویٹر نے اس پر اپنی بیٹی (جینی) کے اغوا کا کیس دائر کر رکھا تھا ...... جبکہ گرفتاری کے وقت جینی چیخ پڑی تھی ...... کہ اس کے باپ نے ...... ڈاکٹر کمال سے ایک پرانی عداوت کے باعث اس پر جھوٹا الزام عائد کیا ہے ...... وہ اس کے ساتھ اپنی مرضی سے عراق گئی تھی ...... وغیرہ ...... مگر اس کی کسی نے نہیں سنی، تو جینی نے بھی پولیس والوں کا پیچھا اتنی آسانی سے نہ چھوڑا اس نے فوراً ہمیشہ کی طرح اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس سے مدد طلب کی اور انہیں اصل حقائق سے آگاہ کیا۔ اغوا کا کیس تو جینی کے اپنے بیان سے ہی لغو قرار دے دیا گیا تھا ...... لہٰذا چند گھنٹوں بعد ہی ڈاکٹر کمال کی رہائی عمل میں لائی گئی اور اس دوران کمال اور جینی کو اس حقیقت کا بھی علم ہوا کہ ...... ان کے ''غیاب'' کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ...... ڈی کارلو کے باپ نیتن ڈیوڈ نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا اور اپنے بیٹے کی ضمانت کروالی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس خبیث نے اس کے بھائی ظہیر احمد کو بھی گرفتار کروا لیا تھا ...... کمال کی رہائی کے بعد ظہیر بھی رہا ہو گیا تھا ...... اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس جینی کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھی۔

پھر جب ان پر آخری انکشاف یہ ہوا کہ ظہیر کی فیملی کو بھی نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا تھا تو یہ بات از خود ہی سمجھ میں آنے والی تھی کہ ...... یہ ''حرکت'' کون کر سکتا تھا ......؟ یہی بات ...... ڈی کارلو کے گلے کا پھندا ثابت ہوئی ... اور پولیس نے اسے اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ اپنے باپ نیتن ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق لندن سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا ......

اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس کے لیے ڈی کارلو کے منہ سے اگلوانا مشکل ثابت نہ ہوا کیونکہ سارے شواہد اس کے خلاف جا رہے تھے ...... رڈنی کی گرفتاری عمل میں آجانے کے بعد ...... ظہیر کے بیوی بچوں کو بازیاب کروا لیا گیا ...... اور ڈی کارلو ...... ایک لمبی سزا پر دوبارہ جیل چلا گیا۔

آج ظہیر احمد کا گھر خوشیوں کا گہوارا بنا ہوا تھا ...... وہاں دن کے کھانے میں سب موجود تھے ...... ظہیر احمد، اس کی بیوی پروین، دونوں بچے ...... ڈاکٹر کمال اور جینی بھی۔

یہ لوگ سب سے زیادہ ...... جینی کے ہی شکر گزار تھے جس نے سچ کی خاطر اپنے لوگوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ...... ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

یونیورسٹی سے ڈی کارلو پر ''نان گریٹا پرسن'' کا لیبل لگا کر اس کا نام خارج کر دیا گیا تھا جبکہ ڈاکٹر کمال احمد کو لیڈز یونیورسٹی والوں نے بڑی عزت کے ساتھ ری جوائن کر لیا تھا۔

اس عزت افزائی پر ڈاکٹر کمال کے فیلوز نے ان دونوں کے اعزاز میں ایک پارٹی کا بھی اہتمام کر ڈالا ...... ان میں زیادہ تعداد مسلم ممالک کے اسکالرز کی تھی۔

جینی بہت خوش تھی۔ وہ سمجھتی تھی اس نے کمال کے ساتھ دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔

ادھر الیا بیتھ اور شن بیتھ کے فوہاگ اور مادام میڈوسا ان کی آمد سے صرف چند گھنٹے پہلے ان کی تلاش میں ''جھک مارنے'' ایک خصوصی امریکی چارٹرڈ طیارے کے ذریعے عراق کی طرف کوچ کر چکے تھے۔

☆☆☆

اپنے شکار کو راہ فرار اختیار کرتے دیکھ کر لیلیٰ نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے، اس کی گن کا رخ اسی کی طرف تھا، تب اس نے ہولے سے خود کلامیہ بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے خود ہی اپنی موت کو آواز دے ڈالی ... مگل ......!'' لیلیٰ نے برسٹ فائر کر دیا۔ مگل چھلنی ہو کر گرا اور وہیں ٹھنڈا پڑ گیا۔

لیلیٰ کو اب اپنی اور بانو کی فکر ہوئی۔ اس نے چلا کر بانو کو اپنے پیچھے آنے کا کہا اور ایک جانب دوڑی ...... اور کچھ سوچ کر اس نے مگل کی ہی رہائش گاہ کا رخ کیا ...... مگر رکنے کے لیے نہیں ...... وہ اندرونی زینے طے کرتی ہوئی اوپر چھت پر پہنچی تھی۔ بانو اس کے عقب میں تھی ...... اور لیلیٰ کے اس اقدام پر الجھن آمیز حیرت کا شکار تھی؛ کیونکہ اس کے مطابق اب مگل کی رہائش گاہ ان کے لیے چوہے دان بھی ثابت ہو سکتی تھی ...... لیلیٰ نے اندر داخل ہوتے ہی اوپر چھت کی طرف جانے والے زینے کا رخ کیا ...... بانو اب بھی اس کی حکمتِ عملی نہ سمجھ پائی ...... بلکہ اس کے خیال میں چھت پر جانا بھی ان کے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہاں سے وہ منڈیروں پر بنی چوکیوں کی زد میں آسکتے تھے، لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا۔ لیلیٰ نے چھت پر بنی ایک دیوار کی آڑ لے کر ...... ایک راکٹ داغا ...... چوکی کے پرخچے اڑ گئے ...... لیلیٰ پھر رکی نہیں ...... وہ اسی طرح ایک مکان سے دوسرے مکان کی چھتیں اور منڈیریں ناپتی ہوئی ...... ایک ایسے مکان کی چھت کے قریب آن پہنچی تھی، جس کے بالکل قریب ...... وہ تباہ حال چوکی تھی ...... لیلیٰ نے وہی خودکار آنکڑا نکال کر پہلے بانو کو اوپر پہنچایا اور پھر خود تباہ حال چوکی کے ملبے پر آ پڑی۔

بانو اب لیلیٰ کی اس چابک دستی اور ذہانت پر ششدر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ یہی وہ مقام تھا، جدھر اسرائیلی کچھ لمحے کے لیے متوجہ تو ضرور ہوئے تھے، لیکن اس طرف کا انہوں نے رخ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''نیچے کودو ...... جلدی ......'' لیلیٰ نے بانو سے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا ...... اور اینکر کا فیتا بانو کی جانب بڑھا دیا ...... بانو پھرتی کے ساتھ دیوار کے دوسری طرف اتری تو لیلیٰ اپنی پیرا ٹروپنگ کی تکنیک سے پہلے ہی نیچے آ چکی تھی ...... یہ آفیسرز کالونی کا بعید ترین گوشہ تھا ...... دشمن اندر ان کی... تلاش میں ٹامک ٹوئیاں ہی مارتے رہ گئے اور یہ دونوں ...... کالونی کی عمارت سے دور ہوتی چلی گئیں، حتیٰ کہ انہوں

نے اپنے فلسطینی میزبان کے گھر ہی آ کر پناہ لی۔
وہاں...... راشدین کی بہن سامہ..... بے چینی سے منتظر تھی...... ان دونوں کو زندہ سلامت دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ لیلیٰ نے قدرے متاسفانہ انداز میں بتایا کہ...... مشن کسی حد تک کامیابی سے ہمکنار تو ہوا ہے، مگر جس انداز سے وہ اسے پورا کرنا چاہتی تھی وہ نہ ہو سکا تھا، جبکہ بانو مطمئن نظر آتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مشن سو فیصد کامیاب رہا تھا...... اسرائیلیوں کی اس آفیسرز کالونی میں، اتنے پہرے کے باوجود اندر داخل ہونا اور کافی حد تک تباہی مچانے کے بعد ایک تعمیراتی کمپنی کے ذمے دار افسر مائیکل مچل.... جو اسرائیلی نسلی دیوار کی تعمیر میں پیش پیش تھا...... اسے واصل جہنم کر ڈالا تھا۔

''عزیزی لیلیٰ......! یہ تمہارا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے...... اس سے دیگر افسران، جو اسرائیل کے اس مکروہ منصوبے کی آب یاری کرنا چاہتے تھے، ان کا مورال گرا... ہوگا، وہ خوف کا شکار ہو گئے ہوں گے، نیز اسرائیلیوں کا یہ دعویٰ بھی باطل ثابت ہوا کہ وہ اس منصوبے کے شریک کاروں کو مکمل تحفظ فراہم کر سکتے ہیں...... جس میں وہ اب مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں......'' لیلیٰ کو مایوس سا دیکھ کر...... بانو کی طرح...... سامہ نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی اور ساتھ ہی ایک خوشخبری بھی سنائی کہ...... فلسطینی آباد کاروں کی اسرائیلی نسلی دیوار کے خلاف تحریک بھی زور پکڑنے لگی ہے... اور عالمی مسلم برادری نے بھی اس کے خلاف اقوام متحدہ میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا ہے۔ اس موقف کے ساتھ کہ بہ ظاہر اسرائیل کا یہ غاصبانہ منصوبہ حالات کو خراب ہونے سے بچانا اور یہودیوں اور فلسطینیوں کی الگ الگ بستیوں کی تعمیر سے ان کے بیچ امن و امان کی فضا قائم کرنا ہے...... وغیرہ۔

مگر اب یہودیوں کی یہ فریب کار چال ناکامی سے دوچار ہوئی ہے......

لیلیٰ کے لیے یہ خبر امید افزا ثابت ہوئی۔ اس پر بانو نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔

''لیلیٰ بہن......! ہماری اس تازہ کارروائی کے بعد تو اسرائیلیوں کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے جائے گی......''

یہ باتیں ناشتے کے دوران ہو رہی تھیں، ناشتا سامہ نے ہی ان کے لیے بنایا تھا...... جو کھجور کی روٹی، مربے اور اونٹ کے دودھ پر مشتمل تھا۔

اس دوران اچانک لیلیٰ کے ذہن میں گزشتہ شب والا وہ عجیب واقعہ ابھرا، جب وہ اور بانو اپنے مشن کے لیے سامہ کے گھر کی بیٹھک سے روانہ ہو رہی تھیں اور...... انہوں نے گھر کے دروازے سے کسی اجنبی کو نکلتے دیکھا تھا...... پہلے تو لیلیٰ نے اسے کچھ خاص اہمیت نہ دی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے سامہ سے بہت دھیمے لہجے میں ذکر کر ہی ڈالا، تو سامہ...... یہ سن کر پہلے تو پریشان سی ہو گئی لیکن پھر اس کا چہرہ شرم کی لالی سے گلنار ہو گیا...... اس کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر بانو کے ہونٹوں پر تو معنی خیز مسکراہٹ ابھری تھی لیکن...... لیلیٰ کے چہرے پہ اتھاہ سنجیدگی طاری رہی۔ تب سامہ نے مارے شرماتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک فلسطینی عرب نوجوان ابوعبید تھا، جو ان کا پڑوسی بھی تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

''لیکن سامہ بہن...... ! رات کے درمیانی پہر اس کا اس طرح تم سے ملنے آنا کچھ معیوب نہیں لگتا......؟ وہ اس کا سیدھا طریقہ بھی استعمال کر سکتا ہے، یعنی تم دونوں اپنے بڑوں تک یہ بات کیوں نہیں پہنچا دیتے......؟ بھلا اس میں کیا قباحت ہے؟''

اس پر سامہ کے چہرے پر ایک حسرت زدہ سی شام اتر آئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔

''پہلے ہم نے یہی سوچا تھا، مگر میرے گھر والے اس رشتے کے خلاف ہیں......''

''کیوں...... اس کی کوئی خاص وجہ......؟'' لیلیٰ نے اپنی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں...... وہ جواباً ایک گہری سانس خارج کر کے بولی۔

''میرے والد اور بھائی...... ابوعبید والوں کو اچھا نہیں سمجھتے...... ان کے خیال میں یہ لوگ فلسطینیوں کے اس مٹھی بھر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو...... اسرائیلیوں کے خلاف مزاحمت کے حامی نہیں ہیں...... بلکہ ان میں سے چند تو صیہونی مراعات لینے کے لیے مجاہدوں تک کی مخبریاں کرنے سے بھی نہیں چوکتے، یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے۔''

''پھر تو تمہیں بھی ابوعبید سے ہر طرح کا تعلق توڑ دینا چاہیے......'' لیلیٰ نے فوراً اس کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا...... اور آگے بولی...... ''کیا تم نہیں جانتی ہو سامہ...... کہ ایسے لوگوں کو ہم ارضِ فلسطین کے غداروں میں شمار کرتے ہیں؟''

''عزیزی لیلیٰ......! یہ ایک غلط فہمی ہے لوگوں کی افواہ ہے یہ...... جو ہمارے ہی ایک رقیب کی پھیلائی ہوئی ہے...... تاکہ یہ رشتہ نہ ہونے پائے...... ابوعبید یا اس کے گھر والے ایسے نہیں

ہیں۔'' سامہ نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

اچانک لیلیٰ کے ذہن طباع میں ایک خیال، خدشہ بن کر ابھرا، بولی۔

''تم نے اسے ہمارے بارے میں تو نہیں بتایا......؟''

لیلیٰ کے اس سوال پر سامہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے گھبراہٹ کے تاثرات ابھرے تھے اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی جبکہ لیلیٰ اور بانو کو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر جواب مل گیا۔ ٹھیک اسی وقت باہر...... ایک سے زائد گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں ابھریں۔ وہ تینوں بری طرح ٹھٹک گئیں...... اسی وقت ایک میگا فون کے بنکارنے کی کریہہ آواز ابھری...... ''لیلیٰ آفندی...... خود کو ہمارے حوالے کر ڈالو...... اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے...... ہم پانچ تک گنتی گنیں گے، اگر تم ہاتھ اوپر اٹھائے دروازے پر نظر نہ آئیں تو تم سمیت اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے...... ایک...... دو......''

لیلیٰ، بانو اور سامہ کے چہرے سن ہو کر رہ گئے...... سامہ کے بوڑھے ماں باپ بھی ان کے کمرے میں آ گئے، وہ بھی پریشان اور ہراساں دکھائی دے رہے تھے...... لیلیٰ نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ ایک تکلیف دہ فیصلہ کیا...... اور...... فوراً دروازے کی طرف لپکی۔

''لل...... لیلیٰ بہن کہاں جا رہی ہو......؟'' بانو اٹھ کر اسے روکنے کو لپکی تو لیلیٰ نے سپاٹ لہجے میں کہا...... ''یہاں میری وجہ سے تم چار بے گناہوں کی زندگی خطرے میں ہے...... بہتر یہی ہوگا کہ میں خود کو...... ان کے حوالے کر دوں...... تم فکر نہ کرو...... میں زیادہ دیر ان یہودی غاصبوں کی قید میں نہیں رہوں گی اور ہاں...... تم فوراً یہاں سے بیت صفانہ نکل جانا۔ فی امان اللہ......''

بانو اسے روکتی رہ گئی لیکن لیلیٰ اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے دروازے پر آ گئی۔

سامنے...... اسرائیلی فوجیوں کی بھاری بھرکم گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے گرد متعدد مسلح فوجی، آٹومیٹک گنیں... تھامے مستعد کھڑے تھے...... ایک یہودی فوجی افسر کے ہاتھوں میں میگا فون تھا اور اس کے ساتھ...... شاید...... احرنوت بھی موجود تھا...... کوئی نہیں جان سکا تھا کہ یہ سب کیسے اچانک ہو گیا تھا؟ کس نے مخبری کی تھی کہ لیلیٰ اس گھر میں موجود تھی؟...... یہ صرف لیلیٰ ہی کے دل میں ایک مبہم سی کھٹک تھی۔

لیلیٰ رضا کارانہ گرفتاری کے لیے جیسے ہی

غلطی

ایک صاحب کتابیں فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کا نام ضمیر الدین تھا۔ جب ان کا کاروبار خوب چمک گیا تو انہوں نے دکان کا بورڈ لکھوانے کی غرض سے ایک پینٹر کو بلا کر بورڈ بنانے کا آرڈر دیا۔ بورڈ پر انہوں نے لکھوایا تھا۔

ضمیر الدین کتاب فروش

لیکن جب وہ بورڈ لکھ کر لایا تو یہ صاحب بورڈ پر لکھے مضمون کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پینٹر نے غلطی سے بورڈ پر جو عبارت لکھ دی تھی۔ وہ اس طرح تھی۔

کتاب الدین ضمیر فروش

سنہری موقع

جج (چور سے) ''تم نے جوہری کی دکان سے زیور چرائے تھے؟''

چور۔ ''جی ہاں۔''

جج۔ ''مگر کیوں...... کیا تمہیں پکڑے جانے کا ڈر نہیں تھا؟''

چور۔ ''جناب میں کیا کرتا۔ دکان کے شوکیس پر تحریر تھا۔ سنہری موقع سے فائدہ اٹھائیے۔''

وفا کیا ہے

☆ وفا وہ پھول ہے، جو محبت کے دامن میں آنے سے پہلے ہی مرجھا جاتا ہے۔

☆ وفا ایک آئیڈیل ہے۔ جو مشکل سے ہی محبت کو حاصل ہوتا ہے۔

☆ وفا وہ غزل ہے جس کا پتا محبت آج بھی ڈھونڈ رہی ہے۔

☆ وفا وہ رنگ ہے۔ جو آج کل دنیا میں نایاب ہے۔

☆ وفا وہ دل ہے جو ہر جگہ نہیں دھڑکتا۔

☆ وفا ایک ایسا آنسو ہے جو خاموشی سے چھلک جاتا ہے۔

☆ وفا وہ دامن ہے۔ جو ہمیشہ محبت کے آگے پھیلا رہتا ہے۔

☆ وفا وہ کٹھن راہ ہے جس پر چلنا مشکل ہے۔

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

دروازے پر آئی ...... ایکا ایکی گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سے فضا گونج اٹھی ...... لیلیٰ چھلنی ہو کر گری ...... اگلے چند سیکنڈوں کے بعد ...... یہ اسرائیلی خونی کارواں ...... اپنی راہ ہولیا۔

لیلیٰ کو اسرائیلیوں نے دھوکے سے ہلاک کیا تھا۔ وہ اس سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ...... اسے دیکھتے ہی گولی ماردینے کے احکامات صادر کردیے گئے تھے۔

لیلیٰ کی شہادت پر عرب بستیوں میں کہرام مچ گیا ...... بانو اور سامہ کو تو جیسے سکتہ ہوگیا۔ لیلیٰ جیسی بڑی مجاہدہ کا اتنی جلدی اور غیر متوقع طور پر اتنی آسانی سے اسرائیلی خونی دستے کے ہاتھوں ہلاک کردیا جانا یہودیوں کی باقاعدہ مربوط منصوبہ بندی کی غمازی کرتا تھا کون نہیں جانتا تھا کہ خلیل الوزیر اور ابوجواد جیسے بڑے لیڈرز مجاہدوں کو بھی اسی طرح دھوکے اور مخبری سے شہید کیا گیا تھا......

بانو کا غم سے برا حال تھا۔ اسے تو لیلیٰ جیسی عظیم مجاہدہ کی اس طرح ہلاکت کا یقین ہی نہیں آرہا تھا...... یہی سبب تھا کہ وہ کچھ دن سامہ کے گھر سے ہلی تک نہیں تھی ...... اس کا دماغ ہی ماؤف رہا تھا...... یوں بھی وہ اکیلی ...... بیتِ صفانہ نہیں جاسکتی تھی ...... ابھی وہ ان خفیہ راستوں سے نابلد تھی ...... اسے سامہ کے بھائی راشدین کا انتظار تھا، اسے امید تھی کہ لیلیٰ کی شہادت کا سن کر وہ ضرور یہاں پہنچے گا۔

یہ اسی رات کا ذکر تھا...... بانو ...... غم زدہ سی اپنے بستر پر دراز تھی ...... نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ بس یوں ہی خالی الذہنی کی حالت میں دراز تھی۔ دوسری مسہری پر سامہ لیٹی ہوئی تھی ...... اچانک بانو نے سامہ کو بستر سے اٹھتے دیکھا...... سامہ اسی کی طرف تکے جارہی تھی۔ بانو کو نہ جانے کیوں اس کے اس طرح تکنے سے اپنے وجود میں سنسنی کی لہرسی اٹھتی محسوس ہوئی ...... وہ کچھ سوچ کر اسی طرح اپنی آنکھیں موندے سوتی بنی رہی ...... اسے جانے کیوں ...... سامہ کا یہ انداز پراسرار ہی لگا تھا ...... رات کا ابھی ابتدائی پہر تھا۔ تاہم ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ سامہ نے قریب مسہری پر سوئی پڑی بانو پر ایک نگاہ ڈالی اور بے آواز دروازہ کھول کر باہر نکل گئی ...... اس کے چند ہی پل بعد بانو بھی آہستگی سے اٹھی اور پھر جانے کیا سوچ کر اس نے اپنے تکیے کے نیچے چھپایا ہوا پستول ہاتھ میں لے لیا۔ وہ کمرے سے نکل کر مختصر سے صحن میں آگئی۔ دوسرے کمرے میں سامہ کے بوڑھے ماں باپ بے خبر سو رہے تھے ...... سامہ ...... صحن سے ملحقہ بیٹھک والے کمرے میں آگئی اور بانو بھی چند ثانیے ایک جگہ دبکنے کے بعد آگے بڑھی اور ...... بیٹھک والے دروازے کے قریب دروازے سے کان لگائے چپکی کھڑی ہوگئی۔

''عبید ......! میری جان ...... آخر ہم کب تک اس طرح ملتے رہیں گے......؟ تم نے کہا تھا کہ تم بہت جلد میرے والدین اور بھائی راشدین سے مل کر...... ان کی غلط فہمی دور کردو گے......؟'' دروازے سے کان لگائے کھڑی بانو نے سامہ کی جذبات میں ڈوبی آواز سنی تو اس کے سینے میں اتھل پتھل مچنے لگی۔ پھر اسے کسی جوان مرد کی سرگوشیانہ انداز کی آواز سنائی دی جو سامہ سے کہہ رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ وہی ابوعبید نامی نوجوان تھا جس کے بارے میں وہ انہیں بتا چکی تھی۔

''تم جانتی ہو سامہ کہ میں تمہارے والدین اور بھائی کو بہت سمجھا چکا ہوں اور ہر طرح سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہاں تک بھی سمجھا چکا ہوں کہ ہم غدار نہیں ہیں ...... بلکہ امن و امان اور سکون کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں ...... کیا فائدہ اسرائیلیوں، یہودیوں سے جنگ کرنے کا......؟''

''وہ تو ٹھیک ہے...... مگر اب کیا ہو......؟ ہم کیسے ایک ہوسکتے ہیں ......؟ تم ہی کچھ ہمت دکھاؤ نا......؟'' سامہ بے چینی سے بولی۔

''میں تو تیار ہوں مگر تم......؟''

''میں بھی تیار ہوں......''

''تو بس پھر ہمیں کسی کو منانے کی ضرورت نہیں، اور مجھے یقین ہے کہ وہ مانیں گے بھی نہیں، اس کا آسان حل یہی ہے کہ...... ہم شادی کرلیتے ہیں اور میں تمہیں اپنی بیوی بنا کر اپنے گھر لے جاتا ہوں......'' ابوعبید بولا تو سامہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

''ہائے ...... ایسا ہوجائے تو اور کیا چاہیے مجھے ...... لیکن ...... میرے گھر والے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے اور میرا بھائی راشدین ...... وہ تو پہلے ہی تم لوگوں سے خار کھائے ہوئے ہے...... اس کے مجاہدین سے تعلقات ہیں ...... وہ خود بھی ایک جاں فروش فلسطینی مجاہد ہے۔ نہیں ...... نہیں ...... میں ایسا نہیں کرسکتی ...... مجھے ڈر ہے کہیں تمہاری بھی جان اس چکر میں......''

''ہونہہ...... وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ...... تم مجھے کیا کم سمجھتی ہو؟ میرے بھی بڑے افسروں سے تعلقات ہیں۔'' ابوعبید اس کی تسلی کی خاطر فوراً اس کی بات کاٹتے...

ہوئے بولا تو سامہ نے قدرے چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب......؟ کیا تمہارے تعلقات...... یہودیوں کے ساتھ ہیں؟''

''دیکھو بات سچی ہے مگر تھوڑی تلخ بھی ہے سامہ......! ہمیں حکمت عملی سے چلنا چاہیے، تمہارے گھر والے اور یہ مجاہدین تو بے وقوف ہیں ...... بھلا کیا فائدہ ہے اس جنگ کا بیشتر لوگ یہودیوں کے حامی بنے ہوئے ...... عیش کی زندگی گزار رہے ہیں...... تو کیا ہمارا حق نہیں؟''

''ہاں عبید! تمہاری بات بھی صحیح ہے...... مگر......''

سامہ کی گومگو سی آواز ابھری۔ دروازے کے پیچھے چھپی کھڑی بانو یہ سب سن رہی تھی اور اس کا دماغ جلنے لگا تھا۔

''سامہ......! مت ڈرو کچھ نہیں ہوگا، کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا......'' عبید بول رہا تھا۔

''مگر تمہارے یہودیوں سے کس طرح اچھے تعلقات ہیں......؟ کیا وہ ہماری مدد کریں گے؟'' سامہ نے سادگی سے پوچھا......

''ہاں ...... کیوں نہیں ...... میں ان کے لیے بڑے بڑے کام سرانجام دیتا ہوں ...... وہ میرے احسان مند ہیں ...... بہت دولت دیتے ہیں مجھے...... صرف تمہیں بتا رہا ہوں ...... اس لیے کہ اب تم میری بیوی بننے والی ہو...... میں ...... ان (یہودیوں) کے لیے مخبری کرتا ہوں......''

''تت...... تو تم نے ہی لیلیٰ کے سلسلے میں ......'' سامہ کہتے کہتے رکی تھی۔

''ہاں ......! میں نے ہی لیلیٰ کی مخبری کی تھی، جب... تمہارے ذریعے مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ یہاں مقیم ہے مگر افسوس مجھے ان تک یہ خبر پہنچانے میں تھوڑی دیر ہوگئی ...... ورنہ آفیسر کالونی والا مشن فیل ہوجاتا لیلیٰ کا...... خیر ...... اب تو مجھے یہودی بہت جلد، لیلیٰ جیسی بڑی اور خطرناک مجاہدہ کو مروانے کے سلسلے میں بڑا انعام دینے والے... ہیں...''

''بڑا انعام تو تمہیں میں دوں گی...... ذلیل ...... غدار وطن!'' اچانک بیٹھک کے اس چھوٹے سے کمرے میں بانو کی جوش سے طنطناتی ہوئی آواز ابھری تھی۔

وہ پستول سنبھالے، جوشِ جنوں میں اندر گھسی چلی آئی تھی۔ وہ دونوں ہی اس کے یوں اچانک در آنے پر بری طرح ٹھٹکے تھے۔ ابوعبید کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں، جبکہ سامہ بھی پریشان اور متوحش سی نظر آنے لگی تھی البتہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ضرور ابھری تھی۔

بانو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... ابوعبید پر گولی چلادی ...... ایک دھماکا ہوا۔ قریب کھڑی سامہ چیخی۔ مگر شاید جوشِ جنوں اور عالم طیش میں بانو کے ہاتھوں میں ارتعاش کے باعث نشانہ چوک گیا تھا اور پھر بروقت ابوعبید نے بھی خود کو گولی سے بچانے کے لیے، جھکائی دی تھی اور پھر اسی طرح وہ بہ سرعت بانو کی طرف بڑھا تھا، قریب پہنچتے ہی اس نے بانو کے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا... اور ایسے ہی وقت میں بانو نے اس پر دوسری گولی چلادی جو ابوعبید کے دائیں بازو میں لگی، مگر تب تک... عبید اپنی سی کوشش میں کامیاب ہوچکا تھا، اس نے بازو کی تکلیف کی پروا کیے بغیر ...... بانو کو دھکا بھی دے ڈالا، وہ چیخ مار کر دیوار سے جا لگی۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......''

عبید یہ کہتے ہوئے گرے ہوئے پستول پر قبضہ کرنے کے لیے ...... جھکا۔ بانو کو اپنی موت صاف دکھائی دینے لگی تھی، مگر اب اس کے پاس خود کو عبید کی سفاکی سے بچانے کا کوئی موقع نہ تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک عجیب بات ہوئی ادھر جیسے ہی عبید فرش پر پستول اٹھانے کے لیے جھکا ...... کسی نے اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا...... ابوعبید نے چونکتی ہوئی ... نظروں سے ذرا سر اٹھا کر دیکھا، وہ سامہ تھی......

''نہیں عبید......! اسے زندہ یہودیوں کے حوالے کرکے ...... ہم اور بھی بڑا انعام پائیں گے......'' سامہ کی اس بات پر ...... غدار ابوعبید ...... کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی ...... بانو بڑی کرب اور شعلہ بار نگاہوں سے سامہ کی طرف دیکھنے لگی۔

اگلے ہی لمحے گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور عبید کی چیخ ابھری ...... اس کی آنکھوں میں حیرت اور ملال جیسے ملے جلے تاثرات ثبت ہوکر رہ گئے تھے ...... بانو کو بھی حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

''تم نے مجھے ایک بڑے دھوکے میں رکھا...... عبید!'' ... سامہ کی آواز فرطِ جذبات اور جوش سے مرتعش ہورہی تھی۔ اسی نے عبید پر گولی چلائی تھی ...... جو اس کے پیٹ میں پیوست ہوگئی تھی ...... وہ گرتے گرتے بھی سامہ کی طرف دکھ اور کرب سے تکے جارہا تھا...... اسے شاید دکھ اور ایک ناقابلِ یقین تصور تھا کہ سامہ، جو اس سے محبت کرتی تھی، اسے گولی بھی مارسکتی ہے......؟

''تم مجھے پہلے محبت کے نام پر بے وقوف بناتے

رہے کہ تم پر لوگ غداری کا جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔ آج میں نے خود چالاکی سے تمہارے منہ سے یہ سب اگلوالیا۔ لیلیٰ جیسی بہادر اور عظیم مجاہدہ کی شہادت سے ہی میں کھٹک گئی تھی کہ ضرور یہ تمہاری حرکت ہوسکتی ہے۔ تم شاید بھول گئے تھے کہ میں بھی ایک مجاہد بھائی کی بہن ہوں۔ کاش...! تم مجھ سے بے وفائی کرتے تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا مگر یہودیوں کے ساتھ تمہارے خفیہ گٹھ جوڑ کا راز آشکار ہونے پر مجھے تم سے سخت نفرت ہوگئی ہے...... تم غدار وطن ہو اور اس کی سزا صرف موت ہے......'' سامیہ کی آواز غیرت جوش سے لرزنے لگی تھی، دوسری گولی اس نے عبید کے سینے میں اتار دی۔

☆☆☆

یونیورسٹی کی فضا اپنے معمول پر تھی...... ڈاکٹر کمال کی اسکالرشپ ختم ہونے والی تھی اور پڑھائی بھی...... فائنل امتحان قریب تھے...... یونیورسٹی کی پالیسی کے مطابق ...... ان گنے چنے ہونہار طالب علموں کو بڑی بڑی شاندار مراعتوں کے ساتھ، آفرز دی جارہی تھیں کہ وہ اگر چاہیں تو اپنی عملی صلاحیتوں کو یہاں (لندن لیڈز یونیورسٹی میں) رہتے ہوئے بروئے کار لاسکتے ہیں......

مگر ڈاکٹر کمال نے صاف انکار کردیا تھا...... وہ واپس اپنے وطن (پاکستان) جانا چاہتا تھا، اور اپنے علم سے صرف اپنے وطن اور لوگوں کو مستفید کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، جس کا وہ پہلے ہی تہیہ کرچکا تھا...... البتہ جینی اس کے اس فیصلے سے کچھ افسردہ سی ہوگئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کمال کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے، اسی لیے وہ بھی اس معاملے میں اس سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کرسکی تھی۔ تاہم ایک موقع پر اس نے کمال سے اتنا ضرور کہا۔

''کمال......! تو کیا تم نے واقعی اپنے وطن واپس جانے کا فیصلہ کرلیا ہے......؟''

وہ اس یونیورسٹی کے وسیع اور خوب صورت لان کے ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے...... دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ ہلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔

آج ایک ہی لیکچر ہوا تھا۔ البتہ فائنل ایگزام کے لیے شام میں ایک اسپیشل لیکچر کا بندوبست کیا گیا تھا۔ گویا یہ دن پڑھائی اور معروفیات کے تھے...... اور اسی مناسبت سے...... ڈاکٹر کمال نے بھی جینی سے ملنا کم کردیا تھا۔ ایک وجہ خاص اور بھی تھی، پی ایچ ڈی کے امتحانات کے اختتام پر ڈاکٹر کمال نے اپنے وطن واپس پاکستان لوٹ جانا تھا، ہمیشہ کے لیے۔ لیکچر کے اختتام پر اس کا لائبریری جانے کا ارادہ تھا، مگر جینی اسے اپنے ساتھ باتوں میں الجھائے ہوئے...... ادھر لے آئی۔

اس کے سوال پر کمال نے بے تاثر سے لہجے میں مختصراً کہا۔ ''ہاں۔''

''لیکن تمہیں...... یونیورسٹی والوں کی آفر کے بارے میں ایک بار اچھی طرح غور کرلینا چاہیے تھا......'' جینی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بہت کم خوش قسمت... ہوتے ہیں وہ...... جن لوگوں کو لیڈز جیسی بین الاقوامی معیار کی یونیورسٹی ایسی آفر کرتی ہے۔''

اس کی بات پر کمال کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ ابھری تھی۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

''لیکن میں اپنی خوش قسمتی، اپنے وطن واپس لوٹ جانے پر سمجھتا ہوں......''

''وہاں کوئی تمہارے علم اور قابلیت کی قدر نہیں کرے گا...... یہاں تم اپنے علم کی بدولت بہت دولت کماؤ گے...... بہت عزت ملے گی تمہیں......'' جینی نے اسے اپنے طور پر سمجھانے کی سعی چاہی، تو وہ ایک نظر جینی کے چہرے پر ڈال کے بولا۔

''کیا تمہارے نزدیک علم اسی لیے حاصل کیا جاتا ہے جینی کہ اس سے بہت سی دولت کمائی جائے......؟ جبکہ علم تو خود ایک بڑی دولت ہے، میں اسے خرچ کرنا چاہتا ہوں، تجوریوں میں سنبھالے نہیں رکھنا چاہتا...... اسے پھیلانا چاہتا ہوں، جو اس کا اصل مقصد ہے۔ رہی بات دولت کی تو...... مجھے یقین ہے کہ کم از کم میں بھوکا نہیں مروں گا...... بس......! میرے لیے یہی کافی ہے......''

''کیا تمہارا یہ آخری فیصلہ ہے کمال......؟'' جینی نے اس بار بہت ہولے سے کہا تھا۔

''ہاں......''

''کیا...... میری خاطر بھی تم یہاں نہیں رک سکتے......؟'' جینی کی اس بات پر کمال پہلی بار اس کا چہرہ... بہ غور دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔ اس نے دیکھا، جینی کے...... نرم و نازک اور تجمل سے چہرے پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت لرزاں تھی، جو کسی ان کہے غم نہاں کا پتا تو دیتی تھی، مگر اس کی تہ میں روٹھے ہوئے مان کی ایک بے کس التجا بھی شامل تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں متوقع جدائی کا کرب بھی شامل تھا جس نے اس کے چہرے کی سوگواری کو سوا کرڈالا

تھا۔ کمال کے لیے جینی کی اس کیفیت کو سمجھنا، کچھ مشکل نہ تھا۔ کمال کے چہرے کی متانت اور بھی گہری ہوگئی۔ تب وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''جینی......! اس میں کوئی شک نہیں کہ تم میرے لیے یہاں ایک اچھی دوست ثابت ہوتی رہی ہو...... بلکہ کئی اہم اور نازک معاملات میں تم نے میری مدد بھی کی، میں تمہارا یہ احسان رہتی زندگی یاد رکھوں گا...... بلکہ... تمہاری دوستی پر مجھے فخر بھی رہے گا اور میں تمہیں ایک اچھے مخلص دوست کی حیثیت سے کبھی نہیں بھولوں گا ...... لیکن جینی...... بعض معاملات میں انسان کا اختیار نہیں ہوتا...... تم شاید اس بے بدل دوستی میں بہت آگے جا چکی ہو...... تمہیں پہلے ہی اس بات کا اندازہ کرلینا چاہیے تھا کہ......''

''ہاں......!'' معاً جینی کی ایک کراہ سے مشابہ آواز ابھری۔ ''اسی بات کا تو مجھے زیادہ دکھ ہے کہ میں...... نے اپنے دل میں ایک پرغرور مان کو جگہ دے ڈالی تھی کہ شاید تم میری محبت کو محسوس کرکے...... اپنا ارادہ بدل لو گے ...... اور......''

''جینی! تمہیں سمجھ لینا چاہیے تھا کہ تمہارا مذہب، معاشرت اور کلچر اور ہے...... میرا اور۔'' کمال بولا۔

''ہمارے معاشرے میں اس قسم کے تعلق کی بنیاد ایک شرعی حیثیت کے بغیر ممکن نہیں ہوتی، جبکہ تمہارے کلچر میں یہ سب ایک ''فارمل'' انداز میں چلتا رہتا ہے...... چلو یہ باتیں بھی چھوڑو...... تم مجھے یہ بتاؤ...... اگر تم میری خاطر وہ سب کچھ بھی کرڈالو جو مجھ سے شادی کرنے کے لیے از بس ضروری ہوگا، لیکن باوصف اس کے میں اپنے ملک پاکستان لوٹنے پر بضد رہوں تو کیا...... تم میرے ساتھ چلوگی......؟''

کمال نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی گیند اس کی کورٹ میں پھینک دی تھی...... جینی کے لیے اگرچہ اور سب کچھ ممکن تھا...... مگر...... اپنا ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے پاکستان جا بسنا...... اس کے لیے ناممکن تھا...... وہ خاموش ہوگئی...... بلکہ اس نے ایک گہری ہنکاری خارج کرکے...... واضح طور پر اپنا سر نفی میں ہلادیا...... کمال کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ رقصاں تھی ...... اس کے خیال میں اس نے جینی کو ناراض کیے بغیر اسے وہ بات سمجھادی تھی...... جس کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

☆☆☆

ٹھیک اسی وقت محسن کے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں ایک منطقی سا خیال ابھرا...... ''فرار''...... ایسی صورت میں دشمن صرف اور صرف اپنی جان بچانے کے لیے فرار کو ترجیح دیتا ہے...... اس نے اسی وقت اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر پر اپنے ساتھیوں کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا تو...... لیفٹیننٹ شیری کا پیغام چونکا دینے والا ثابت ہوا ...... اس نے ٹرانسمیٹر پر بتایا

''ہم بیسمنٹ میں جانے کے لیے...... لفٹ کو آن کرنا چاہ رہے تھے مگر وہ آن نہ ہوسکی...... لگتا ہے...... معاملہ دوسرا رخ اختیار کرگیا ہے...... اور......''

اس کی بات پر محسن کے ذہن رسا میں ایک جھماکا ہوا ...... اور وہ پل کے پل سمجھ گیا کہ اس کا خیال غلط نہیں تھا ...... لفٹ چونکہ صرف آئزر مین کے ہی استعمال میں رہتی تھی، آن کرنے پر اسے کسی خفیہ الارم سسٹم پر اس کا پتا چلا خواب گاہ سے اس کے غیاب اور لفٹ کا بدستور جام رہنا...... محسن کے یقینی قیاس کی تصدیق کے لیے کافی تھا۔ اس نے چلا کر اپنے سارے ساتھیوں کو زینوں کے ذریعے آندھی طوفان کی طرح اوپر پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی...... زینے کی طرف دوڑا۔

کچھ ہی سیکنڈوں کے بعد یہ سات چھاتہ بردار کمانڈوز وائٹ کیسل کی چھت پر تھے مگر...... اس طرح کہ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ شیطان ابن شیطان ...... آئزر مین بیری جونیئر کو اپنی بلیک کوئین محبوبہ کے ساتھ ایک چاپڑ میں سوار، فضا میں بلند ہوتا دیکھ رہے تھے...... اس کی دوری کسی بھی قسم کے راکٹ لانچر کی رسائی میں نہیں آتی تھی۔

☆☆☆

چاپڑ میں موجود...... اپنی بلیک کوئین محبوبہ کے ساتھ بیٹھا...... آئزر مین بیری جان بچ جانے کی فتح سے مسرور نظر آرہا تھا...... مگر بلیک کوئین افسردہ تھی...... وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

''ڈارلنگ......! یہ بہت برا ہوا...... دشمنوں نے ہم پر بہت کاری وار کیا...... ہمیں اپنی ہی پناہ گاہ سے نکل بھاگنے پر مجبور کردیا......''

''نو مائی سوئٹ ہارٹ......! اس کا غم مت کرو......'' آئزر مین پرغرور لہجے میں بولا۔

''جب تک آئزر مین زندہ ہے تو سب کچھ باقی ہے۔ اب تم دیکھنا...... میں اس کا بدلہ کیسے فلسطینیوں سے

چکا تا ہوں ......'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے چوپڑ کا رخ بدلا تو ......اچانک بلیک کوئین کی گھٹی گھٹی آواز ابھری ......
''ڈ ڈ ......ڈارلنگ ......وہ ......وہ دیکھو ......'' آ ٓزرمین نے اس سمت دیکھا اور یکا یک اس کا چہرہ کفن کی سفیدی کا منظر پیش کرنے لگا ......اس کے ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا ......

☆ ☆ ☆

محسن اپنے ہمراہ ایک کاندھے سے فائر کرنے والا میزائل شوٹر لایا تھا۔ وہ چیخا۔
''میری مدد کرو ......جلدی ......'' ساتھی اس کی جانب بڑھے ......
محسن نے اپنی کمانڈو کٹ چھت کے فرش پر کھول کر پھیلا دی۔

میزائل تین حصوں میں تھا ......جبکہ شوٹر کے چار حصے تھے محسن نے شوٹر کے بڑے میکنزم والے فولادی بیرل کو اپنے کاندھے سے فائر کرنے کا فیصلہ کیا تھا ......میزائل اس میں فٹ کر دیا گیا ...... اس کا بلاسٹنگ پوائنٹ بھی ریڈی تھا ......ہیا حبیب اور ابن طلحہؒ نے محسن کو تھامے رکھا تھا ......تاکہ میزائل فائر ہونے کی صورت میں جھٹکا لگنے کے باعث وہ گرنے نہ پائے۔

آزرمین کا ہیلی کاپٹر لمحہ بہ لمحہ ان کی دم بہ خود نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا ......محسن نے نشانہ لے کر میزائل فائر کر دیا۔

ایک زناٹے دار آواز کے ساتھ ......دھوئیں کی ایک لکیر ......پیچھے چھوڑتا ہوا میزائل ......وائٹ کیسل کی چھت سے تیزی کے ساتھ اڑتا ہوا نکلا ......

ان ساتوں کی اب دم بہ خود سی نظریں ......سامنے دور نقطے کی صورت میں نظر آنے والے چاپڑ پر جمی ہوئی تھیں اور ان کی سانسیں جیسے سینوں میں اٹکی رہ گئی تھیں ......چند سیکنڈوں بعد ہی انہوں نے اس نقطے کو پھیلتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے فوراً اپنی آنکھوں سے دوربینیں لگا لیں۔ آزرمین بیری ...جونیئر اپنے چاپڑ سمیت واصل جہنم ہو چکا تھا، اس کے چاپڑ کے پرخچے فضا میں بکھر گئے تھے ......

اگلے ہی لمحے ......وائٹ کیسل کی چھت مجاہدین کے نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی تھی۔

چند گھنٹوں بعد، تل کرم میں یاسر العربی ......اپنی سات جہادی برادر فورس کو مبارکباد دے رہا تھا۔

محسن اور اس کے جری ساتھی، آزرمین بیری جونیئر کو فنا کے گھاٹ اتارنے اور اس کی پناہ گاہ ''وائٹ کیسل'' ...کو تباہ کرنے کے بعد ٹریننگ کیمپ سے ہتھیائے ہوئے ہیلی کاپٹر کے ذریعے نکل آئے تھے، البتہ وائٹ کیسل کو تباہ کرنے سے قبل یہ لوگ اس کی بیسمنٹ سے تمام ضروری ...دستاویزات ساتھ اڑا لائے تھے ......جس میں یہودیوں کے مکروہ منصوبوں اور ان کی کاؤنٹر انٹیلی جنس کی تفصیلات شامل تھیں۔

غزہ کے بے بس مایوس لوگو ......!
ہمیں خبر ہے کہ ......
یزید عہد رواں نے پھر سے اہتمام کرب و بلا کیا ہے
ہر ایک لمحے میں جانے کتنی! قیامتوں کو بپا کیا ہے
لہو لہو ہے پندار ہستی! خواب جتنے تھے کھو گئے ہیں
گھر کے آنگن میں کھیلتے بچے موت کی نیند سو گئے ہیں
ہر سو مسموم سی فضا ہے یزید عہد رواں کی دیکھو
لہو میں ڈوبی یہ کربلا ہے، تمہارے ہونٹوں پہ لرزشیں ہیں
تمہاری آنکھوں میں خواہشیں ہیں
کہیں سے کوئی مسیحا آ کر دست جبر و ستم کی زد سے
ظلم و جور و جفا کی حد سے تمہیں نکالے ......تمہیں بچالے
مگر سنو ......!
تم یہ کس کے منتظر ہو؟
تمہیں یہ آخر امید کیوں ہے، یہاں تو جذبوں کا قحط ہے
یہاں تو احساس مر چکے ہیں جو وجہ تخلیق انسانیت تھی
ہم اس سے گزر چکے ہیں جو عہد درد دل ہوا تھا
اب اس کی ترمیم ہو چکی ہے جس امت سرور کا باطل کوڑ رتھا
وہ فرقوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ شر کی آتش عروج پر ہے
باغ سارے اجڑ رہے ہیں، ہم عدو سے کیا لڑیں گے
ہم تو آپس میں لڑ رہے ہیں ......زمین تمہارے لہو سے تر ہے
نمناک دیدہ فلک ہے یہ ظلم و جبر و جفا کی آندھی
محدود تمہاری حد تلک ہے، یہ بچے جو تمہارے جل رہے ہیں
لرزتے ہونٹوں پہ حسرتوں کے سوال سارے سسک رہے ہیں
کسی پہ کوئی اثر نہ ہوگا کہ اپنی اپنی انا کی جنگ میں بقا کی جنگ میں
ساری قومیں کھو چکی ہیں
یوں سمجھو کہ بے حس ہو چکی ہیں

ختم شد

ناقابلِ گرفت

تنویر ریاض

انسان دولت حاصل کرنے کے لیے کیسی کیسی ترکیبیں آزماتا ہے اور اسی آزمائش میں چاہے زندگی مشکلات میں بسر ہو جائے لیکن جس مقام پر بھی اسے موقع ملتا ہے انسان، انسان کو ڈسنے سے باز نہیں آتا... اس کی آنکھوں میں بھی بچپن سے کچھ خواب سجے تھے لیکن ایک رشتہ ایسا بھی تھا جو اسے تعبیر پانے ہی نہیں دیتا تھا مگر ایک روز... اس کے تمام خواب سچے ثابت ہو گئے بس ذرا تدبیر ٹیڑھی تھی لیکن کام سیدھا کر گئی۔

ایک معصوم کے ہاتھوں ناقابل گرفت جرم کا ارتکاب

وہ لاش کو دیکھ کر بالکل نہیں جھجکی بلکہ ایک منٹ تک اسے دیکھنے کے بعد اس نے اپنی نظریں میرے چہرے پر جما دیں۔ شاید اسے لاش کو دیکھ کر اتنی بے کلی نہ ہوئی ہو جتنی مجھے اس کے اس طرح دیکھنے پر ہو رہی تھی۔ وہ ہمارے مقامی اسپتال کی نرس مس جولین یوک تھی۔ اس کے حسن کو بیان کرنے کے لیے خوش شکل یا خوب صورت کے الفاظ بھی کم تھے۔ مجھے پہلے کبھی اس سے اتنا زیادہ قریب ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا کہ اس کی روشن سبز آنکھیں دیکھ سکوں۔ اس کے سیاہ بالوں کا بڑا حصہ ہیٹ کے نیچے چھپ گیا تھا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر میں وقتی طور پر بھول گیا کہ میں نے اسے کیوں بلایا تھا۔

یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر گزر

رہی تھی کہ میری آواز اس تک پہنچ پاتی۔ میں پل کے نیچے نالے کی تہ میں کھڑا تھا جہاں ایک گھنٹا پیشتر کچھ سیاہ فام لڑکے مچھلی کا شکار کرنے آئے تھے۔ وہ لاش کو دیکھ کر خوف زدہ ہوگئے اور انہوں نے وہاں سے دوڑ لگادی۔ راستے میں انہوں نے ایک کسان کو روک کر لاش کے بارے میں بتایا۔ اتفاق سے کچھ ہی فاصلے پر میں ایک دکان سے لنچ بکس خرید رہا تھا۔ کسان مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں آگیا اور اس نے مجھے لاش کے بارے میں اطلاع دی۔ میں نے فوراً اصطبل کی جانب دوڑ لگادی تاکہ ایک گھوڑا کرائے پر لے سکوں۔

میں لاش کا جائزہ لے رہا تھا کہ میں نے اسے دو پہیوں والی چھوٹی گاڑی پر گزرتے دیکھا جس میں ٹٹو جتا ہوا تھا۔ ایسی گاڑیاں عموماً کچے راستے پر سفر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ برابر میں اس کا سفید بل ڈاگ گمبو بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانا اور چلانا شروع کردیا۔ پہلے کتے نے مجھے دیکھا اور بھونک کر اپنی مالکن کی توجہ میری طرف مبذول کروائی۔ اس نے بڑی احتیاط سے گاڑی روکی اور اپنی بڑی سی نیلی ٹوپی کو سر پر اچھی طرح جماتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ اس نے کتے کو وہیں گاڑی میں رکنے کا اشارہ کیا اور دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی ہوئی میری طرف آگئی۔

میں نے تعظیماً اپنا ہیٹ اتارا اور اس طرح کھڑا ہوگیا کہ لاش پر اس کی براہ راست نظر نہ پڑسکے۔ گوکہ اس کا کام بوڑھوں اور نومولود بچوں کی دیکھ بھال کرنا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ بعض اوقات وہ ڈاکٹر میکونی کی پوسٹ مارٹم کرنے میں معاونت کیا کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے جانتی ہوگی۔ اس کے باوجود میں نے اپنا بیج دکھانا ضروری سمجھا اور بڑے مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''گڈ آفٹرنون مس یوک...... تمہیں زحمت دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے اس وقت کسی کی مدد کی ضرورت تھی اور تم اس کام کے لیے بہت مناسب ہو۔ شاید یہ منظر تمہارے لیے زیادہ خوشگوار نہ ہو۔''

یہ کہہ کر میں ایک طرف ہٹ گیا۔ اس شخص کی لاش چکنے پتھروں کے ڈھیر پر پڑی تھی جیسے کسی نے اسے اوپر سے پھینکا ہو۔ اس کا قیمتی سوٹ اور دھاری دار قمیص خون میں بھیگ گئی تھی۔ تیز ہوا چلنے کے سبب اس کا ہیٹ بیس فٹ دور جا گرا تھا۔ اس کی گردن اس طرح مڑ گئی تھی کہ اس کے چہرے کا زیادہ حصہ دیکھا جاسکتا تھا۔ ہمیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔

''ایسا لگتا ہے کہ یہ بدقسمت شخص پل سے نیچے گرا ہے یا اس نے چھلانگ لگائی ہے۔ کیا تم اسے پہچانتی ہو؟''

''ہاں۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ ''اس کا نام رینالڈ فیرلے ہے۔ یہ ہاسکل بٹ شو کمپنی میں سفری سیلز مین ہے۔''

''کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ یہ وہی ہے؟''

''ہاں، مجھے پورا یقین ہے شیرف۔''

''میں شیرف نہیں بلکہ اس کا ڈپٹی لوئیس اسٹیلے ہوں۔'' میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہا۔ ''اگر یہ سیلز مین ہے تو یقیناً اس کا قیام کسی ہوٹل میں ہوگا۔''

''ہاں، یہ اور اس کی بیوی ہوٹل میں رہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ شاید اسے فیرلے کے بیوی بچوں کا خیال آگیا تھا کہ وہ اس کے مرنے کے بعد کس طرح زندگی گزاریں گے۔

میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم یہ افسوسناک خبر اس کی بیوی کو سنادوگی۔ ممکن ہے کہ ہمیں فیرلے کے دوستوں اور وارثوں کو بھی مطلع کرنا پڑے۔ مجھے اس لاش کو شہر لے کر جانا ہوگا تاکہ ڈاکٹر معائنہ کرکے اس کی موت کا باضابطہ اعلان کرے۔ میں نہیں چاہتا کہ مسز فیرلے کو اپنے شوہر کی موت کی خبر کسی اور ذریعے سے ملے۔ اس بات کا امکان ہے کہ جن لڑکوں نے اس کی لاش دیکھی تھی، وہ اسے پہچان گئے ہوں اور انہوں نے اس کی اطلاع دوسرے لوگوں کو بھی دے دی ہو۔''

اس نے اپنی بھویں سکیڑیں اور بولی۔ ''میں اپنی گاڑی میں اس لاش کو لے جانے میں تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔ ڈاکٹر میکونی اپنے بھتیجے کے پاس گیا ہوا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں شیرف یا مجھے اس کی موت کی تصدیق کرنے کا اختیار ہے جبکہ شیرف بھی پھوڑے کے آپریشن کے بعد بستر پر پڑا ہوا ہے۔''

یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی اس لیے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ اس نے لاش پر جھک کر گردن اور کلائیوں کو دبایا پھر ایک رومال نکال کر فیرلے کی ناک پر رکھ دیا لیکن وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔

''یہ مرچکا ہے اور مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ میں اس کی موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کردوں گی۔ اس کا زخم ابھی تازہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کو مرے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوئے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی کھڑی ہوگئی اور چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''اس کی گاڑی کہاں ہے؟''

میں نے لاعلمی کے انداز میں کندھے اچکائے تو وہ بولی۔ ''میرے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ شخص یہاں کس طرح پہنچا؟''

مجھے سڑک کے کنارے کوئی کار نظر نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں یہی سمجھا کہ وہ کسی گھوڑا گاڑی میں آیا ہوگا اور یوں لگتا تھا کہ اس کا گھوڑا مالک کا انتظار کرنے کے بعد مایوس ہوکر اپنے تھان پر لوٹ گیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا، جولین نے پل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کچھ سوچا۔ پل پر ریل کی پٹری کے دونوں جانب اتنی کشادہ سڑک تھی کہ اس پر سے بہ آسانی ایک گاڑی گزر سکتی تھی۔ اس سڑک سے مشرق کی جانب ایک راستہ نیچے کی جانب آرہا تھا جبکہ دوسری جانب کی سڑک پل کی پٹری کے ساتھ ساتھ قصبے کی طرف جارہی تھی۔

جولین نے سیٹی بجا کر اپنے کتے گمبو کو بلایا اور اسے لاش کے پاس ٹھہرنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد ہم دونوں کار کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ سڑک کے کنارے ایک پرانے ماڈل کی بیوک کھڑی نظر آئی۔ میں نے مس جولین کی توجہ ان قدموں کے نشانات کی طرف دلائی جو پل کی طرف جانے والی سڑک پر نظر آرہے تھے لیکن وہاں کوئی ایسا نشان نظر نہیں آیا جس سے معلوم ہوتا کہ جانے والا واپس بھی آیا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے پل پر جانے کی اتنی جلدی کیوں تھی؟'' وہ قدموں کے نشانات کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

ہمیں پل پر کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ دو تہائی فاصلہ طے کرنے کے بعد جولین کی نظر پل کی ریلنگ پر پھنسے ہوئے بل کھائے ہوئے دھاگوں پر گئی تو وہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''یقیناً یہی وہ جگہ ہے جہاں سے اسے نیچے پھینکا گیا ہوگا۔''

میری نظر ریلنگ کے اوپری حصے پر لگے ہوئے خون کے چھینٹوں پر گئی تو میں نے کہا۔ ''ایسا نہیں لگتا کہ اس نے خود سے چھلانگ لگائی ہو...... تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میری عقل یہ تسلیم نہیں کرتی کہ اس نے خودکشی کی ہوگی۔ ایسا کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی گاڑی سامان سے بھری ہوئی ہے جسے بیچ کر وہ بھاری منافع کماتا۔ اس کی بیوی گھر پر انتظار کررہی ہوگی۔ اس نے گھڑی اور چین پہن رکھی تھی۔ اگر اس کا ارادہ خودکشی کرنے کا ہوتا تو کیا وہ اس طرح سج دھج کر باہر نکلتا...... اور سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر لگنے والی وہ مخصوص چوٹ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود نہیں گرا بلکہ اسے گرایا گیا ہے۔''

''بہت خوب۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ایک شخص بلندی سے پتھروں کے ڈھیر پر گرتا ہے تو اسے چوٹ ضرور لگے گی۔ خواہ وہ خود چھلانگ لگائے یا اسے دھکا دیا جائے۔''

''یہ میں بھی جانتی ہوں ڈپٹی۔'' وہ پرسکون انداز میں بولی۔ ''لیکن وہ پتھروں کا ڈھیر اونٹ کے کوہان کی طرح ابھرا ہوا ہے جبکہ مسٹر فیرلے کے گال اور آنکھ کے نیچے زخم کی نوعیت ایسی ہے جیسے کسی نے کدال نما شے سے ضرب لگائی ہو۔''

میں نے پہلے اس زخم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی لیکن جب میں نے دوبارہ اس کے بارے میں سوچا تو مجھے جولین کی بات میں وزن نظر آیا۔ ''گویا تمہارا خیال ہے کہ پل پر سے گرنے سے پہلے ہی اس کے چہرے پر ضرب لگائی گئی تھی؟''

''ہاں۔''

''لیکن کیوں؟ اگر کوئی شخص اسے لوٹنا چاہ رہا تھا تو اس نے گھڑی کیوں چھوڑ دی اور سب سے بڑھ کر اس کی گاڑی میں لدے ہوئے نئے جوتوں پر بھی اس کی نیت خراب نہ ہوئی اگر وہ کوئی لٹیرا تھا تو وہ جوتوں کے ساتھ گاڑی بھی لے جاتا۔''

اس نے کندھے اچکادیے تو میں نے کہا۔ ''تم فیرلے کے بارے میں کیا جانتی ہو؟ اس کی کسی سے کوئی دشمنی تھی یا اس نے کسی کے ساتھ بے ایمانی کی تھی؟''

اس نے غور سے میرے چہرے کی جانب دیکھا اور واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔ راستے میں اس نے کہا۔ ''مسٹر فیرلے زیادہ تر سفر میں رہتے تھے لیکن شہر میں سب کے ساتھ ان کے خوشگوار تعلقات تھے۔ وہ مشی گن سے آئے تھے جبکہ ان کی بیوی کا تعلق کلیلن کاؤنٹی سے ہے اور ان کی کاروباری ساکھ بہت اچھی تھی۔ یہاں تک کہ خریدنے کے بعد اگر کسی کو جوتے پسند نہیں آتے تو وہ اس کے پیسے واپس کردیا کرتے تھے۔''

ہم دونوں نے فیرلے کی لاش کو ربر کی شیٹ میں لپیٹا اور جولین کی خچر گاڑی میں ڈال کر مردہ خانے تک لے آئے۔ وہاں لاش کی مکمل حفاظت کی جاتی ... اور کسی غیر متعلقہ شخص کی اس تک رسائی ممکن نہ تھی۔

☆☆☆

مسز فیرلے ہوٹل کے پورچ میں بیٹھی نمکین پہیلیوں سے دل بہلا رہی تھی۔ وہ ایک قبول صورت نوجوان عورت تھی۔ اس

نے بنیان نما شرٹ پر جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کی انگلی میں شادی کی سنہری انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ میں نے تعظیماً اپنا ہیٹ اتارا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میں اور جولین اس سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہ رہے ہیں۔

مسز فیرلے یہ خبر سن کر یوں اچھلی جیسے اس کے قریب ہی کوئلے کی کان میں دھماکا ہوا ہو۔ یہ ایک غیر متوقع خبر تھی جسے سننے کے بعد اس کے لیے اپنے ہوش و حواس پر قابو پانا ممکن نہ تھا۔ اسی لیے میں چاہ رہا تھا کہ جولین کچھ دیر اس کے پاس رہے۔ میں نے ان دونوں کو ہوٹل میں چھوڑا اور خود فولنٹن کو لے کر مردہ خانے چلا گیا تاکہ لاش کی کچھ تصاویر لے لی جائیں اور ڈاکٹر میکونی اور شیرف کو بعد میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

اسی شام جولین نے مجھے بتایا کہ مسز فیرلے نے پادری اور اس کی بیوی کے پاس جا کر اپنا غم ہلکا کیا اور اب وہ ویلڈوسٹا میں مقیم مسز فیرلے کے رشتے داروں کو تار دے رہے تھے کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو مسز فیرلے کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ اس وقت میرے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں نے مسز فیرلے کو گھڑی اور چین دی تو وہ سمجھ گئی ہوگی کہ اس کے شوہر کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ ایک عورت کے لیے اس سے بڑا صدمہ کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے محروم ہوجائے جس سے وہ شدید محبت کرتی تھی۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی شک میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم کرنا چاہیے کہ حادثے کے وقت مسز فیرلے اس جگہ سے کافی فاصلے پر تھی۔''

جولین نے مجھے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ ''ہوٹل کے ایک باورچی گیری واشنگٹن نے بتایا ہے کہ اس روز مسز فیرلے نے صبح کا سارا وقت ہوٹل کے کچن میں گزارا۔ وہ خمیری رول بنانے کا طریقہ سیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی۔''

''کیا مسز بیسلے ہوٹل میں ٹھہرنے والے مہمانوں کو کچن میں آنے کی اجازت دے دیتی ہے؟''

''شاید اس نے مسز فیرلے کو یہ رعایت دے رکھی ہو کیونکہ یہ جوڑا اس ہوٹل میں تقریباً ایک سال سے مقیم ہے۔''

''کیا اس نے فیرلے کے بارے میں کچھ اور بتایا؟''

''ہاں، جب ضبط کا بندھن ٹوٹ جائے تو جذبات کا سیلاب امڈ آتا ہے۔'' جولین نے اپنی ٹوپی اتار کر میز پر رکھی تو اس کے خوب صورت بال شانوں پر لہرانے لگے اور میرے لیے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہوگیا۔ وہ میری محویت کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

''اس نے مجھے بتایا کہ فیرلے سے اس کی ملاقات تین سال پہلے مشی گن میں ہوئی تھی اور کچھ ملاقاتوں کے بعد ہی فیرلے نے اسے شادی کی پیشکش کردی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں مسز فیرلے کے لیے اس کی ہمدردی کو محسوس کرسکتا تھا۔

''شادی کے بعد انہوں نے مشی گن کے بجائے یہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔'' میں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جوتے بنانے والی کمپنی جنوب میں اپنے کاروبار کو وسعت دینا چاہ رہی تھی۔ انہوں نے مسٹر فیرلے کو ایک پرکشش ملازمت کی پیشکش کی تو وہ انکار نہ کرسکا۔ مسز فیرلے نے بتایا کہ وہ اپنے کام سے بہت مطمئن تھا۔''

''حیرت ہے کہ شادی کو تین سال ہوگئے اور ان کے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

جولین کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں نے اس سے یہ بات نہیں پوچھی۔''

''اگر ان کا کوئی بچہ ہوتا تو وہ اپنے آپ کو اتنا تنہا محسوس نہ کرتی۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ میں اس کے ساتھ ہی دفتر سے باہر آگیا۔ میں اسے ہوٹل تک چھوڑنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے منع کردیا اور بولی۔ ''آج بہت تھکا دینے والا دن تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ تم نے اپنا کام بڑے اچھے طریقے سے انجام دیا ہے۔''

''یہی بات میں تمہارے لیے بھی کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ ایک بار پھر تمہیں چھوٹی سی زحمت دینا پڑ جائے۔'' وہ حیران ہوکر مجھے دیکھنے لگی، اس کی آنکھوں میں تجسس نمایاں تھا۔

''کیونکہ مس وائٹ بھی اس پل کے قریب رہتی ہے، اس لیے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ تمہیں اپنا دوست سمجھتی ہیں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آج وہیں جارہی تھی جب تم نے اشارہ کرکے مجھے بلایا تھا۔ بہرحال مجھے تمہاری مدد کرکے خوشی ہوگی۔''

بعض وجوہات کی بنا پر میں دو روز تک اس طرف نہ جاسکا۔ میں نے شیرف کو ٹیلی فون پر اس واقعے کی اطلاع دے دی تھی اور اس کا خیال تھا کہ فیرلے کی موت ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ میں کسی واضح ثبوت کے بغیر اس کی تردید نہیں کرسکتا تھا اور اس کے لیے مس وائٹ سے ملنا بہت ضروری تھا کیونکہ مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ وہ دونوں بہنیں تقریباً روزانہ اس پل پر چہل قدمی کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے کچھ دیکھا ہو۔

میں نے مس لوسیا وائٹ کو ٹیلی فون پر اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اس وقت تک پورے قصبے میں تقریباً ایک درجن ٹیلی فون لگ چکے تھے اور ان دونوں بہنوں کو سب سے پہلے ٹیلی فون کا کنکشن ملا تھا کیونکہ ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور ان کی رہائش بھی ایسی جگہ تھی جہاں پہنچنا آسان نہیں تھا۔

صدر دروازے پر دو کتوں نے میرا استقبال کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر غرا رہے تھے پھر ایک سیاہ فام عورت دروازے پر آئی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے اپنے سر پر ایک زرد رنگ کا رومال لپیٹ رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کے بالوں کی سفیدی کا پتا لگانا مشکل تھا۔ اس نے کتوں کو پچکار کر ایک طرف کیا اور مجھے لے کر ہال میں چلی گئی۔ اس نے اپنا تعارف لوسیا وائٹ کی حیثیت سے کروایا اور کہا کہ اس کی بڑی بہن بیرل وائٹ اس واقعے کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ لہٰذا ہم نے اسے سکون آور دوا دے دی ہے۔ اب شاید ہی وہ پورا دن کمرے سے باہر آسکے۔

لوسیا اس کی سوتیلی بہن تھی اور اس کی ماں عمر میں چند ہی مہینے بیرل سے بڑی ہوگی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ دونوں بہنیں اپنی جوانی کے دنوں میں چرچ میں دعائیہ نغمات گایا کرتی تھیں لیکن گزشتہ چند برسوں سے انہوں نے اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری تک محدود کرلیا تھا کیونکہ بیرل اور لوسیا اعصابی مریضہ بن چکی تھیں لیکن قصبے کے لوگوں سے ان کا رابطہ تھا اور ڈاکٹر میکونی بھی ٹیلی فون پر ان کی خیریت پوچھتا رہتا تھا۔ قصبے کی بوڑھی عورتیں بھی اس سے ملنے آتی رہتی تھیں۔ دونوں بہنیں باقاعدگی سے قصبے میں تین میل تک پیدل چلتی تھیں۔

میں نے اس چہل قدمی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ ''مجھے چہل قدمی کا اتنا شوق نہیں جتنا میری بہن کو ہے لیکن ڈاکٹر میکونی کا کہنا ہے کہ یہ ورزش ہمارے لیے فائدہ مند ہے لہٰذا میں بھی کبھار اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ گو کہ اس کی رفتار کم ہوتی ہے اس لیے میں اسے منع نہیں کرتی۔ بعض اوقات ہمارے گھر کام کرنے والی لڑکی ایرس اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔''

''پھر بھی تین میل کا فاصلہ طے کرنا ایک بوڑھی عورت کے لیے کافی تکلیف دہ ہے۔''

''ضروری نہیں کہ وہ پورا راستہ پیدل ہی چلے۔ کبھی کبھی ہمارا کوئی پڑوسی اسے سواری کی پیشکش کردیتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ یہ دیکھنے کے لیے اسٹیشن چلی گئی کہ ٹرینوں کے اوقات میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی۔''

وہ میری طرف جھکی اور قدرے آہستہ آواز سے بولی۔ ''اس نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ وہ وہاں جنگ میں مرنے والوں کی فہرست دیکھنے جایا کرتی تھی لیکن یہ پرانی بات ہے اور وہ ابھی تک اپنے ماضی سے جڑی ہوئی ہے۔ پرانی یادیں آج بھی اس کے ذہن سے چپکی ہوئی ہیں اب وہ وہاں ٹرینوں کے اوقات دیکھنے جاتی ہے۔ میں نے اسے ایک چھوٹی سی جیبی گھڑی لے کر دی ہے جس کا بٹن دبانے سے گھنٹوں کی سریلی جھنکار سنائی دیتی ہے اور اگر ٹرین کے آنے کا وقت ہو تو وہ پل پر نہیں جاتی۔''

''لیکن وہ سن نہیں سکتی پھر یہ گھڑی اس کے کس کام کی ہے؟''

مس لوسیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''ہاں وہ سن نہیں سکتی لیکن ہر پندرہ منٹ بعد گھڑی میں ہونے والی تھرتھراہٹ سے اسے وقت کا پتا چل جاتا ہے۔ جب ایک حس ناکارہ ہوجائے تو دوسری کام کرنا شروع کردیتی ہے۔''

''تم دونوں کے درمیان گفتگو کس طرح ہوتی ہے؟''

''ہم ہاتھ کے اشارے اور چھوٹی چھوٹی پرچیوں کے ذریعے کام چلاتے ہیں۔ اسے بولنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور وہ اپنا مطلب بہ آسانی بیان کرسکتی ہے۔''

''کیا پرسوں بھی وہ گھر سے باہر گئی تھی...... میرا مطلب ہے جس دن پل پر یہ حادثہ پیش آیا؟''

''وہ معمول کے مطابق نو بجے گھر سے نکلی۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی گھڑی میں چابی بھری کیونکہ صبح کے وقت اس کی انگلیاں پوری طرح حرکت نہیں کرتیں اور وہ خوشگوار موڈ میں اپنے راستے پر چل دی۔''

''وہ گھر کب واپس آئی تھی؟''

''ہمیشہ کی طرح دوپہر کے کھانے پر ٹھیک ساڑھے بارہ بجے۔ میرا خیال ہے کہ بھوک لگنے کی وجہ سے وہ وقت کی پابند ہوگئی ہے اور اسے گھڑی دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔''

''کیا اس نے راستے میں کوئی غیر معمولی بات دیکھی

اور گھر پہنچ کر تمہیں اس کے بارے میں کچھ بتایا؟''

''نہیں البتہ وہ معمول سے زیادہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی لیکن یہ کوئی ایسی قابلِ غور بات نہیں کیونکہ اس کی عمر اسّی برس سے زیادہ ہے اور میں یہ توقع نہیں کرسکتی کہ وہ کسی کھلاڑی کی طرح چاق و چوبند نظر آئے۔''

اچانک ہی راہ داری میں سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس سے پہلے کہ لوسیا اپنی بہن کے استقبال کے لیے اٹھتی، وہ فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی لیکن میری نظریں کافی دیر تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ اس کا بایاں ہاتھ دروازے کی چوکھٹ پر تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کی انگوٹھی والی انگلی غائب تھی۔

''تم کچھ خیال نہ کرنا۔'' لوسیا معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ''وہ آج اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے شاید اسی لیے اس نے تم سے ملنا پسند نہیں کیا۔''

''معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں مزید کچھ نہیں پوچھوں گا۔ صرف اتنا بتادو کہ کیا تم مسٹر فیرلے کو پہلے سے جانتی تھیں؟''

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ گزشتہ موسم خزاں میں اس سے ریلوے اسٹیشن پر ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ میرے ایک جاننے والے مسٹر میک نے ان کے جوتوں کی بہت تعریف کی تھی اور ان سے ہمیں متعارف کروایا تھا لیکن مسٹر میک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم دونوں بہنیں اپنے جوتے خصوصی آرڈر پر اٹلانٹا سے بنواتی ہیں۔ بہرحال اس بہانے مسٹر فیرلے سے ملاقات ہوگئی۔''

ایک بار پھر میں نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی تو دل چاہا کہ کسی اسکول کے طالب علم کی طرح دوڑتے ہوئے ان قدموں کا تعاقب کروں لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا جب میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ فام عورت اپنی پیٹھ پر کپڑوں کی بالٹی لادے مکان کی طرف آرہی ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کافی عرصے سے یہاں کام کررہی ہو؟''

یہ کہہ کر میں نے کوٹ کی جیب سے ایک چاندی کا سکہ نکالا اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا جسے اس نے جلدی سے اپنے لباس کی آستین میں چھپالیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام ارس واشگٹن ہے اور میرا خاندان تین نسلوں سے یہاں ملازم ہے۔ میں جب یہاں آئی تو مس لوسیا کے والد زندہ تھے اور مس بیرل بھی درمیانی عمر کو پہنچ چکی تھیں۔''

''کیا تم بتاسکتی ہو کہ مس بیرل کی ایک انگلی کیسے ضائع ہوئی؟''

''مس بیرل کی زندگی دکھوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی دو مرتبہ شادی ہوئی۔ ان کا پہلا شوہر جنگ کے پہلے سال ہی مارا گیا جبکہ دوسرے کا انتقال اس کے آخری برس میں ہوا۔ ان کے دو بچے بھی ہوئے۔ ایک تو مردہ حالت میں پیدا ہوا تھا جبکہ دوسرا نمونیے سے ہلاک ہوگیا۔ مجھے تو ان کے نام بھی معلوم نہیں۔ اب تو لوگ بھول چکے ہیں کہ کبھی ان کی شادی بھی ہوئی تھی۔ ان کے پاپا کے انتقال کے بعد لوگوں نے دونوں بہنوں کو مس کہنا شروع کردیا۔ جہاں تک انگلی ضائع ہونے کا تعلق ہے تو مس لوسیا نے مجھے بتایا کہ ایک بھگوڑے امریکی فوجی نے مس بیرل سے ان کی شادی کی ہیرے والی انگوٹھی چھیننے کی کوشش کی تھی اور جب انہیں انگوٹھی اتارنے میں دیر ہوئی تو اس نے ان کی انگلی ہی کاٹ دی۔ اس حادثے کے باوجود وہ مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ مس بیرل کے پاس اپنا پھولوں کا باغ اور گراموفون ہے۔ گو وہ سن نہیں سکتی لیکن کبھی کبھی اسے چلا کر خوش ہولیتی ہے۔ اکثر اسے طویل فاصلے طے کرنے کے لیے چھڑی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اب بھی وہ دوسری بوڑھی عورتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔''

''مس لوسیا کیا کرتی ہے؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

''وہ مس بیرل کی دیکھ بھال کرتی ہے جس طرح پہلے اپنے باپ کی کیا کرتی تھی۔''

''کیا واقعی لوسیا کی شادی نہیں ہوئی؟''

''جہاں تک میں جانتی ہوں، میں نے اس کے علاوہ کوئی بات نہیں سنی۔''

''بہت بہت شکریہ۔ ایک بات اور...... کیا تم گزشتہ روز یہاں آئی تھیں جب مس بیرل باہر گئی تھی؟''

''نہیں، میں گھر پر اپنے شوہر کے ساتھ کام کررہی تھی۔''

میں نے اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھے تو مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے راستے سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

مجھے بہت زیادہ امید نہیں تھی کہ جولین میرے بلادے پر پکنک منانے چلی آئے گی۔ بہرحال میں اپنی طرف سے پوری تیاری کرکے آیا تھا۔ میں نے ریلوے اسٹیشن سے دو لنچ باکس خریدے۔ ہر ایک میں فرائڈ چکن کے دو ٹکڑے، دو گوشت کے پارچے، بسکٹ، سیب، ابلا ہوا

انڈا اور ایک کیک کا ٹکڑا موجود تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اکثر دو لنچ باکس خریدتا اور خود ہی کھا جاتا۔ میرے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ پورا دن گھومنے پھرنے میں گزر جاتا اور بہت کم دوپہر میں ڈھنگ سے کھانا کھانے کا موقع ملتا تھا۔

اس کی آمد میرے لیے بہار کے تازہ جھونکے سے کم نہ تھی۔ اس نے بہت خوب صورت سبز رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور سر کے بال بھی ٹوپی کی قید سے آزاد تھے۔ میں نے فرش پر ایک سفید کپڑا بچھایا اور کھانے کی چیزیں اس پر رکھ دیں۔ جولین اپنے ساتھ گھر کے بنے ہوئے سینڈوچ لائی تھی جن کے ساتھ مسالے والے ٹماٹر اور ابلی ہوئی پھلیاں تھیں۔ کھانے کے بعد ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا یعنی کہ میرے دادا جنگ ختم ہونے کے بعد سوری سے یہاں آئے تھے۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں جس میں دو جڑواں ہیں۔ اس کی تین بہنیں تھیں اور اس نے نرس بننے کا فیصلہ کلارا برٹن کو دیکھ کر کیا جس نے اپنی زندگی سیلاب سے متاثرہ پناہ گزینوں کی امداد کے لیے وقف کردی تھی۔ باتوں کے درمیان وہ کئی مرتبہ اتنے قریب آگئی کہ میرے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا تاہم میں کسی کھلی جگہ پر کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی وہ اسے گوارا کرتی۔ اس کے باوجود یہ ملاقات بڑی خوشگوار رہی اور میں ایک مسرور و مطمئن شخص کی طرح گھر واپس آگیا۔

دوسرے دن مجھے پیغام ملا کہ مس بیرل وائٹ رات کسی وقت سوتے میں انتقال کرگئی اور یہ کہ میں فوراً وہاں پہنچوں۔ میں نے جلدی جلدی شیو بنا کر لباس تبدیل کیا اور وقت ضائع کیے بغیر وہاں پہنچ گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ مس لوسیا غم و اندوہ کی تصویر بنی لاش کے پاس بیٹھی ہوگی لیکن یہ دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی کہ وہ باہر صحن میں کھڑی مردہ خانے کے منتظم سے باتیں کررہی تھی۔ اس نے سیاہ سلک کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کی تراش خراش دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس نے اس موقع کے لیے یہ لباس پہلے سے تیار کروالیا تھا۔

وہ مجھے اوپری منزل پر واقع ایک کمرے میں لے گئی جہاں مس بیرل کی لاش ایک بے جان مجسمے کی طرح بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے اور سر کے گرد رومال لپٹا ہوا تھا جبکہ بقیہ جسم پر لینن کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سرسراہٹ اور چرچراہٹ کی آوازیں سنیں تو سمجھ گیا کہ مس جولین پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میں نے نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھا تو وہ ایک کونے میں اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی کو نظر نہ آسکے۔ میں نے اسے دیکھ کر سر کو خفیف سی جنبش دی اور دوبارہ لاش کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں چند سیکنڈ تک تعظیماً خاموش کھڑا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایسے موقع پر کیا کیا جاتا ہے۔

مس لوسیا نے میرا مسئلہ اس طرح حل کیا کہ وہ میرے اور جولین کے درمیان کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ''میں تمہاری ممنون ہوں کہ یہاں آئے اور میرے غم میں شرکت کی۔ میرے دل پر ایک بوجھ ہے اور میں اسے ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ہم دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہونٹوں پر اس طرح انگلی رکھ لی جیسے ڈر ہو کہ کہیں مس بیرل کی روح اس کی باتیں سن کر واپس نہ آجائے۔

وہ ہمیں لے کر ایک نسبتاً آراستہ کمرے میں آئی اور ہمیں ان کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جن پر گلابی مخمل چڑھا ہوا تھا۔ وہ خود ایک عام سی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کس طرح شروع کروں۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''گزشتہ رات سونے سے پہلے میری بہن نے مجھے ایک خوف ناک راز میں شریک کیا تھا۔ غالباً وہ جان گئی تھی کہ اس کا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے۔ میں یہ اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ تمہیں بھی اس سے آگاہ کردوں۔ مسٹر لوئیس! تم قانون کے رکھوالے ہو جبکہ مس جولین ہم دونوں بہنوں کی فرشتہ صفت نرس اور ہمراز رہی ہیں اس لیے چاہتی ہوں کہ تم دونوں کو بھی اس حقیقت کا پتا چل جائے۔''

ہم دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون سا خوف ناک راز ہوسکتا ہے۔ کمرے میں کچھ دیر سکوت طاری رہا پھر اس کی بھاری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''میری بہن مسٹر فیرلے کی موت کی ذمے دار ہے۔''

مجھے لگا کہ بہن کی موت کے صدمے کے سبب اس کا ذہن متاثر ہوا ہے اور وہ اول فول بولے جارہی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے پہلے کے مقابلے میں صاف اور بھاری آواز میں کہا۔ ''اس نے اپنی چھڑی سے ان پر حملہ کیا اور انہیں پل کی ریلنگ پر سے گرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ ان کی موت واقع ہوگئی۔ اسے اپنے اس عمل پر ایک منٹ کے لیے بھی پچھتاوا نہیں ہوا۔''

ہم دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔ ''لیکن اس نے ایسا کیوں کیا مس وائٹ؟''

''مسٹر فیرلے نے ٹرین کے آنے کی آواز سن لی

ہوگی اور انہوں نے دیکھا ہوگا کہ میری بہن پل کی پٹری پر چل رہی ہے۔ انہوں نے چلا کر اسے خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور وہ اس کی جانب دوڑے تاکہ کھینچ کر پٹری سے دور کرسکیں۔''

جولین نے قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا۔''میرا یہ خیال ہے کہ مس بیرل کو غلط فہمی ہوگئی اور وہ مسٹر فیرلے کو اپنی جانب آتا دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی ہوگی۔''

مس لوسیا عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔''وہ جانتی تھی کہ کیا کررہی ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں مادام؟''جولین چونکتے ہوئے بولی۔

''ممکن ہے کہ اس کا ارادہ مسٹر فیرلے کو قتل کرنے کا نہ ہو اور اس نے اپنے دفاع میں ایسا کیا ہو۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اس نے مسٹر فیرلے کو قتل کیا لیکن کیوں؟ وہ تو اسے ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہ تھی؟''

''میری بہن کو معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ مس بیرل کو اس سے کیا خطرہ تھا؟''

''جب میری بہن نے مڑ کر دیکھا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کررہا ہے تو اس نے پوری قوت سے مسٹر فیرلے پر چھڑی سے حملہ کردیا۔''

''کیا تمہارے کہنے کا مطلب ہے......''

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔''تم جو بھی سمجھو لیکن میں نہیں سمجھتی کہ وہ جسمانی طور پر اتنی طاقتور تھی۔ یقیناً اس نے اپنے کمزور جسم کی پوری قوت مجتمع کرکے حملہ کیا ہوگا جس سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پل کی ریلنگ پر جاگرا۔ میری بہن کا کہنا تھا کہ وہ یہ گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ کوئی آوارہ شخص اس کے جسم کو ہاتھ لگائے۔ چاہے وہ ٹرین کے نیچے ہی کیوں نہ آجاتی۔''

مس لوسیا کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی تھیٹر میں اسٹیج پر کھڑی مکالمے ادا کررہی ہو۔ اس نے اپنے لہجے میں جوش پیدا کرتے ہوئے کہا۔''میری بہن نے بتایا کہ سر پر چھڑی کی ضرب لگنے سے وہ لڑکھڑایا اور اس نے اپنا ہیٹ سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس اثنا میں میری بہن نے اس پر ایک اور وار کردیا۔ وہ اس حملے سے نہ سنبھل سکا اور پل کی ریلنگ پر جاگرا۔ اس کی اونچائی بہت کم ہے اور اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ جب ٹرین پل پر سے گزر گئی تو میری بہن ایک ستون کا سہارا لیے نیچے کھائی کی تہ میں دیکھ رہی تھی جہاں فیرلے بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔''

میرا ارادہ مس لوسیا کی بے عزتی کرنے کا نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ڈرامائی انداز میں بول رہی ہے۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگالیا کہ میں نے اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا۔

''میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ بالکل سچ ہے۔''وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔''میری بہن بار بار کہہ رہی تھی کہ اس نے اپنے تمام حسابات مکمل کردیے ہیں۔ اس کے بعد وہ کوما میں چلی گئی۔ میرے والد کا انتقال بھی اسی طرح ہوا تھا۔ تب میں نے مس جولین کو پیغام بھیجا کہ وہ میرے پاس آجائے۔ اس نے ہر مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے اور اس کے آنے سے مجھے بڑی ڈھارس ہوتی ہے۔''یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔''کیا تم لوگ کافی پینا پسند کروگے؟''

اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے، وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ گئی لیکن چوکھٹ پر پہنچ کر وہ مڑی اور بولی۔ ''میں محسوس کررہی ہوں کہ مجھے بھی اپنی ایک چھوٹی سی غلطی کا اعتراف کرلینا چاہیے دراصل اس روز میں بڑی بہن کے ہاتھ پر گھڑی باندھنا بھول گئی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اسے گھڑی پہنا چکی ہوں لیکن میں نے اس بارے میں صرف سوچا تھا، عمل نہیں کیا تھا۔ بعد میں جب مجھے خیال آیا تو وہ جاچکی تھی۔ اگر اس کے ہاتھ میں گھڑی ہوتی تو اسے ٹرین کے گزرنے کے وقت کا پتا ہوتا اور وہ پل پر نہ جاتی اور نہ ہی مسٹر فیرلے اس کی مدد کے لیے آگے بڑھتے اور نہ ان کی جان جاتی۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔''

میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی خاص موضوع پر اتنی دیر تک گفتگو نہیں کی تھی۔ مجھے کمرے میں گھٹن کا احساس ہونے لگا تو میں تازہ ہوا میں سانس لینے کی خاطر باہر آگیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو جولین، مس لوسیا کا ہاتھ تھامے ہوئے کہہ رہی تھی کہ اسے اپنے آپ کو کسی عذاب میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں۔

''میں اس کی ضرورت پوری کرنے میں ناکام رہی۔''مس لوسیا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''یہ گھڑی ہمیشہ مجھے پریشان کرتی رہے گی۔''

جولین نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔''میرا خیال ہے مس لوسیا کہ اب تمہیں اتنے بڑے مکان میں رہنے کی ضرورت نہیں۔''

''اب تم نے یہ ذکر چھیڑ دیا ہے تو میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے ہمیشہ سے ہی سفر کرنے کی خواہش رہی ہے۔ میں براڈوے جانا چاہتی ہوں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''میں نے حیرت سے کہا۔

''مجھے ہمیشہ سے ہی براڈوے کے ڈرامے دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں جانتی ہوں کہ اس عمر میں یہ احمقانہ خواہش سمجھی جائے گی لیکن مرنے سے پہلے ایک مرتبہ لوگوں کے درمیان بیٹھ کر ان ڈراموں سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔''

اس نے ہم دونوں کے چہروں کے تاثرات پڑھ لیے اور بات بدلتے ہوئے بولی۔''میں چاہتی ہوں کہ میری بہن کی تجہیز و تکفین پورے وقار اور احترام کے ساتھ انجام پائے۔ میں نے ساری زندگی اس کے سامنے زبان نہیں کھولی حالانکہ کئی بار میرے ہونٹوں پر نیویارک کا نام آیا لیکن ادا نہیں کرسکی۔ میں نے اپنی تمام خواہشات کو دبا رکھا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے لگی ہوں اور میری ساری خواہشیں دوبارہ زندہ ہوگئی ہیں۔''

☆☆☆

واپسی کا سفر خاموشی سے گزرا۔ جولین مجھ سے بالکل چپک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا یا بے دھیانی میں فاصلہ رکھنا بھول گئی۔ خچر کی رفتار قدرے آہستہ تھی۔ شاید وہ بھی ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت ساتھ گزارنے کا موقع دینا چاہ رہا تھا۔ اچانک ہی وہ میری طرف گھومی اور اتنا قریب آگئی کہ اس کے بالوں کی لٹیں میرے چہرے کو چھونے لگیں۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''ڈیئی اسٹینلے! کوئی بات مجھے مسلسل پریشان کررہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا اظہار کس طرح کروں؟''

میں نے ناامیدی سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔''کیا تم مجھے صرف لوئیس کہہ کر مخاطب نہیں کرسکتیں جبکہ ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں۔''

اس نے میرے احتجاج کو نظر انداز کردیا، بولی۔ ''یقین جانو، میں نے کبھی اتنی بری بات نہیں سوچی۔''

''جو کچھ سوچ رہی ہو، وہ کہہ ڈالو۔ شاید پھر وہ بات اتنی زیادہ بری نہ لگے۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ مس لوسیا واقعی مس بیرل کے ہاتھ پر گھڑی باندھنا بھول گئی تھی۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہو۔ وہ جانتی تھی کہ مس بیرل کو ٹرینوں کی آمدورفت کے اوقات زبانی یاد ہیں اور وہ تقریباً روزانہ ہی اسٹیشن جاکر معلوم کیا کرتی تھی کہ کہیں اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی۔ وہ بہری ہونے کی وجہ سے ٹرین کی آواز نہیں سن سکتی تھی اس لیے گھڑی کی مدد سے وہ ٹرین کے گزرنے کے وقت کا اندازہ لگالیتی تھی۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مس لوسیا نے ایک منصوبے کے تحت اس کے ہاتھ پر گھڑی نہ باندھی ہو تاکہ اسے وقت کا اندازہ نہ ہو اور وہ ٹرین سے ٹکرا جائے۔ آخر وہ کب تک اس کی دیکھ بھال کرسکتی تھی، کب تک اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتی جبکہ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ مس بیرل کو بڑھاپے کے علاوہ اور کوئی بیماری نہیں اور کافی عرصے تک اس کے زندہ رہنے کا امکان ہے۔''

وہ میرے اتنے قریب تھی کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے پہلو سے لگاتے ہوئے بولا۔''مس لوسیا کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اس کی ساری دولت سمیٹ کر خاموشی سے شمال کی جانب نکل جاتی اور بقیہ عمر وہاں رہ کر تھیٹر کے ڈرامے دیکھ کر لطف اندوز ہوتی رہتی۔''

جولین نے اپنا چہرہ میرے قریب کرلیا۔ ایک بار پھر اس کے بالوں کی لٹ میری سوچھوں کو چھونے لگی۔ اس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ ابھری اور وہ سرشاری کے عالم میں بولی۔''تم بھی بالکل بدھو ہو میرے ڈیئی۔ وہ دولت کتنے عرصے اس کا ساتھ دیتی لیکن اب وہ اپنی بہن کے ترکے کی واحد وارث ہے۔ اس کے حصے میں یہ عالی شان مکان اور پھلوں کا باغ بھی آیا ہے۔ اگر وہ مکان بیچ دے تب بھی پھلوں کے باغ کی آمدنی سے ساری عمر عیش کرسکتی ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔''لیکن ہم مس لوسیا کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتے۔ بہن کے ہاتھ پر گھڑی نہ باندھنا کوئی جرم نہیں ہے۔ بظاہر مس بیرل ہی فیرلے کی موت کی ذمے دار ہے۔ اگر وہ اس پر چھڑی سے حملہ نہ کرتی تو وہ پل سے نیچے نہ گرتا۔ اس کیس کو داخلِ دفتر ہی سمجھو اور کسی سے اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔''

''ہاں، شاید ان دونوں کی موت اسی طرح لکھی تھی۔''وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی پھر اس نے میرے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔''اور جو کچھ اب ہورہا ہے؟''

''اسے بھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلو۔''میں نے ہنستے ہوئے کہا اور گاڑی کی رفتار تیز کردی۔

سفید پوش

ملک صفدر حیات

محبت کرنا کوئی جرم نہیں لیکن اس کے حصول کے لیے جرائم کا ارتکاب ناقابلِ معافی ہوتا ہے اور اسی لیے محبت جیسا پاکیزہ جذبہ دنیا کی نگاہ میں شرم اور ذلت کا احساس بن کر رہ جاتا ہے... اگرچہ وہ بھی ایک وفادار نمک خوار تھا لیکن جانے کیسے اتنی پستی کی جانب چل دیا کہ جس کے ہر قدم پر رسوائی اور ذلت کی کیچڑ بکھری ہوئی تھی جبکہ اس وقت اس پر تو جیسے بس عشق کی وحشت سوار تھی اور یہ گھبراہٹ کہ اگر ابھی کچھ نہ کرسکا تو کبھی کچھ نہ کرسکے گا لہٰذا اس جنونی عاشق نے سر دھڑ کی بازی لگادی مگر افسوس کہ نہ سر بلندی سے اٹھا سکا اور نہ دھڑ منزل کی جانب جا سکا۔ کیونکہ نیت میں کھوٹ ہو تو حقیقی خوشی دور کھڑی مسکراتی ہے اور جب محافظ ہی غاصب بن جائے تو دنیا کے ہر رشتے سے اعتبار ختم ہو جاتا ہے... اس پر بھی بہت مشکل سے یقین آیا تھا اور جب آگیا تو ہر چہرے میں لٹیروں کی جھلک نظر آنے لگی... اس دھندلے منظر کو ملک صفدر حیات نے اس طرح شفاف طریقے سے واضح کیا کہ ہر ہر چہرے سے نقاب الٹ گئی۔

دل کے ہاتھوں مجبور اپنی چادر سے پاؤں نکالنے والے ایک سرپھرے عاشق کی دلیری

اپریل کی کوئی تاریخ تھی۔ میں تھانے میں بیٹھا روزمرہ کے کام نمٹا رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا، چودھری قادر علی مجھ سے ملنے آیا ہے۔

قادر علی سے میری پہلے بھی دو تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ وہ شمس آباد کا چودھری تھا۔ شمس آباد نامی یہ گاؤں میرے تھانے سے مشرق کی سمت، ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ''شمس آباد'' کا نام چودھری قادر علی کے دادا مرحوم شمس علی کے نام پر رکھا گیا تھا مگر یہ گئے وقتوں کا قصہ ہے۔ اب تو قادر علی کا والد نادر علی بھی مرحوم ہو چکا تھا اور خود قادر علی بھی میری معلومات کے مطابق، پچاس کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔

''چودھری قادر خیریت سے آیا ہے نا؟'' میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے استفسار کیا۔

''خیریت نظر تو نہیں آرہی جناب۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''ان کے ساتھ چار پانچ افراد بھی ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ پچھلی رات ان کی حویلی میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''بڑی گڑبڑ......!'' میں نے کانسٹیبل کے الفاظ کو دہرایا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے، چودھری قادر علی کو فوراً میرے پاس بھیجو۔''

''جو حکم ملک صاحب!'' کانسٹیبل مجھے سیلوٹ کرنے کے بعد کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد چودھری قادر علی میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے افراد کو باہر برآمدے ہی میں چھوڑ دیا تھا جس سے دو

باتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ نمبر ایک، اس کے ہمراہ آنے والے لوگ غیر اہم تھے۔ نمبر دو، معاملہ خاصا گمبھیر تھا۔ ویسے چودھری کی حالت سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ حالات چودھری کے قابو میں نہیں ہیں ورنہ وہ یوں افراتفری کے عالم میں خود تھانے آنے کے بجائے اپنے کسی بندے کو بھیجتا۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔

''ملک صاحب!'' وہ پریشان لہجے میں بولا۔ ''پچھلی رات ڈاکوؤں نے میری حویلی میں گھس کر قیامت برپا کر دی ہے۔ وہ...... وہ میری جوان بیٹی نورین کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چودھری صاحب؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' چودھری نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔ ''ایک ہفتے کے بعد نورین کی شادی تھی۔ ڈاکو نورین کے ساتھ تمام طلائی زیورات اور قیمتی ملبوسات کا بھی صفایا کر گئے ہیں۔ جس سوٹ کیس میں یہ سامان رکھا ہوا تھا، وہ کمرے سے غائب ہے......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! یہ بہت ہی حساس اور سنگین معاملہ ہے، اسی لیے میں خود چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آج جمعہ ہے۔ اگلے جمعے کو نورین کی رخصتی ہے۔ آپ کو کسی بھی قیمت پر اگلے جمعے سے پہلے نورین کو واپس لانا ہے ورنہ میری ناک کٹ جائے گی۔ میری عزت اب آپ کے ہاتھ میں ہے......''

مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن میں چودھری قادر علی کے بارے میں جتنا بھی جانتا تھا، اس کی روشنی میں وہ روایتی ''چودھری برادری'' سے ہٹ کر ایک صلح جو، امن پسند اور نمود و نمائش سے عاری شخص تھا۔ اس کی حویلی میں اتنا بڑا واقعہ پیش آ گیا تھا اور وہ اپنی مغوی بیٹی کی واپسی کے لیے مجھ سے منت کر رہا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی روایتی چودھری ہوتا تو اب تک پورے گاؤں بلکہ ارد گرد کے گاؤں کی بھی ایسی کم تیسی کر چکا ہوتا۔ تھانے وہ بعد میں آتا، پہلے وہ اپنی جاگیردارانہ طاقت کو آزمانے کی کوشش کرتا۔

میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہیں کریں چودھری صاحب...... ایک ہفتہ تو بہت بڑا عرصہ ہے، میں آپ کی بیٹی کو ایک دو دن ہی میں ڈھونڈ نکالوں گا مگر......''

''مگر کیا ملک صاحب؟'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''مگر یہ کہ......'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے تمام تر حالات پوری سچائی کے ساتھ بتائیں گے۔''

''جی ہاں...... بالکل......!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میری آپ سے ایک درخواست ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ فوری طور پر میرے ساتھ حویلی چلیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پہلے آپ وقوعہ کا معائنہ کر لیں۔ اس کے بعد آپ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے، میں اس کا جواب دوں گا۔''

اس کی تجویز انتہائی معقول تھی لہٰذا میں نے اس کے ہمراہ شمس آباد جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم تھانے سے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

شمس آباد ایک ہزار سے بارہ سو تک نفوس کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہم جلد ہی چودھری قادر علی کی معیت میں شمس آباد پہنچ گئے۔ میرے ساتھ عملے کا ایک آدمی کانسٹیبل واحد بھی تھا۔ واحد بہت تیز طرار اور چاق و چوبند اہلکار تھا۔

تانگے حویلی کے گیٹ پر رکے اور چودھری ہمیں اپنے ساتھ حویلی کے اندر لے گیا۔ وہ حویلی نہ تو زیادہ بڑی تھی اور نہ ہی چھوٹی۔ اس کی آرائش و زیبائش پر بھی دل کھول کر خرچہ نہیں کیا گیا تھا۔ چودھری قادر علی چونکہ خود سادہ مزاج کا مالک تھا لہٰذا اس کی حویلی کے چپے چپے سے بھی سادگی جھلکتی تھی۔ عام روایتی چودھریوں کی حویلیوں جیسی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے کانسٹیبل واحد کو خصوصی ہدایات دے کر حویلی کے مختلف بیرونی حصوں کے ''معائنے'' پر مامور کر دیا اور خود چودھری کے ہمراہ اندرونی رہائشی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

چودھری قادر علی مجھے ایک ایسی جگہ لے آیا جہاں چار کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ اس مقام تک رسائی سے پہلے حویلی کی خواتین کو دوسرے حصے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں نے اوپر جن چار کمروں کا ذکر کیا، وہ بنیادی طور پر بیڈ روم تھے۔ یہ کمرے شمالاً جنوباً حویلی کے وسطی حصے

میں بنے ہوئے تھے۔

جنوبی سمت میں واقع آخری کمرا چودھری قادر علی اور چودھرائن زاہدہ پروین کی خواب گاہ تھی۔ اس کے بعد گھریلو ملازمہ بشیراں کا کمرا تھا جو چودھری کے دو بیٹوں کی آیا بھی تھی۔ پانچ سالہ نوید اور تین سالہ سعید بشیراں کی نگرانی اور نگہداشت میں رہتے تھے اور رات کو اسی کے کمرے میں سوتے تھے۔ بشیراں کے بعد مغوی نورین کا کمرا تھا اور شمالی سمت میں سب سے آخر میں ایک ایسا کمرا تھا جہاں نورین کے جہیز کا سامان رکھا گیا تھا۔ تمام کا تمام فرنیچر اور دیگر قیمتی سامان جوں کا توں کمرے کے اندر موجود تھا۔ بس، وہاں سے وہ سوٹ کیس غائب تھا جس کے اندر طلائی زیورات اور بیش بہا ریشمی ملبوسات رکھے ہوئے تھے۔

میں نے نورین اور جہیز والے کمرے کو جائے وقوعہ کی حیثیت دیتے ہوئے وہاں کا تفصیلی اور تنقیدی معائنہ کیا۔ دونوں کمروں کے کسی بھی حصے سے مجھے افراتفری کے آثار نہیں ملے جن سے ظاہر اور ثابت ہوتا ہو کہ وہاں ڈاکوؤں نے کوئی ہنگامی کارروائی کی ہوگی جبکہ چودھری قادر علی نے مجھے تھانے میں یہی بتایا تھا کہ...... پچھلی رات ڈاکوؤں نے میری حویلی میں گھس کر قیامت برپا کر دی ہے اور وہ میری جوان بیٹی نورین کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

میں دونوں کمروں کے تسلی بخش جائزے سے فارغ ہوا تو چودھری قادر کو لے کر ایک کمرے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''چودھری صاحب! آپ ایک امن پسند اور شریف النفس انسان ہیں اس لیے میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں مگر جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، اس کے آثار کہیں نظر نہیں آ رہے......''

''میری بیٹی حویلی سے غائب ہے......'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''قیمتی سامان والا سوٹ کیس بھی کمرے میں موجود نہیں...... آپ کو اور کس قسم کے آثار کی تلاش ہے؟''

''میرا اشارہ ڈاکوؤں کی کارروائی کی جانب تھا چودھری صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''جب ڈاکو کہیں پر ہلّا بولتے ہیں تو وہاں افراتفری اور ابتری پیدا ہوتی ہے لیکن میں نے جن دو کمروں کا معائنہ کیا ہے، وہاں تو سب امن و امان ہی دکھائی دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی بیٹی خود ہی سوٹ کیس اٹھا کر کہیں چلی گئی ہو۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔

''حالات و واقعات کی روشنی میں میرے ذہن نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔'' میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''معذرت کے ساتھ مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ حویلی کے اندر مجھے ڈاکوؤں کی کارروائی کہیں نظر نہیں آ رہی۔''

''مگر نورین...... بھاری سوٹ کیس اٹھا کر...... خود کیوں کہیں چلی جائے گی؟'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری بیٹی اس قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتی ملک صاحب۔''

''میں آپ کے کرب کو محسوس کر سکتا ہوں چودھری صاحب!'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ نے خود اپنی آنکھوں سے ڈاکوؤں کو یہ کارروائی کرتے دیکھا تھا؟''

''میں نے نہیں، بشیراں نے دیکھا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''وہ...... آپ کی گھریلو ملازمہ اور بچوں کی آیا؟''

''جی ہاں!'' چودھری نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''بشیراں آدھی رات کو میرے چھوٹے بیٹے سعید کو رفع حاجت کرانے کے لیے کمرے سے نکل کر باتھ روم کی طرف بڑھی تو اس نے دو افراد کو تیزی سے حویلی کے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے اپنے سر پر سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا اور دوسرے نے اپنے کندھے پر نورین کو لاد رکھا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئی اور اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں آن واحد میں کمرے سے باہر آیا اور بشیراں نے مجھے بتایا کہ ڈاکو نورین کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے حویلی کے گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا لیکن جب تک میں حویلی سے باہر پہنچتا، ڈاکو وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ وہ تعداد میں کتنے تھے۔ رات کی تاریکی میں مجھے گھوڑوں کے بھاگنے کی مخصوص آوازیں سنائی دیں۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، وہ دو یا تین یا پھر چار گھوڑے تھے۔''

''آپ نے ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔ ''حویلی میں آپ کے محافظ ملازم بھی تو موجود ہوں گے۔ وہ ڈاکوؤں

کی کارروائی کے دوران میں کہاں تھے؟ ڈاکو حویلی میں اتنی بڑی واردات کرکے رفوچکر ہوگئے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے کیوں بیٹھے رہے......؟''

میرے متعدد سوالات کے جواب میں چودھری قادر علی نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔ ''حویلی کا کھلا ہوا گیٹ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ یہ جیلا اور بالا کہاں مر گئے ہیں۔ جیلا اور بالا میرے خاص ملازم ہیں جو حویلی کے گیٹ کے قریب ہی بنے ہوئے ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ حویلی کی نگرانی اور پہرے داری ان کے فرائض میں شامل ہے۔''

''پھر جیلا اور بالا کے بارے میں آپ کو کیا پتا چلا؟'' وہ لمحے بھر کو رکا تو میں نے سوال کیا۔

''بشیراں کی پکار پر تو میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور سیدھا حویلی کے گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن جب ڈاکو تاریکی میں غائب ہوگئے تو میں نے تیزی سے جیلا اور بالا کے کمرے کا رخ کیا تھا۔''

''کیا وہ دونوں اپنے کمرے میں موجود تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ دونوں بے ہوش پڑے تھے۔''

''بے ہوش......!'' میں چونک اٹھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا......؟''

''وہ اپنی اپنی چارپائی پر بے سدھ پڑے تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے انہیں جگانے کے لیے پہلے آوازیں دیں۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے تو میں نے غصے میں انہیں جھنجوڑ ڈالا اور ان کی چارپائیوں کو ٹھڈے بھی مارے مگر اس سے بھی بات نہ بنی تو میں نے بالٹی بھر بھر کر ان پر پانی ڈالا......'' وہ ذرا دیر کو سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بڑی مشکل سے میں انہیں ہوش میں لانے میں کامیاب ہوسکا۔ جب وہ کچھ بتانے کے قابل ہوئے تو پتا چلا، ان دونوں کو حویلی میں ہونے والی واردات کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ ڈاکو ان کی بے ہوشی کے دوران ہی میں اپنا کام کرکے چلتے بنے تھے۔ مجھے تو یہ لگتا ہے ملک صاحب! ڈاکوؤں نے کسی طرح حویلی میں داخل ہونے کے بعد جیلا اور بالا کو بے ہوش کیا پھر وہ نورین والے کمرے میں پہنچے اور اٹھانے سے پہلے اسے بھی بے ہوش کردیا ورنہ وہ اپنے اغوا کے وقت ضرور شور مچاتی۔ اس قسم کی وارداتیں کرنے والے مجرموں کے پاس بے ہوشی والی دوا میں بسا ہوا رومال ہوتا ہے جو وہ کسی کو بھی سنگھا کر اتنا غفیل کردیتے ہیں۔ سوتے ہوئے آدمی پر تو اس رومال کا استعمال اور بھی آسان ہوجاتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چودھری صاحب!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''ڈاکوؤں کے پاس کلوروفارم میں بسا ہوا ایسا رومال ہوتا ہے جسے وہ موی (موم جامہ کی بنی ہوئی) تھیلی میں محفوظ رکھتے ہیں اور بہ وقتِ ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ نورین پر کلوروفارم والے رومال کا استعمال تو سمجھ میں آنے والی بات ہے مگر......'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''مگر یہ جیلا اور بالا کیسے پہرے دار ہیں جنہیں بہ یک وقت ڈاکوؤں نے تسخیر کرلیا...... کیا وہ گہری نیند میں ڈوب کر حویلی کی نگرانی کررہے تھے؟''

''میں نے انہیں سختی سے ہدایت کررکھی ہے، وہ باری باری اپنی نیند پوری کریں یعنی ایک وقت میں ایک سوئے اور دوسرا جاگتا رہے۔'' چودھری نے بتایا۔ ''پچھلی رات ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے، یہ میں نے ابھی ان سے پوچھا نہیں۔ ان ہنگامی حالات نے مجھے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔''

''کوئی بات نہیں چودھری صاحب! آپ نہیں پوچھ سکے تو یہی سوال میں ان سے کروں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے حویلی میں مقیم دوسرے افراد سے بھی پوچھ گچھ کرنا ہے۔''

''کیوں نہیں...... ضرور۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''چودھری صاحب! آپ ذرا میرے ساتھ حویلی سے باہر آئیں۔''

وہ فوراً سے پیشتر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر ہم حویلی کے اندرونی حصے سے نکل کر کشادہ صحن سے گزرتے ہوئے حویلی کے گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ میں نے چودھری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''چودھری صاحب! آپ کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں؟''

''نہیں جناب!'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نے ایسا کوئی روگ نہیں پال رکھا۔ اللہ کا شکر ہے، نہ میں کسی کا دشمن ہوں اور نہ کوئی میرا دشمن ہے۔''

''مگر آپ کے بقول پچھلی رات حویلی میں جو

اندوہناک واقعہ پیش آیا ہے، وہ کسی دوست کا کارنامہ تو نہیں ہوسکتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر اسے سیدھی سادی ڈاکوؤں کی واردات بھی سمجھ لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں کو حویلی کے اندرونی حالات ومعاملات کی اتنی گہری معلومات کیسے تھیں کہ وہ بہ آسانی حویلی کے اندر داخل ہوئے، انہوں نے چوکیداروں کو...بے ہوش کیا پھر وہ سیدھے نورین کے کمرے میں پہنچے۔ اسے بے ہوش کرکے اٹھایا اور اس کے برابر والے کمرے سے طلائی زیورات وقیمتی ملبوسات والا سوٹ کیس اٹھا کر اطمینان سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔''

''کون سی بات؟'' چودھری نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

میں نے بتایا۔ ''یہ کہ اس واردات سے پہلے ڈاکوؤں نے حویلی کے اندرونی حالات کے بارے میں مکمل تحقیق کی ہوگی کہ کون سی چیز کہاں اور کس جگہ پر ہوگی۔ اور عین ممکن ہے، یہ خطرناک معلومات حویلی کے اندر ہی سے کسی نے انہیں پہنچائی ہو۔''

''آپ کا مطلب ہے......'' وہ چلتے چلتے رک گیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''حویلی کا کوئی آدمی ان ڈاکوؤں کے ساتھ ملا ہوا ہے......''

''یہ ناممکن تو نہیں چودھری صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چودھری صاحب! دراصل پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ موجودہ حالات کو دیکھ کر ایک بات میرے ذہن میں آئی اور وہ میں نے آپ کے سامنے بیان کردی۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ آپ کے کسی دشمن کی کارروائی ہے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ دشمن حویلی کے اندرونی حالات سے پوری طرح آگاہ ہے۔ یہ آگاہی اس نے چاہے کیسے بھی حاصل کی ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''دیکھیں جی ملک صاحب......'' وہ ایک مرتبہ پھر میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''اگر اس روئے زمین پر واقعی کوئی میرا دشمن ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور جہاں تک حویلی کے اندر سے کسی کے معلومات فراہم کرنے کا تعلق ہے تو میں کسی پر شک نہیں کرسکتا۔ یہ سب میرے بھروسے کے لوگ ہیں۔''

باتیں کرتے ہوئے ہم حویلی کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''چودھری صاحب! آپ کے وہ دونوں ملازم جیلا اور بالا کہیں نظر نہیں آرہے۔''

''یہیں کہیں ہوں گے جناب۔'' وہ سرسری لہجے میں بولا۔ ''جب ہم تھانے سے واپس آئے تھے تو میں نے انہیں ادھر ہی دیکھا تھا۔''

ہم حویلی کے گیٹ سے باہر نکل آئے تو میں نے دریافت کیا۔ ''چودھری صاحب! آپ نے ڈاکوؤں کو کس جانب فرار ہوتے دیکھا تھا...... میرا مطلب ہے، ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی مخصوص آواز تاریکی میں کس سمت محسوس ہوئی تھی؟''

''اس طرف جناب......!'' چودھری نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''ادھر تو تھانہ ہے۔''

''میں نے جو دیکھا اور جو سنا، وہ آپ کو بتادیا ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ شمس آباد سے مغرب میں ایک میل کے فاصلے پر میرا تھانہ تھا اور اسی سمت میں اگر مزید آگے بڑھتے جائیں تو لگ بھگ میل، سوا میل کے بعد جنگل شروع ہوجاتا تھا جو شمالاً جنوباً میلوں تک پھیلا ہوا تھا جبکہ شرقاً غرباً بھی اس کا پھیلاؤ پانچ میل سے کم نہیں تھا۔ وہ ڈاکو شمس آباد سے نکل کر مجھے سلام کرنے تھانے تو آنہیں سکتے تھے۔ اغلب امکان یہی نظر آتا تھا کہ انہوں نے تھانے سے پہلو تہی کرتے ہوئے جنگل کا رخ کیا ہوگا۔ اس بات کا فوری طور پر فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا کہ اگر وہ جنگل ہی میں گھسے تھے تو سیدھے مغربی سمت بڑھتے چلے گئے تھے یا انہوں نے اپنے گھوڑوں کو شمالاً جنوباً کسی طرف موڑ لیا تھا۔

میں نے چودھری قادر علی کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تو وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! ایسا ہوسکتا ہے۔ بس، اب آپ جلدی سے میری نورین کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ میری عزت پر کوئی حرف نہ آئے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں چودھری صاحب۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اللہ عزت رکھنے والا ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ نورین شمس آباد سے بیاہ کر کہاں جانے والی تھی؟''

''بہادر پور!'' اس نے جواب دیا۔ ''بہادر پور کے چودھری خدا بخش کے بیٹے کریم بخش سے نورین کی شادی ہونے والی تھی۔''

''بہادر پور'' نامی وہ گاؤں، شمس آباد سے جنوب مغرب میں، چارمیل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میری معلومات کے مطابق بہادر پور کے اختتام سے جنگل شروع ہوجاتا تھا۔ گویا وہ جنگل کے کنارے واقع تھا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''چودھری صاحب! نورین اور کریم بخش کا رشتہ امن وامان سے طے ہوگیا تھا یا اس دوران میں کوئی بدمزگی ہوئی تھی...... یا یہ کہ نورین کے دوسری جگہوں سے بھی رشتے آئے تھے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی، اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مگر یقین کریں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ چودھری خدا بخش سے میری دیرینہ دوستی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتے ہیں۔ کریم بخش اور نورین کے رشتے کی بات ہم دونوں کے درمیان ہی طے پائی تھی اور کسی کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ایک سال پہلے منگنی ہوئی تھی اور اب ایک ہفتے بعد نورین کی برات آنے والی تھی کہ......!'' بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

میں اسے حویلی کے اندر لے آیا۔ یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ پورے شمس آباد میں تھرتھلی مچ گئی تھی۔ حویلی کے نزدیک بھی گاؤں کے کئی افراد جمع تھے لیکن چودھری کے ملازمینِ خاص جیلا اور بالا کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے چودھری سے کہا۔

''چودھری صاحب! جیلا اور بالا کو پیدا کریں۔ ان کے بیانات بہت ضروری ہیں۔ پتا نہیں، وہ کدھر غائب ہیں؟''

چودھری نے گاؤں کے دو اہم افراد کو اپنے پاس بلا کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''تم دونوں فوری طور پر جیلا اور بالا کو ڈھونڈ کر میرے پاس لاؤ...... فوراً!''

وہ دونوں حکم بجالانے کا یقین دلاتے ہوئے روانہ ہوگئے۔

میری نظر میں چودھری قادر علی کے ذاتی ملازم اور حویلی کے نگران جیلا و بالا نہایت ہی اہم افراد تھے۔ انہیں بے ہوش کرنے کے بعد ہی مبینہ ڈاکوؤں نے حویلی والی مہم سر کی تھی۔ جیلا اور بالا سے پوچھ گچھ کی جاتی تو ڈاکوؤں کے حوالے سے کوئی اہم سراغ ہاتھ لگ سکتا تھا۔ میں نے حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچنے کے بعد کہا۔

''چودھری صاحب! جب تک جیلا اور بالا یہاں پہنچتے ہیں، اس وقت تک میں آپ کی گھریلو ملازمہ بشیراں سے چند سوالات کرلیتا ہوں۔ سب سے پہلے بشیراں ہی نے ڈاکوؤں کو دیکھا تھا۔ ممکن ہے، بشیراں سے کوئی ایسی بات پتا چل جائے جس سے نورین تک پہنچنا آسان ہوجائے۔''

چودھری نے مجھے برآمدے میں بٹھایا اور کہا۔ ''میں بشیراں کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔''

پھر وہ حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بشیراں میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ گھنگرالے بالوں والی سانولے رنگ کی ایک فربہ اندام عورت تھی۔ قد میانہ اور عمر پینتالیس، پچاس کے درمیان۔ چودھری کے مطابق بشیراں کی ساری زندگی اسی حویلی میں گزری تھی اور وہ اس کی نظر میں ایک قابلِ بھروسا ملازمہ تھی۔

میں نے بشیراں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چودھری صاحب تمہاری بہت تعریف کررہے تھے۔ وہ تمہارے کام سے بہت خوش ہیں۔ نورین والے واقعے کا تمہیں بھی دکھ ہوا ہوگا؟''

میں نے ملے جلے جملوں سے پوچھ گچھ کا آغاز کیا تھا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''چودھری صاحب کی مہربانی ہے جو انہوں نے میری تعریف کی۔ میں تو حویلی کے کام کو عبادت سمجھ کر کرتی ہوں جی اور جہاں تک نورین والے واقعے کا تعلق ہے......'' اس نے ذرا رک کر ایک گہری سانس لی پھر بڑے کرب سے بولی۔ ''جس طرح میں چودھری نوید اور چودھری سعید کو پال رہی ہوں نا...... ایسے ہی نورین کی پرورش بھی میرے ہی ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ اس سے آپ میرے دکھ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر سعید میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میں ہر شے کی پروا کیے بغیر ان ڈاکوؤں کے پیچھے دوڑ لگا دیتی......''

''ہوں......!'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اب تک میں جتنی معلومات حاصل کرسکا ہوں، ان کے مطابق سب سے پہلے ڈاکوؤں کو تم ہی نے دیکھا تھا۔ کیا تم ان کے قد کاٹھ یا حلیوں کے بارے میں مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟''

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آدھی رات کا وقت تھا اور ہر طرف اندھیرا ہی

اندھیرا۔ میں ان لوگوں کے چہرے نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ......''

''کیونکہ...... کیا؟'' وہ رکی تو میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''انہوں نے ڈھانٹے لگا رکھے تھے۔'' وہ بڑے سکون سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''جب میں ننھے سعید کو رفع حاجت کرانے کے لیے اپنے کمرے سے نکل کر حویلی کے صحن کی طرف آئی تو میں نے ان دونوں ڈاکوؤں کو تیزی سے بھاگ کر حویلی کے گیٹ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے زیورات اور قیمتی سامان والا سوٹ کیس اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا اور دوسرے نے نورین کو کندھے پر لاد رکھا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر بہت زور سے چیخی تھی۔ میری آواز سن کر چودھری صاحب اپنے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ جب میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔''

وہ تفصیل بیان کرکے خاموش ہوئی تو میں نے استفسار کیا۔ ''بشیراں بی بی! تم نے رات کی تاریکی میں کیسے جان لیا کہ ایک ڈاکو نے نورین کو کندھے پر ڈال رکھا تھا؟''

''کیا مطلب ہے جی آپ کا......؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''نورین اپنے کمرے سے غائب تھی تو ڈاکو پھر نورین ہی کو اٹھا کر لے گیا تھا نا جی!''

وہ میری بات کو سمجھ نہیں پائی تھی لہٰذا میں نے آسان الفاظ میں کہا۔ ''نورین کے کمرے کو تو بعد میں چیک کیا گیا ہوگا۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ جب تم نے ڈاکوؤں کو حویلی کے گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ وہ نورین ہی ہے۔ میں اس پہچان کی وجہ جاننا چاہتا ہوں؟''

''تھانے وار صاحب! اس حویلی میں ہم تین ہی عورتیں ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اور تینوں کا قد کاٹھ اور جسامت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔ چودھرائن جی دبلی پتلی اور چھوٹے قد کی ہیں جبکہ نورین بھرے ہوئے جسم کی مالک ایک اونچی لمبی لڑکی ہے۔ بس، میں نے انہی خصوصیات کی بنا پر اندازہ لگایا تھا کہ ڈاکو نے نورین کو کندھے پر ڈال رکھا ہے۔''

بشیراں بی بی کی وضاحت سے میری تسلی ہوگئی۔ میں نے پوچھا۔ ''جب ڈاکو نورین کو کندھے پر ڈال کر حویلی کے گیٹ کی طرف بھاگ رہا تھا تو کیا نورین نے کوئی مزاحمت کرنے یا شور مچانے کی کوشش نہیں کی تھی؟''

''نہیں جی......'' اس نے گردن کو نفی میں جنبش دی اور بتایا۔ ''وہ تو ایسے لگ رہا تھا جناب کہ ڈاکو کسی لاش کو اٹھا کر بھاگ رہا ہو۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکوؤں نے نورین کو پہلے بے ہوش کیا ہوگا اور اس کے بعد ہی اٹھایا ہوگا۔ ان ظالموں نے حویلی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے حویلی کے رکھوالوں جیلا اور بالا کو بے ہوش کیا تھا۔''

پھر بشیراں مجھے جیلا اور بالا کی بے ہوشی کی تفصیل سنانے لگی۔ یہ باتیں پہلے ہی چودھری قادر علی کی زبانی مجھ تک پہنچ چکی تھیں لہٰذا میں نے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے براہِ راست سوال کیا۔

''بشیراں! تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟''

''میں...... میں کیا جانوں جی......!'' وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگی۔ ''مجھے تو وہ دونوں ڈاکو ہی لگے تھے۔''

''یعنی...... تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ چودھری قادر علی کے ساتھ یہ دشمنوں والی کارروائی کس نے کی ہے؟''

''نہیں جی......'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

اس کے بعد میں لگ بھگ دس منٹ تک گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے سوالات کرکے بشیراں سے یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ ڈاکوؤں کو کیسے پتا چلا، کس کمرے میں نورین سوتی ہے؟ کس کمرے میں طلائی زیورات اور قیمتی ملبوسات والا سوٹ کیس رکھا ہوا ہے؟ وہ حویلی میں کس تدبیر سے داخل ہوئے؟ انہوں نے حویلی کے رکھوالوں پر کس طرح قابو پایا...... اور کیا کسی گھر کے بھیدی نے تو یہ لنکا نہیں ڈھائی؟

بشیراں سے مجھے کوئی بھی ایسی بات معلوم نہ ہوسکی جسے ''کام'' کی بات کہا جاسکے اور جس کی ''مدد'' سے نورین کو ڈھونڈنے میں آسانی میسر آجائے۔ میں بشیراں سے سوال کرتے ہوئے مسلسل اس کے چہرے کے تاثرات، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کی حرکات وسکنات کا بھی باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا جس کے نتیجے میں میرا پیشہ ورانہ تجربہ یہ کہتا تھا، وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے اسے فارغ کردیا۔

میں پچھلے ایک گھنٹے سے چودھری قادر علی کی حویلی میں موجود تھا اور میری حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس حویلی میں زندگی بسر کرنے والے افراد کی تعداد آٹھ تھی۔ چودھری قادر علی، اس کی بیوی زاہدہ پروین، ان کے تین بچے نورین، نوید، سعید، ملازمہ بشیراں بی بی اور دو ملازم رکھوالے...... جیلا اور بالا!

نورین اغوا ہوچکی تھی۔ سعید اور نوید کی عمریں ایسی

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یاد ہے...... چلیں۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں چودھری قادر علی کے کمرے میں موجود تھا۔ اس وقت ہم تینوں کے سوا وہاں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ چودھری کی بیوی زاہدہ پروین کو دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ وہ چودھرائن ہے کیونکہ چودھری اور زاہدہ پروین کی عمروں میں بہت زیادہ فرق تھا۔

چودھری نے میری آنکھوں اور چہرے پر نمودار ہونے والی حیرت کو فوراً نوٹ کرلیا اور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''زاہدہ سے میری شادی کو چھ سال ہوئے ہیں۔''

''اور نورین......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے چودھری کی طرف دیکھا۔

''وہ میری پہلی بیوی مختار بیگم سے ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مختار بیگم سے میری چار اولادیں ہوئی تھیں۔ تین بیٹے تو پیدا ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ چوتھے نمبر پر نورین پیدا ہوئی تھی اور اسے جنم دیتے ہوئے مختار بیگم کا انتقال ہوگیا تھا۔ زاہدہ سے میری دو اولادیں ہیں...... سعید اور نوید۔''

زاہدہ پروین کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس سال رہی ہوگی۔ وہ بلاشبہ ایک پرکشش اور حسین وجمیل عورت تھی تاہم ان لمحات میں وہ خاصی افسردہ نظر آتی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔

''تھانے دار صاحب......!'' اس کے لہجے سے دکھ اور اداسی ٹپکتی تھی۔ ''مجھے نورین کو پیش آنے والے واقعے کا بڑا غم ہے۔ پچھلے چھ سال میں ہمارے درمیان بڑے گہرے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ ہم بالکل دو سہیلیوں کی طرح حویلی میں رہتی تھیں۔ میں پچھلے چھ ماہ سے کتنے چاؤ سے اس کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ پتا نہیں کس ظالم نے......'' بولتے بولتے زاہدہ کی آواز بھرا گئی۔

میں نے مناسب الفاظ میں چودھرائن کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں انشاء اللہ بہت جلد نورین کو تلاش کرکے واپس لے آؤں گا۔ میری تسلی تشفی سے اس کی پریشانی میں قدرے کمی واقع ہوئی تو میں چودھری کے ساتھ حویلی کے بیرونی حصے میں آگیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ واپس آگئے جنہیں چودھری قادر علی نے جیلا اور بالا کی تلاش میں بھیجا تھا۔ بالا حویلی پہنچ گیا تھا مگر جیلا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چودھری نے بالا سے پوچھا۔

''تم لوگ کہاں مر گئے تھے؟'' چودھری کے استفسار میں خفگی تھی۔ ''اور وہ جیلا کدھر ہے؟''

''چودھری صاحب!'' بالا لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں جیلا کو روکتا رہا مگر اس نے میری ایک نہ سنی اور وہ چلا گیا۔''

''کہاں چلا گیا؟'' چودھری نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''جنگل کی طرف!'' بالا نے جواب دیا۔ ''جناب! وہ گھوڑے پر بیٹھ کر نورین بی بی کی تلاش میں نکلا ہے۔ رات ڈاکوؤں نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا، اس کا جیلا کے دماغ پر بڑا گہرا اثر ہوا ہے۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟'' چودھری بالا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''وہ کہہ رہا تھا......'' بالا وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم اس حویلی کے رکھوالے ہیں اور ہمیں بے ہوش کرکے وہ بدمعاش ڈاکو اتنی بڑی واردات کر گئے کہ ہم چودھری صاحب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اب......'' لمحاتی توقف کرکے بالا نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے جیلا کے الفاظ کو مکمل کردیا۔

''اب جب تک میں نورین بی بی کو واپس نہیں لے آؤں گا، حویلی میں قدم نہیں رکھوں گا۔''

''عجیب پاگل ہے یہ جیلا بھی۔'' چودھری بڑبڑایا۔ ''اگر اسے نورین کی تلاش میں جانا ہی تھا تو مجھے تو بتا کر جاتا۔ میں اس کے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی بھیج دیتا۔''

''یہ بات میں نے بھی اس سے کہی تھی۔'' بالا جلدی سے بولا۔ ''کہ جدھر بھی جاتا ہے، چودھری صاحب کو بتادو۔

اس نے کہا، میں جا کر چودھری صاحب کو بتا دوں...... اور وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا جنگل کی طرف نکل گیا۔''

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ شمس آباد اور میرے تھانے میں ایک میل کا فاصلہ تھا اور جنگل میرے تھانے سے میل، سوا میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس حساب سے شمس آباد اور جنگل کے درمیان لگ بھگ دو، سوا دو میل کا فاصلہ حائل تھا۔ جیلا نے غیرت بھری پھرتی دکھائی تھی جو وہ چودھری قادر علی کو خبر کیے بغیر ہی نورین کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کی واپسی پر ہی پتا چل سکتا تھا کہ اس تلاش میں جیلا نے کون سا تیر مارا تھا۔

میں جیلا اور بالا سے خصوصی پوچھ گچھ کا ارادہ رکھتا تھا۔ جیلا تو فی الحال میسر نہیں تھا لہٰذا میں بالا ہی کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

اقبال عرف بالا کی عمر کم و بیش پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ بال گھنگرالے اور ہلکی ہلکی سونچھیں اس کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔

''ہاں بھئی بالا......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ذرا تفصیل سے بتاؤ، پچھلی رات یہاں حویلی میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''جناب! جب چودھری صاحب نے مجھے جگایا...... بلکہ ہم دونوں کو پانی پھینک پھینک کر جگایا تو اس وقت تک ڈاکو اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔ مجھے تو اس واقعے کے بارے میں چودھری صاحب ہی سے پتا چلا ہے۔''

''تم دونوں اس حویلی کے رکھوالے ہو۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر تم دونوں پر ڈاکوؤں نے ایک ساتھ کیسے قابو پالیا؟ چودھری صاحب نے تو تم لوگوں کو باری باری سونے کی تاکید کر رکھی ہے نا......؟''

''جی ہاں۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں کا سونے اور جاگنے کا وقت طے ہے۔''

''اور وہ طے شدہ وقت کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''پہلے میں سوتا ہوں جی۔'' اس نے بتایا۔ ''آدھی رات کے بعد کسی وقت جب جیلا کو نیند آنے لگے تو وہ مجھے جگا دیتا ہے اور خود سو جاتا ہے۔ پھر صبح تک میں جاگ کر حویلی کا پہرا دیتا ہوں۔''

''کیا پچھلی رات بھی تم پہلے سو گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس وقت جیلا چاق و چوبند اور ہوشیار تھا۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ آدھی رات کے بعد جیلا نے مجھے جگایا کیوں نہیں اور...... اور خود بھی کیوں سو گیا......''

''اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ تم دونوں بے خبر سو رہے تھے بلکہ بے ہوش تھے۔'' میں نے بالا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''چودھری صاحب نے بڑی مشکل سے تمہیں بیدار کیا تھا۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھانے دار صاحب!'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آخر اتنا بڑا واقعہ کیسے پیش آ گیا......''

''واقعہ تو یہ واقعی، بہت بڑا ہے بالا۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا پھر خاصے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تمہارے خیال میں یہ کس کی کارروائی ہو سکتی ہے؟''

''جناب...... مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آج تک کبھی اس حویلی سے ایک پیسے کی چوری نہیں ہوئی۔ کجا یہ کہ ڈاکو نورین بی بی کو اٹھا لے گئے اور سارے زیورات بھی......''

''یعنی تمہیں کسی خاص آدمی پر شک نہیں ہے؟'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی بھی ایسا شخص جو چودھری قادر علی سے دشمنی رکھتا ہو؟''

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''چودھری صاحب تو اتنے اچھے ہیں کہ کوئی ان سے دشمنی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد اقبال عرف بالا کو فارغ کر دیا۔ اس سے کوئی بھی مفید بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ اگر اس کی جگہ میں نے جمیل عرف جیلا سے پوچھ گچھ کی ہوتی تو یقیناً کوئی کام کی بات سامنے آ سکتی تھی کیونکہ جب بالا سویا تھا تو اس وقت جیلا جاگ رہا تھا۔ دونوں پہرے داروں کی پراسرار بے ہوشی والا معما جیلا ہی حل کر سکتا تھا اور جیلا...... نورین کی تلاش میں جنگل کی طرف گیا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کانسٹیبل واحد کھوجی فتح محمد کو لے کر حویلی پہنچ گیا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں کھوجی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا۔ ''چاچا! اس سے آگے تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔''

''فکر ای نہ کرو ملک صاحب۔'' وہ ٹھیٹ دیہاتی لہجے میں بولا۔ ''ہونیں رزلٹ سامنے آ جائے گا۔''

کھوجی فتح محمد کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی تاہم اس کی پھرتی کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ چالیس سے زیادہ کا نہیں۔ اس کی بینائی بھی ماشاء اللہ بڑی ٹھیک ٹھاک تھی۔ آدھے گھنٹے کی ماہرانہ تحقیق اور تفتیش کے بعد فتح محمد نے رپورٹ پیش کر دی۔

کھوجی کے مطابق، چار گھڑ سوار چودھری قادر علی کی حویلی تک آئے تھے لیکن حویلی کے اندر صرف دو اجنبی افراد کے پاؤں کا کھرا ملا تھا۔ یہ کھرا حویلی کے بیرونی گیٹ سے نورین والے کمرے اور اس کے برابر واقع سامان والے کمرے تک گیا تھا اور پھر واپس حویلی کے گیٹ تک چلا گیا تھا۔ حویلی کے باہر بھی ان دو اجنبی اشخاص کا کھرا پایا گیا تھا اور پھر چار گھڑ سواروں کا کھرا شمس آباد سے نکل کر ہمارے تھانے کی جانب یعنی گاؤں سے مغرب کی سمت چلا گیا تھا۔

میں نے کانسٹیبل کو وہیں چھوڑا اور کھوجی فتح محمد کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ گھڑ سواروں کے کھرے کا پیچھا جاری رکھے پھر میں چودھری کو بھرپور تسلی دینے کے بعد تھانے آ گیا۔

☆☆☆

ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا اور وہ یہ کہ میں نے شمس آباد سے رخصت ہوتے وقت چودھری قادر علی کو ہدایت کر دی تھی کہ اس کا خاص آدمی جیلا جیسے ہی واپس آئے، وہ اسے میرے پاس تھانے بھیج دے۔ چودھری نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا تھا۔ میں جیلا کا خصوصی انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔

تھانے پہنچ کر میں نے اے ایس آئی افتخار حسین کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ افتخار حسین خاصا تیز طرار پولیس اہلکار تھا۔ میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

''افتخار! میں تمہیں نورین کی تلاش میں جنگل کی طرف روانہ کرنا چاہتا ہوں۔ حالات و واقعات کے مطابق ڈاکو اسے جنگل ہی کی سمت لے کر گئے ہیں۔ تم اپنے ساتھ دو کانسٹیبلو کو بھی لے جانا لیکن......''

''لیکن کیا ملک صاحب؟'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے فوراً پوچھا۔

''لیکن یہ کہ......'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جنگل کی طرف روانہ ہونے کی تیاری مکمل کر لو مگر اس مشن کا آغاز کرنے کے لیے کھوجی کی واپسی کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''ہوں......'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور اگر کھوجی کا کام شام سے پہلے مکمل نہ ہوا تو......؟''

''تو پھر تم اس مشن پر کل صبح روانہ ہو گے۔'' میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ''کھوجی فتح محمد نے چار گھڑ سواروں کا کھرا پکڑ رکھا ہے۔ اس کی ماہرانہ رپورٹ کے بغیر کسی قسم کی مہم جوئی مناسب نہیں ہوگی۔ میرا ذہن ایک بات ماننے کو تیار نہیں کہ ڈاکوؤں نے شمس آباد سے نکل کر تھانے کا رخ کیا ہوگا۔ اگرچہ چودھری قادر علی کا بھی بیان ہے کہ اس نے گھڑ سواروں کو مغرب کی سمت یعنی ہمارے تھانے کی جانب تاریکی میں غائب ہوتے دیکھا تھا اور ابتدائی کھرا بھی اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے مگر میں دلی طور پر مطمئن نہیں ہوں۔''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب۔'' افتخار نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''یہ ممکن نہیں کہ ڈاکوؤں کو یہ پتا نہ ہو کہ شمس آباد اور جنگل کے بیچ میں تھانہ بھی پڑتا ہے۔ اگر انہوں نے شمس آباد سے نکل کر جنگل ہی کا رخ کیا ہے تو پھر تھانے سے بچ کر ہی آگے بڑھے ہوں گے۔''

''تم نے ذہانت سے بھرپور بات کی ہے۔'' میں نے ستائشی نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا۔ ''میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کے خیالات ہیں۔''

''کھوجی فتح محمد کی واپسی تک واقعی کچھ نہیں ہو سکتا۔'' افتخار حسین نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہرحال، میں اپنی تیاری مکمل کرتا ہوں۔''

تھوڑی دیر تک ہمارے درمیان اسی واردات کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی پھر اے ایس آئی میرے کمرے سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ آج دوپہر کا کھانا بھاگ دوڑ میں گول ہو گیا تھا۔ اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے۔ میں نے وقت کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہلکی پھلکی پیٹ پوجا کر لی تاکہ کام بھی چل جائے اور رات کا کھانا بھی خراب نہ ہو۔ بعض اوقات محکمہ جاتی معاملات میں سر جھکانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ حتیٰ کہ یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کب کھانے کا وقت ہوا اور کب یہ وقت گزر گیا۔ بہرحال، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں......

شام سے تھوڑی دیر پہلے کانسٹیبل واحد اور کھوجی فتح محمد تھانے پہنچ گئے۔ میں نے کھوجی کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور کوئی سنسنی خیز اطلاع لایا ہوگا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں چاچا...... کیا رپورٹ ہے؟''
''رپورٹ تو خاصی حوصلہ افزا ہے جی۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ''وہ چاروں گھڑسوار جنگل ہی میں داخل ہوئے ہیں مگر تھانے سے بچ بچا کر۔''
''تھانے سے بچ بچا کر......!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے کھوجی کو دیکھا۔ ''اس بات کا کیا مطلب ہے چاچا؟''
''دیکھیں جی ملک صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''شمس آباد سے یہ تھانہ لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ چاروں گھڑسوار، چودھری قادر علی کی حویلی سے کوئی چھ فرلانگ (پونا میل) تو سیدھے تھانے کی طرف ہی آئے تھے لیکن پھر انہوں نے اپنا راستہ تبدیل کرلیا تھا۔ میں نے جس فاصلے کا ذکر کیا ہے، وہاں سے وہ جنوب مغرب کی سمت مڑ کر سفر کرتے ہوئے جنگل میں داخل ہوئے ہیں۔''
''اور اس کے بعد......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے کھوجی کی طرف دیکھا۔
''اس کے بعد تو اللہ ہی جانے جی۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نے جنگل کے اندر جا کر کھرا نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کام دن کی روشنی ہی میں ہوسکتا ہے ملک صاحب۔ البتہ......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''البتہ، میں نے اس مقام پر ایک واضح نشانی لگا دی ہے جہاں سے وہ گھڑسوار جنگل کے اندر داخل ہوئے تھے۔ اگر آپ کا حکم ہوگا تو صبح وہیں سے ڈاکوؤں کے کھرے کا کام دوبارہ شروع کردوں گا۔''
''حکم کی بات نہیں چاچا، یہ وقت کی ضرورت ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کل صبح اے ایس آئی اور دو کانسٹیبلز کو بھی تمہارے ساتھ روانہ کروں گا۔ یہ کھوج لگانا بہت ضروری ہے کہ وہ ڈاکو، چودھری قادر علی کی بیٹی نورین کو اغوا کرکے کہاں لے گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی ہاتھ لگے گا، تبھی پتا چلایا جاسکے گا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ ان کی چودھری سے کیا دشمنی ہے اور...... یہ کہ انہوں نے یہ کام کسی اور کے ایما پر تو نہیں کیا۔''
''ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں کل صبح ہی صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا۔ اس کے بعد آپ کی جو مرضی ہو۔''
''او کے......'' میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب تم جا کر آرام کرو۔ کل کا دن پتا نہیں، کتنا مصروف ہو۔ ہوسکتا ہے، تمہیں سانس لینے کی فرصت بھی میسر نہ آئے۔''
وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''کیا بات ہے چاچا...... کوئی مشکل یا پریشانی ہے؟''
''ملک صاحب! آپ نے جس مصروفیت کا ذکر کیا ہے وہ صرف میرے ہی لیے نہیں، آپ کے لیے بھی ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس مصروفیت میں آپ مجھے نہیں بھول جانا۔''
''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ میں فوراً سے پیشتر اس کی بات کی تہ میں پہنچ گیا تھا۔ ''فکر نہ کرو چاچا!'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہارا انعام مجھے یاد ہے لیکن...... پہلے کام ختم ہوجائے اور اس کام کا کوئی حوصلہ افزا نتیجہ بھی سامنے آجائے۔''
''انشاء اللہ!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''جب کام شروع ہوگیا ہے تو اس کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوگا۔''
''مجھے تمہاری تجرباتی مہارت اور کڑی محنت کا پوری طرح احساس ہے چاچا۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے چار پانچ گھنٹوں میں کھرے کا اچھا خاصا کام نمٹا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں......'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بات مکمل کردی۔
''ان گھڑسواروں نے جہاں سے راستہ بدلا تھا، وہاں سے جنوب مغرب میں جنگل کا کنارہ لگ بھگ دو میل تو ہوگا۔''
''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ فاصلہ دو میل یا دو میل سے کچھ زیادہ ہی ہوگا مگر میرے خیال میں یہ کام کافی آسان تھا۔ چار گھڑسواروں کا کھرا بہت سیدھا اور واضح تھا۔ ہمیں اس کا تعاقب کرنے میں کوئی خاص دشواری محسوس نہیں ہوئی لیکن یہی کام جنگل کے اندر آسان ثابت نہیں ہوگا۔ خیر...... اللہ مالک ہے۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔''
کھوجی کو رخصت کرنے کے بعد میں نے اے ایس آئی کو ایک مرتبہ پھر اپنے پاس بلالیا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس منٹ تک اسی معاملے پر بات چیت ہوتی رہی۔ میں نے اسے بڑی تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا کہ اگلی صبح اسے

کس انداز سے اپنے مشن کا آغاز کرنا ہے۔ افتخار حسین نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرے گا۔
اے ایس آئی کو فارغ کرنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک چودھری قادر علی کی حویلی میں پیش آنے والے ڈکیتی اور اغوا کے اس واقعے پر غور کرتا رہا۔ کسی بھی کیس میں اس وقت بڑی مشکلات پیدا ہوجاتی ہیں جب جائے وقوعہ یا متاثرین کی طرف سے مجرم یا مجرموں کے بارے میں کوئی پوائنٹ سامنے نہ آئے۔ یعنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے کوئی سرا یا سراغ ہاتھ نہ لگے۔ یہ کیس بھی کچھ اسی نوعیت کی صورتِ حال کا حامل تھا۔
میری اب تک کی حاصل شدہ معلومات کے مطابق چودھری قادر علی کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور میں کسی بھی قیمت پر ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ ''کارنامہ'' کسی دوست کی طرف سے انجام دیا گیا تھا۔ دوسرا بڑا ایشو ڈاکوؤں کی بروقت معلوماتی کارروائی کا تھا۔ چودھری کی حویلی کو نشانۂ ستم بنانے والوں کو حویلی کے اندر کا احوال بہ خوبی معلوم تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ڈاکوؤں کو حویلی کے اندرونی حالات و معاملات سے مکمل آگاہی حاصل تھی یا پھر یہ قیمتی معلومات انہیں مہیا کی گئی تھیں اور یہ کام کوئی گھر کا بھیدی ہی کرسکتا تھا۔ تیسرا پہلو حویلی کے پہرے داروں کا تھا۔ بیک وقت دونوں محافظوں کا اتنا غفیل ہوجانا بھی ذہن میں چبھن پیدا کرتا تھا۔
محافظوں میں سے بالا کا میں نے تفصیلی انٹرویو کرلیا تھا لیکن اس تمام تر پوچھ گچھ میں سے کوئی کام کی بات نکل کر سامنے نہیں آسکی تھی۔ چودھری قادر علی کا یہ کہہ دینا کہ اس کی کسی سے دشمنی نہیں، مجھے ہضم نہیں ہوسکا تھا۔ اگر واقعی اس کا روئے زمین پر کوئی دشمن نہیں تھا تو پھر ایک امکان یہ بھی سامنے آتا تھا کہ نورین اپنی مرضی سے اغوا ہوئی ہو......
یہ امکان اگرچہ خاصا کمزور تھا تاہم وہی بات کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ میں اس زاویے پر سوچے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے ادھر حویلی میں چودھری قادر علی اور اس کی نوجوان بیوی زاہدہ پروین سے بھی اس حوالے سے ڈھکے چھپے الفاظ میں سوالات کیے تھے لیکن ان کی جانب سے کوئی خاطر خواہ جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ اگر نورین اپنی مرضی سے اغوا ہوئی تھی تو یقیناً اس کا کسی کے ساتھ چکر رہا ہوگا۔ وہ بہادر پور کے چودھری کریم بخش سے شادی نہیں کرنا چاہ رہی ہوگی جبھی شادی سے ایک ہفتہ قبل اس نے ڈرامائی انداز میں حویلی کو خیرباد کہہ دیا تھا مگر میری اس امکانی تھیوری کو تقویت بخشنے والی کوئی بات ابھی سامنے نہیں آسکی تھی۔ چودھری اور اس کی بیوی ایسے کسی معاملے سے صاف انکاری تھے۔ اب آجا کر حویلی کے دوسرے محافظ جمیل عرف جیلا کی واپسی سے کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔
جیلا کئی پہلوؤں سے اہمیت کا حامل تھا۔ نمبر ایک، اس کی ڈیوٹی رات ابتدائی حصے میں جاگنے کی تھی۔ آدھی رات کے بعد وہ بالا کو جگاتا تھا اور خود سو جاتا تھا۔ وقوعہ کی رات، بالا کے بیان کے مطابق، وہ جو رات کو سویا تو پھر چودھری نے پانی پھینک پھینک کر ہی اسے جگایا تھا اور اس کے ساتھ ہی جیلا بھی بے خبر سوتا ہوا پایا گیا تھا۔ اسی دوران میں ڈاکو اپنی کارروائی ڈال کر رفوچکر ہوچکے تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جیلا، بالا کو جگانے سے پہلے کیسے سو گیا؟ ڈاکو اس کے جاگنے کے دوران میں آئے تھے یا اس کے سونے کے بعد؟
نمبر دو، وہ نورین کی تلاش میں چپ چاپ کیوں نکل گیا تھا؟ وہ چودھری قادر علی کا پرانا نمک خوار تھا۔ اس قسم کا جرأت مندانہ قدم اٹھانے سے پہلے اس نے چودھری کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟ اسی نوعیت کے اور بھی بہت سے سوالات ذہن میں سر اٹھاتے تھے جن کے جوابات صرف اور صرف جیلا ہی دے سکتا تھا۔ میں بڑی بے تابی سے جیلا کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔
کہتے ہیں، کبھی کبھی بے تابی بہت جلدی رنگ لے آتی ہے۔ میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے کمرے میں آکر اطلاع دی۔
''سر! چودھری صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔''
''کون چودھری صاحب؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔
''جناب! میں چودھری قادر علی کی بات کر رہا ہوں۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''ان کے ساتھ ایک بندہ بھی ہے۔''
''ٹھیک ہے، انہیں فوراً میرے پاس بھیج دو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔
''او کے سر......!'' کانسٹیبل یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔
''چودھری قادر علی اور اس وقت......'' میں نے حیرت بھرے انداز میں خود کلامی کی۔ ''خیر دیکھتے ہیں، کیا

ماجرا ہے؟''

اس وقت تک رات نے اپنے پر پھیلا لیے تھے۔ اگر چودھری قادر علی شمس آباد سے تھانے آیا تھا تو اس کا مطلب تھا ضرور کوئی اہم بات ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں چودھری اور اس کا ساتھی میرے سامنے موجود تھے۔

میری پیشکش پر چودھری میرے سامنے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا جبکہ اس کے ساتھ آنے والا شخص چودھری کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ میں نے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چودھری صاحب! خیریت تو ہے۔ آپ اس وقت تھانے آئے ہیں، کوئی خاص بات......؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے خاصے افسردہ لہجے میں بولا۔ ''بات اگر خاص نہ ہوتی تو شاید میں کل صبح آپ کے پاس آتا یا پھر آپ کی ہدایت کے مطابق، جیلا کو اکیلے ہی تھانے بھیج دیتا۔''

''تو کیا نورین کی تلاش میں جانے والا آپ کا ملازم جیلا جنگل سے واپس آگیا ہے؟'' میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''جی ہاں۔'' چودھری نے یہ کہتے ہوئے اپنے پیچھے کھڑے شخص کی جانب اشارہ کیا اور بتایا۔ ''یہ جیلا ہے جناب۔ یہ جیسے ہی واپس آیا اور اس نے مجھے ایک خوفناک کہانی سنائی، میں اسے لے کر سیدھا آپ کے پاس آگیا ہوں......''

''خوف ناک کہانی......!'' میں چونک اٹھا۔ ''کیسی خوف ناک کہانی چودھری صاحب؟''

''نورین کے بارے میں جیلا نے جو کچھ بتایا ہے، اسے سن کر تو میری جان ہی نکل گئی ہے ملک صاحب۔'' چودھری نے دل گیر آواز میں کہا۔ ''آپ خود اس سے پوچھ لیں کہ اس نے ادھر جنگل میں کیا دیکھا ہے۔''

میں فی الفور جیلا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''ہاں بھئی! تم جنگل میں کیا دیکھ کر آرہے ہو......؟''

''جناب! چودھری صاحب نے ہمیں جگانے کے بعد ڈاکوؤں کی واردات کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ لوگ نورین بی بی کو اٹھا کر جنگل کی طرف گئے ہوں گے۔'' جیلا بڑی وضاحت سے مجھے اپنے حالیہ تجربے کے بارے میں بتانے لگا۔ ''کاش! میں رات ہی کو نورین بی بی کی تلاش میں نکل جاتا تو وہ کچھ دیکھنے کو نہ ملتا جو میں ابھی دیکھ کر آرہا ہوں۔''

''یہی تو میں بھی جاننا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ''تم نے وہاں جنگل میں ایسا کیا دیکھ لیا ہے جس نے چودھری صاحب کو اتنا پریشان کردیا ہے؟''

''میں جب جنگل میں داخل ہوا تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں صحیح سمت میں جارہا ہوں یا راہ سے بھٹک چکا ہوں۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ضروری نہیں تھا کہ ڈاکو بھی اسی مقام سے جنگل میں داخل ہوئے ہوں جہاں سے میں گھسا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، یہ جنگل کتنا گھنا اور لمبا چوڑا ہے......''

''ہاں، یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور اپنے سامنے کھڑے جیلا سے پوچھا۔ ''ذرا مجھے بتاؤ، تم کس طرف سے جنگل میں داخل ہوئے تھے؟''

جیلا کے جواب نے میرے تن بدن میں سنسنی سی دوڑادی۔ کھوجی بابا نے جنگل کے جس کنارے پر نشانیاں لگائی تھیں، وہ مقام جیلا کے جنگل میں داخل ہونے والے مقام سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا تم نے راستے میں میرے بندوں کو نہیں دیکھا؟''

''آپ کے بندے......'' اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ ''میں سمجھا نہیں تھانے دار صاحب۔''

''وہ دو افراد تھے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''ایک پکی عمر کا کھوجی بابا اور دوسرا نوجوان کانسٹیبل...... کانسٹیبل یونیفارم میں تھا اور وہ دونوں تانگے پر سوار تھے......؟''

''جی...... جی...... میں نے انہیں دیکھا تھا۔'' وہ جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''جب میں جنگل سے واپس آیا تھا تو ایک تانگے پر میری نظر پڑی تھی جس میں ایک پولیس والا بھی بیٹھا ہوا تھا۔''

''اب تم مجھے بتاؤ، جنگل میں کیا دیکھ کر آرہے ہو؟'' میں فوراً اصل بات کی طرف آگیا۔

''جناب! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، یہ جنگل بہت ہی گھنا اور دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔'' وہ تھوک نگلنے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ میں اس جنگل میں نورین بی بی کا سراغ لگاسکوں گا لیکن اس موقع پر اللہ نے میری مدد کی مگر......''

بولتے بولتے جیلا کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہوگیا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''مگر کیا......؟''

''میں جنگل میں، زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ تک گیا ہوں گا کہ ایک صندوق کو دیکھ کر چونک اٹھا......''

''صندوق......؟'' میں نے پوچھا۔

''دور سے وہ صندوق ہی نظر آیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن قریب جاکر پتا چلا کہ وہ نورین بی بی کے جہیز کے سامان والا سوٹ کیس تھا۔ یہ سوٹ کیس کھلا ہوا تھا اور اس کے اردگرد چاروں طرف قیمتی کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، ڈاکوؤں نے بڑی عجلت میں سوٹ کیس کی تلاشی لی ہو......''

''چودھری صاحب کے مطابق، اس سوٹ کیس میں قیمتی ملبوسات کے علاوہ طلائی زیورات بھی رکھے ہوئے تھے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں نے سوٹ کیس میں سے طلائی زیورات نکالے اور آگے بڑھ گئے۔''

''جی...... جی ہاں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ میں نورین بی بی کے لیے کچھ نہیں کرسکا۔''

''کیا تم نے جنگل میں مزید آگے جاکر نورین کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' میں نے جیلا سے استفسار کیا۔

''جی ہاں، جہاں تک میرے بس میں تھا، میں نے کوشش کی ہے جناب۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ''لیکن اس کوشش سے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ مجھے لگتا ہے، ڈاکو نورین بی بی اور زیورات کو لے کر جنگل کے بیچوں بیچ کہیں آگے نکل گئے ہیں......'' اتنا بتانے کے بعد وہ کسی ناکام شخص کی طرح گردن جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

''ملک صاحب!'' چودھری امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہاں سے آپ کا کام شروع ہوتا ہے۔ جیلا جنگل میں جو کچھ دیکھ کر آیا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکو میری بچی کو جنگل کے راستے کہیں لے گئے ہیں یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنگل کے اندرونی حصے میں ان کا ٹھکانا ہو۔ اگر آپ بروقت کارروائی کریں تو نورین تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں چودھری صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی رسان سے کہا۔ ''لیکن چند باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔''

''کون سی باتیں ملک صاحب؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''نمبر ایک......'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا کام یہاں سے شروع نہیں ہوتا چودھری صاحب! میں نے آج صبح آپ کی حویلی سے اپنی تفتیش کا آغاز کیا تھا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے کھوجی نے ڈاکوؤں کا کھرا بڑی مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے گھوڑوں کے قدموں کے نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے جنگل تک پہنچ گیا تھا لیکن اندھیرا ہوجانے کی وجہ سے اس کام کو عارضی طور پر روکنا پڑا۔ صبح انشاء اللہ! پھر وہیں سے کام شروع ہوگا جہاں آج چھوڑا ہے اور صبح جیلا بھی کھوجی کے ساتھ ہوگا۔''

''جیلا......؟'' چودھری کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

''میں کیوں جی؟'' جیلا نے بے ساختہ پوچھا۔

میں چونکہ چودھری سے مخاطب تھا لہٰذا روئے سخن اسی کی طرف رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کی ایک خاص وجہ ہے چودھری صاحب! جیلا جہاں سے جنگل میں داخل ہوا ہے، وہ مقام اس جگہ سے چند گز کی دوری پر ہے جہاں میرے کھوجی نے اپنے تحقیقاتی کام کو پہنچایا ہے۔ اگر جیلا میری ٹیم کے ساتھ ہوگا تو یہ انہیں اس سوٹ کیس تک پہنچا دے گا جسے یہ جنگل میں کھلا پڑا دیکھ کر آیا ہے۔ اس سے میری ٹیم کا کام آسان ہوجائے گا اور وہ جلد از جلد یہ جاننے میں کامیاب ہوجائیں گے کہ ڈاکوؤں کا وہ شیطانی ٹولا طلائی زیورات اور نورین کو لے کر کس طرف گیا ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' چودھری نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''میں صبح تڑکے جیلا کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے چودھری صاحب۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جن باتوں کی وضاحت کررہا تھا ان میں دوسرا نمبر ڈاکوؤں کے کھرے کا ہے۔ آپ اس بات کا تو اطمینان رکھیں کہ میں انشاء اللہ بہت جلد آپ کی بچی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ ڈاکو گھوڑوں پر سفر کریں یا پیدل، وہ میرے کھوجی کی عقابی نظر سے بچ نہیں پائیں گے۔ میں ان کے کھرے کی مدد سے بہت جلد ان کی گردنیں دبوچ لوں گا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب۔'' وہ تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''نمبر تین......'' میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آپ کے اس ملازم خاص جیلا سے بھی تھوڑی پوچھ گچھ کرنا ہے۔ میرے ذہن میں چند ایسے سوالات ہیں جن کا

ابھی تک تسلی بخش جواب مجھے مل نہیں سکا۔''
''جی ضرور......'' چودھری نے جیلا کی طرف دیکھا۔ ''آپ پوچھیں اس سے جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔''

جیلا کی عمر چھبیس ستائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایک درمیانے قد کاٹھ کا مالک سانولا شخص تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بے پناہ بے چینی اور اضطرار جھلکتا دیکھا۔ ہوسکتا ہے، اس کی یہ کیفیت ڈاکوؤں والے واقعے کی وجہ سے ہو۔ وہ حویلی کا محافظ تھا اور اسے انٹا غفیل کر کے ڈاکو اس کے منہ پر کالک مل کر چلے گئے تھے۔ یہ بڑے شرم کا مقام تھا۔ بہرحال، جیلا بڑا ڈسٹرب نظر آتا تھا۔

''بیٹھ جاؤ جیلا......!'' میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

''ج...... جی......'' وہ چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں کھڑا ہی ٹھیک ہوں۔ آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں ایسے ہی پوچھ لیں۔''

مجھے یہ سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ چودھری کے برابر والی کرسی پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ میں نے بھی بیٹھنے پر اصرار نہیں کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''جیلا! بالا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ رات کے پہلے حصے میں سوتا تھا اور تم رات کے آخری حصے میں اپنی نیند پوری کرتے تھے؟''

''جی ہاں...... بالا نے آپ کو ٹھیک بتایا ہے۔''

''کیا پچھلی رات بھی بالا پہلے سویا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی تھانے دار صاحب!'' جیلا نے جواب دیا۔

''بالا سو رہا تھا اور تم جاگ کر پہرا دے رہے تھے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا پھر بالا کے بیان کو چیک کرنے کی غرض سے استفسار کیا۔ ''کیا آدھی رات کے بعد تم نے بالا کو جگا دیا تھا؟''

''نہیں جناب! اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''نوبت نہیں آئی...... کیا مطلب؟''

''جناب! بالا مزے کی نیند سو رہا تھا اور میں جاگ کر حویلی کی حفاظت کر رہا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پچھلے کچھ دنوں سے میری کمر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا، تھوڑی دیر چارپائی پر لیٹ کر کمر سیدھی کر لیتا ہوں۔ میں بالا کے برابر دوسری چارپائی پر دراز ہوگیا، پھر پتا نہیں، کب میری آنکھ لگ گئی......''

''گویا تم نے اپنے فرض سے غفلت برتنے کا مظاہرہ کیا تھا؟'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

''میں مانتا ہوں جی، وہ میری غلطی تھی۔'' وہ ندامت آمیز انداز میں بولا۔ ''مجھے چارپائی پر نہیں لیٹنا چاہیے تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اپنی کمر کے درد کو برداشت کر لیتا تو شاید یہ افسوس ناک واقعہ پیش ہی نہ آتا۔''

''تمہیں کچھ اندازہ ہے، تم کتنے بجے چارپائی پر لیٹے تھے؟''

''میرا خیال ہے، اس وقت رات کے گیارہ یا ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے۔''

''پھر تو تم نے واقعی بہت غلط کیا۔'' میں نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم گھنٹا، آدھا گھنٹا اور صبر کر لیتے یا تمہاری کمر میں زیادہ ہی تکلیف تھی تو تم بالا کو جلدی جگا سکتے تھے۔''

''بس جی، جو وقت ہاتھ سے نکل جائے وہ واپس نہیں آتا۔'' وہ شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں رات کا باقی حصہ اپنی اس غلطی پر پشیماں ہو ہو کر کڑھتا رہا اور صبح جب یہ کیفیت میری برداشت سے باہر ہوگئی تو میں گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کی طرف نکل گیا لیکن افسوس کہ......''

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے ندامت سے گردن جھکالی۔

میں نے مناسب الفاظ میں چودھری قادر علی کو تسلی تشفی دی اور جیلا کو صبح تھانے بھیجنے کی تاکید کر کے انہیں رخصت کر دیا۔

اگلی صبح بڑی سنسنی خیز ثابت ہونے والی تھی لہٰذا میں تھانے سے اٹھا اور اپنے کوارٹر کی طرف روانہ ہوگیا تاکہ ایک بھرپور نیند لے سکوں۔ کل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس نوعیت کی مصروفیات کا سامنا کرنا پڑتا لہٰذا اس بھاگ دوڑ کے لیے آرام بھی ضروری تھا۔

☆☆☆

میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو اے ایس آئی دو کانسٹیبلو منظور اور شاکر کے ساتھ کرکسے، جنگل کی طرف جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

''افتخار حسین!'' وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا کھوجی تھانے پہنچ گیا ہے؟''

''جی ہاں۔ وہ تو کافی دیر سے آیا ہوا ہے۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''بس، آپ کی آمد کا انتظار ہو رہا ہے۔





میں بھی بالکل تیار بیٹھا ہوں۔''
''وہ تو تمہیں دیکھ کر ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں، ابھی آپ لوگوں کو نکلنے میں تھوڑی دیر لگے گی۔'' بات ختم کرکے میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور آواز لگائی۔ ''واحد......!''
''دیر کیوں لگے گی ملک صاحب؟'' اے ایس آئی نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔
''تم لوگوں کے ساتھ ایک اور بندہ بھی جائے گا۔''
''وہ کون بندہ ہے جناب؟'' اے ایس آئی کی حیرت دوچند ہوگئی۔
''اس بندے کا نام جمیل عرف جیلا اور تعلق شمس آباد سے ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ چودھری قادر علی کا وہی ملازم ہے جو کل صبح کسی کو بتائے بغیر نورین کی تلاش میں جنگل کی طرف نکل گیا تھا۔ اس کی روانگی کے بارے میں صرف اس کے ساتھی بالا کو خبر تھی۔ بالا ہی کی زبانی مجھے بھی پتا چلا تھا۔ شاید میں نے کل شام تم سے جیلا کا ذکر بھی کیا تھا۔''
''جی ملک صاحب! ذکر تو آپ نے ضرور کیا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ آج وہ بھی ہمارے ساتھ جنگل کی طرف جائے گا۔'' اے ایس آئی نے متانت سے کہا۔ ''لگتا ہے، وہ جنگل کی طرف سے کوئی خاص خبر لایا ہے جو آپ اسے ہمارے ساتھ بھیجنا چاہتے ہیں؟''
''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے افتخار حسین۔'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اگرچہ جیلا، نورین کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تاہم وہ ڈاکوؤں کے، جنگل میں پہلے پڑاؤ تک رسائی حاصل کرچکا ہے۔ وہ اگر تمہارے ساتھ رہے گا تو نورین کی تلاش میں کافی آسانی ہوجائے گی۔''
''ڈاکوؤں کا پہلا پڑاؤ......'' اے ایس آئی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب؟''
اس سے پہلے کہ میں افتخار حسین کی بات کا جواب دیتا، کانسٹیبل واحد کمرے میں داخل ہوا۔ ''جی حکم ملک صاحب!''
''شمس آباد سے کوئی بندہ تو نہیں آیا؟'' میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔
''نہیں جناب! ابھی تک تو نہیں آیا۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے کانسٹیبل کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بندے کا نام جمیل عرف جیلا ہے۔ وہ جیسے ہی تھانے پہنچے، اسے فوراً میرے پاس لے آنا۔''
''او کے ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے مجھے سیلوٹ کیا اور واپس چلا گیا۔
میں نے اے ایس آئی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اپنی بات کو مکمل کردیا۔ یہ دراصل اس کے سوال کا جواب بھی تھا۔
''ڈاکوؤں نے جنگل میں کوئی فرلانگ بھر سفر کرنے کے بعد ایک جگہ عارضی قیام کیا تھا۔ وہاں انہوں نے حویلی سے لائے گئے سوٹ کیس کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ وہ سارے قیمتی ملبوسات کو سوٹ کیس سے نکال کر ادھر ادھر پھینک گئے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ سوٹ کیس کو بھی جنگل کے اسی حصے میں چھوڑ گئے ہیں۔ بس، طلائی زیورات اور نورین کو لے کر وہ گھنے جنگل میں کہیں گم ہوگئے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''ہمارا کھوجی جنگل کے داخلی حصے پر، جہاں تک ڈاکوؤں کا کھرا پکڑ کر پہنچا ہے، وہ مقام وہاں سے چند گز کے فاصلے پر ہے جدھر جیلا سوٹ کیس اور قیمتی ملبوسات بکھرے پڑے دیکھ کر آیا ہے۔''
''اوہ......!'' اے ایس آئی سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے، جیلا کو اپنے ساتھ لے جانا سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔''
''میں نے یہی سوچ کر اسے تمہارے ساتھ نتھی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے کہا۔
''آپ کا فیصلہ زبردست اور بروقت ہے ملک صاحب......!''
ادھر اے ایس آئی کی بات ختم ہوئی، ادھر کانسٹیبل واحد ایک بار پھر میرے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے... بہ آواز بلند اطلاع دی۔
''ملک صاحب! شمس آباد والا بندہ تو آگیا ہے مگر اس کا نام بدل گیا ہے۔''
''نام بدل گیا ہے...... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے گھور کر کانسٹیبل کو دیکھا۔
''وہ جی...... آپ نے کہا تھا اس بندے کا نام جمیل عرف جیلا ہے۔'' کانسٹیبل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ بندہ اپنا نام اقبال عرف بالا بتا رہا ہے۔''
بالا دراصل جیلا کا جوڑی دار تھا۔ میں کل چودھری کی حویلی میں بالا کا تفصیلی انٹرویو کرچکا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا

کہ چودھری قادر علی نے جیلا کی جگہ بالا کو کیوں تھانے بھیج دیا۔ صورتِ حال جاننے کے لیے میں نے کانسٹیبل واحد سے کہا۔
''وہ جیلا ہے یا بالا، اسے فوراً میرے پاس لے آؤ۔''
''جی ملک صاحب......'' کانسٹیبل یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔
''یہ کیا ماجرا ہے ملک صاحب؟'' اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھا۔
''یہ ماجرا ہے یا باجرا...... ابھی کھل کر تمہارے سامنے آجائے گا۔'' میں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شمس آباد سے آنے والا بندہ ہی اس معمے کو حل کرسکتا ہے۔''
اگلے ہی لمحے کانسٹیبل جس شخص کو میرے کمرے میں لے کر آیا، وہ صد فیصد اقبال عرف بالا تھا۔ میں نے بالا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر پوچھا۔
''وہ جیلا کدھر ہے؟''
''جیلا کو رات سے بہت تیز بخار ہے تھانے دار صاحب۔'' بالا نے بتایا۔ ''چودھری صاحب نے یہی بتانے کے لیے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''اگر آپ مجھے اپنے ساتھ جنگل لے جانا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔''
''کیا تم ڈاکوؤں اور جنگل کے بارے میں جیلا جتنی معلومات رکھتے ہو؟'' میں نے بالا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔
''نہیں جی...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ جلدی سے بولا۔
''تو پھر تمہیں اپنے ساتھ جنگل لے جانے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جنگل سے زیادہ چودھری قادر علی کی حویلی کو تمہاری.... ضرورت ہے...... کیا سمجھے؟''
''جی سمجھ گیا۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''چنگی طراں سمجھ گیا جناب۔''
''اگر چنگی طراں سمجھ ہی گئے ہو تو پھر فی الفور واپس چلے جاؤ۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''حویلی کی حفاظت اور دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ اگر ممکن ہو تو میرا ابھی ایک کام کردینا۔''
''آپ حکم کریں سرکار۔'' وہ خاصے جوش سے بولا۔
''ایک نہیں، میں آپ کے دس کام کردوں گا۔''
''دس نہیں...... صرف ایک کام۔'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔
''جی...... جی...... !'' وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔
''تمہیں حویلی کے اندر اور باہر رہتے ہوئے ہر لمحے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ہر وقت ذہن میں اس سوال کو دہراتے رہنا ہے کہ چودھری صاحب کا ایسا دشمن کون شخص ہوسکتا ہے جس نے ڈکیتی اور قتل کی واردات کی ہے یا کرائی ہے؟''
''میں آپ کی ہدایات کو یاد رکھوں گا جی۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''اور جیسا آپ نے حکم دیا ہے، میں اس کے مطابق عمل کروں گا جناب۔''
''تم اس کام کو میرے حکم سے زیادہ اپنا فرض سمجھ کر انجام دینا۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''تم چودھری قادر علی کے پرانے نمک خوار ہو۔ اگر یہ پتا چل جاتا ہے کہ حویلی میں ہونے والی ڈکیتی اور نورین کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہے تو مجھے مجرموں تک پہنچ کر نورین کو واپس لانے میں آسانی ہوجائے گی اور چودھری کے وفادار ملازم ہونے کے ناتے تمہاری بھی یہی خواہش ہوگی کہ نورین بی بی جلد از جلد حویلی واپس آجائے۔''
''یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے تھانے دار صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میری اور جیلا کی غفلت کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ ہم دونوں کی یہی خواہش ہے کہ نورین بی بی باعزت اور زندہ سلامت واپس آجائے۔ جیلا تو نورین کو ڈھونڈنے کل جنگل کی طرف بھی گیا تھا لیکن کچھ بھی اس کے ہاتھ نہ آسکا۔ اسی شکست اور غم کی وجہ سے اسے پھونک کر بخار چڑھ گیا ہے۔ جیلا کامیاب ہوا یا جنگل سے خالی ہاتھ واپس آگیا مگر اس نے ایک کوشش تو کی اور ایک میں ہوں کہ......!''
''دل چھوٹا نہ کرو بالا۔'' میں نے اس کی آزردگی کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم من و عن میری ہدایت پر عمل کرتے رہے تو ہوسکتا ہے، تم کوئی بڑا کارنامہ انجام دے ڈالو......''
''سچ!'' اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔
''ہاں، میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اب تم فوراً شمس آباد روانہ ہوجاؤ اور

جیسا میں نے تمہیں سمجھایا ہے، اس کے مطابق عمل کرو۔''

بالا نے تہ دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور سلام کرکے رخصت ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اے ایس آئی افتخار حسین کو کھوجی فتح محمد اور دو چاق و چوبند کانسٹیبلوں کی معیت میں جنگل کی جانب روانہ کر دیا۔ وہ سب دو گھوڑوں پر سوار ہوکر تھانے سے روانہ ہوئے تھے۔ ایک گھوڑے پر دونوں کانسٹیبلو سوار تھے اور دوسرے گھوڑے پر اے ایس آئی کے پیچھے کھوجی بابا بیٹھا ہوا تھا۔ جنگل کے اندر سفر کرنے کے لیے تانگا کسی بھی صورت موزوں نہیں تھا اسی لیے گھوڑوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔

اس روز ہفتے کا دن تھا۔ میں پورا دن تھانے میں موجود رہا لیکن کوئی بھی قابل ذکر واقعہ رونما نہ ہوا۔ میں امید کر رہا تھا کہ چودھری قادر علی ضرور تھانے چکر لگا کر صورت حال جاننے کی کوشش کرے گا۔ وہ آیا اور نہ ہی اس کی حویلی کی جانب سے کوئی تازہ اطلاع موصول ہوئی۔

شام رات میں ڈھل رہی تھی کہ جنگل کی طرف جانے والی متلاشی پارٹی واپس لوٹ آئی۔ ان کی شکلوں ہی سے نظر آرہا تھا کہ وہ ناکام و نامراد لوٹے ہیں۔ میں نے صرف اے ایس آئی اور کھوجی فتح محمد کو اپنے پاس بلالیا۔

''ہاں بھئی، کیا رہا......؟'' میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

''ملک صاحب! ہم قیمتی ملبوسات اور سوٹ کیس تو اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔'' اے ایس آئی نے مایوسی بھرے لہجے میں بتایا۔ ''لیکن ڈاکوؤں اور نورین کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔''

''گھوڑوں کا کھرا کیا کہتا ہے......؟'' میں نے کھوجی سے سوال کیا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب۔'' فتح محمد نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''جیسا کہ آپ جانتے ہیں، یہ جنگل شرق سے مغرب کی جانب لگ بھگ پانچ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم گھوڑوں کے سموں کا کھرا پکڑ کر جنگل کے دوسرے کنارے تک گئے ہیں۔ اس کے بعد کھرا نہیں مل سکا۔''

''کھرا نہیں مل سکا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''چاچا! کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ملک صاحب! جنگل کے مغربی کنارے پر شمالاً جنوباً ایک کچی سڑک ہے۔'' کھوجی نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ''کھرے سے یہ تو پتا چلا ہے کہ گھڑسوار جنگل کو عبور کرکے باہر نکلے ہیں۔ اس کے بعد کھرا غائب ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے ڈاکو وہاں سے کسی گاڑی وغیرہ میں سوار ہوکر کسی طرف نکل گئے ہیں۔ اس کچی سڑک پر بیل گاڑیوں اور تانگوں کے علاوہ بسوں اور ویگنوں کی آمد و رفت کے آثار بھی ملتے ہیں۔''

''ڈاکو بیل گاڑی میں بیٹھے ہیں یا موٹر گاڑی میں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''مگر ان چار گھوڑوں کے بارے میں تم کیا کہو گے جن پر سوار ہوکر وہ لوگ شمس آباد سے جنگل کے دوسرے کنارے تک پہنچے تھے؟''

کھوجی نے جنگل کی دوسری جانب جس کچی سڑک کا ذکر کیا تھا، وہ میری دیکھی بھالی ہوئی تھی۔ مذکورہ سڑک شمال مغرب میں تھوڑا آگے جاکر ایک پکی سڑک سے مل جاتی تھی جو سیدھی لائل پور (موجودہ فیصل آباد) شہر تک جاتی تھی۔ اگر ڈاکوؤں نے ادھر کا رخ کیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا، وہ لائل پور گئے تھے اور اگر انہوں نے مخالف سمت میں سفر کیا تھا تو پھر ان کو ''فیروز نگر، ملک وال اور چک بتیس'' میں ڈھونڈنے کی ضرورت تھی۔ یہ تینوں گاؤں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مذکورہ کچی سڑک کی زیریں جانب واقع تھے۔

کھوجی فتح محمد نے میرے جھلاہٹ بھرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ''ملک صاحب! میں نے جنگل سے باہر نکلنے کے بعد گھوڑوں کے کھرے کو تلاش کرنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی ہے مگر اس مقصد میں مجھے کامیابی نہیں ہوسکی۔ اب گھوم پھر کر میرا ذہن ایک ہی طرف جا رہا ہے......''

''چاچا! بجھارتیں نہ ڈالو۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''تمہارا ذہن گھوم پھر کر جدھر بھی جا رہا ہے فوراً اس کی وضاحت بھی کر ڈالو۔''

''میرے خیال میں ڈاکوؤں نے جنگل سے نکلنے کے بعد گھوڑوں کے سموں پر موم جامے یا کپڑے کی تھیلیاں چڑھالی ہوں گی۔'' فتح محمد نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ ''اسی لیے گھوڑوں کا کھرا آگے نہیں مل سکا۔ بعض شاطر مجرم اس قسم کی حرکت کرتے ہیں۔''

''اور بعض ذہین کھوجی ان شاطر مجرموں کی حرکت کو ناکام بھی بنا دیتے ہیں۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''گھوڑوں کے کھروں پر موم جامے یا موٹے کپڑے کی تھیلیاں چڑھا لیے جانے کے باوجود بھی وہ پاؤں کے دباؤ کا سہارا لے کر اپنا کام نکال لیتے ہیں؟''

میں نے ایک طرح سے کھوجی فتح محمد پر طنز کیا تھا۔ وہ میرے لہجے کی ترشی اور تیکھے پن کو فوراً محسوس کرکے بولا۔

''جی ہاں! یہ بات میں بھی جانتا ہوں ملک صاحب! اور اللہ کے فضل و کرم سے مجھ میں یہ صلاحیت موجود ہے جس کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے......''

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر کیا ارادہ ہے تمہارا چاچا؟''

''میں کل صبح اپنا کام وہیں سے دوبارہ شروع کروں گا جہاں آج چھوڑ کر آیا ہوں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''آج پانچ میل کے جنگل کو عبور کرنے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا ہے اور آپ کو پتا ہے، کھرے کھوج کا کام رات کی تاریکی میں نہیں ہوسکتا۔ کل انشاء اللہ! مجھے اپنی صلاحیتیں آزمانے کا زیادہ موقع ملے گا اور میں آپ کو کوئی خوش خبری بھی سنا سکوں گا۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے چاچا!'' میں نے خلوص دل سے کہا۔ ''تم کل صبح ایک کانسٹیبل کو ساتھ رکھ کر کام کو آگے بڑھاؤ۔ اس کے ساتھ ہی میں لائل پور، فیروز نگر، ملک وال اور چک بتی (بتیس) کو چیک کرنے کے انتظامات کرتا ہوں۔''

کھوجی تھوڑی دیر مزید میرے پاس بیٹھ کر رخصت ہوگیا۔ میں اے ایس آئی افتخار حسین کے ساتھ اگلے دن کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

اتوار کی صبح اگرچہ شہروں اور قصبہ جات وغیرہ میں بسنے والے عام لوگوں کے لیے بڑی سہانی ہوتی ہے مگر گاؤں دیہات میں چونکہ چھٹی...... خصوصاً ہفتہ وار چھٹی کا کوئی تصور نہیں ہوتا اس لیے ہر دن ایک جیسا لگتا ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی نوکری بھی کچھ اسی مزاج کی ہوتی ہے۔ خاص طور پر دیہاتی تھانوں میں جہاں تھانے دار کی رہائش بھی تھانے کے اندر ہی رہائشی کوارٹر میں ہو تو پھر یہی محسوس ہوتا ہے، محکمۂ پولیس سے رشتے داری ہے اور تھانہ گھر ہے۔

اتوار کی صبح تھانے جانے سے پہلے میں ایک ضروری کام کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ہفتے بھر کے میلے کپڑوں کو ایک گٹھڑی میں باندھنا ہوتا ہے کیونکہ دھوبی اتوار ہی کو آتا تھا۔ وہ دھلے ہوئے کپڑے دے جاتا اور میلے کپڑوں کی گٹھڑی لے جاتا۔ میری شروع ہی سے یہ عادت رہی ہے کہ یونیفارم ہو یا عام گھریلو استعمال کے کپڑے، میں انہیں اتارتے وقت جیبیں وغیرہ ضرور چیک کرلیا کرتا ہوں۔ اسی طرح جب میں میلے کپڑوں کی گٹھڑی باندھتا تھا تو ایک مرتبہ پھر احتیاطاً جیبوں میں جھانک لیا کرتا تھا۔

کہتے ہیں، احتیاط بہت اچھی چیز ہے۔ ایسا کہتے ہیں تو کچھ بھی غلط نہیں کہتے۔ اس اتوار کی صبح بھی جب میں میلے کپڑوں کی گٹھڑی باندھتے وقت انہیں چیک کر رہا تھا...... یونیفارم کی ایک پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے عجیب سا لگا۔ میرا ہاتھ کسی دھاتی شے سے ٹکرایا تھا۔ میں نے فوراً مذکورہ شے کو جیب سے باہر نکال لیا۔

وہ ایک لاکٹ تھا جو چاندی کی زنجیر میں پرویا گیا تھا۔ لاکٹ کے چاندی کے فریم میں ایک فیروزی پتھر جڑا ہوا تھا جو غالباً فیروزہ تھا۔ چاندی کی زنجیر ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔

اس لاکٹ پر نگاہ پڑتے ہی سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے یاد آگیا کہ مذکورہ لاکٹ مجھے کہاں سے ملا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، جب میں جمعے کی صبح چودھری قادر علی کی حویلی پہنچ کر جائے وقوعہ کا معائنہ کر رہا تھا تو یہ لاکٹ مجھے مغوی نورین کے کمرے کے فرش پر پڑا ملا تھا۔ اس وقت میں چونکہ بہت سے معاملات کو ایک ساتھ دیکھ رہا تھا اس لیے میں نے اس لاکٹ کو پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا کہ بعد میں چودھری سے اس کے بارے میں استفسار کروں گا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اس لاکٹ کا تعلق مغوی نورین سے ہوگا اور اغوا کی ہنگامی واردات کے دوران میں زنجیر ٹوٹ جانے کے باعث لاکٹ اس کی گردن سے نکل کر کمرے کے فرش پر گر گیا ہوگا۔ لیکن یہ ایک اتفاق ہے کہ بعد میں فیروزے والا یہ لاکٹ میرے ذہن سے نکل گیا اور اب اچانک ہی سامنے آگیا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ یونیفارم کی پہلی تلاشی میں مذکورہ لاکٹ میرے ہاتھ سے کیسے نکل گیا۔ بہرحال، ہر کام میں قدرت کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس لاکٹ کے ساتھ کون سی کہانی جڑی ہوئی تھی۔

میں حسب معمول تیار ہوکر تھانے آگیا۔ فیروزے والا لاکٹ میری جیب میں تھا اور میں مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تھانے میں کھوجی فتح محمد مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میں نے کل ایک چبھتے ہوئے جملے سے اس کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ خاصا جذباتی ہوگیا تھا اور اس وقت بھی بڑے جوش میں دکھائی دیتا تھا۔

فتح محمد ایک تجربہ کار اور ہنرمند شخص تھا۔ ہر فنکار جذباتی ہوتا ہے۔ اس کے اندر خودداری اور انا بھی ہوتی

ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کل وہ میرے تیکھے جملے کے جواب میں اچھل پڑا تھا۔ یقیناً اسے ایسا محسوس ہوا ہوگا کہ میں اس کے سامنے دوسرے ماہر کھوجیوں کا ذکر کر کے اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جبکہ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے فتح محمد کو ایک کانسٹیبل دے کر روانہ کر دیا۔ اس کی رپورٹ کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ متلاشی ٹیم کو لائل پور کی طرف روانہ کیا جائے یا دیگر گاؤں کی سمت۔ پھر میں نے افتخار حسین کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ مجھے سلام کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''افتخار! میں دو تین گھنٹے کے لیے شمس آباد کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ اس دوران میں تھانے کا نظم و نسق تم سنبھالو گے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''کیا ادھر کوئی خاص بات ہے؟''

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے اس سے لاکٹ کا ذکر نہیں کیا۔ ''ہو سکتا ہے، وہاں پہنچ کر کوئی خاص بات سامنے آ جائے۔ کل کا پورا دن چودھری قادر علی کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ پتا تو کیا جائے، ادھر حویلی میں ہو کیا رہا ہے......''

''جی ہاں...... ضرور۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''آپ تھانے کی طرف سے مطمئن ہو کر جائیں۔ آپ نے اتنا تو سکھا ہی دیا ہے کہ مجھے یہاں کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی اور پھر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! شمس آباد یہاں سے دور ہی کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک میل نا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو بھی گئی تو میں آپ کو بلا لوں گا۔''

افتخار حسین کی پُراعتماد باتوں نے مجھے مطمئن کر دیا۔ پھر اسی نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر میرے لیے تانگے کا بندوبست کیا اور میں کانسٹیبل واحد کے ہمراہ شمس آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ لاکٹ ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

میں اور چودھری قادر علی، حویلی کی بیٹھک میں براجمان تھے۔ پہلے جب میں یہاں آیا تو بیٹھک میں بیٹھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ سارا وقت افراتفری میں گزر گیا تھا۔ چودھری کی بیٹھک سجاوٹ اور سادگی کا خوب صورت امتزاج پیش کرتی تھی۔ یعنی وہاں اپنا رعب و دبدبہ اور کروفر ظاہر کرنے والی کوئی شے دیواروں پر آویزاں نہیں کی گئی تھی۔ گویا وہ بیٹھک چودھری قادر علی کے فطری مزاج کی عکاس تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد چودھری نے دل گرفتہ لہجے میں پوچھا۔ ''ملک صاحب! میری نورین کی کوئی خیر خبر......؟''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں چودھری کو اپنی اب تک کی تفتیش اور تحقیق سے آگاہ کیا پھر آخر میں تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''آج شام تک یہ پتا چل جائے گا کہ وہ ڈاکو نورین کو جنگل سے باہر نکلنے کے بعد لائل پور کی طرف لے گئے ہیں یا پھر زیریں جانب موضعات فیروز نگر، ملک وال اور چک بتیس کی طرف۔ ذرا سمت کا تعین ہو جائے، اس کے بعد نورین کی تلاش بہت آسان ہو جائے گی۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہی متلاشی ٹیم کو روانہ کیا جا سکتا ہے۔''

''ملک صاحب! ابھی تک تو میں نے کوشش یہی کی ہے کہ ادھر بہادر پور والوں کو اس واردات کی خبر نہ ہو۔'' چودھری نے تشویش ناک نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کسی بھی طرح ایک دو دن میں نورین کو بازیاب کرنے کی کوشش کریں۔ اگر میرے دوست چودھری خدا بخش کو اس اندوہناک واقعے کا پتا چل گیا تو پھر قیامت ہی آ جائے گی۔ میری پگڑی بھی اچھلے گی اور ناک بھی کٹے گی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا چودھری صاحب۔'' میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔ ''آپ خوامخواہ پریشان ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''کیا آپ اس واردات کو معمولی واقعہ سمجھ رہے ہیں......''

''نہیں چودھری صاحب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تو چودھری خدا بخش کے حوالے سے کہہ رہا تھا۔''

''چودھری خدا بخش کے حوالے سے؟'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

''ملک صاحب! آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔''

''چودھری خدا بخش آپ کا دیرینہ اور قابلِ بھروسا دوست ہے نا؟''

''بے شک! ایسی ہی بات ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''سچے اور مخلص دوست اپنے دوستوں کی مجبوریوں کو سمجھنے اور ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں چودھری صاحب۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو یہی کہوں گا کہ چودھری خدا بخش کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیں۔ وہ اس معاملے میں آپ سے تعاون اور ہمدردی کرے گا۔''

''نہیں ملک صاحب......'' وہ بڑی تیزی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی پانی سر سے زیادہ اونچا نہیں ہوا۔ بس، ایک دو دن میں آپ نورین کو ڈھونڈ نکالیں جب کوئی چارہ کار نہیں رہے گا تو پھر میں خود بہادر پور جا کر چودھری خدا بخش کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کر دوں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' میں نے سادہ انداز میں کہا۔ ''ویسے اس وقت میں ایک اور کام سے آپ کے پاس آیا تھا۔''

''اور کام سے...... کون سا کام ملک صاحب؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔ ''ادھر جنگل سے ہمیں ایک خاص شے ملی ہے۔ میں وہ شے آپ کو دکھاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے، اس کی مدد سے ان ڈاکوؤں کا سراغ لگانے میں کوئی مدد مل سکے۔''

''جی...... دکھائیں۔'' وہ پُراشتیاق انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے فیروزے والا لاکٹ جیب سے نکال کر چودھری کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کی واضح چمک ابھری پھر وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ لاکٹ آپ کو جنگل سے ملا ہے......؟''

''جی ہاں!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ اس لاکٹ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں؟''

''جی ہاں، بالکل۔ اس میں نہ پہچاننے والی کون سی بات ہے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''یہ تو جیلا کا لاکٹ ہے!''

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ میں جس لاکٹ کو نورین کا سمجھا تھا، وہ جیلا کا نکل آیا تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جیلا کا لاکٹ نورین کے کمرے میں کیسے پہنچ گیا؟

یہ بڑا سنسنی خیز سوال تھا لہٰذا میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ''چودھری صاحب! آپ کو یقین ہے کہ یہ لاکٹ جیلا ہی کا ہے......؟''

''جناب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' وہ شاکی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے صد فیصد یقین ہے کہ یہ لاکٹ جیلا ہی کا ہے۔ لگتا ہے، اس کی زنجیر ٹوٹنے کی وجہ سے یہ جنگل میں کہیں گر گیا ہوگا۔ اگر آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں تو جیلا سے پوچھ لیں۔ وہ ادھر گیٹ کے قریب اپنے کمرے میں موجود ہے۔ آپ کہیں تو میں جیلا کو یہاں بلا لیتا ہوں۔''

''لاکٹ'' کے حوالے سے پوچھ گچھ کے لیے میں نے حویلی کی طرف آتے ہوئے راستے میں ایک لائحہ عمل تیار کر لیا تھا جس میں بہت سی باتیں حقیقت سے دور تھیں اور میں سچائی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اسی لائحہ عمل پر عمل پیرا تھا۔

''جیلا کا بخار اب کیسا ہے؟'' میں نے چودھری سے پوچھا۔

''اب تو وہ ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بس کمزوری ہے۔ ایک آدھ دن آرام کرے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ''اب جیلا کو بلا لیں۔''

تھوڑی دیر کے بعد جیلا بیٹھک میں موجود تھا۔ چودھری کے اشارے پر وہ ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ جب سے مجھے یہ پتا چلا تھا کہ فیروزے والا وہ لاکٹ جیلا کا تھا اور ہر وقت اس کی گردن میں لٹکا رہتا تھا، میرے رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک سے بیٹھ چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''جیلا! تمہارا وہ لاکٹ کہاں ہے جو ہر وقت تمہاری گردن میں موجود رہتا تھا؟''

''پتا نہیں جی، وہ کہاں گر گیا ہے۔'' وہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''میں نورین بی بی کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان رہا ہوں بلکہ ابھی تک پریشان ہوں۔ جب تک نورین بی بی واپس نہیں آ جاتی، حویلی میں رہنے والا ایک ایک شخص بلکہ پورا شمس آباد ہی اداس اور فکرمند رہے گا......'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ان دو تین دنوں میں یہاں ایسی افراتفری رہی ہے کہ مجھے خود اپنا ہوش نہیں رہا، لاکٹ پر کیا دھیان دیتا.....''

''تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے جیلا۔''میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔''انشاء اللہ! میں عنقریب نورین کو بازیاب کرلوں گا۔ فی الحال میں تمہارا فیروزے والا لاکٹ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔''

جیلا کی آنکھوں میں الجھن آمیز حیرت نمودار ہوئی۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔''وہ آپ کو کہاں سے ملا؟''

تھوڑی دیر پہلے میں نے مذکورہ لاکٹ کو جیب میں رکھ لیا تھا۔ جیلا کے اضطراری سوال پر میں نے وہ لاکٹ اپنی جیب میں سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لاکٹ ہمیں جنگل میں سے ملا ہے۔''

''اس کی زنجیر ٹوٹی ہوئی ہے۔''وہ لاکٹ کو ہاتھوں میں پھراتے ہوئے بولا۔''میرا خیال ہے، جب میں نورین بی بی کی تلاش میں جنگل کی طرف گیا تھا تو یہ لاکٹ زنجیر ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہاں گر گیا ہوگا۔''

میں اس دوران میں مسلسل جیلا کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان لمحات میں جیلا مجھے خاصا الجھا ہوا دکھائی دیا۔ ہوسکتا ہے یہ اس کی بیماری کے اثرات کا ثمر ہو۔ بہرحال میں نے اسے پکا کرنے کی خاطر پوچھا۔''ویسے یہ لاکٹ ہے تو تمہارا ہی نا......؟''

''ہاں جی، بالکل!''وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''میں بھلا اپنے لاکٹ کو پہچاننے میں کس طرح غلطی کرسکتا ہوں۔ پورے شمس آباد میں ایسا لاکٹ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔''

''اور تمہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ جمعے کی صبح جب تم نورین کی تلاش میں، چودھری صاحب کو بتائے بغیر چپ چاپ جنگل کی طرف جارہے تھے تو یہ لاکٹ تمہاری گردن میں موجود تھا؟''میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

''جی ہاں۔ جب میں گھوڑے پر بیٹھ رہا تھا تو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے چھو کر اس لاکٹ کو دیکھا تھا۔''وہ مضبوط لہجے میں بولا۔''لیکن واپسی میں، میں نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ جب میں لوٹ کر حویلی آیا تو لاکٹ غائب تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا، راستے میں آتے جاتے یا پھر جنگل میں کہیں گر گیا ہوگا۔ میں نے لاکٹ کو تلاش کرنے کے بارے میں بھی سوچا تھا لیکن تیز بخار نے مجھے اس کی مہلت ہی نہیں دی اور اب بھی کمزوری کی وجہ سے اتنے چکر آرہے ہیں کہ میں ٹھیک طرح آپ سے بات بھی نہیں کرپا رہا ہوں۔''

''ہاں جیلا! میں بھی یہی محسوس کررہا ہوں کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔''تم یہ لاکٹ اپنے پاس رکھ لو اور اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو...... نورین کے حوالے سے بھی ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ ایک دو دن میں وہ حویلی میں موجود ہوگی۔''

جیلا نے لاکٹ کی''بازیابی'' کے لیے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کرکے بیٹھک سے نکل گیا۔ چودھری نے سوچتی ہوئی گہری نظر سے مجھے دیکھا اور بکھری ہوئی الجھن زدہ آواز میں پوچھا۔

''ملک صاحب! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں......؟''

''کیا مطلب چودھری صاحب؟''میں نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ......''وہ بدستور الجھے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''آپ کی باتوں اور ان سے جھلکنے والے اطمینان سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے، نورین کہاں ہے...... اور آپ جب چاہیں گے اسے سامنے لے آئیں گے؟''

''ایسی بات نہیں ہے چودھری صاحب!''میں نے سرسری لہجے میں کہا۔''بہ خدا! مجھے اس بات کا تو علم نہیں کہ نورین اس وقت کہاں ہوگی لیکن اگر آپ میرے ایک سوال کا بالکل درست جواب دیں تو ممکن ہے، میں شام سے پہلے آپ کی بیٹی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجاؤں......''

''ملک صاحب! اس وقت مجھ سے زیادہ اور کوئی اس بات کا خواہش مند نہیں ہوگا کہ نورین جلد از جلد باعزت اور صحیح سلامت واپس حویلی پہنچ جائے۔''وہ آگے کو جھک کر گہری سنجیدگی سے بولا۔''آپ جتنے بھی سوالات پوچھیں گے، میں ان کا ٹھیک جواب دوں گا۔''

''جتنے اور کتنے نہیں، صرف ایک سادہ سا سوال......!''

''جی پوچھیں، آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''میں نے پچھلے پھیرے میں حویلی کے اندرونی حصے کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔''میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''خاص طور پر ان چار کمروں کا جو ایک ہی قطار میں بنے ہوئے ہیں جن میں سے تین تو آپ لوگوں کی خواب گاہیں ہیں اور چوتھے کمرے میں نورین کا جہیز بھرا ہوا ہے۔''لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی، آپ کے بچوں کی اور نورین کی خواب گاہ میں کس کس کو جانے کی اجازت ہے؟''

''میں، میری گھر والی زاہدہ پروین، بشیراں بی بی، نوید، سعید اور نورین۔''اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔''یا پھر جو ہمارے قریبی رشتے دار ہیں، وہ جب شمس آباد آتے ہیں تو وہ ان کمروں میں بہ آسانی آجاسکتے ہیں۔ ویسے میں نے باہر سے آنے والے مہمانوں کے قیام و طعام کے لیے حویلی کے اندر ہی دو تین کمرے الگ سے بھی بنا رکھے ہیں۔''

''جیلا اور بالا سے آپ کی کوئی رشتے داری نکلتی ہے؟''میں نے چودھری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خاصے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں جی...... بالکل نہیں۔''وہ ٹھوس انداز میں بولا۔''وہ صرف ملازم ہیں۔ نمک خوار اور وفادار ملازم۔ انہیں حویلی کے اندرونی رہائشی کمروں میں آنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ وہ زنان خانے سے دور حویلی کے بیرونی حصے میں ڈیوٹی دیتے ہیں۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ......''میں نے بھی تھوڑا آگے جھک کر معنی خیز لہجے میں پوچھا۔''وہ نیلے پتھر والا چاندی کا لاکٹ مجھے نورین کے کمرے کے فرش پر پڑا ملا تھا تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا چودھری صاحب؟''

''اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!''میری بات سنتے ہی چودھری اچھل پڑا۔''جب جیلا کو نورین کے کمرے میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں تو پھر اس کا لاکٹ وہاں کیسے پہنچ سکتا ہے۔''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں چودھری کو فیروزے والے لاکٹ کی کہانی سنائی اور آخر میں کہا۔''مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ جیلا اس ڈکیتی اور اغوا والی واردات کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں، وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولا۔''یہ...... یہ...... آپ کیا...... کہہ رہے ہیں...... ملک صاحب؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔''میں آپ کے نمک خوار جیلا کو اپنے ساتھ تھانے لے کر جارہا ہوں۔ شام سے پہلے اس نے حیرت انگیز اور ناقابل یقین انکشافات نہ کیے تو میں سمجھوں گا، اب تک میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں جھک ماری ہے۔''

چودھری قادر علی مشکل ہی سے سہی مگر اس بات کے لیے راضی ہوگیا کہ میں جیلا کو تفتیش کے لیے تھانے لے جاؤں۔ اس کے بعد حویلی میں رکنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ ہم نے جیلا کو تانگے میں بٹھایا اور تھانے کی جانب روانہ ہوگئے۔

وہ راستے بھر خاموش اور کھویا کھویا سا رہا۔ میں نے جیلا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے کس مقصد کے لیے تھانے لے کر جارہا ہوں۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نورین کی تلاش کے سلسلے میں اسے کوئی اہم ذمے داری سونپنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

☆ ☆ ☆

مجھے شروع ہی سے جیلا اور بالا پر شک تھا۔ وہ چودھری کی حویلی کے محافظ تھے اور اس پراسرار واردات کے وقت وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر پائے گئے تھے اور یہی بات مجھے ہضم نہیں ہورہی تھی۔ بالا کا تفصیلی انٹرویو کرنے کے بعد میں مطمئن ہوگیا تھا لیکن جیلا کا رویہ ابتدا ہی سے مشکوک تھا۔ یہ لاکٹ والا''معاملہ'' سامنے آنے کے بعد تو میرا یہ شک یقین میں بدل گیا تھا کہ وہ اس واردات کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔

میں نے تھانے پہنچ کر جیلا کو خوفناک صورت والے ایک حوالدار کے حوالے کیا اور واضح الفاظ میں کہا۔''چمن خان! میں جانتا ہوں کہ چودھری قادر علی کی حویلی میں ہونے والی ڈکیتی اور اغوا کی واردات میں کسی نہ کسی حوالے سے یہ جیلا بھی ملوث ہے۔ اس کی زبان سے اقرار کرانا اب تمہاری ذمے داری ہے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!''چمن خان نے جیلا کو ایسی نظر سے دیکھا جیسے قصاب، بکرے کو دیکھتا ہے۔''میں ایک گھنٹے کے اندر آپ کو رپورٹ پیش کرتا ہوں۔''

اس کے بعد چمن خان، جیلا کو دھکیلتے ہوئے ٹرائل روم کی طرف لے گیا۔ جیلا اس غیر متوقع صورت حال سے بے حد خوفزدہ ہوگیا تھا لہٰذا اس نے چمن خان کی بتائی ہوئی مدت

سے پہلے ہی زبان کھول دی۔ جو لوگ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی سنگین جرم کا ارتکاب کرتے ہیں اور پولیس سے کبھی ان کا واسطہ نہیں پڑا ہوتا، ان کی زبان کو کھلوانے کے لیے خطرناک تفتیشی ہتھکنڈے استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

''ملک صاحب! یہ بندہ تو ہیجڑ سے بھی زیادہ ڈرپوک نکلا ہے۔'' چمن خان نے میرے پاس آکر بتایا۔ ''اس نے زبان کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ کھول دیا ہے۔ اس وقت اس کے بدن سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہیں......''

''تم جلدی سے جیلا کی صفائی ستھرائی کا بندوبست کرو چمن خان!'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ اس کا بیان قلم بند کیا جا سکے۔''

☆☆☆

اس روز میں نے جمیل عرف جیلا کا جو بیان قلم بند کیا، میں اس کی تفصیل میں تو نہیں جاؤں گا تاہم غیرضروری اور غیرمتعلق باتوں کو حذف کر کے میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

جیلا، نورین کو پسند کرتا تھا لیکن اس پسندیدگی کے اظہار کا مطلب یہ تھا کہ اپنے پروانۂ موت پر دستخط کرتا۔ جب نورین کی شادی کی تاریخ پکی ہوگئی تو وہ اداس رہنے لگا۔ نورین کو کچھ ہی دنوں میں شمس آباد کو چھوڑ کر بہادر پور چلے جانا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے تو کبھی کبھار اسے نورین کی شکل نظر آجاتی تھی لیکن اگر وہ بیاہ کر بہادر پور چلی جاتی تو پھر جیلا کے لیے بڑی مشکل ہوجاتی۔ احساسِ محرومی، جذبات کی شکست اور ناآسودہ خواہشات نے اسے ایک شیطانی منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اکسایا۔ چک بتیس میں اس کا ایک دوست بشارت رہتا تھا جس کے ہر قسم کے لوگوں سے تعلقات تھے۔ بشارت نے جب جیلا کی بپتا سنی تو وہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔

جیلا حویلی کے اندرونی معاملات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ بشارت کے مشورے پر ڈاکوؤں کا آلۂ کار بننے پر تیار ہوگیا۔ اس نے حویلی کے اندرونی حالات سے ڈاکوؤں کو آگاہ کردیا۔ ان چار ڈاکوؤں کا بندوبست بشارت نے کیا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق جمعرات اور جمعے کی درمیانی شب چار ڈاکو گھوڑوں پر سوار ہوکر چودھری قادر علی کی حویلی پہنچ گئے۔ ان کے پاس بے ہوش کرنے والی دوا (کلوروفارم) میں بسے ہوئے رومال بھی تھے۔ دو ڈاکو جیلا کی مدد اور تعاون سے حویلی کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت بالا گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی ناک پر مخصوص رومال رکھ کر اسے انٹاغفیل کردیا گیا تھا۔ جیلا ڈاکوؤں کے ساتھ پہلے نورین والے کمرے تک پہنچا۔ ڈاکوؤں نے سوئی ہوئی نورین کو بھی رومال کی مدد سے انٹاغفیل کردیا۔ اس کے بعد جیلا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور خود کو بے ہوش ثابت کرنے لگا۔ ڈاکوؤں کی وہ مکمل راہنمائی کر چکا تھا۔ انہوں نے نورین کو کندھے پر لادا اور طلائی زیورات والا سوٹ کیس اٹھا کر چلتے بنے۔

ان کے بیچ جنگل کے ایک مخصوص حصے میں اگلی صبح ملاقات طے تھی جہاں بشارت بھی موجود ہوتا اسی لیے جمعے کی صبح جیلا چپ چاپ جنگل کی طرف نکل گیا تھا۔ پروگرام کے مطابق طلائی زیورات پر ڈاکوؤں کو قبضہ کرنا تھا اور نورین جیلا کے حوالے کردی جاتی۔ جیلا، بشارت کی مدد سے نورین کو لے کر کسی محفوظ علاقے کی طرف نکل جاتا لیکن ڈاکو، جیلا کو ڈاج دے گئے تھے۔ اگلی صبح جب وہ جنگل کے مخصوص مقام پر پہنچا تو وہاں کھلے ہوئے سوٹ کیس اور ریشمی ملبوسات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس صورتِ حال سے جیلا کے ذہن کو ایسا دھچکا لگا کہ وہ تیز بخار میں مبتلا ہوگیا۔ جیلا جب ڈاکوؤں کی راہنمائی کرتے ہوئے نورین کے کمرے میں گیا تھا تو وہیں اس کا لاکٹ گر گیا تھا جو اس کیس کو حل کرنے کا سبب بن گیا۔

جیلا کی نشان دہی پر میں نے چک بتیس اور اردگرد کے گاؤں دیہات میں چھاپے مار کر بشارت کو گرفتار کرلیا۔ وہ فیروزنگر سے آگے ایک گاؤں عمرکوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ جب میں نے بشارت کو تفتیش کی چکی میں پیسنے کے لیے ڈالا تو اس نے ڈاکوؤں کے پتے ٹھکانے سے مجھے آگاہ کردیا۔

میں نے سرتوڑ کوشش کر کے اٹھارہ اپریل بدھ کے روز دوپہر میں نورین کو بازیاب کرلیا۔ یعنی اس کی برات سے صرف ایک دن پہلے۔ اس دوران میں نورین کے ساتھ کیا بیتی اور میں نے جیلا و بشارت سمیت ڈاکوؤں کا کیا حشر کیا، یہ ایک الگ عبرت ناک داستان ہے جو پھر کسی مناسب موقع پر بیان کروں گا۔

محبت کرنا کوئی جرم ہے اور نہ ہی گناہ لیکن اس محبت کے حصول کے لیے جرم کی راہ اختیار کرنا کسی بھی طور قابلِ معافی نہیں۔ اگر یہ نکتہ انسانوں کی سمجھ میں آجائے تو ہماری دنیا جنت بن جائے گی۔

(تحریر: حسام بٹ)

احتجاج شکن

ابوضیا اقبال

دنیا میں دو طرح کے لوگ اپنا منفرد مقام بنا پاتے ہیں۔ ایک بہت اچھے... دوسرے بہت برے... لہٰذا ان کے کردار و عمل میں بھی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ان کی پسند ناپسند اور اظہار کے طریقے بھی الگ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اسے بھی بہت سی باتوں پر اعتراض تھا مگر احتجاج کا سخت مخالف تھا اور اس نے اپنی مخالفت کا اظہار کچھ اور ہی رنگ میں کیا کیونکہ اس میں کچھ نہ کچھ تو انفرادیت تھی۔



جس ٹرین میں مسٹر بینسن سوار ہوئے، وہ لوگوں سے کھچاکھچ بھری ہوئی تھی اور زیرِ زمین سفر کررہی تھی۔ وہ اواخر جنوری کی سہ پہر میں ہر اسٹاپ پر مسافروں کو اتارتی بڑی کاہلی سے دریائے ٹیمز کے ڈیلٹائی علاقے میں سطح زمین پر رواں دواں تھی اور تقریباً خالی ہوچکی تھی۔ وہ ایسے علاقوں سے گزر رہی تھی جن کے نام بڑے رومانوی تھے لیکن وہاں اینٹوں کے بنے ہوئے پرانے مکانوں اور چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹرین لندن ٹرانسپورٹ سسٹم کے آخری اور نوتعمیر شدہ اسٹیشن ویلنگفورڈ برج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ اسٹیشن نوتعمیر شدہ مڈل سیکس یونیورسٹی کے متعلقین کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا۔

شام کا جھٹ پٹا اترنے لگا تو اسٹریٹ لیمپس نارنجی روشنی اگلنے لگے۔ مسٹر بینسن اسٹیشن پر اترے تو انہیں فٹ پاتھوں پر برف نظر آئی۔ ان کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سا

سوٹ کیس تھا۔ وہ ہائی اسٹریٹ کی طرف جانے والی ڈھلوان پر چل دیے۔ ہائی اسٹریٹ پر پہنچے تو انہیں احساس ہوا کہ وہاں کچھ ہو رہا ہے۔

سڑک کے بیچوں بیچ لوگوں کا ایک گروہ مارچ کر رہا تھا۔ ان میں سے بیشتر کچھ گا رہے تھے اور کچھ چلا رہے تھے۔ ان کے عقب میں کافی ٹریفک رکا ہوا تھا اور اس میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ وہ قریب آئے تو مسٹر بینسن کے کانوں میں کچھ لفظ پڑے وہ طلبا تھے، ان کا نعرہ تھا "جب تک ہمارے مطالبات تسلیم نہیں کیے جائیں گے ہم شیو نہیں کریں گے۔" ایک اور گروپ چیخ رہا تھا۔ "ہم جیک ہاروے کو کسی کڑوے سیب کے درخت پر پھانسی دیں گے۔" وہاں ایسے لوگ جو نہ گا رہے تھے، نہ نعرے لگا رہے تھے صرف پولیس والے تھے جو جلوس کے ساتھ ساتھ مارچ کر رہے تھے۔

اگلی قطار میں تین افراد تھے۔ وہ قریب سے گزرے تو مسٹر بینسن نے انہیں صاف طور پر دیکھا۔ درمیان میں ایک موٹا تازہ سرخ چہرے والا، بیل جیسا نوجوان تھا۔ اس کی داہنی طرف کافی کی رنگت والا ایک نوجوان تھا۔ اس کے بال کالے تھے بہت پتلی سیاہ مونچھیں تھیں۔ وہ بہت سنجیدہ طبع لگتا تھا۔ بائیں جانب سفید رنگت والی ایک پرکشش لڑکی تھی اس کے گھنگھریالے بال تانبے کی رنگت کے تھے۔

مسٹر بینسن کھڑے وہ تماشا دیکھتے اور شور سنتے رہے یہاں تک کہ جلوس بہت دور چلا گیا۔ بالآخر ٹریفک کے دھارے نے دوبارہ بہنا شروع کیا۔ کار ڈرائیو کرنے والوں کے چہروں پر بے زاری کا تاثر تھا مسٹر بینسن بھی آگے بڑھ گئے۔

برف باری پھر شروع ہو گئی تھی۔

مسٹر بینسن کے ذہن میں یونیورسٹی کا ایک خاص تصور تھا۔ اس لیے انہیں شاک لگا۔ مڈل سیکس یونیورسٹی کو بڑے پیمانے پر بنانے کی اسکیم رہی ہوگی لیکن بعد میں بچت کے نقطۂ نظر سے نقشہ تبدیل کیا گیا ہوگا۔ اس لیے عمارتیں بے ڈھنگی سی لگ رہی تھیں۔ وہاں ہرے بھرے لان بھی نہیں تھے۔ دیکھنے میں وہ کسی عام سی جاگیر اور آرمی کنٹونمنٹ کے درمیان کی کوئی چیز لگتی تھی۔

انہوں نے پرنسپل کا لاج تلاش کیا جو نام نہاد یونیورسٹی کے دور ترین حصے میں واقع تھا۔ پرنسپل نے مسٹر بینسن کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر جیک ہاروے سفید بالوں والا ایک موٹا پلپلا شخص تھا۔ اس کے ہونٹوں پر رسمی پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی۔

"آؤ..... اندر آ جاؤ۔" اس نے کہا۔ "تم تو لگتا ہے منجمد ہو چکے ہو۔ کیا یہاں تک پیدل آنا پڑا؟ ہاں یہاں ٹیکسیوں کی بڑی قلت ہے۔ مسٹر بینسن، مجھے خوشی ہے کہ تم فیکلٹی کے عارضی رکن کی حیثیت سے جوائن کر رہے ہو۔ تمہیں جدید یورپ کی معاشرتی اور معاشی تاریخ کے مضمون کو کور کرنا ہوگا۔ وزیر صاحب نے تمہاری زوردار سفارش کرتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ تم ماہر لسانیات بھی ہو۔"

"جی ہاں، یورپ کی بیشتر زبانوں میں شد بد رکھتا ہوں میں۔" مسٹر بینسن نے انکساری سے کہا۔

"تب تو تم بہت کارآمد ثابت ہو گے۔ اس مضمون کی بیشتر کتابیں جرمن زبان میں ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں تم ہمارے ہاں مستقل طور پر آ جاؤ؟"

"پہلے میں طلبا سے مل لوں تبھی کچھ کہہ سکتا ہوں۔ یہاں آتے ہوئے راستے میں کچھ طلبا ملے تھے۔ بینرز اٹھائے ہوئے ایک اچھی خاصی فوج۔"

"وہ اکثر مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔" ڈاکٹر ہاروے نے کہا۔ "اس بار کیا مسئلہ تھا؟"

"مجھے تو صرف ایک نعرہ سنائی دیا..... جیک ہاروے کو پھانسی دو۔"

پرنسپل ہنس دیا۔ "بہت زندہ دل لوگ ہیں لیکن بے ضرر ہیں۔ میں نے گزشتہ سال کے آغاز میں یہاں کا چارج لیا تھا جب سے اب تک میرے درجنوں پتلے جلائے جا چکے ہیں لیکن مجھے کوئی فکر نہیں ہوئی۔"

"بس آپ کے پتلے ہی جلتے رہیں تو کوئی حرج نہیں۔" مسٹر بینسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

دو دن بعد بینسن نے پہلی بار کلاس کا سامنا کیا۔ یہ بات ان کے لیے دلچسپی کا باعث تھی کہ مظاہرہ کرنے والے طلبا کے تینوں لیڈر اس کلاس میں موجود تھے۔ وہ ان کے متعلق تھوڑا بہت تو معلوم کر چکے تھے۔ لڑکی ایلیا وارنی تھی، کروڑ پتی سیموئیل وارنی کی بیٹی۔ بھاری بھر کم لڑکا آئرش تھا، اس کا نام پیٹرک میگھان تھا۔ دبلے پتلے لڑکے کے متعلق وہ پہلے ہی سے جانتے تھے۔ وہ احمد بن اکبر بن سلیمان تھا، راس الدار کے حکمراں کا وارث۔

اس مفروضے کے تحت کہ جس چیز میں انہیں دلچسپی ہے اس میں ان کے اسٹوڈنٹ بھی دلچسپی لیں گے، مسٹر بینسن نے جنگوں کے درمیان کے جرمنی کا موضوع منتخب کیا۔ انہوں نے کوٹ ایز نر اور ہوفمین کی عبوری حکومت کا تجزیہ کیا اور بالاکن کی حکومت تک پہنچے تو ایلیا نے مداخلت کی۔ اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بڑے مہذب لہجے میں پوچھا۔

"سر! اگر ہم درمیان میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہیں تو آپ اس مداخلت کا برا تو نہیں مانیں گے؟"

"ہرگز نہیں۔" مسٹر بینسن نے کہا۔ "لیکن یہ بات پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟"

"وہ...... کچھ لیکچرار ایسے ہیں کہ اس پر بہت ناراض ہوتے ہیں۔"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھ جیسے شوقیہ لیکچرار جو آؤٹ آف پریکٹس بھی ہوں ایسی مداخلت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں سکھ کا سانس لینے کی مہلت بھی مل جاتی ہے اور یہ سکون بھی ہو جاتا ہے کہ وہ جو نوٹس تیار کر کے لائے ہیں ان کی مدد سے پورا پیریڈ گزر جائے گا۔" اس پر پوری کلاس خوش دلی سے ہنس دی۔

"بات یہ ہے کہ آپ جس عہد پر لیکچر دے رہے ہیں وہ بہت خوف ناک رہا ہوگا لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کے بعد جو دور آیا وہ ہٹلر کا تھا۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ موازنہ کیا جائے تو ہٹلر کا عہد اپنے پیش روؤں کے عہد سے بہتر تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ ہٹلر بہت تباہ کن تھا۔" مسٹر بینسن نے آہستہ سے کہا۔ "نہ صرف جرمنی کے لیے بلکہ پوری مغربی دنیا کے لیے۔"

"لیکن یہ فیصلہ آپ شاید جنگ کے بعد شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے سے صادر فرما رہے ہیں۔" احمد نے کہا۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ میں نے یہ بات صرف کتابوں کی بنیاد پر کہی ہے تو تم غلطی پر ہو۔ اس میں میرے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا بھی دخل ہے۔"

"تو آپ ہٹلر سے ملے تھے؟"

"ہاں، دو بار ملا تھا۔"

"مگر وہ رسمی ملاقاتیں ہوں گی۔" احمد نے اعتراض کیا۔ "اور آپ ان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے۔"

"ایک ملاقات رسمی تھی مگر دوسری غیر رسمی تھی اور دونوں بار میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی، جس سے تاریخ کا فیصلہ غلط یا جانب دارانہ قرار دیا جا سکے اور اس سے میری یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بدنظمی، بدامنی اور سیاسی انتشار اپنے پیچھے ہمیشہ کوئی ڈکٹیٹر شپ لاتا ہے۔"

"کیا یہ ایسا اصول ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتا؟" احمد نے پوچھا، اس کے انداز میں دلچسپی تھی۔

"نہیں مستثنیات بھی ہیں مثلاً آئر لینڈ میں عام طور پر سیاسی انتشار مزید سیاسی انتشار لاتا ہے۔" اس پر توقع کے عین مطابق پیٹرک میگھان بھڑک اٹھا۔ تاہم پیریڈ مکمل طور پر خوش گوار انداز میں گزرا۔

☆☆☆

"یہ شخص کون ہے؟" میگھان نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ تینوں اس وقت ایلیا کے کوٹھری نما کمرے میں بیٹھے تھے۔ احمد اور ایلیا بیڈ پر تھے اور میگھان اکلوتی کرسی پر قابض تھا۔

"یہ اس ٹرم میں موروٹز کے حصے کے لیکچر پورے کرے گا۔" ایلیا نے بتایا۔

"اچھا لیکچرار نہیں لیکن موروٹز سے بہر حال بہتر ہے۔"

"مجھے تو بھئی بہت اچھا لگا اور خدا کے لیے جمائیاں لینا بند کرو پیٹرک۔"

"مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"شام چار بجے نیند کا کیا کام اور سنو ہمارے ایجنڈے پر اہم معاملات موجود ہیں۔ پہلا نکتہ کل کا مظاہرہ۔"

"تم مصر ہو کہ وہ پر تشدد ہوگا؟" احمد نے پوچھا۔

"ہاں، میں اس پر اصرار کروں گی۔ ہمارے عام مظاہرے لاحاصل ثابت ہو چکے ہیں۔" ایلیا بولی۔ "ابھی تک ہم ٹریفک بلاک کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکے ہیں۔ ہم بااختیار لوگوں پر کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکے ہیں۔ اگر تم شامل نہیں ہونا چاہتے تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔"

"نہیں شامل تو میں ہوں گا۔"

"لیکن لگتا ہے تم قائل نہیں ہوئے ہو۔ تمہارے لہجے میں زور نہیں۔"

"جو کچھ ہم طلب کر رہے ہیں وہ میں جانتا ہوں جائز ہے۔ یہ کہ ہمارے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ نہ کیا جائے۔ ہمیں اپنے معاملات میں آزادی حاصل ہونی چاہیے اور یہ بھی سن لو کہ میں تشدد سے خوف زدہ نہیں۔ میں جہاں سے آیا ہوں وہاں تشدد معمولات میں شامل ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ تشدد کے ردعمل کے طور پر رویے اور سخت ہو جاتے ہیں۔ فی الوقت ہم میں سے چند ایک ہی ایسے ہوں گے جو بااختیار لوگوں سے فساد محسوس کرتے ہوں۔ کم از کم مجھے کوئی عناد نہیں، بغیر کسی وجہ کے تشدد پر اتر آنا میرے خیال میں زیادتی ہے۔"

ایلیا نے گہری سانس لی۔ "یہ تو اچھی صورت حال نہیں۔ چلو، پیٹ کا ووٹ فیصلہ کن ہوگا۔" لیکن کرسی کی طرف سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔

"خدا کی پناہ، یہ تو سو چکا ہے۔"

☆☆☆

ایلکس فریزر درحقیقت بڑی توپ چیز تھا۔ اس کا دفتر آٹھویں منزل پر تھا جہاں سے ٹیمز کا خوب صورت منظر دکھائی دیتا تھا۔ دفتر میں فرش پر دبیز قالین بچھے تھے۔ کرسیاں بہت آرام دہ اور بیش قیمت تھیں۔ اس کی اپنی میز ٹینس کورٹ کے سائز کی تھی۔ ایک کونے میں تیل کے کنویں کا ایک ماڈل رکھا تھا۔ اس کی سیکریٹری بھی دیکھنے کی چیز تھی۔ پورے آفس میں واحد بے ڈھنگی چیز خود ایلکس فریزر تھا۔ وہ پستہ قامت اور مختصر سا آدمی تھا۔ اس کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ جو سوٹ پہنے ہوئے تھا کم از کم دس سال پرانا لگتا تھا۔ اس پر استری بھی ڈھنگ سے نہیں کی گئی تھی۔

کالڈر نے ایک نظر میں یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ اسے بے ڈھنگا پن پسند نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ کسی ارب پتی کا بے ڈھنگا پن بھی فیشن کہلاتا ہے۔

''بہت سنگین صورت حال ہے۔'' فریزر نے کہا۔ ''ہماری ایک ذیلی کمپنی ہے...... ایسٹ گلف آئل کمپنی وہ مسقط اور اومان کے قریب تیل کی تلاش کا کام کر رہی ہے۔ میں نے سروے رپورٹ پڑھی ہے۔ راس الدار کی سروے رپورٹ جیسی حوصلہ افزا رپورٹ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔''

''مبارک ہو۔'' کالڈر نے کہا۔

''مبارک باد ابھی قبل از وقت ہے۔ ہمارے پاس فی الوقت صرف عارضی کانٹریکٹ ہے۔ ہم ڈرلنگ نہیں کر سکتے۔ صرف سروے کر سکتے ہیں۔ ڈرلنگ کانٹریکٹ پر ابھی دستخط ہونے کا مرحلہ باقی ہے۔''

''راس الدار؟'' کالڈر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''وہاں کا حکمراں شیخ اکبر ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ لالچی آدمی تو کبھی نہیں رہا۔''

''وہ لالچی ہے بھی نہیں، وہ پرانی قدروں کا حامل ایک صحرائی عرب ہے۔ اس کے پاس آئیڈیلز ہیں، اس نے دیکھا ہے کہ دولت نے چھوٹی عرب ریاستوں کو کیسی خوشحالی دی ہے۔''

''تو مغربی روایات کے مطابق آپ اس سے پیکج ڈیل کر لیں۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ تیل سے جو دولت آئے گی، اس سے سڑکیں بنائی جائیں گی، اسپتال تعمیر ہوں گے، تعلیم عام ہوگی لیکن شراب بھی آئے گی، ٹریفک حادثات بھی ہوں گے اور دولت کی ہوس بھی جاگ اٹھے گی پھر پڑوسیوں کے حسد کا سامنا بھی کرنا ہوگا جو تیل سے محروم ہیں۔''

''یہ تو کوئی اچھی بیلنس شیٹ نہیں۔''

''ممکن ہے میں کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کر گیا ہوں۔ بہر حال بڈھا شیخ انہی خطوط پر سوچ رہا ہے۔ مغربی تہذیب کو سمجھنے کے لیے اس نے اپنے بیٹے کو انگلینڈ کی ایک یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے بھیجا ہے تاکہ پتا چل جائے کہ مغربی تہذیب کے کیا فائدے ہیں اور کیا نقصانات۔ فارن آفس نے مڈل سیکس یونیورسٹی تجویز کی تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ نئی یونیورسٹی ہونے کی وجہ سے وہاں زیادہ مسائل نہیں ہوں گے۔''

''یونیورسٹی نئی سہی لیکن وہاں طلبا بہت تیزی سے سیکھ رہے ہیں۔ دو دن پہلے انہوں نے پرنسپل کی اقامت گاہ پر پتھراؤ کیا، کھڑکیوں کے شیشے توڑے، پرنسپل کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ اب وہ ایک مہربان انکل ہے نہ بڑا بھائی' وہ تو ایک بپھرا ہوا شیر بن گیا ہے۔''

''صحیح سمت میں پھینکا جانے والا ایک پتھر پوری دنیا کو بدل سکتا ہے لیکن مجھے فکر احمد کی ہے کہیں وہ پتھر احمد نے نہ پھینکا ہو۔''

''احمد اس جنگ میں سب سے اگلی صف میں تھا۔ خوش قسمتی سے پولیس نے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ انہوں نے تو بس ایک جنگلی آئرش لڑکے کو گرفتار کر لیا لیکن ضروری نہیں کہ اگلی بار بھی احمد محفوظ رہے اور اگر اس نے ایک رات بھی حوالات میں گزار لی تو ایسٹ گلف کمپنی کو راس الدار میں کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

فریزر اٹھا اور تیل کے کنویں کے ماڈل کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ''کالڈر...... تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہونے والا معاہدہ کتنا اہم ہے۔''

''میں یہ بات سمجھتا ہوں۔'' کالڈر نے کہا۔ ''اور ہم اس معاملے کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چیف نے وہاں میرے ساتھ بینسن کو بھیجا ہے۔ وہ ایک ٹرم تک وہاں معاملات پر نظر رکھے گا اور اب بینسن نے مجھے بھی مدد کے لیے وہاں بلایا ہے۔ عام حالات میں بینسن اپنے طور پر معاملات سے نمٹنے کی اہلیت رکھتا ہے لیکن یہ معاملہ کچھ پیچیدہ ہے۔''

''کیسی پیچیدگی؟''

''اس خوب صورت پیچیدگی کا نام ہے ایلیا وارنی۔''

''سام وارنی کی بیٹی؟''

''جی ہاں۔''

''صورتِ حال تو پہلے ہی خراب تھی یہ اور برا ہوا۔''

فریزر نے افسردگی سے کہا۔

☆☆☆

''لو...... لنچ کی گھنٹی بج گئی۔'' بینسن نے کہا۔ ''بہت پڑھائی ہو چکی' اب چھٹی۔''

ایلیا وارنی نے اس کی میز پر رکھی ہوئی اپنی کتابیں اور کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ یہاں جو کھانا دیا جاتا ہے وہ سب کی بھوک اڑانے کو کافی ہے۔''

بینسن اپنا پائپ بھرنے میں مصروف تھا۔ ''کھانا ایک ایسی چیز ہے، جسے بہت زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے اور غیر اہم بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ میں دوسرے قبیل سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں گھر پر ہوتا ہوں تو میری آنٹی میرے لیے کھانا پکاتی ہیں، وہ تین ڈشوں پر زور دیتی ہیں۔ قیمہ، مرغی کا قورمہ اور آئرش اسٹو۔'' اس نے پائپ کے چند ہلکے کش لیے۔ ''اور میں ذائقے کی پہچان سے اتنا بے بہرا ہوں کہ ان تینوں میں فرق بھی نہیں کر سکتا۔''

ایلیا نے کہا۔ ''ایک بات بتائیں مسٹر بینسن، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔''

''سنجیدگی سے بات کریں، آپ معلم ہرگز نہیں ہیں۔''

''یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟''

''آپ دیکھنے میں ٹیچر نہیں لگتے۔ صرف دیکھنے میں نہیں، بات کرنے اور سوچنے میں بھی۔''

''لگتا ہے، تم نے اس پر تحقیقی کام کیا ہے۔''

''بالکل، یہ تیسری یونیورسٹی ہے جس میں، میں پڑھ رہی ہوں۔ دو یونیورسٹیوں سے نکالی جا چکی ہوں نامناسب رویے کی بنیاد پر۔''

''تمہیں یہاں داخلہ ملا تو یہ بات یہاں والوں کے علم میں تھی؟''

''جی ہاں، میرے والد نے انہیں بھاری مالی امداد کا یقین دلایا تھا لائبریری کے لیے۔''

''اوہ......!''

''اب بتائیں، آپ کوئی آفیسر ہیں یا انسپکٹر ہیں؟''

''خدا کی پناہ۔'' بینسن نے گھبرا کر کہا۔ ''کیا میں ایسا لگتا ہوں؟''

''یا پھر آپ اور بڑی چیز ہیں مثلاً انٹیلی جنس کے رکن اور ہماری جاسوسی کے لیے آئے ہیں؟''

بینسن نے ایک گہرا کش لے کر دھواں بکھیر دیا۔

''بتایئے نا...؟''

''آدھی حقیقت تو تم سمجھ ہی چکی ہو۔'' بینسن نے کہا۔ ''تو پوری ہی جان لو۔ میں ویسے بھی تمہیں اپنے اعتماد میں لینے والا تھا۔ مجھے یہاں احمد پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ وہ بری صحبت میں نہ پڑے۔''

''بری صحبت کا مطلب ہے...... میں اور پیٹرک؟''

''ہاں۔''

''اور یہ کام آپ کیسے کریں گے؟''

''میرا تجربہ ہے کہ ایسی خطرناک صورتِ حال میں دشمنوں کو اپنے ساتھ ملا لینا بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔''

''واہ...... ذرا تفصیل سے بتائیں مجھے۔''

''احمد کا باپ ایک چھوٹی سی صحرائی مملکت کا فرماں روا ہے۔ وہاں کی آبادی بھی بہت تھوڑی ہے۔ ان کا گزارہ اونٹوں کی افزائش اور کھجوروں پر ہے۔ کبھی کبھی وہ سونے کی اسمگلنگ میں بھی ملوث ہو جاتے ہیں لیکن اب وہاں تیل نکلنے کا قوی ترین امکان سامنے آیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کانٹریکٹ ہمیں ملے۔ عام حالات میں وہ ہمیں ہی ملے گا کیونکہ تیل کی تلاش کا کام بھی ہم نے ہی کیا ہے لیکن اگر احمد کو سزا ہوئی یا اسے یونیورسٹی سے نکالا گیا تو صورت حال بدل جائے گی۔''

''اور تم چاہتے ہو کہ میں احمد کو اچھا بچہ بننے کی تلقین کروں تاکہ تیل کمپنی دولت کما سکے؟''

''تیل کمپنی نہیں...... انگلینڈ۔''

''اب تم حب الوطنی کا ڈھول پیٹنا شروع کر دینا۔''

''یہ تو ہوگا، اب تیس سال پہلے کے جوانوں کے بارے میں سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے۔ ائرفورس میں جاتے تھے اور ان میں سے بیشتر اپنی مونچھوں سمیت جل مرے۔ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مرنے والے ہیں لیکن وہ ناخوش نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے کہ وہ وطن کی خاطر جان سے گزر رہے ہوتے تھے۔ تمہیں یہ سن کر ہنسی آ رہی ہوگی۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایلیا نے کہا۔ ''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ یہ ایسی بات ہے، جسے سن کر ہنسی بھی آ سکتی ہے اور رونا بھی۔ بات شاید محسوس کرنے کی ہے لیکن بہر حال یہ پچھلے زمانوں کی بات ہے اور اب وہ دن کہاں......''

''مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میں بڈھا ہو چکا ہوں میں تو نوجوانوں کے لیے سوچتا ہوں۔ ایسا بھی کیا کہ آدمی کی زندگی گزر جائے اور مرنے کے لیے ایک ڈھنگ کا مقصد

بھی نہ ملے۔ شاید یہی ان کی بے چینی کا سبب ہے۔"

"ہمارے پاس بھی ایک سبب، ایک نصب العین ہے۔"

"پرنسپل کے گھر پر پتھراؤ کرنا۔"

"آپ اس لہجے میں یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ ہماری بات سمجھ نہیں سکے۔ پرنسپل صاحب اپنی کھڑکیوں میں دوبارہ شیشے لگوا سکتے ہیں، کھڑکیوں کی مرمت کروا سکتے ہیں مگر اپنے پبلک امیج کو درست نہیں کر سکتے۔"

"کیوں بھئی، ان کے پبلک امیج میں کیا خرابی ہے؟"

"وہ فراڈ ہیں۔ یہاں دوسرے درجے کی بلکہ تیسرے درجے کی چیزیں بیچی جا رہی ہیں۔ پڑھائی کا معیار بہت خراب ہے۔ اسٹوڈنٹس گھر بیٹھ کر خود مطالعہ کر کے یہاں سے بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں اور ذہین طلبا یہی کرتے ہیں۔"

"تو راتوں رات معلم تو تیار نہیں کیے جا سکتے۔"

"یہ درست ہے لیکن دوسرے معاملات تو ٹھیک کیے جا سکتے ہیں۔ چالیس طلبا کے لیے یہاں ایک باتھ روم ہے، وہ بھی تنگ سا اور وقتاً فوقتاً وہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ دیواریں ایسی ہیں کہ تین کمرے دور سے آوازیں سنائی دیتی ہے جیسے اپنے کمرے میں گفتگو ہو رہی ہو اور کھانا...... ایسا کھانا کسی جیل میں کھلایا جائے تو دوسرے ہی روز بغاوت ہو جائے۔"

"تو تم یہ سب کیسے بہتر کر سکتی ہو؟"

"سادہ سی بات ہے، انتظام طلبا کی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ آپ کو شاید احساس نہیں یہاں ایسے لوگ بھی زیر تعلیم ہیں کہ جو یہاں نہ ہوتے تو کاروبار کامیابی سے چلانے میں دوسروں کی مدد کر رہے ہوتے۔ یہاں ایسی لڑکیاں ہیں جو شادی کر کے بڑی خوش اسلوبی سے گھر چلا رہی ہوتیں۔ بچے پال رہی ہوتیں اور یونیورسٹی والے ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے ہم بچے ہوں۔ یہ ہے ہماری جنگ...... اس رویّے کے خلاف جنگ جاری رہے گی۔ میں نہیں سمجھتی کہ ہم میں سے کوئی مارا جائے گا لیکن اس جنگ میں ہم بے آرام ضرور ہوں گے ممکن ہے کچھ زخمی بھی ہو جائیں۔"

"چلو اگر میں مان لوں کہ تم نے جو کچھ کیا ہے، کچھ مبالغے کے باوجود درست ہے تب بھی کیا ضروری ہے کہ احمد اس جنگ میں شامل ہو؟" بینسن نے کہا۔

"وہ اور پیٹ میکمان لیڈر ہیں۔ اب پیٹ جیل میں ہے احمد پیچھے ہٹ گیا تو ہمیں سب کچھ از سر نو کرنا ہوگا۔"

"تم خود کو کمتر سمجھ رہی ہو، وہ لیڈر نہیں ہیں، لیڈر تم ہو۔"

"اگر یہ سچ بھی ہے تو بھی میں اکیلی یہ سب نہیں کر سکتی۔" ایلیا نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہیں احساس ہے کہ اگر جنگ جاری رہی تو تمہیں صحیح معنوں میں مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ایک ناراض انتظامیہ سے بڑھ کر گندی جنگ کوئی نہیں لڑ سکتا۔"

"میں جانتی ہوں، یہ جنگ سخت بھی ہوگی اور گندی بھی۔ اسی لیے ایک سخت جان لیڈر کی ضرورت ہے۔ تو یہ ذمے داری آپ سنبھال لیں، کیا خیال ہے؟"

بینسن نے ایک گہری سانس لی۔ "میں اس لڑائی میں شامل ہی نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔

"لیکن آپ کو اس میں لطف آئے گا، ہے نا...؟ آپ کو معلوم ہے مجھے یہ احساس کب ہوا کہ آپ دوسرے پروفیسروں سے مختلف ہیں؟ جس وقت آپ ہٹلر کے متعلق باتیں کر رہے تھے کیا واقعی آپ ہٹلر سے ملے تھے؟"

"ہاں۔"

"کب؟"

"43ء میں روس میں۔ اس نے مجھے تمغا دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میری وہاں موجودگی کا مقصد اس کے طیارے میں بم فٹ کرنا تھا۔"

"یہ ہوئی نا بات، میں یہی تو کہہ رہی ہوں کہ ہمیں آپ جیسے لیڈر کی ضرورت ہے۔" ایلیا نے کہا۔ "آپ بلوا کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔"

☆☆☆

کالڈر ویلنگٹن فورڈ کی ایک عقبی سڑک پر واقع بار میں بیٹھا تھا۔ اپنی شخصیت، اپنے لباس اور عمر سے وہ غیر اہم آدمی لگتا تھا۔ اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوا اور وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔

بارش ہو رہی تھی۔ بار اندر سے بے حد گرم اور پرہجوم تھا۔ کالڈر وہسکی کے گھونٹ لیتا رہا۔ جس موٹے شخص کا وہ تعاقب کر رہا تھا وہ ایک گوشے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بیئر پیتے ہوئے وہ کبھی کبھی اپنی گھڑی میں وقت دیکھتا۔ نو بجے کے قریب بالآخر اس کا ملاقاتی آ گیا۔ وہ دبلا پتلا شخص تھا۔ دونوں بیٹھے چند منٹ باتیں کرتے رہے۔ پیکٹ کا تبادلہ اتنی نفاست اور رازداری سے ہوا کہ اگر کالڈر خصوصیت سے ان پر نظر نہ رکھے ہوتا تو اس کو بھی پتا نہ چلتا۔

پیکٹ ملتے ہی موٹا شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کانوں پر مفلر لپیٹا اور عام سے انداز میں بار میں موجود تمام

لوگوں کو گڈ نائٹ کہتے ہوئے بار سے رخصت ہو گیا۔ باہر سڑک پر تاریکی تھی۔ وہ سر جھکائے بارش سے بچتا بچاتا آگے بڑھتا رہا۔ اسے مطلق احساس نہیں تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اچانک کالڈر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو کالڈر نے بڑی مہارت سے اس کے حلق پر ایک نپا تلا ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ گرنے لگا تو کالڈر نے اسے سنبھالا اور اسے آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ پیکٹ اس کی جیب میں تھا جو اس نے اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ اس اثنا میں موٹے شخص نے کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ کالڈر نے سہارا دے کر اسے بٹھایا۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا مسٹر پوشنگ تو یہاں سے سیدھا گھر جاتا۔ اس موسم میں باہر رہنے سے زکام ہو جاتا ہے۔" کالڈر نے کہا۔

☆☆☆

یہ اس واقعے کے دو دن بعد کی بات ہے۔

"یہ مسٹر پوشنگ ہے کون؟" بینسن نے پوچھا۔

"اس کی تمباکو اور مٹھائی کی دکان ہے۔ یونیورسٹی کے پیچھے۔" کالڈر نے بتایا۔ "اس کے بیشتر گاہک طلبا ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں وہ مٹھائی اور سگریٹ سے کہیں زیادہ ضرررساں چیزیں فروخت کرتا ہے۔"

"منشیات؟"

"ہاں۔"

"بہت تباہ کن مال؟"

"نہیں میرا خیال ہے اس کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں۔ وہ بس سادہ افیم فروخت کرتا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے مال دینے والے کو دیکھ لیا تھا۔ میں اسے جانتا ہوں اس کا نام جو کیمسن ہے۔ میں اس کی اوقات جانتا ہوں۔"

"خطرناک بات ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔" بینسن نے کہا۔ "اب ارباب اختیار اس سلسلے میں کیا کریں گے؟"

"دیکھنا یہ ہے کہ پرنسپل کیا ایکشن لیتا ہے۔ پوشنگ تو بے حوصلہ آدمی ہے۔ اس نے چھ طلبا کی نشان دہی کر دی جو اس سے مال لیتے تھے۔ میں نے پرنسپل سے کہا تھا کہو تو پوشنگ کو ایسا ڈرا دوں کہ......"

"تو پرنسپل نے تمہاری بات نہیں مانی؟"

"دشواری یہ ہے کہ پوشنگ کے گاہکوں میں پیٹرک میکمان بھی ہے اور پرنسپل بہت منتقم مزاج آدمی ثابت ہو رہا ہے وہ یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

☆☆☆

پاؤں پھیلانے والے

شیخ سعید حلبی دمشق میں رہتے تھے۔ حاکم وقت سلطان ابراہیم پاشا کو ان سے ملنے کی آرزو تھی۔ ایک دن چنانچہ اطلاع دے کر انہیں ملنے کے لیے آ گیا۔ شیخ سعید حلبی اس وقت پاؤں پھیلائے اپنے شاگردوں کو درس حدیث دے رہے تھے۔ انہوں نے سلطان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے نظر اٹھا کر سلطان کی طرف دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اشارہ دینے کے بعد وہ پھر درس دینے میں مصروف ہو گئے۔ سلطان درس کے اختتام تک وہاں موجود رہا اور نہایت خاموشی سے درس سنا۔ حلبی واپس پہنچ کر ایک قاصد کے ہاتھ اس نے اشرفیوں کی ایک تھیلی شیخ سعید حلبی کی خدمت میں بھیجی۔ قاصد جب تھیلی لے کر ان کے پاس پہنچا تو آپ نے قاصد سے کہا کہ وہ تھیلی کس لیے لایا ہے۔ ہدیہ کے طور پر قاصد نے کہا۔ مجھے ان اشرفیوں کی ضرورت نہیں لہٰذا تم اسے واپس لے جاؤ شیخ سعید حلبی نے اس پر کہا۔ وہ کیوں؟ قاصد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ سلطان کو میرا اسلام عرض کرنا اور کہنا جو پاؤں پھیلاتے ہیں وہ ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ شیخ سعید حلبی کا جواب تھا۔

مرسلہ۔ محمد جاوید شبیر بربرہ، علی پور

"جی مس وارنی؟" پرنسپل کے لہجے میں گرم جوشی اور سرد مہری کا عجیب ترین امتزاج تھا۔ ایلیا وارنی اس کے لیے ایک بانی بھی تھی اور اس کا باپ یونیورسٹی کو عطیہ بھی دینے والا تھا۔

"میں پیٹ میکمان اور دوسروں کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"دوسرے کون؟"

"وہ جو افیم خریدتے رہے ہیں، بے وقوف لوگ۔"

"میں اس سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کروں گا۔" پرنسپل نے سرد لہجے میں کہا۔ "وہ قانونی طور پر جرم کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔"

"پولیس کا کہنا ہے کہ اگر آپ زور نہیں دیں گے تو وہ کیس نہیں بنائیں گے۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ میرے خیال میں یہ بات میرے اور ہوم آفس کے نمائندے کے درمیان ایک راز تھی جس نے اس معاملے کو بے نقاب کیا ہے۔"

''ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔'' ایلیا نے بات ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟''

''سمجھوتا؟''

''اگر آپ پولیس کو مقدمہ قائم کرنے سے روک دیں تو میں گارنٹی دیتی ہوں کہ اب یونیورسٹی میں بدامنی نہیں ہوگی۔''

پرنسپل کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ میں ایسی گھٹیا سودے بازی میں حصہ لے سکتا ہوں؟''

''وزیر صاحب آئندہ ہفتے لائبریری ونگ کا افتتاح کرنے آرہے ہیں۔ آپ یقیناً نہیں چاہیں گے کہ اس موقع پر کوئی گڑبڑ ہو۔ گڑبڑ ہوئی تو وزیر صاحب یہی سوچیں گے کہ آپ اچھے منتظم نہیں ہیں۔''

''تم نے مجھے غلط سمجھا ہے لڑکی۔'' پرنسپل نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ ''میں اچھا منتظم نہ ہوتا تو تمہاری بلیک میلنگ اور رشوت کے سامنے پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔ اب اٹھ جاؤ، مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔''

☆☆☆

''یعنی ہم تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔'' بینسن نے کہا۔

''لڑکی بہت اچھی ہے...... ناقابلِ فراموش۔'' کالڈر نے تبصرہ کیا۔ وہ پام کورٹ ہوٹل میں چائے پی رہے تھے جہاں کالڈر مقیم تھا۔

''اس میں کوئی شک نہیں، اس کی شخصیت بہت متاثر کن ہے۔'' بینسن نے تائید کی۔ ''اس کا باپ کروڑپتی ہے اور وہ انتہا پسند اور مخلص آئیڈیلسٹ۔ اسے پرنسپل بنا دیا جائے تو یہ ملک بھر کی مثالی یونیورسٹی بن جائے۔''

''لگتا ہے، تمہیں اس نے زیادہ ہی متاثر کردیا ہے۔''

''بے شک اور جانتے ہو اس نے فوراً ہی مجھے پہچان لیا تھا۔''

''وہ کیسے؟'' کالڈر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اس نے مشروط پیشکش کی کہ احمد کو احتجاجی طلبا کی قیادت سے ہٹا دے گی۔''

''اور شرط کیا تھی۔''

''شرط یہ تھی کہ میں احمد کی جگہ طلبا کی قیادت سنبھال لوں مگر میں باوجود اس کے کہ یوں ہمارے مسائل حل ہورہے تھے، میں یہ شرط نہیں مان نہیں سکتا تھا۔''

دونوں آرکسٹرا کی دھن سنتے رہے۔ بینسن تو کھوسا گیا، وہ ساتھ ساتھ گنگنارہا تھا اچانک اسے احساس ہوا کہ کالڈر نے اس سے کچھ کہا ہے۔ ''کیا کہا تم نے؟'' اس نے پوچھا۔ ''کچھ احمد کے بارے میں کہہ رہے تھے؟''

''میں کہہ رہا تھا کہ اب تمہیں احمد کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے باپ نے اسے وطن واپس بلا لیا ہے۔''

''وطن واپس......؟''

''اس کا یونیورسٹی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ فیصلہ پالیسی کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔''

''تمہیں کب معلوم ہوئی یہ بات؟''

''ابھی ایک گھنٹا پہلے۔''

''یہ پالیسی کا کیا مطلب ہوا؟'' بینسن الرٹ ہوگیا۔ ''صاف صاف بتاؤ، کیا معاملہ ہے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا گیا؟''

''میں خود بھی فیصلہ کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ تمہیں بتاؤں یا نہ بتاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں یہ سن کر غصہ آئے گا پھر میں نے سوچا چائے پی لو تو بتاؤں......''

☆☆☆

''سب سے پہلے تو ہم پیٹ سے اور دوسرے لڑکوں سے محروم ہوئے۔ وہ بے چارے تو اس وقت تک ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتے جب تک مقدمہ عدالت میں ہے اور اب احمد...... لعنت ہو، سب کچھ تباہ ہوکے رہ گیا۔''

وہ پہلا موقع تھا کہ بینسن نے ایلیا کی آنکھیں بھیگتے دیکھیں۔ ''میرا خیال ہے، یہ مناسب موقع ہے کہ میں تمہیں حکمت عملی پر لیکچر دوں۔'' بینسن نے کہا۔ ''تم نے پرنسپل کو صلح کی پیشکش کرکے غلطی کی تھی۔ اپنے حریف کو صلح کی پیشکش اس وقت کرنی چاہیے، جب آپ مضبوط پوزیشن میں ہوں۔''

''آئی ایم سوری مگر میری سمجھ میں نہیں......''

''جب آپ کو پے در پے نقصانات ہورہے ہوں، جب آپ سامنے سے دھکیلے جارہے ہوں، جب دونوں پہلوؤں سے آپ پر گولہ باری ہورہی ہو اور جب آپ کو عقب سے بھی خطرات لاحق ہوں تو آپ کے پاس صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے۔ آپ اٹیک کریں' یہی تمہیں کرنا ہے۔ تمام طلبا تمہارے پیچھے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ پرنسپل ہٹ دھرمی سے کام لے رہا ہے۔ پرنسپل اتنا زیادہ غیر مقبول کبھی نہیں رہا۔ بدھ کو وزیر صاحب یہاں آرہے ہیں۔ اس وقت پریس کی پوری قوت یہاں موجود ہوگی۔ یہ تم لوگوں کے لیے سنہری موقع ہے۔ دنیا کو یہ بتانے کا کہ تم لوگ پرنسپل کو کیا سمجھتے ہو؟''

''باتیں کرنا بہت آسان ہے، جانتے ہو ہمارا ہر ایسا رکن جو کچھ کرنے کی اہلیت رکھتا تھا، آؤٹ آف ایکشن ہے۔ اڑتالیس گھنٹے میں نئی کمیٹی تو نہیں تشکیل دی جاسکتی۔''

بینسن نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے کہا۔ ''تقاریر اسمبلی ہال میں ہوں گی۔ ڈائس کے عین اوپر ایک اٹاری سی ہے۔ میرا خیال ہے، چھت لکڑی کی یا پلاسٹر بورڈ کی ہے۔ اگر وہاں درست مقام پر ایک ٹریپ ڈور بنا دیا جائے......''

''میرے پاس افرادی قوت اور مناسب آلات ہوں تو میں درجنوں زبردست آئیڈے سوچ سکتی ہوں۔'' ایلیا بولی۔ ''اور تمہیں معلوم ہے کہ رات کے وقت اسمبلی ہال لاک کردیا جاتا ہے۔''

''میرا ایک دوست یہاں ویلنگٹن فورڈ میں مقیم ہے۔'' بینسن نے کہا۔ ''تالوں سے اس کی بڑی آشنائی ہے اور وہ ہر طرح کے ضروری آلات کا بندوبست بھی کرسکتا ہے۔''

''لیکن وہ ہماری مدد کیوں کرنے لگا؟ بلکہ تم بھی ایسا کیوں کرو گے؟''

''ہم دونوں ہی پرنسپل سے بے حد خفا ہیں۔'' بینسن نے کہا۔ ''اور جب ہم کسی سے ناراض ہوں تو اسے سزا دیے بغیر نہیں مانتے۔''

☆☆☆

بینسن اپنے چیف مسٹر فورٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ مسٹر فورٹ بولے تو ان کے لہجے میں ناپسندیدگی تھی۔ ''اس کا مطلب ہے بینسن کہ اس ناخوشگوار واقعے میں تمہارا ہاتھ تھا؟''

''جی ہاں، میں نے ہی اسے آرگنائز کیا تھا کالڈر کی مدد سے۔''

''اور اگر تم پکڑے جاتے تو؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس بات کا خیال رکھا۔'' مسٹر فورٹ پھر سامنے رکھی رپورٹ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ''اخبار میں لکھا ہے کہ پرنسپل اور وزیر صاحب پر اچانک ہی کالک اور راکھ کی برسات ہوگئی۔''

''ہم نے اس میں آٹا بھی ملایا تھا۔'' بینسن نے بتایا۔ ''اس کی وجہ سے ان کے حلیے نہایت عجیب ہوگئے۔''

''بلیک اینڈ وائٹ۔'' کالڈر نے لقمہ دیا۔

''اور اگر الزام اس لڑکی ایلیا وارنی پر لگا اور اس نے تمہارا نام لے دیا تو؟'' مسٹر فورٹ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اس کے خلاف ثبوت نام کی دھجی بھی نہیں ملے گی۔ وہ سامعین کی تیسری قطار میں بیٹھی تھی۔ ٹریپ ڈور کھلنے میں اس کا ہاتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔''

''اور ٹماٹر بھی اس نے نہیں پھینکے؟'' کالڈر بولا۔

''ٹماٹر؟ اخبار میں تو ٹماٹروں کا کوئی تذکرہ نہیں۔''

''کوئی بیس کے قریب طلبا تھے جنہوں نے ان پر ٹماٹر پھینکے اور ان میں سے کوئی پہلے کبھی احتجاجی سرگرمیوں میں ملوث نہیں رہا تھا۔''

ایسا لگا جیسے مسٹر فورٹ اس منظر کا تصور کررہے ہوں۔ ''راکھ، آٹا اور ٹماٹر جبکہ وزیر صاحب ذاتی وقار کا بہت خیال رکھنے والے آدمی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ محظوظ ہوئے ہوں گے۔''

''محظوظ کیا ہوتے وہ تو آدھے گھنٹے تک پرنسپل کو آگاہ کرتے رہے کہ اس کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے پرنسپل سے کہا کہ تمہارے اسٹوڈنٹ تمہارے قابو سے بالکل باہر ہیں۔ اس بات پر شرط لگائی جاسکتی ہے کہ پہلی فرصت میں نئے پرنسپل کا تقرر ہوگا۔''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ پرنسپل کا تذکرہ کرتے وقت تمہارے لہجے میں عناد ہوتا ہے، یہ ایک غیر معمولی بات ہے ایسا کیوں ہے؟''

''آپ کو معلوم ہے، اس نے احمد سے کیسے چھٹکارا پایا تھا؟''

''پوری طرح نہیں معلوم اور میں نے یہ خبر سن کر بس سکون کی سانس لی تھی کہ ہم لوگ شرمندگی سے بچ گئے۔ میں نے تفصیل معلوم ہی نہیں کی۔'' مسٹر فورٹ بولے۔

''پرنسپل نے احمد کے باپ کو ایک پیغام بھجوایا تھا۔'' کالڈر نے بتایا۔ ''یہ پیغام کہ اس کا بیٹا ایک یہودی لڑکی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ بات آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔''

''میری ذاتی رائے میں وہ محض آٹے، راکھ اور ٹماٹر کا مستحق نہیں تھا۔ اس پر تو کھولتا ہوا پانی پھینکا جانا چاہیے تھا۔'' بینسن نے رائے دی۔

مسٹر فورٹ چند لمحے اپنی کرسی پر جھولتے رہے' ان کی آنکھیں کہیں دور دیکھتی محسوس ہورہی تھیں پھر انہوں نے کہا۔ ''یہ تجربہ اس سے پہلے اس صدی کی تیسری دہائی کے اوائل میں کیا گیا تھا...... ایبرڈین یونیورسٹی میں پرنسپل کے الیکشن کے دوران اور بے حد کامیاب اور مؤثر ثابت ہوا تھا۔''

کالڈر اور بینسن حیرت سے انہیں دیکھتے رہے۔ ''تو آپ بھی......؟'' کالڈر نے کہا۔

مسٹر فورٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

محفلِ شعروسخن



❊ فریال گوہر......کراچی
اب اس کا نام درختوں پہ لکھتے پھرتے ہیں
ہم اس کو بھول رہے تھے وہ یاد جب آیا

❊ عاصم خان......سکھر
ڈوبتا جاتا ہے بے وصل چراغوں کا دھواں
پھیلتا جاتا ہے اک ہجر مسلسل جاناں
ہم سے کچھ تیرے مراسم ہی بڑے گہرے تھے
ورنہ صحراؤں میں رکتے نہیں بادل جاناں

❊ کوثر رضوی......حیدرآباد
رفتہ رفتہ میرے ہاتھوں سے لکیریں اڑ گئیں
قسمتوں کے بھید مٹھی میں بھی پوشیدہ نہ تھے

❊ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکرِ یار چلے

❊ رضوان تنولی کریڑوی......اورنگی ٹاؤن، کراچی
مقرر ہوں، نہ واعظ ہوں، نہ ساحر ہوں میں لفظوں کا
زبان بس ساتھ دیتی ہے میں باتیں دل سے کرتا ہوں

❊ عتیق الرحمٰن، عمران زیب......سمندری، فیصل آباد
میری آنکھوں میں آنسو تیرے دامن میں بہار
گل بنا سکتا ہے تو شبنم بنا سکتا ہوں میں

❊ محمد صفدر معاویہ......تحصیل وضلع خانیوال
درِزنداں پہ دستک آہستہ میری جان
دیوانے سو رہے ہیں شبِ غم گزار کر

❊ محمد حنیف گبول......ملتان جیل
اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

❊ سید عبادت کاظمی......ڈیرہ اسماعیل خان
یہ کس مقام پہ سوجھی تھی بچھڑنے کی
اب تو جاکے کہیں دن سنورنے والے تھے

❊ ریاض بٹ......حسن ابدال
اس دل کے آئینے میں بس عکس ہے تمہارا
اپنا ہمیں بنا لو پھر عید آگئی ہے

❊ رانا سجاد اختر......ملتان جیل
نہ حاکم اہلِ دانش ہیں نہ قابل اب رعایا ہے
ملیں اس ملک کو دانا ویبنا اک تمنا ہے
چمک جس کی سبھی کھوٹے کھروں سے بڑھ کے ہو عمدہ
نگینوں میں ہو ایسا اک نگینہ یہ بھی اک تمنا ہے

❊ جاوید شبیر بربرہ......علی پور، مظفر گڑھ
میرے محبوب کو نہ یہ کہنا
عید کا چاند لگ رہے ہو تم

❊ سید محی الدین اشفاق......فتح پور، لیہ
پھر پلٹ آئی ہیں ساون کی سہانی راتیں
پھر تیری یاد میں جلنے کے زمانے آئے

❊ فرح گل......درابن کلاں
تپتے صحراؤں پہ گرجا سردریا برسا
تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برسا
طنز ہیں سوختہ جانوں پہ گرجتے بادل
یا تو گھنگھور گھٹائیں نہ ہٹا یا برسا

❊ زاہد چودھری......چھور کینٹ
قربت بھی نہیں دل سے اتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا
آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتیں لہو سے
اور زخم جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

❊ محمد جاوید......تحصیل علی پور
یہ تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
یہ تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے

❊ مہر محمد عامر اسماعیل......حاصل پور، ضلع بہاولپور
محبتوں میں ہر اک لمحہ وصال ہوگا یہ طے ہوا تھا
بچھڑ کے بھی ایک دوسرے کا خیال ہوگا یہ طے ہوا تھا
بچھڑ گئے ہیں تو کیا ہوا کہ یہی تو دستورِ زندگی ہے
جدائیوں میں نہ قربتوں کا ملال ہوگا یہ طے ہوا تھا

❊ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
گزرا وقت اور بہتا دریا لوٹ کے پھر نہ آئے گا
نقش پا کیوں تکتے ہو، یہ ہوا چلی مٹ جائے گا
کچے رنگ سے کب تک اپنے دل پہ لکھو گے پیار کے گیت
دھوپ پڑے گی جب کاغذ پر تو سادہ رہ جائے گا

❊ احمد حسن عرضی خان......قبولہ بائی پاس
آنکھیں نم کر گیا بچھڑے محبوب کا خیال
وہ دیکھو دردِ دل دینے چلی آئی ہے عید

❊ غلام یاسین نوناری......چوک سرور شہید
نصیحت روز بکتی ہے عقیدت روز بکتی ہے
ہمارے شہر میں لوگو محبت روز بکتی ہے

❊ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
ایک وہ جن کیلئے طوفان کنارے بن گئے
ایک ہم ہیں جن کی قسمت میں کہیں ساحل نہ تھا

❊ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
اگرچہ رنج بہت ہے، پہ لب ہلیں گے نہیں
بس اک نظر تجھے دیکھیں گے کچھ کہیں گے نہیں
اس ایک پل کی رفاقت کو بھی غنیمت جان
تمام عمر ترے ساتھ ہم رہیں گے نہیں

❊ آسیہ نور......سکھر
لذت آوارگی بھی اس قدر محتاط تھی
گھر کی ویرانی کو پہلے باخبر کرنا پڑا
ہائے وہ لمحہ کہ جس میں اس سے ملنا تھا سلیم
ہم کو وہ لمحہ بھی اب وقفِ ہنر کرنا پڑا

❊ مدحت......کراچی
یہ فاصلہ جو ازل ہی سے درمیان کا ہے
زمیں سے کوئی تعلق تو آسمان کا ہے
تو خود ہی ٹوٹ پڑے گا طلسمِ خوش فہمی
یقیں کے شہر سے رستہ مرے گمان کا ہے

❊ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نئی منڈی سکھیکی
یوں بھی نہیں کہ میرے بلانے سے آگیا
جب رہ سکا نہیں تو بہانے سے آگیا

❊ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
یہ دل برا سہی سرِ بازار تو نہ کہہ
کچھ دیر آخر تو اس میں رہا بھی تو ہے

❊ شازیہ......کراچی
دور تک پھیلا ہوا اک واہمہ رہ جائے گا
تو نہیں ہوگا تو ان آنکھوں میں کیا رہ جائے گا

❊ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
ہر نظر سورج گزیدہ ہے بھلا دیکھے گا کون
دھوپ کی شدت ہے اب رنگِ صدا دیکھے گا کون
لوگ اونچا کر رہے ہیں ہر درودیوار کو
جو زمیں میں سو رہی ہے وہ بلا دیکھے گا کون

❊ کمال انور......چنیوٹ
میں سوچتا ہوں کہ سچ کب تلک نہ بولیں گے
گھٹن بڑھے گی تو خود ہی دریچہ کھولیں گے

❊ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن خانیوال
نہ جانے خود سے کیسے بنتی ہوگی
نفرت تجھے بے وفاؤں سے بہت تھی

❁ مدثر علی...... اسلام آباد

تم سانس کی مانند ہو میرے لیے
تجھے لیتے رہیں گے، جیتے رہیں گے

❁ عثمان انصاری...... نیوسینٹرل جیل ملتان

کیسے کہوں کہ میرے لیے کیا ہو تم
یقین کرو بہت خاص، بہت خاص ہو تم

❁ قاضی عرفان احمد عاجز...... آڑہ، چواسیدن شاہ

بدن سے روح جاتی ہے تو بجھ جاتی ہے صفِ ماتم
مگر کردار مر جائے تو کیوں ماتم نہیں ہوتا

❁ مونا رضوان...... کورنگی، کراچی

سوکھے پھول اور تتلی کو کل پھینکا اپنی کتابوں سے
جن لمحوں میں قید تھے سپنے ان کو بھی آزاد کیا

❁ حنا عروج...... کراچی

غیروں سے تو واقف تھے ہم، کھائی ہے اپنوں سے مات
دل کی بازی جان کے ہاری کچھ تھے ایسے ہی حالات

❁ ادریس احمد...... لاہور

بکتے ہوئے بازار میں ہم نے دیکھے رام محبت کے
گلی گلی میں شور ہوا جب گر گئے دام محبت کے

❁ محمد اعجاز...... حیدرآباد

بھول کے پہلی عورت کو دوجی سے کرے پیمان
گلی گلی پھرتے ہیں بچے باپ بنے انجان

❁ محمد زریان سلطان...... اردو بازار، کراچی

اپنوں نے تو مرے دکھوں کو کھیل تماشا سمجھا تھا
مل گئے مجھ کو چارہ گر بھی بیگانوں کی بستی میں

❁ سید احسن علی ...... سرگودھا

وہ مہروش جو آیا گھر میرے بن بلائے
یہ تو نے آج گردش چرخ بریں نئی کی

❁ احمد خان...... کوئٹہ

عشق کے باعث گنے جاتے تھے نادانوں میں ہم
ورنہ گنتے اپنے آگے کس کو دانائی میں تھے

❁ امتیاز علی...... پھالیاں

دل کھول کر نہ کرسکے ہم نالہ دفغاں
دھڑکا یہی رہا کہ وہ نازک دماغ ہے

❁ عاصم علی...... راولپنڈی

ابھی تو تمھیں سرطاقِ غم جلائیں نہیں
کہ تم نے عشق کیا تہمتیں اٹھائیں نہیں

❁ محمد ذوالفقار...... خانیوال

بدن کیا روح بھی قیدی ہوئی جاتی ہے میری
یہ آنکھیں وا ہوئیں یا وا درِ زنداں ہوا ہے

❁ مدثر...... منڈی بہاؤالدین

تصویروں کا روگ بھی آخر کیسا ہوتا ہے
تنہائی میں بات کرو تو بولنے لگتی ہیں

❁ بینش علی...... حیدرآباد

زندگی بھر کی شناسائی چلی جائے گی
گھر بسالوں گا تو تنہائی چلی جائے گی

❁ نعمان اعجاز...... ملتان

اک موج مرے سر سے یہ کہتی ہوئی گزری
ساحل سے تو اندازۂ طوفاں نہ کیا کر

❁ محمد حسن...... بہاولپور

سرپھری پاگل ہوا کی کس کو خواہش تھی بھلا
حبس کی شدت بڑھی تھی لوگ بے گھر ہوگئے

❁ فرحان علی...... میانوالی

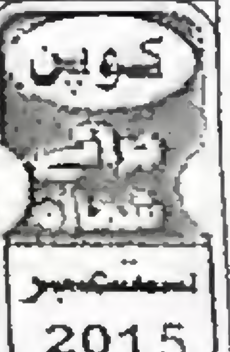
تجھ کو یہ ضد میں تری آنکھوں سے دنیا دیکھتا
اور مجھے خواہش ترے لب سے ادا ہونے کی تھی

❁ زینب...... فیصل آباد

کیسے عجیب لوگ تھے جن کے یہ مشغلے رہے
میرے بھی ساتھ ساتھ تھے غیر سے بھی ملے رہے

❁ کوثر منظور...... لاہور

تجھے بھلائیں کہ اب تیری آرزو کی جائے
یہ بات طے ہو تو پھر تجھ سے گفتگو کی جائے



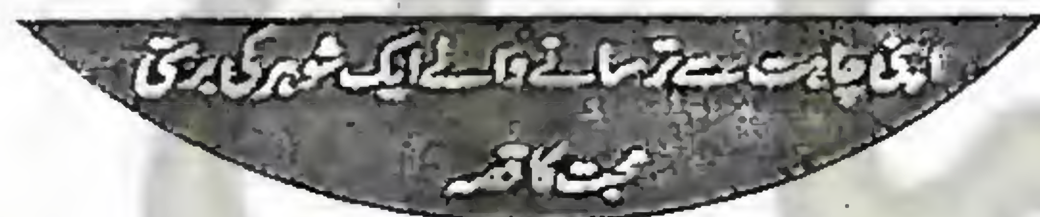
محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --



تہ در تہ شخصیت کا تذکرہ چھڑ جائے اور عورت کے روپ پر بحث نہ ہو اس کے بنا تو کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔ عورت ذات ہے ہی ایسی چیز جو کبھی زمین تو کبھی آسمان، کبھی بہار تو کبھی خزاں، کبھی یقین تو کبھی گماں کی صورت ڈھل کر دنیا کو حیران کرتی رہی ہے مگر پھر بھی اس کی حقیقت واضح نہیں ہوتی... یہی حال اس کا بھی تھا جو چلا تھا عورت کو آزمانے اور اس کا اصل روپ دیکھنے مگر بدقسمتی سے ایک ذرا جھلک دکھلا کر وہ ایسے نظروں سے اوجھل ہوئی کہ تاحیات وہ اس کی کھوج میں پہلو بدلتا رہ گیا کیونکہ... عورت واقعی ایک پہیلی ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔



رام دیال پورا بہروپیا تھا۔ اسے بھیس اور آواز بدلنے میں کمال حاصل تھا۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو وہاں اس کی اداکاری کی دھوم مچی رہتی تھی۔ اب سینما کی دنیا میں آیا تو ہر جانب اس کے چرچے تھے۔ کالج سے ڈگری لیتے ہی اسے بمبئی کی ایک فلم کمپنی میں اچھی جگہ مل گئی تھی۔ پھر جلد ہی اس کا شمار ملک کے بہترین اداکاروں میں ہونے لگا۔ لوگ اس کی اداکاری کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ اس کے پاس ذہانت تھی، وہ فنِ اداکاری کی باریکیوں کو خوب سمجھتا تھا اور فن کی بلندیوں کو چھونے کا آرزومند تھا۔ اس لیے وہ جو بھی کردار ادا کرتا، اس میں حقیقت کا رنگ بھر دیتا اور دیکھنے والے داد و تحسین کے



ڈونگرے برسانے لگتے۔

حال ہی میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ بمبئی کی ایک خوش حال بستی میں چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لے کر اس میں رہنے لگا تھا۔ ایک وقت تھا جب وہ ایسی کوٹھی میں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی مفلسی کا زمانہ تھا۔ اب وہ دولت میں کھیل رہا تھا۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ اس کی شادی بھی اونچے گھرانے میں ہوئی تھی۔ بیوی بھی خوب صورت اور خوش گفتار تھی۔ جس طرح بادل خشک اور پیاسی زمین پر برس کر اسے سرسبز کر دیتے ہیں، اسی طرح قدرت نے رام دیال کی مفلس زندگی کو بھی دھن کی بارش سے سینچ دیا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ سائے بڑھتے بڑھتے کسی بھیانک دیو کی طرح کائنات پر چھا گئے تھے۔ رام دیال لائبریری میں بیٹھا تھا۔ ابھی تک کمرے کی بتیاں نہیں جلی تھیں۔ وہ کھڑکی کے قریب کرسی رکھے ایک رسالہ پڑھنے میں مگن تھا۔

چپڑاسی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے بٹن دبا کر بلب روشن کر دیے۔ یکایک کمرا روشنی سے جگمگا اٹھا۔ رام دیال نے ایک نظر ملازم پر ڈالی، رومال سے عینک کو صاف کیا اور دوبارہ مطالعہ کرنے لگا۔ وہ ”نیا دور“ کا خواتین ایڈیشن تھا۔ وہ رسالہ تو اس نے یونہی اٹھا لیا تھا اور ورق گردانی کرتے ہوئے ایک مضمون پر اس کی نگاہ اٹک کر رہ گئی۔ اس کی سرخی خاصی دلچسپ تھی۔ اس نے مضمون کو پڑھنا شروع کیا تو پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ پورا مضمون اس نے پڑھ لیا۔ اس تحریر میں کسی اداکار کی سوانح حیات، اداکاری پر تبصرہ یا جائزہ پیش نہیں کیا گیا تھا۔ فن اداکاری پر کوئی نئی بات نہیں لکھی گئی تھی...... وہ ایک عام اور سیدھا سادہ مضمون تھا۔ جس میں عورت کی فطرت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ رام دیال کے لیے بالکل نئی بات تھی، جس میں لکھا تھا۔

”عورت محبت سے گندھی ہے۔ وہ اپنے ساتھ جڑے ہر رشتے کو اس کے حصے کی محبت دیتی ہے۔ وہ اپنے شوہر پر سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار رہتی ہے لیکن اگر اس کا شوہر اس کی محبت کو نظرانداز کرنے لگے، اس کی چاہت کو ٹھکرا دے تو موقع ملنے پر وہ محبت کی تشنگی دور کرنے کے لیے کوئی دوسری راہ تلاش کرنے لگتی ہے...... وہ دوسری چیزوں میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ خواہ وہ متحرک ہوں یا غیر متحرک، ذی روح ہوں یا بے روح...... یہی فطرت کا اصول ہے۔“

رام دیال اٹھا اور لائبریری سے باہر آ گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سڑک پر روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ وہ دل کی دھڑکن کی رفتار کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو اپنی اداکاری سے لاکھوں لوگوں کو متاثر کر دیتا ہے۔

اس کی بیوی ارملا بے مثال حسن کی مالک تھی۔ وہ کسی فنکار کے تخیل کا شاہکار تھی۔ آواز ایسی کہ جیسے شعلہ سا لپک جائے۔ فن گائیکی میں اس نے خاص مہارت اور صلاحیت حاصل کر لی تھی۔ یہ خوبی گویا سونے پر سہاگا تھی۔ وہ جب بھی ستار سنبھال کر بیٹھتی اور اس کی کومل انگلیاں تاروں کو چھیڑتیں تو خوابیدہ خیال انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتے اور سماعت کے ذریعے مٹھاس اور مستی کا گویا ایک دریا سامع کی نس نس میں بہنے لگتا۔ رام دیال اس پری جان سے فدا تھا اور وہ بھی گویا اس کی قربت میں جی اٹھتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے لیکن اب جانے کیوں اس چاہت میں کمی سی آنے لگی تھی۔ ظاہر ہے انسان میں مستقل طور پر ایک جذبہ اسی شدومد کے ساتھ کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ شاید رام دیال کی بے انتہا مصروفیت اس کا سبب تھی...... کوئی بھی وجہ ہو بہرحال ان کے درمیان پنپنے والا محبت کا پودا کملانے لگا تھا۔

ارملا نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھی رام دیال کا انتظار کر رہی تھی۔ سامنے والی کوٹھی میں کوئی شخص چلتا پھرتا نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ خالی پڑی کوٹھی آباد ہو گئی تھی۔ اس میں کوئی نیا کرایہ دار آ گیا تھا۔ وہ تجسس سے اس طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کے کان سیڑھیوں کی جانب لگے تھے۔ البتہ آنکھیں اس شخص پر گڑی تھیں جو بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ وہ کوٹھی کئی دنوں سے خالی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اس طرف کچھ ہلچل محسوس کرنے لگی تھی۔ بلب کی روشنی میں اس شخص کو بھی آتے جاتے دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بے چین ہے...... کوئی بے کلی ہے جو اسے بیٹھنے نہیں دیتی۔

گھڑی نے ٹن، ٹن، نو بجائے۔ سامنے والی کوٹھی میں روشنی گل ہو گئی۔ ارملا کو تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے ستار اٹھا لیا اور اس کی ملائم انگلیاں تاروں سے کھیلنے لگیں۔ دوسرے ہی لمحے فضا مدھر گیت سے جھومنے لگی۔

”سکھی ان نینن تو دھن ہارے......“

ایک درد تھا جو سر کی رتھ پر سوار ہو کر پھیل رہا تھا۔ لوچ اور لے تھی۔ سینے میں انتظار کی آگ تھی...... وہ گویا اپنے آپ میں ڈوب گئی، سروں میں منہمک ہو گئی۔ اپنی مدھر آواز کے سوز میں کھو گئی۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ رام دیال کب آیا اور کب سے دروازے سے ٹیک لگائے اس کی جانب دیکھے جا رہا ہے۔

وہ بے سدھ گاتی رہی۔ اس کی انگلیاں ستار کے تاروں پر رقص کرتی رہیں۔ اس کی نیم وا آنکھیں ستار پر جمی تھیں۔

سماعت ستار سے نکلنے والے سر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ رام دیال کی بھویں تنی ہوئی تھیں۔ وہ ایک دم پلٹا اور وہاں سے چلا گیا۔ کھانے کے کمرے میں آ کر اس نے ملازمہ سے کھانا منگوایا اور کھا کر سونے چلا گیا۔ ارملا گاتی رہی۔ وہ اپنے درد بھرے گیت سے تصور کو نبھا لی رہی...... ادھر وہ آیا اور چلا گیا۔ وہ اسی گویا اس کے آنے اور جانے سے بے خبر رہی...... اسے تو اپنی ہی خبر نہیں تھی۔

اگلے دن رام دیال صبح ہی گھر سے چلا گیا اور رات گئے تک واپس آیا۔ ارملا دوڑی دوڑی گئی اور پرات میں پانی لے آئی تا کہ اس کا منہ ہاتھ دھلوا سکے۔ رام دیال کے چہرے سے غصہ ٹپک رہا تھا۔

”آپ اتنی دیر کہاں رہے؟“

وہ خاموش رہا۔

ارملا نے پانی کا تسلہ آگے بڑھا دیا۔ گھر میں دو ملازمائیں تو تھیں، لیکن شوہر کی خدمت وہ خود کیا کرتی تھی۔ رام دیال شام کو جب گھر آتا تو وہ اس کا منہ ہاتھ دھلواتی۔ طشتری میں کچھ کھانے کو لاتی اور اسٹوڈیو کی خبریں پوچھتی۔

آج رام دیال نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ وہ چپ چاپ کھڑی اس کے گمبھیر چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کا دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا تھا۔ طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، اس خیال سے کہ وہ جواب میں جھڑک نہ دے۔ کبھی امید گدگدانے لگتی اور کبھی ناامیدی دامن تھام لیتی۔ جب انسان کے دل میں شک پیدا ہو جائے تو پھر اس کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ ناامیدی ہمدرد کی صورت میں قریب آ جاتی ہے...... ایسے میں امید سراب بن کر آنکھوں کے سامنے تحلیل ہو جاتی ہے۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”چپ رہو۔“

”سوامی......!“

”خاموش......! میں نے کہا نا، چپ رہو۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔“

ارملا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ناامیدی نے امید کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے قدم گویا زمین میں گڑ کر رہ گئے تھے۔ اسے کل کا واقعہ یاد آ گیا لیکن ایک معمولی سی بات پر اتنا غصہ، یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اسے تو اس بات پر خوش ہونا چاہیے تھا...... نہیں، یہ بات نہیں۔ اس سے ضرور کوئی دوسری بھول ہو گئی ہے، کوئی حکم عدولی سرزد ہوئی ہے...... ممکن ہے کسی سے جھگڑا ہو گیا ہو۔ اس کے دل میں مختلف اندیشے سر اٹھاتے رہے، اسے ہولاتے رہے۔ یکایک وہ آگے بڑھی اور اس کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے اپنا سر شوہر کے گھٹنوں پر رکھ کر دھیرے سے بولی۔

”مجھ سے انجانے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معاف کر دیں۔“

رام دیال نے اسے بری طرح جھٹک دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ارملا خود کو سنبھال نہ سکی اور بری طرح سے فرش پر ڈھے گئی۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا سونے کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ارملا بہت دیر تک اسی طرح پڑی آنسو بہاتی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک معمولی سی بات پر وہ اپنے شوہر کی نظروں سے گر جائے گی۔ رام دیال کے اس رویے کو دیکھ کر ارملا کے دل میں اس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات سر اٹھانے لگے۔ اس نے آج تک شوہر کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے رام دیال کی... معمولی سی بات کو بھی اہمیت دی تھی۔ اس کا ہر حکم بجا لاتی تھی، سر آنکھوں پر رکھتی تھی...... پھر یہ اہانت کیوں؟

اس کے دل میں شک ابھرا کہ کوئی اداکارہ ان کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول رہی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنی اس سوچ پر شرم آنے لگی۔ وہ محض شک کی بنیاد پر ایسا سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے بارے میں ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتی تھی...... تو پھر وہ اپنے شوہر سے اس کی اداسی اور اس رویے کا سبب ہی کیوں نہ پوچھ لے؟ کیا وہ اتنا بھی حق نہیں رکھتی؟

یہ سوچ کر وہ اٹھی۔ اسے اپنے وجود میں عجیب سی قوت لہریں لیتی محسوس ہوئی۔ وہ جائے گی...... اپنے شوہر سے اس غصے اور ناراضی کا سبب پوچھ کر رہے گی...... اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی جب تک کہ وہ سب کچھ بتا نہیں دیتا...... یا اپنی بانہوں میں لے کر یہ نہ کہہ دے۔ ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔“

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی رام دیال کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ارملا کو آتا دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا اور کڑک کر بولا۔

”کیوں آئی ہو یہاں؟ نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ جا کر سو جاؤ۔ مجھے تنگ مت کرو۔“

”میرا قصور......“

”میں کہتا ہوں چلی جاؤ۔“

ارملا دم بخود سی کھڑی رہ گئی۔ جیسے کسی جادوگرنی نے اس کے سر پر جادو کی چھڑی پھیر کر اسے پتھر کا بنا دیا ہو۔ قوت اور

خوداعتمادی جو کچھ دیر قبل وہ محسوس کر رہی تھی، سب ہوا ہوگئی۔ خواہش کے باوجود وہ مزید کچھ نہ بول پائی۔ اداسی کا سبب پوچھنا...... اس بے وجہ غصے کا گلہ کرنا...... اپنے قصور کی معافی مانگنا۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ تصورات کے شاندار محل پل بھر میں زمیں بوس ہوگئے۔

وہ چپ چاپ واپس چلی آئی اور رو رو کر تکیہ بھگوتی رہی۔ نیند نہ جانے کہاں جا سوئی تھی۔

وقت کو پنکھ لگا کر دن اڑتے گئے۔ رام دیال اب گھر میں بہت کم آتا تھا۔ ارملا کی خدمت کے لیے دو ملازماؤں میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ ان سے تنگ آگئی تھی۔ اسے کسی کی خدمت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو محبت کی بھوکی تھی۔ اس کی زندگی کا باغ محبت کے پھول سے خالی تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا گویا ساقی کی چال چل رہی تھی۔ باہر کہیں سے پپیہے کی آواز آرہی تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا۔ ارملا کے دل میں خوشی اور امنگ کے بجائے افسردگی کی ایک لہری سی دوڑ گئی۔

اس نے ایک گہری سانس لی، اٹھی اور ستار سنبھال لیا۔ سر بکھرنے لگے۔ موسم پر گویا نشہ سا طاری ہونے لگا۔ اس کی آواز میں درد تھا، غم تھا اور جلن تھی۔ وہ اپنے احساسات میں ڈوبی گاتی رہی۔ اسے بیرونی دنیا کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اچانک سامنے والی کوٹھی سے جیسے کسی نے ستار کی آواز کے جواب میں گانا شروع کر دیا ہو۔

''پیا بن چین کہاں من کو......''

گیت ختم ہوگیا۔ فضا میں چھایا ہوا جادو ٹوٹ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑکی میں آگئی۔ اس نے دیکھا، وہ شخص ستار پر ہاتھ رکھے بڑے انہماک سے اس کا گانا سن رہا تھا۔

ارملا کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کامرانی کی سنسنی! اس لمحے وہ رام دیال، اس کی محبت، اس کی جدائی...... سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں بس ایک ہی خیال بس گیا تھا کہ اس نے ایک دوسرے راگی کو مات دے دی ہے۔

اس کے بعد روزانہ دونوں طرف سے گیت اٹھتے اور فضا میں بکھر جاتے۔ دو دکھی انسان، تنہائی کے شکار، دو فنکار سنگیت کے ذریعے ایک دوسرے سے ہمدردی ظاہر کرتے۔ دل کا درد گیتوں کی زبانی ایک دوسرے کو سنایا کرتے۔

ایک مہینا اور بیت گیا۔ کمپنی ایک نئی فلم تیار کر رہی تھی۔ ان دنوں رام دیال کو رات میں بھی کام کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ کئی کئی راتیں اسٹوڈیو ہی میں گزار دیتا۔ اتنے دنوں میں وہ صرف ایک بار گھر آیا تھا۔ ارملا کا دل دھڑک اٹھا...... پہلے اور اب دل کے دھڑکنے میں کتنا فرق تھا۔ پہلے وہ اس خوف سے کانپ اٹھتی تھی کہ رام دیال کہیں اس سے خفا نہ ہو جائے۔ اب وہ اس خدشے سے مری جا رہی تھی کہ کہیں شوہر اس کے دل کی بات نہ جان لے۔ کہیں وہ رات بھر رہ کر ان کے سنگیت ربط میں خلل نہ ڈال دے۔

اکتوبر کا آخری ہفتہ تھا۔ رام دیال گھر آیا۔ ارملا میں اتنا حوصلہ بھی نہ تھا کہ شوہر سے نظریں ملا سکتی۔ وہ اس کے سامنے بھی نہ گئی۔ رام دیال نے اسے بلوایا بھی نہیں۔ وہ ملازمہ سے صرف اتنا کہہ کر چلا گیا۔

''میں مزید ایک ماہ تک گھر نہیں آسکوں گا۔ فلم کے کچھ سین دوبارہ شوٹ ہونے ہیں۔''

جب وہ چلا گیا تو ارملا نے سکون کی سانس لی۔ جیسے اس کے دل سے کوئی بوجھ سا ہٹ گیا ہو۔ وہ کوئی ایسا ہمدرد چاہتی تھی جس کے سامنے اپنا محبت بھرا دل کھول کر رکھ دے۔ رام دیال وہ نہیں تھا۔ وہ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ پانی بلندی کی طرف نہیں جاتا، نشیب ہی میں بہتا ہے۔ رام دیال بلندی پر کھڑا تھا اور ''وہ'' شخص نیچے، اس کی پہنچ میں تھا۔ ارملا کا دل اس کی طرف بہہ چلا۔

اس دن ارملا نے دل سے گایا۔ آج اس کے گیت میں مٹھاس تھی۔ جس میں اداسی کی جگہ خوشی، امنگ اور جوش ہلکورے لے رہا تھا۔ اب وہ کمرے میں بیٹھ کر گانے کے بجائے باہر برآمدے میں بیٹھ کر گایا کرتی تھی۔ دونوں کی تانیں ایک دوسرے کی تان سے مل کر رہ جاتیں۔ ان کے دل تو کب کے مل چکے تھے۔

شام کا وقت تھا۔ ارملا لان میں ٹہل رہی تھی۔ اس کی نگاہیں رہ رہ کر سامنے والی کوٹھی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اس وقت ارملا کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لے رہی تھی کہ وہ شخص اس کے لان میں آجائے اور وہ اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دے۔

ارملا کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ تنہا رہتا ہے لیکن کبھی اس نے دن کے وقت اسے نہیں دیکھا تھا۔ دھوپ اپنا وجود کھو چکی تھی۔ رات کا دھندلکا ڈوبتے سورج کی لالی میں دھیرے دھیرے حلول کر رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، پودے جھوم رہے تھے اور ارملا کے دل کو کچھ ہوا جا رہا تھا۔ کچھ گدگدی سی ہو رہی تھی۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور گنگنانے لگی۔ دھیرے دھیرے یہ گنگنانا گیت کی شکل اختیار کر گیا اور وہ پوری آواز سے گانے لگی۔ اپنی مدھر آواز اور گیت کی دھن میں گم سی ہوگئی۔ باغیچے کی قد آدم فصیل کی دوسری جانب سے ایک سایہ آہستہ قدموں سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ارملا اس سے....

بے خبر گاتی رہی۔ یکایک ایک کپکپاتے ہوئے ہاتھ نے اس کے کندھے کو چھوا..... اس کی آواز میں لرزش سی پیدا ہوئی اور وہ خوفزدہ سی ہو کر خاموش ہو گئی۔

''آپ خوب گاتی ہیں۔''

ارملا نے بیٹھے بیٹھے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک خوب صورت اور قوی شخص تھا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ بال کافی لمبے اور بنگالی فیشن سے کٹے ہوئے تھے۔ اس نے سلک کا کرتہ اور لاچا پہنا ہوا تھا۔ ارملا نے کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لیا اور دل ہی دل میں خود سے کہا۔ ''بھاگ چل۔''

لیکن اس کا وجود گویا کسی ان دیکھے حصار میں تھا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکی۔ پنچھی جال کے قریب تھا، دانہ سامنے تھا۔ گرفتار ہونے کی دیر تھی۔

''آپ کے گلے میں جادو ہے۔''

ارملا نے نظریں اٹھائیں، اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ وہ بھی مسکرایا۔

''یہ آپ کا حسن سماعت ہے۔ میں تو آپ کے قدموں میں بیٹھ کر کچھ سیکھ سکتی ہوں۔''

وہ ہنسا۔

''آپ اکیلے رہتے ہیں؟'' ارملا نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اور آپ کی بیوی؟''

وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''میری بیوی.....؟ میری بیوی کہاں ہے۔ فی الحال تو میں اس سنسار میں تنہا ہی ہوں۔ ایک ٹھکرایا ہوا انسان ہوں۔ اب یہاں آ گیا ہوں۔ کوئی مجھے پوچھنے والا نہیں۔ کوئی مجھ سے بات کرنے والا نہیں۔''

اس کی آواز میں لرزش تھی۔ ارملا نے دیکھا، اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ مایوسی اور ناامیدی کی ایک ہلکی سی ریکھا وہاں صاف دکھائی دیتی تھی۔ یکایک اس کے دل میں ہمدردی کی لہر سی پیدا ہوئی اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

وہ اس کے قریب بنچ پر بیٹھ گیا۔ ارملا اب تک بیٹھی ہی تھی۔ وہ ایک دم کھسک کر اس سے کچھ دور ہو گئی۔ اس میں اٹھنے کی ہمت اب بھی نہیں تھی۔

اس شخص نے ارملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ارملا کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ نوجوان کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی تھی۔ وہ ارملا کا ہاتھ تھامے رہا اور بولا۔

''میرا خیال تھا کہ میں یہاں آ کر تنہائی میں گا کر اپنا دل بہلایا کروں گا۔ میرے پاس دولت اور مال وزر کی کمی نہیں لیکن اس سے مجھے چین نہیں ملتا۔ دولت سے سکون نہیں خریدا جا سکتا..... میرا دل بے چین رہتا ہے۔ اس لیے میں ستار بجاتا تھا۔ اس کے تاروں سے نکلنے والی جھنکار میرے دل کو سکون پہنچاتی تھی..... لیکن اب تو ستار بھی بے بس ہو گیا ہے۔ وہ بھی مجھے سکون نہیں پہنچاتا۔ اب ستار بجا کر بھی میرے دل کی بے کلی نہیں جاتی۔''

ارملا سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس نے پھر اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ نوجوان نے نہایت محبت اور عقیدت سے اس کے ملائم ہاتھ کی پشت کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ ارملا کے پورے وجود میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور اندر کی طرف بھاگی۔

''پھر کب درشن ہوں گے؟''

ارملا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور پلنگ پر گر کر رونے لگی۔ پنچھی جال میں پھنس چکا تھا اور اب آزاد ہونے کے لیے پھڑپھڑا رہا تھا۔

وہ دیر تک روتی رہی۔ اسے رہ رہ کر اپنے شوہر کی سنگدلی کا خیال آتا۔ جو کچھ ہوا تھا، اس کا خیال ہی اس کے دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔ وہ اس راستے پر نہیں چلنا چاہتی تھی۔ پچھتاوے کی آگ اسے جلائے دے رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر آ جائے۔ اس کے پاس بیٹھے، محبت کی باتیں کرے اور وہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر اتنا روئے، اتنا روئے کہ اس کا پتھر دل پانی ہو جائے۔

وہ اٹھ کر رام دیال کی لائبریری میں چلی گئی۔ ایک چھوٹی سی میز پر نفیس سے فریم میں اس کی تصویر رکھی تھی۔ ارملا نے اسے اٹھایا اور کافی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

رام دیال کے قدموں کی چاپ نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ اٹھی اور بڑی لگاوٹ کے ساتھ اپنے شوہر کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ آنسو بہا کر گویا اس کا دل صاف ہو گیا تھا۔ اب اس کے دل میں خالص محبت لہریں لے رہی تھی۔ وہ کچن سے ایک تسلے میں پانی اور تولیا لے آئی اور رام دیال کے روبرو جا کھڑی ہوئی۔ اس کی نظریں شوہر کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ اس کا دل امید کے تار سے بندھا ڈول رہا تھا۔ اس نے دیکھا رام دیال نے تسلا لے کر منہ دھو لیا اور پھر اسے کچھ ناشتا لانے کو کہا۔ جب وہ مٹھائی لے آئی تو رام دیال نے طشتری لینے کے بجائے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کے منہ میں مٹھائی کا ٹکڑا رکھ دیا۔ لمحے بھر کے لیے اس کی روح تک ناچ اٹھی..... اس نے چونک کر سر اٹھایا اور دیکھا رام دیال اسی طرح بیٹھا ہے اور وہ اسی طرح تسلا تھامے کھڑی ہے۔ اس کا تصور اس کی خواہشات سے کھیل رہا تھا۔ امید کا تار ٹوٹ گیا۔ خیالوں میں بسی تخیل کی دنیا بھسم ہو گئی۔ حقیقت اس کے سامنے تھی۔ دل پارہ پارہ کر دینے والی حقیقت۔

رام دیال نے ہاتھ جھٹک کر اشارے سے اسے جانے کا کہا۔ وہ چپ چاپ کٹھ پتلی کی طرح مڑی اور بے جان قدموں سے واپس چلی گئی۔ جیسے وہ عورت نہیں بلکہ کسی کے اشاروں پر چلنے والی بے جان مورت ہو۔ اپنے کمرے میں آ کر پانی کا تسلا انگیٹھی پر رکھا اور فرش پر لیٹ کر سسکنے لگی۔ نمناک آلود اور ٹھنڈی زمین سے اسے کچھ اپنایت کا احساس ہوا۔ وہ اس سے لپٹ کر خوب روئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی عزیز ترین ہستی کی آغوش میں سمٹ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہو۔

وہ کئی دن تک اپنے کمرے میں بند رہی۔ رام دیال ملازمہ سے کہہ گیا تھا کہ وہ مزید پندرہ دن کے لیے باہر جا رہا ہے اور گھر نہیں آ سکے گا۔ لہٰذا وہ گھر اور مالکن کا خیال رکھے۔ ارملا کو اپنے شوہر کی بے رحمی پر رونا آتا تھا۔ وہ پاپ کی ندی میں بہے جا رہی تھی اور اس کا شوہر اسے بچانے کے لیے ہاتھ تک نہ ہلاتا تھا۔ ایک بھیانک آگ تھی جو اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی اور اس کا شوہر بے فکر اور لاتعلق سا کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔

سامنے والی کوٹھی سے مسلسل ستار کی آواز آتی تھی۔ گیت بھی بلند ہوتے تھے۔ اب ان میں خوشی اور امنگ کی تانیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے گیت کی صورت میں درد کائنات میں پھیل رہا ہو۔ ارملا کی روح تڑپ اٹھتی لیکن وہ کمرے سے باہر نہ نکلتی۔

شام کا وقت تھا۔ سامنے والی کوٹھی سے گیت بلند ہوا جو ارملا پر قیامت ڈھا گیا۔ اس کا ایک ایک لفظ ارملا کے دل میں چبھا جا رہا تھا۔ وہ اٹھی اور ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس کا ستار بے کس بھکاری کی طرح ایک طرف پڑا تھا۔ اس پر مٹی کی ہلکی سی تہ جم گئی تھی۔ اس نے اسے کپڑے سے صاف کیا اور ہیجان کی سی کیفیت میں اسے چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے۔ سامنے والی کوٹھی سے آنے والے گیت کے بول اس کی سماعت سے مسلسل چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔

''کیوں روٹھ گئے ہم سے.....''

ارملا نے ایک گہری سانس لی اور اس کی انگلیاں ستار کے تاروں پر تھرکنے لگیں۔ بے خودی میں وہی گیت اس کے ستار سے نکلنے لگا۔

''کیوں روٹھ گئے ہم سے.....''

وہ گویا ستار کی دھن سے بندھا کھنچا چلا آ رہا تھا۔ وہ کوٹھی سے نکلا اور لان سے ہوتا ہوا تھوڑا دم باندھ کو پھلانگ کر ارملا کے لان میں آ گیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ ستار بجاتی رہی اور یہ اس کی دھن پر گاتا رہا۔ دونوں فن کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ اس نے شاید اس سے پہلے اتنا اچھا نہ گایا ہو..... اور ارملا نے بھی شاید اس سے پہلے اتنا اچھا ستار نہ بجایا ہو۔ گیت کی لے اور ستار کی جھنکار، دونوں ایک ہو کر گویا روٹھے ہوئے دلوں کو محبت کی راہ دکھا رہے تھے۔

گیت ختم ہو گیا۔ ستار خاموش... اور ارملا اس کی بانہوں میں تھی۔ اس طرح نہ جانے کتنے لمحے بیت گئے۔ یکایک ارملا کے وجود میں لرزش سی ہوئی اور وہ گویا چونک کر کسی خواب سے بیدار ہو گئی۔ اس نے خود کو چھڑایا اور اندر کی طرف بھاگنے لگی۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... دوسرے ہاتھ سے اپنی وگ نیچے کو..... لمبے بالوں کی وگ بھی الگ کر لی۔

شام کے دھندلکے میں ارملا نے دیکھا وہ اپنے شوہر کے سامنے بیٹھی ہے۔ وہ ہنس رہا تھا۔ ارملا کے چہرے پر موت کی زردی پھیل گئی۔

''دیکھا ہمارا بہروپ ارملا!'' رام دیال کے لہجے سے کامرانی کی خوشی جھلک رہی تھی۔ اس نے ارملا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اس نے بیوی کو یہ نہیں بتایا کہ وہ اب تک یہ ناٹک اس لیے رچائے ہوئے تھا کہ ''نیا دور'' میں شائع ہونے والے مضمون کی حقیقت جاننا چاہتا تھا۔

''میرا ہاتھ چھوڑیے۔'' ارملا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''بیٹھو تو سہی.....''

''میں ابھی آئی۔'' ارملا ہاتھ چھڑا کر اوپر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

چند لمحے بیت گئے۔ رام دیال گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ارملا کے کمرے سے آنے والی ایک چیخ سے ٹوٹا۔ وہ اوپر کی جانب دوڑا۔ کمرے میں پہنچ کر دیکھا ارملا آگ کا گولا بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک بار چیخی ضرور تھی مگر اب خاموشی سے جل رہی تھی۔ رام دیال کانپ اٹھا اور اس کی دھاڑ سے پورا مکان گونج اٹھا۔ ''ارملا.....!''

اس نے ارملا کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

شمشان میں ارملا کا سوختہ وجود دوبارہ آگ کی گود میں رکھا تھا۔ رام دیال بت بنا بیٹھا ٹکٹکی باندھے شعلوں کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے پاگل پن اور عورت کی فطرت کی اس پہیلی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔





محی الدین نواب

اکیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

[illegible] کا ایک دل ربا سلسلہ



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر و اور چاچی منی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا، محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی ممنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہو گئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب میرا اور جگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو گیا کہ مرینہ ماروی کو جام تمارو کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرا لیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مر جاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر گوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ مراد مرینہ کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ رابعہ خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے ہاں پہنچا دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر میمی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آ گیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کروا کے اسے اپنا چہرہ دے دیا۔ اب یوں عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ دشمن مراد کو بونا دیکھ کر چکرا گئے۔ ماروی کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروا دی اور ایک انجکشن لگوا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ اب اس کے پاس نہ اپنا چہرہ تھا اور نہ پرانی یادداشت۔ اس کی یادداشت تھوڑی دیر کے لیے آئی تھی تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر میمی سن کے بیٹے ایمان سے ہو گئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتا دیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھگانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ لندن ایئرپورٹ پر میکی پر حملہ ہوا اور اس کا ایک بیٹا مارا گیا۔ مارنے والے نے اپنا نام مراد بتایا۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا۔ مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد نے دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر لیا، مراد انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا۔ میڈونا ایمان علی کے ساتھ اسکیٹنگ کرنے آئی ہوئی ہے۔ ایسے میں مراد وہاں پہنچ کر میکی کو دھمکی دیتا ہے کہ تیری بیٹی گئی۔ میکی پریشان ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میکی براؤن کی تو کھوپڑی گھوم کر رہ گئی تھی۔ یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ مراد یوں اچانک اسکیٹنگ لوکیشن میں اس کی بیٹی کے پاس پہنچ جائے گا۔

اس نے فوراً ہی سیکیورٹی افسر سے فون پر پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟ میڈونا کہاں ہے؟ اس کمینے نے ابھی فون پر کہا ہے کہ وہ میری بیٹی کے پاس پہنچ گیا ہے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اسکیٹنگ لوکیشن میں بے بی کے ساتھ ہیں۔ میں دوربین سے دیکھ رہا ہوں' بے بی مزے سے اسکیٹ کرتی ہوئی، ایک فلیگ سے گزر کر دوسرے فلیگ کی طرف جا رہی ہے۔ ہمارے چھ مسلح گارڈز اس کے آس پاس ذرا فاصلہ رکھ کر اسکیٹ کر رہے ہیں۔ ایمان علی بھی اس کے ساتھ ہے۔“

میکی نے چیخ کر کہا۔ ”میں یقین کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے میڈونا کی بات کراؤ۔ وہ دشمن جھوٹ نہیں بولے گا۔ وہ میری بیٹی کے قریب ہی ہے۔“

سیکیورٹی افسر نے کہا۔ ”سر! آپ اطمینان رکھیں' ہمارے چھ گارڈز بے بی کے ساتھ اسکیٹ کر رہے ہیں۔ ایسے وقت کسی کے پاس فون نہیں ہوتا۔ آپ اس وقت بے بی سے بھی رابطہ نہیں کر سکیں گے۔ وہ سب ہماری آوازوں سے، ہماری پہنچ سے دور ہیں۔“

میکی بے بسی سے بیٹھ گیا۔ اسکیٹنگ کا پورا ایک راؤنڈ ختم ہونے کے بعد ہی بیٹی سے فون پر بات ہو سکتی تھی۔

اُدھر کھیل شروع ہو گیا۔ چیپٹ راؤ کے ایک ماتحت نے برف پر پھسلتے ہوئے ایک گارڈ کے قریب پہنچتے ہی اس کی ٹانگ میں زور کی اسٹک ماری۔ اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ اچھل کر پشت کے بل برف کی سطح پر گرا۔ برف کی سختی نے ریڑھ کی ہڈی کے بارہ بجا دیے۔ پاؤں کے نیچے سے ایک تختہ نکل گیا۔ وہ نشیب میں لڑھکتے ہوئے جانے لگا۔

دوسرے دو گارڈز نے اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھی۔ وہ ذرا دور تھے۔ اس ماتحت کو پکڑنے کے لیے اُدھر جانے لگے۔ مراد نے جیکٹ کی جیب کے اندر سے گولی چلائی۔ کوئی آواز نہیں ابھری۔ وہ دونوں گارڈز زخمی ہو کر گر پڑے۔ وہ بھی لڑھکتے ہوئے دور تک چلے گئے۔

مراد اسی لیے سب سے پیچھے تھا۔ اپنے ماتحتوں کو تحفظ دینے کے لیے گن چلا رہا تھا۔ اس نے پچھلی رات ایمان علی سے فون پر کہہ دیا تھا کہ وہ اسکیٹنگ کے دوران میڈونا سے پیچھے رہے گا اور جیسے ہی اشارہ ملے گا تو وہ گر پڑے گا۔

اس نے یہی کیا تھا۔ دوڑ لگانے کے دوران ہی میڈونا سے پیچھے ہو گیا تھا۔ اس نے دو گارڈز کو گولیاں کھا کر گرتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ مراد وہاں ان کے آس پاس ہے۔

اسی وقت مراد نے میڈونا کے بالکل قریب پہنچ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”میرے قریب رہو۔ دشمن کی گولی تمہاری طرف نہیں آئے گی۔“

وہ ویسے ہی بری طرح سہمی ہوئی، اپنے تین گارڈز کے بعد ایمان علی کا بھی انجام دیکھ چکی تھی۔ وہ برف میں گر کر لڑھکتا ہوا دوسری سمت چلا گیا تھا۔ باقی تین گارڈز اپنی اپنی گن نکالے اس کی طرف آ رہے تھے۔ مراد نے چیخ کر کہا۔ ”گولی نہ چلانا، بے بی ماری جائے گی۔ جاؤ دشمنوں کو روکو۔“

میڈونا نے بھی یہی بات دہرائی۔ وہ تینوں گارڈز ان ماتحتوں سے الجھنے لگے۔ ان کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ پھر وہ ماتحت پلاننگ کے مطابق دوسری سمت بھاگنے لگے۔ اس طرح مراد کے دوست اور دشمن سب اس سے دور ہو گئے۔

وہ میڈونا کے ساتھ اسکیٹ کرتا ہوا آخری نشیبی فلیگ کے پاس آ کر رک گیا، پھر بولا۔ ”تم دیکھ رہی ہو، میرے پاس گن ہے۔ اگر دشمن ہوتا تو قریب آتے ہی گولی مار دیتا۔“

وہ اس سے لپٹ کر بولی۔ ”میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گی۔“

وہ انعام تو دے ہی رہی تھی۔ اس برفانی علاقے میں

کمبل ہو گئی تھی۔ مراد کو یوں لگا جیسے آگ کا شعلہ لپٹ گیا ہو۔ وہ فوراً ہی اسے الگ کرتے ہوئے بولا۔ ''اب بھی کوئی گولی کہیں سے آسکتی ہے۔ وہ سامنے پولیس اسٹیشن ہے۔ وہاں چلو۔''

انہوں نے تختوں سے پاؤں نکال لیے۔ وہ بولی۔ ''میں ننگے پاؤں نہیں چل سکوں گی۔ پلیز مجھے وہاں تک اٹھا کر لے چلو۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اس کے پیروں کو دیکھا۔ جوتے نہیں تھے۔ صرف اسکیٹنگ کی جرابیں تھیں۔ وہ آگ سے دور رہنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے سوچا۔ ''مرد کو خواہشات سے زیر نہیں ہونا چاہیے۔ میں اتنا کمزور نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ایمان کی قوت ہے۔''

یہ سوچتے ہی اس نے ایک ہاتھ سے اسے اٹھا کر اپنے شانے پر لاد لیا اور کسی بھی غلط جذبے سے عاری ہو کر وہاں سے تن کر جانے لگا۔ وہ اچانک سحر زدہ سی ہو گئی۔ ''کیا مرد ایسے ہوتے ہیں۔ ایک چٹکی میں اٹھا کر لے جاتے ہیں؟ ''کل میں نے ایمان علی سے کہا تھا' مجھے بازوؤں میں اٹھاؤ۔ ضد کرنے پر اس نے دونوں بازوؤں میں اٹھایا تھا پھر بیڈ پر چھوڑ دیا تھا۔ ہائے وہ کمی یہ پوری کر رہا ہے۔ کیسا پتھر جیسا سخت ہے۔''

وہ پٹری بدل رہی تھی۔ نیت بدل جائے تو مرد بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایمان علی اس کے ذہن سے واش آؤٹ ہو گیا۔ مراد چشم زدن میں اس کے اندر کھلبلی پیدا کرنے لگا۔

اس نے پولیس اسٹیشن کے اندر آکر اسے کاندھے سے اُتار دیا۔ فائرنگ اور زخمی ہونے والوں کی خبریں وہاں تک پہنچ گئی تھیں۔ آفیسر سپاہیوں کے ساتھ اسکیٹنگ کے میدان کی طرف گیا تھا۔ جونیئر آفیسر نے مراد کا بیان لکھا۔

میڈونا نے باپ کو کال کی۔ اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ''باپ کی جان! خیریت سے ہو؟ وہ دشمن تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے؟''

''پتا نہیں پاپا! کون تھا وہ دشمن...... ہمارے گارڈز ہاتھی کے دانت ہیں' صرف دکھانے کے لیے۔ مجھے تو ایک جوان نے بچایا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو آپ ابھی بیٹی کی آواز نہ سنتے۔''

''تھینکس گاڈ! کون ہے وہ جوان؟ مجھ سے بات کراؤ۔''

میڈونا نے مراد کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاپا سے بات کرو۔''

مراد نے فون کو لے کر کان سے لگایا۔ دو جانی دشمن ایک کال کے ذریعے قریب آگئے۔ اس نے کہا۔ ''ہیلو فرمائیے؟''

اس نے پوچھا۔ ''بیٹے! تم کون ہو؟ تم نے میری بیٹی کو ایک بہت ہی خطرناک دشمن سے بچایا ہے۔ میں تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں گا۔ اب میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ اس خطرناک دشمن سے کوئی بچ نہیں پاتا۔ تم نے اس کا مقابلہ کیسے کیا ہے؟ کیا تم نے اس کی صورت دیکھی ہے؟''

''میں روز ہی اپنی صورت دیکھتا ہوں۔''

''میں تمہارے نہیں، اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم اسے کہیں دیکھ کر پہچان سکو گے؟''

''نہیں، اس نے منہ پر مفلر لپیٹا ہوا تھا اور آنکھوں پر اسنو گوگلس تھا۔ چہرہ چھپا ہوا تھا۔''

''پلیز بتاؤ تم نے اس کا مقابلہ کیسے کیا تھا؟''

''میں آپ کی بیٹی کو بچانے کے لیے قریب آرہا تھا۔ وہ دشمن گن نکال چکا تھا۔ آپ کی بیٹی کو گولی مارنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی میں نے اپنی اسٹک اس کے پاؤں پر ماری۔ اس کے قدم اکھڑ گئے۔ ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ وہ لڑھکتا ہوا نشیب کی طرف جانے لگا۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''شاباش! تم نے اسے گولی کیوں نہیں ماری؟''

''اسے گولی مارنے سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ پہلے آپ کی بیٹی کے لیے ڈھال بن جاتا۔ میں ڈھال بن کر ہی اسے بحفاظت پولیس اسٹیشن تک لے آیا ہوں۔ اب آپ آکر اسے اپنی حفاظت میں لیں اور مجھے جانے دیں۔''

''میں وہاں نہیں، سسلی میں ہوں۔ تم میری میڈونا کو چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ تمہاری دلیری کہتی ہے کہ وہ دشمن تمہارے ہی ہاتھوں مارا جائے گا، تم میڈونا کے ساتھ رہو۔ مجھ سے جتنی رقم چاہو گے، تمہیں دیتا رہوں گا۔''

''نہ میں رقم کا محتاج ہوں اور نہ ہی کسی کا باڈی گارڈ بن کر رہنا چاہتا ہوں مگر ہاں شملہ میں میرے لیے رہائش کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ یہ مسئلہ حل کر دیں گے تو......''

وہ فوراً ہی بات کاٹ کر بولا۔ ''مسئلہ حل ہو گیا سمجھو۔ میری بیٹی کے ساتھ ایک بہت ہی مہنگے اور آرام دہ کاٹیج میں رہو۔ اسے قائل کرو کہ وہ جلد سے جلد وہاں سے باپ کے پاس چلی جائے۔ اسے کسی طرح بخیریت میرے پاس بھیج دو۔ اس کے بعد بھی میں تم سے دوستی رکھوں گا۔ میں نے کہا نا مجھے یقین ہو گیا ہے، تم ہی میرے اس بدترین دشمن کو ہلاک کر سکو گے۔''

مراد نے کہا۔ ''وہ کون ہے، میں نہیں جانتا اور نہ ہی

خواہ مخواہ اس سے دشمنی مول لوں گا۔ میری یہ کمزوری ہے کہ میں کسی عورت پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ میڈونا پر ظلم کرنے والا تھا اس لیے میں اسے بچانے آگیا۔ آئندہ ایسے کسی جھمیلے میں نہیں پڑوں گا۔''

اس نے ''جسٹ اے منٹ'' کہہ کر ذرا چپ رہ کر سوچا۔ عقل میں یہ بات آئی کہ بیٹی کو وہیں شملہ میں رہنا چاہیے۔ وہ وہاں رہے گی تو مراد اس پر حملے کرتا رہے گا اور یہ جوان اسے بچانے کے لیے اس سے مقابلہ کرتا رہے گا۔ مراد ضرور اس کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

پھر اس نے فون پر کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں تم سے نہیں کہوں گا کہ تم کسی جھمیلے میں پڑو۔ صرف اتنا کرو کہ جب تک میڈونا وہاں ہے اس کے ساتھ کاٹیج میں رہو۔ اسے ایک جانی دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہ جاؤ۔''

''یہ مجھے منظور ہے۔ جب تک میڈونا یہاں رہے گی، میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ وہ دشمن کتنے پانی میں ہے۔ میں اسے قریب نہیں آنے دوں گا۔''

''تھینکس، مینی مینی تھینکس۔ فون میڈونا کو دو۔''

مراد نے فون اسے دیا۔ اس نے بڑی حکمتِ عملی سے اپنا بھاؤ بڑھا کر دشمن کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ آئندہ اس کی بیٹی کی رگ جاں کے قریب رہنے والا تھا۔

میڈونا نے فون پر پوچھا۔ ''یس پاپا! اس جوان سے معاملہ طے ہو گیا؟ میں نے ابھی تک اس کا نام نہیں پوچھا ہے۔''

میڈونا نے یہ کہتے ہوئے مراد کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''میرا نام عادل نواز ہے۔ میں یہاں گرمیوں کا موسم گزارنے آیا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''پاپا! اس کا نام عادل نواز ہے۔''

وہ بولا۔ ''بیٹی! تم نے کہا تھا کہ مراد عورتوں پر حملہ نہیں کرتا ہے۔ تم نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دشمن کم ظرف ہے۔ اس کا کوئی اصول نہیں ہے۔ شکر کرو، عادل نواز تمہاری سلامتی کے لیے آگیا ہے۔''

''کیا یہ میرے ساتھ رہے گا؟''

''ہاں تم عادل نواز سے ذرا دور جاؤ۔ میں کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''او کے پاپا!'' وہ فون بند کر کے پولیس افسر سے بولی۔ ''واش روم کہاں ہے؟''

سپاہی نے کہا۔ ''آپ میرے ساتھ آئیں۔''

وہ اس کے ساتھ آفس سے نکل کر عمارت کے ایک حصے میں آئی۔ وہاں واش روم کے اندر پہنچ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر باپ سے فون پر بولی۔ ''ہاں بولیں۔ میں اکیلی ہوں۔''

باپ نے پوچھا۔ ''یہ عادل نواز دیکھنے میں کیسا ہے؟''

''او پاپا! ویری ویری ہینڈسم، میں تو اس کی طرف کھنچی جا رہی ہوں۔''

''اور وہ ایمان علی......؟''

''وہ، کیا بتاؤں؟ اسے دیکھتے ہی وہ دل سے اتر گیا ہے۔ اس سے کیسے پیچھا چھڑاؤں؟''

''تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ میں تمہارے بدلتے ہوئے مزاج کو سمجھتا ہوں، ابھی حکم دیتا ہوں۔ وہاں کے تمام گارڈز اسے تمہارے قریب نہیں آنے دیں گے۔ اگر وہ سیدھی طرح واپس چلا جائے گا تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے گولی مار کر کہیں پھینک دیا جائے گا۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''تھینک یو پاپا! آئی لو یو۔''

''یہ بات سمجھ لو کہ اسے تم سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے بڑی حکمتِ عملی سے اسے تمہارے ساتھ رہنے پر راضی کیا ہے۔ اب اسے اپنی طرف جھکانا تمہارا کام ہے۔ اسے کبھی بھی طرح اپنا لائف پارٹنر یا باڈی گارڈ بناؤ۔ وہیں شملہ میں رہو۔ مراد تم پر حملہ کرنے آتا رہے گا تو عادل نواز کے ہاتھوں ضرور مارا جائے گا۔''

''او کے پاپا! میں عادل کے پاس جا رہی ہوں...... بائی۔''

وہ مراد کے پاس آگئی۔ وہاں انسپکٹر کے آفس میں اس کے مسلح گارڈز آگئے تھے۔ اس نے مراد سے کہا۔ ''میں بہت خوش ہوں۔ پاپا نے کہا ہے تم میرے ساتھ کاٹیج میں رہو گے، چلو ہماری گاڑی آگئی ہے۔''

وہ اٹھ کر اس کے ساتھ آفس سے باہر آتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے سے پہلے کچھ ضروری باتیں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ میری باتوں پر عمل کرو گی تو ساتھ رہوں گا۔ ورنہ چلا جاؤں گا۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں اتنی محبتیں دوں گی کہ تم کہیں جانا بھول جاؤ گے۔''

''میری پہلی شرط یہی ہے کہ محبت نہیں کرو گی۔ نہ جسمانی تعلق کی خواہش رکھو گی۔ میں ابھی زیادہ نہیں بولوں گا۔ کار میں گارڈز ہماری باتیں سنیں گے۔ اہم باتیں کاٹیج میں پہنچ کر ہوں گی۔''

وہ اس کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے وقت بھی اس نے فاصلہ رکھا تھا۔ اس کا سخت رویہ میڈونا کو مایوس کر رہا تھا لیکن اسے اپنے حسن و شباب پر بڑا ناز تھا۔ اسے

یقین تھا کہ وہ رفتہ رفتہ اسے اپنا اسیر بنالے گی۔

وہ کالج کے احاطے میں پہنچ گئے۔ وہاں احاطے کے باہر اور اندر کئی مسلح گارڈز نظر آرہے تھے۔ کالج کے اطراف رنگ برنگے پھولوں کا باغیچہ تھا۔ وہ دونوں کالج کے اندر آگئے۔ گارڈز باہر رہ گئے۔ مراد تھکے ہوئے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میڈونا اسی صوفے پر قریب آکر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''پولیس اسٹیشن میں تمہاری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ تم کیا بول رہے تھے؟''

وہ وہاں سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر جاکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہی کہہ رہا تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔ ہم ایک صوفے پر بھی قریب ہوکر نہیں بیٹھیں گے۔''

''ہائے تم کتنے نیک اور پارسا ہو۔ مجھے ایسے ہی آئیڈیل کی تلاش تھی، جو حسین عورتوں کو لفٹ نہ دیتا ہو۔ میں نے تمہارے جیسے پارسا کے انتظار میں اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہے۔ کسی کو میں نے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دی۔''

''میں نے اسکیٹنگ گراؤنڈ میں تمہیں اپنے یار کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہاں تم اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''پلیز مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ تم کیسی زندگی گزار رہی ہو۔ مجھے اتنی عقل ہے کہ تازہ کھانا ملتا ہو تو باسی کو منہ نہیں لگانا چاہیے۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''تم مجھے منہ نہ لگانے کی بات کررہے ہو۔ میری انسلٹ کررہے ہو۔''

''میرا نیک مشورہ ہے کہ میرا خیال دماغ سے نکال دو۔ پھر انسلٹ محسوس نہیں ہوگی۔''

''تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ میں تمہیں ٹھکراتی ہوں۔ دور ہوجاؤ میری نظروں سے......''

''تمہارے باپ کو زبان دے کر آیا ہوں۔ وہ بولے گا کہ چلا جاؤں تو چلا جاؤں گا۔''

وہ باپ سے فون پر رابطہ کرنے لگی۔ مراد نے اسے اور طیش دلانے کے لیے کہا۔ ''کتنا بھی غصہ دکھاؤ، پھر سے کنواری بن نہیں سکوگی۔ ہمیشہ آبرو باختہ کہلاؤ گی۔''

وہ حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے بولی۔ ''یو شٹ اپ۔''

اسی لمحے میں باپ سے رابطہ ہوگیا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم مجھے شٹ اپ کہہ رہی ہو؟''

وہ چیخ کر بولی۔ ''میں اس مغرور کو کہہ رہی ہوں۔ یہ میری انسلٹ کررہا ہے۔ کہتا ہے، میں کنواری نہیں ہوں۔ اپنی آبرو لٹا چکی ہوں۔ پاپا! اسے ابھی یہاں سے نکال دیں۔''

وہ پریشان ہوکر بولا۔ ''میڈونا! تم اپنے ذاتی معاملے میں میرا کام بگاڑ رہی ہو۔ میں انتظار کررہا ہوں کہ مراد جلد ہی عادل نواز سے ٹکرائے گا۔ میرا دل کہتا ہے، اس بار مراد مارا جائے گا لیکن تم دوسرے مسئلے میں میری پلاننگ کو ناکام بنارہی ہو۔ اپنا فون اسے دو۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا فون آگے بڑھادیا۔

''کیا تم اسے غصہ دلارہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''سوری، میری نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ میں آدھے گھنٹے بعد باتیں کرسکوں گا۔''

وہ فون بند کرکے کالج کے مختلف حصوں کو دیکھنے لگا۔ پھر ایک کمرے میں جاکر اس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ میڈونا دور ہی دور سے اسے دیکھتی ہوئی پیچھے جارہی تھی۔ جب اس نے ایک کمرے کا دروازہ بند کرلیا تو اس نے فون پر باپ سے کہا۔ ''آپ ایک غلط آدمی پر بھروسا کررہے ہیں۔ جو آپ کی بیٹی کی عزت نہ کرتا ہو، وہ آپ کا دوست نہیں، دشمن ہی ہوگا۔''

''میڈونا! مجھے اس سے دوستی نہیں کرنی ہے۔ بس ایک بار اسے مراد سے ٹکرانے دو۔ جس طرح دوسرے مارے گئے ہیں، اسی طرح وہ بھی مراد کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اس کے مرنے سے ہمارا کچھ نہیں جائے گا اور اگر مراد اس کے ہاتھوں مارا جائے گا تو تمہارے باپ کو بیٹھے بٹھائے ایک بہت ہی خطرناک دشمن سے نجات مل جائے گی۔''

پھر وہ ذرا سرگوشی میں بولا۔ ''ہم یہودی ہیں۔ ان مسلمانوں سے ہمارا گٹھ جوڑ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ جس دن یہ مراد کو ہلاک کرے گا، اسی دن میرے گارڈز اسے جہنم میں پہنچادیں گے۔ میں اپنی بیٹی کی انسلٹ کرنے والے کو وہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔''

''پاپا! آپ کی چال سمجھ میں آگئی ہے۔ بس میں یہی چاہتی ہوں کہ یہ یہاں سے زندہ نہ جائے۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟''

''اپنی انسلٹ برداشت کرو۔ کچھ دنوں تک تماشا دیکھو کہ مراد یا عادل میں سے کون زندہ رہے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے عادل تمہارے سامنے مارا جائے گا۔''

''تھینک یو پاپا......!''

''بس غصہ تھوک دو اور اس سے دوستی کرو۔''

''آل رائٹ پاپا...... یہی کروں گی۔''

وہ بند کمرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کی یہی کوشش

ہوتی تھی کہ ایک وقت کی بھی نماز قضا نہ ہونے پائے۔ وہ دعا مانگنے کے بعد وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ اسی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے سوچا میکی براؤن کال کررہا ہے۔ فون اٹھا کر نمبر پڑھنے سے معلوم ہوا ایمان علی پکار رہا ہے۔

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہاں بولو؟''

اس نے پوچھا۔ ''اکیلے ہو؟''

''ہاں، کوئی آس پاس نہیں ہے۔''

''یار! میرے ساتھ عجیب تماشا ہورہا ہے۔ گارڈز نے مجھے کالج میں جانے سے روک دیا ہے۔ میرا سامان باہر لاکر کہہ دیا ہے کہ آئندہ ادھر نہ آؤں۔ میڈونا نے مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا ہے۔ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنی سلامتی چاہتا ہوں تو آج ہی دہلی واپس چلا جاؤں۔ تم بولو کیا کروں؟''

''چپ چاپ دہلی چلے جاؤ۔ یہ انٹرنیشنل بدمعاش ہیں، ان کے منہ نہ لگو۔''

''یار! یہ تو زیادتی ہے۔ میں میڈونا کے ساتھ کچھ اور راتیں گزارنا چاہتا تھا۔''

''تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہورہی ہے۔ تم بھی ایک حسن سے کھیلتے ہو، پھر اسے چھوڑ کر دوسری کی طرف چل دیتے ہو۔ میڈونا بھی تمہارے ساتھ یہی کررہی ہے۔''

''کیا تمہاری طرف لڑھک گئی ہے؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو، میں ایسی دل پھینک عورتوں کو دیکھتے ہی لاحول پڑھتا ہوں اور ان سے دور بھاگتا ہوں۔ تمہیں بھی سمجھاتا ہوں۔ بہت عیاشی کرچکے۔ اب نمازیں پڑھو۔''

''وہ تو پڑھتا ہوں۔''

''جب دل چاہتا ہے یا ضرورت کے وقت خدا یاد آتا ہے تو پڑھ لیتے ہو۔ سچ بولو، کل سے اب تک میڈونا کے ساتھ رہ کر ایک وقت کی بھی نماز پڑھی؟''

''وہ یار! بات یہ ہے کہ وہ یہودی حسینہ ہے۔ دل نے کہا اس کی چھت کے نیچے نماز نہیں پڑھوں گا۔ دوسرے دن کسی مسجد میں جاؤں گا۔''

''بس آگے نہ بولو۔ میں نے اسی یہودی حسینہ کے کالج میں ابھی نماز پڑھی ہے۔ دل میں خدا کا خوف رکھو پھر خود ہی عبادت کی طرف مائل ہوتے رہو گے، بہر حال میں زیادہ لیکچر دینا نہیں چاہتا۔ یہاں سے آج ہی چلے جاؤ۔ آئندہ مجھے فون نہ کرنا۔ میں اپنے فون سے تمہارے نمبر ڈیلیٹ کررہا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ وہاں سے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر آیا تو میڈونا سامنے کھڑی تھی۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ ''عادل......! میں سوری کہتی ہوں۔''

مراد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''جب تم نے کہا کہ میں کنواری نہیں ہوں تو مجھے غصہ آگیا اور میں نے غصے میں تمہارے احسان کو بھلادیا۔ آج تم میری جان نہ بچاتے تو میں کب کی مرچکی ہوتی۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔''

وہ ذرا قریب ہوکر بولی۔ ''پلیز میں نے غصے میں جو بھی کہا ہے، اسے بھول جاؤ۔ مجھے معاف کردو۔''

''تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ تم اعتراف کررہی ہو۔ معافی مانگ رہی ہو۔ میں کھلے دل سے معاف کرتا ہوں۔''

''تھینک یو عادل! تم بہت اچھے ہو۔''

وہ اور قریب آکر بولی۔ ''میں اور قریب نہیں آؤں گی۔ تم فاصلہ رکھنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔''

''ایسی سمجھ داری سے رہو گی تو میں تمہارے دشمن کو خاک میں ملانے تک یہاں رہوں گا۔''

وہ دل میں بولی۔ ''اسی لیے تو پھر سے دوستی کررہی ہوں۔ دشمن کو خاک میں ملانے کے بعد تم بھی مٹی میں مل جاؤ گے۔''

پھر اس نے کہا۔ ''جس کمرے میں تم نے عبادت کی ہے، اب اسی میں رہا کرو گے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، گارڈز کو حکم دو گے تو ضرورت فوراً پوری ہوگی۔''

ایک گارڈ نے آکر کہا۔ ''لنچ تیار ہے۔ میز پر آجائیں۔''

وہ ڈائننگ ٹیبل پر آگئے۔ میڈونا نے اس کی طرف ایک ڈش بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم واقعی پارسا ہو؟ تم نے کبھی کسی حسینہ میں دلچسپی نہیں لی ہے؟''

اس کے تصور میں ماروی آگئی۔ وہ اسے بڑے جذبے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بس ایک ہی ہے۔ تم نے پوچھا اور وہ نگاہوں کے سامنے آگئی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تم کسی کے پکے عاشق ہو؟''

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ ''ہاں، مگر یہ عشق یک طرفہ ہے۔ وہ مجھے گھاس نہیں ڈال رہی ہے۔''

''تعجب ہے۔ تمہارے جیسے ہینڈسم اور اسمارٹ جوان سے دل نہیں لگا رہی ہے۔ کیا بہت مغرور ہے؟''

''ہاں، مگر اس کے خلاف کچھ نہ کہنا۔ اس مغرور کی ہر ادا میرے دل کو بھاتی ہے۔''

''اوگاڈ! اس کے غرور سے بھی محبت ہے۔ پھر تو واقعی

اس کے سچے عاشق ہو۔ یہ بتاؤ اس کے لیے پاگل ہو تو پھر اس سے دور یہاں کیوں آئے ہو؟''

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ گرمیاں گزارنے اِدھر آئے گی۔ اسی لیے یہاں آیا ہوں۔''

''کیا وہ شملہ میں ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہوں گی۔''

اس نے دل میں کہا۔ ''میری ماروی تو دل میں رہتی ہے۔ اسے کیسے دکھا سکوں گا؟''

پھر اس نے کہا۔ ''مجھے نظر آئے گی تو تمہیں ضرور دکھاؤں گا۔ کل یہاں آکر اسے تلاش کیا، وہ نظر نہیں آئی۔ ابھی لنچ کرکے باہر جاؤں گا پھر اسے تلاش کروں گا۔''

وہ لنچ کے بعد کالج سے باہر آگیا پھر سڑک کے کنارے چلتا ہوا وہاں سے بہت دور آکر اس نے چمپت راؤ سے فون پر کہا۔ ''میں اس وقت ہنومان مندر کی طرف جا رہا ہوں۔ آجاؤ۔''

''ابھی پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ چمپت راؤ نے کہا۔ ''میں دور سے دیکھ رہا تھا۔ تم میڈونا کے ساتھ اس کے کالج میں گئے تھے۔ کیا اس کا اعتماد حاصل ہو گیا ہے؟''

''اس کے باپ کا بھی اعتماد حاصل کر چکا ہوں۔ اسے یقین ہے کہ اس کا دشمن مراد میرے ہی ہاتھوں مارا جائے گا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ہاتھوں تمہیں مار ڈالنے کے فریب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یار...! تم بڑی اچھی چال چل رہے ہو۔ آگے کیا ارادہ ہے؟''

مراد نے ایک ذرا سوچنے کے بعد کہا۔ ''اب تم مرینہ سے رابطہ کرو۔ اس سے بولو کہ آج کسی وقت میڈونا پر حملہ کرے۔ میں پھر اسے بچاؤں گا۔ پھر میکی براؤن کا اعتماد مستحکم ہوگا کہ میں مراد علی منگی پر بھاری پڑ رہا ہوں۔''

اس نے مرینہ کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہوتے ہی وہ بولی۔ ''چمپت راؤ تم کہاں ہو؟ کیا مراد نے تم سے رابطہ کیا ہے؟''

''نہیں، میں نے یہی پوچھنے کے لیے تمہیں کال کی ہے۔ اس نے تم سے یا ماسٹر کوبوبو سے رابطہ کیا ہوگا۔''

''مجھ سے تو نہیں ماسٹر سے کیا تھا۔ اس نے ماسٹر سے کہا ہے کہ وہ یہاں شملہ میں ہے۔ یہ بات مرینہ کو یعنی مجھ کو اور چمپت راؤ کو نہ بتائی جائے۔ وہ ہم سب سے چھپ کر میکی براؤن کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ ماسٹر نے اسے سمجھایا ہے کہ وہ کم از کم مجھ سے نہ چھپے۔ میرے ساتھ رہ کر دشمنوں پر زیادہ بھاری پڑے گا لیکن پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے' اس نے ماسٹر کی بات ٹال دی ہے۔''

وہ انجان بن کر بولا۔ ''کیا واقعی...؟''

مرینہ نے کہا۔ ''میں حیران ہوں کہ ماسٹر اس کی خودسری ... اور گستاخی برداشت کر رہا ہے؟''

''تم ماسٹر کوبوبو کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ صرف اپنا کام نکالنا جانتا ہے اور مراد پر اسے بھروسا ہے کہ وہ میرے اور تمہارے بغیر یہاں بھی میکی براؤن پر بھاری پڑے گا۔''

''وہ یہاں ہے تو میں ضرور اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔''

''اگر آج صبح کلفری کے اسکیٹنگ... گراؤنڈ میں جاتیں تو ضرور اسے پکڑ لیتیں۔ میں نے سنا ہے وہاں میڈونا کے چھ باڈی گارڈز تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا ہے اور دو زخمی ہوئے ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ مراد نے ہی یہ دلیری دکھائی ہے۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''او گاڈ! وہ اکیلا فائٹ کر رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں گھیرا جائے گا۔ مارا جائے گا۔''

وہ ذرا رُک کر بولی۔ ''اگر وہ اس لیے مجھ سے دور ہو گیا ہے کہ مجھے اپنی منکوحہ نہیں بنانا چاہتا ہے تو نہ بنائے۔ میں اس کی سلامتی چاہتی ہوں۔ وہ مجھ سے صرف دوستی ہی رکھے، یہ بات اسے کیسے سمجھاؤں؟ مجھے غصہ آرہا ہے۔ اس نے فون کی سم بدل دی ہے، اس سے باتیں کیسے کروں؟''

''ایک راستہ ہے۔ میڈونا پر آج کسی وقت حملہ کرو۔ وہ بھی میڈونا کی تاک میں کہیں آس پاس ہوگا۔ وہ بھی اسے نقصان پہنچانے کے لیے حملہ کرے گا تو تم اسے پہچان لوگی۔''

''ہوں...... ٹھیک کہتے ہو۔ وہ کسی وقت بھی کالج سے نکلے گی تو ضرور اس پر حملہ کروں گی۔''

''میرے ماتحت دن رات اس پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ جب بھی کالج سے باہر جائے گی' میں تمہیں فون پر اطلاع دوں گا۔ ایسے وقت ہمیں ساتھ رہنا چاہیے۔ مجھے بتاؤ، ہماری ملاقات کہاں ہو سکتی ہے، میں وہاں آجاؤں گا۔''

''سوری، جب تک مراد چھپا رہے گا، تب تک میں بھی اپنے نئے بہروپ میں چھپی رہوں گی۔ مائنڈ نہ کرنا' تمہارے سامنے بھی نہیں آؤں گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہم فون کے ذریعے ہی رابطہ رکھیں گے۔''

اس نے فون بند کرکے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ ''وہ ہم پر بھروسا نہیں کر رہی ہے۔''

''ہوں...... اور میں اسے بچانا چاہتا ہوں کہ وہ کس

نئے چہرے کے پیچھے خود کو چھپا کر مجھ تک پہنچنا چاہتی ہے۔''

''تم کسی وقت میڈونا کے ساتھ تفریح کے لیے نکلو۔ مرینہ حملہ کرے گی تو تم اسے پہچان لو گے۔''

''میں ابھی کالج میں جاؤں گا۔ کوشش کروں گا کہ وہ شاپنگ وغیرہ کے لیے کالج سے باہر آئے۔ ابھی میکی براؤن کو کال کرو۔ میں بات کروں گا۔''

چمپت راؤ نے میکی براؤن کے نمبر پنچ کر کے فون مراد کو دیا۔ اس نے اسے لے کر کان سے لگایا۔ پھر رابطہ ہونے پر اپنی آواز اور لہجے میں کہا۔ ''مجھے پہچان رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم...... تم مراد بول رہے ہو۔ پھر کوئی دھمکی دینے آئے ہو۔ صبح تم نے دیکھ لیا کہ میڈونا کا ایک باڈی گارڈ کتنا تگڑا ہے۔ تم قسمت کے دھنی ہو۔ اس سے بچ کر نکل گئے۔ آئندہ وہ دلیر جوان تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''مانتا ہوں، پہلی بار ایک پھرتیلے دشمن سے مقابلہ ہوا تھا۔ میں مرتے مرتے بچ گیا۔ بری طرح زخمی ہو چکا ہوں۔ علاج کے لیے دہلی واپس جا رہا ہوں۔ ایک آدھ ہفتے میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہی شملہ پھر آؤں گا۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''وہ مارا۔ پہلی بار تم میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔ اب میں دہلی میں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔''

''میں زخمی شیر ہوں۔ تمہارا وہ آدمی دہلی آئے گا تو تمہیں اس کی لاش ہی ملے گی۔ میں اسکیٹنگ کے دوران اس کی صورت دیکھ نہیں پایا۔ اس کا آدھا چہرہ مفلر میں اور آدھا اسنو گوگلس میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے صرف اس کا نام بتادو۔''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے فون بند کر دیا۔ مراد نے فون کو دیکھتے ہوئے اسے چمپت راؤ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت خوش ہے۔ قہقہہ لگا رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا ہے کہ میں یہاں نہیں ہوں۔ اب وہ بیٹی کو آزادی سے باہر گھومنے پھرنے کی اجازت دے گا۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟ کیا کرو گے؟''

''وہی جو سوچا ہے۔ وہ میرے ساتھ باہر کہیں بھی گھومنے پھرنے کے لیے راضی ہو جائے گی۔ میں اسے ڈنر کے لیے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں لے جاؤں گا۔''

وہ دونوں جدا ہو گئے۔ اب رات ہی کو کچھ ہونے والا تھا۔ مراد کسی طرح مرینہ کو نئے چہرے کے ساتھ پہچان لینا چاہتا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ پہلے وہ پہچان لے گی تو گلے پڑ جائے گی پھر اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا اور وہ اس اجنبی کے پیچھے پڑ گئی تھی، جس سے پچھلی رات ٹکراؤ ہوا تھا۔ وہ دوسرے دن اسے تلاش کرتی ہوئی اسکیٹنگ گراؤنڈ کی طرف گئی تھی۔ مراد کو قریب سے دیکھتے ہوئے گزر گئی تھی۔ مراد نے بھی اسے دیکھا تھا لیکن وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔

مرینہ نے اس وقت بھی چمپت راؤ سے فون پر باتیں کرتے وقت اس اجنبی کو دیکھ لیا تھا۔ اب اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ پہلے یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ کہاں رہتا ہے اور تنہا کس طرح میڈونا کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے؟

لیکن وہ اس کا تعاقب کرتے کرتے ٹھٹک گئی۔ وہ اجنبی میڈونا کے کالج کے احاطے میں داخل ہو گیا تھا۔ یعنی وہ دشمن کا آدمی تھا۔

وہ ایک قہوہ خانے کے باہر کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ 'کیا یہ مراد نہیں ہے؟ میکی براؤن کا کوئی قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ اسی لیے میڈونا کے کالج میں گیا ہے۔'

اس نے دوسرے پہلو سے سوچا۔ 'کیا مراد ڈبل گیم کھیل رہا ہے؟ میکی براؤن کا دشمن تو ہے ہی' اب دوست بن رہا ہے۔ ہاں وہ ایسی کوئی چال چل سکتا ہے۔ وہ اس دشمن کا اعتماد حاصل کر کے میڈونا کے پاس اس کے کالج میں پہنچ گیا ہے؟'

وہ صحیح سمت میں سوچنے لگی۔ 'ہاں۔ اس نے یہی کیا ہے۔ وہ فطرتاً عورتوں کو ہلاک نہیں کرتا۔ جب مجھ سے دشمنی تھی تو اس نے مجھے زخمی کیا تھا۔ میری جان نہیں لی تھی۔ اسی طرح وہ میڈونا کے قریب پہنچ کر اسے ہلاک نہیں کرے گا۔ میکی براؤن کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی اور ہی گیم کھیلتا رہے گا۔'

ہوٹل کے ملازم نے اس کے سامنے قہوے کی پیالی لا کر رکھی۔ وہ بلیک ٹی کا ایک گھونٹ لے کر سوچنے لگی۔ 'کئی باتیں سمجھنے کو رہ گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس کے پیچھے بھاگ رہی ہوں، وہ مراد ہی ہے۔'

اس نے دوسرا گھونٹ لے کر سوچا۔ 'دوسری بات یہ کہ وہ سخت حفاظتی انتظامات میں سرنگ بنا کر میڈونا کے کالج میں پہنچ گیا ہے۔ مجھے یہ کسی طرح معلوم کرنا ہوگا کہ میں مراد کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہی ہوں۔'

وہ غلطی یہ کر رہی تھی کہ دشمن کے آدمی کو مراد سمجھ رہی تھی اور یہ بات بھی صحیح تھی کہ مراد دشمن کا اعتماد حاصل کر کے میڈونا کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ وہ صحیح سمت میں سوچنے کے باوجود یہ معلوم نہیں کر سکتی تھی کہ مراد اس کالج میں موجود ہے اور جسے اس نے کالج میں جاتے دیکھا ہے، وہ محض ایک فریب ہے۔

وہ حقیقتاً میکی براؤن کا ایک انڈین جاسوس دھرم ویر تھا۔ پچھلی رات مرینہ سے اتفاقاً ٹکرایا تھا۔ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ مرینہ اس نئے روپ میں ہے اور اسے مراد سمجھ کر دھوکا کھا رہی ہے۔ یعنی یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مراد بھی اپنا چہرہ اور حلیہ بدل چکا ہے اور مرینہ اسے نہیں پہچان رہی ہے۔

دھرم ویر جانتا تھا کہ وہ کتنی خطرناک عورت ہے۔ اگر اس کے پاس گن ہوتی تو وہ اسے وہیں ختم کر دیتا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ اس لیے اندھیرے میں اس سے کترا کر نکل گیا تھا۔

اس نے کالج کے احاطے میں آ کر میکی براؤن سے فون پر کہا تھا۔ ''ابھی مرینہ سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا۔ افسوس کہ میں خالی ہاتھ تھا۔ اسے مجھ سے نہیں' مجھے اس سے خطرہ تھا۔ اس لیے میں تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اس سے کترا کر چلا آیا ہوں۔''

''یہ تو تم نے سنہری موقع گنوا دیا۔ کیا تم اپنے پاس گن نہیں رکھتے ہو؟ خالی ہاتھ کیوں تھے؟''

اس نے کہا۔ ''تین انجانے دشمنوں سے ٹکراؤ ہوا تھا۔ دو کو میں نے مار گرایا۔ میری گن خالی ہو گئی تھی میں وہاں سے بھاگنے لگا تو تیسرے نے میرا پیچھا کیا۔ اس کی گن بھی خالی ہو چکی تھی۔ ایک جگہ ہم دونوں میں مقابلہ ہوا تو میں نے اسے مار گرایا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ایسے وقت مرینہ مجھے کہیں سے دیکھ رہی تھی۔ مراد سمجھ کر میرے پیچھے پڑ گئی۔''

''تم اسے اپنے پیچھے لگاؤ۔ ایسے وقت تمہارے آدمی اسے نظروں میں رکھیں گے۔''

''ہمارا کوئی آدمی اسے نئے روپ میں نہیں پہچانے گا۔ میں ہی اسے ٹریپ کروں گا۔ وہ میرے تعاقب میں رہے گی، میں کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اسے گولی مار دوں گا۔''

اس نے دوسرے دن یہی کیا۔ بھرا ہوا ریوالور لباس میں چھپا کر شملہ کی مختلف وادیوں میں اسے تلاش کرتا رہا۔ ایسے وقت مرینہ بھی اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن شام تک وہ بھٹکتے رہے۔ پھر مرینہ ہی اسے دیکھ کر چھپ گئی۔ یہ پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ چھپ کر اس کا تعاقب کرے گی۔ اس کی مصروفیات کو دیکھتی رہے گی۔ یوں اس کی رہائش گاہ تک پہنچے گی۔

اب اسے کالج کے احاطے میں جاتے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد مراد اس کالج میں واپس آیا۔ مرینہ وہاں سے دور قہوہ خانے کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ نہ سکی۔

میڈونا نے پوچھا۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں شاپنگ کے لیے جانا چاہتی ہوں اور پاپا نے تاکید کی ہے کہ میں تمہارے ساتھ باہر نکلا کروں۔ کیا ابھی چلو گے؟''

''ضرور چلوں گا۔ پہلے اپنے پاپا سے بات کراؤ۔''

اس نے باپ سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''مسٹر عادل آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

اس نے فون مراد کو دیا۔ اس نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو مسٹر براؤن! آپ کی صاحب زادی شاپنگ کے لیے جانا چاہتی ہیں۔ میں پہلے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مراد کہاں ہو سکتا ہے۔ میں نے اسکیٹنگ اسٹک سے حملہ کر کے اسے گرایا تھا۔ وہ برف پر دور تک لڑھکتا گیا تھا۔ یقیناً زخمی ہوا ہوگا۔ آپ کے آدمی معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ یہاں کسی اسپتال میں ہے یا نہیں؟''

وہ بڑی ترنگ میں بولا۔ ''وہ دفع ہو گیا ہے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے معلوم کیا ہے۔ وہ علاج کے لیے دہلی چلا گیا ہے۔ شملہ میں نہیں ہے۔ تم میڈونا کو کالج سے باہر لے جا سکتے ہو۔''

''آپ اجازت دے رہے ہیں تو ضرور لے جاؤں گا لیکن ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، وہ دہلی نہ گیا ہو' آپ کو غلط خبر دی گئی ہو۔ میں اپنی پلاننگ کے مطابق میڈونا کو باہر لے جاؤں گا۔''

''تمہاری پلاننگ کیا ہے؟''

''میں چاہتا ہوں، میرے قد اور میری جسامت والا کوئی آپ کا آدمی میڈونا کے ساتھ باہر جائے اور میں ذرا فاصلہ رکھ کر میڈونا کے لیے ڈھال بنا رہوں۔ دشمن یہاں ہوگا تو میرے قد کے آدمی کو دیکھ کر دھوکا کھائے گا اور اس پر گولی چلائے گا۔ میں آپ کی بیٹی پر آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔''

''ہاں، میرا ایک جاسوس دھرم ویر' میڈونا کے ساتھ جائے گا۔ مرینہ اسے دیکھ کر دھوکا کھا چکی ہے۔ اسے مراد سمجھ رہی ہے۔''

مراد نے انجان بن کر پوچھا۔ ''یہ مرینہ کون ہے؟''

''وہ مراد کی محبوبہ ہے۔ اسے شملہ میں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ وہ بھی ہماری دشمن ہے۔ بہت ہی خطرناک فائٹر اور شوٹر ہے۔ کبھی اس سے ٹکراؤ ہو تو یہ نہ سمجھنا کہ وہ عام عورتوں کی طرح کمزور ہوگی۔ کوئی بھی عورت مقابلے پر آئے اسے مرینہ سمجھ کر فوراً گولی مار دینا۔ تم ایک لمحے کی بھی دیر کرو گے تو دوسرا لمحہ اس کا ہو جائے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں، میں محتاط رہوں گا۔''

اس نے فون میڈونا کو دیا۔ باپ نے اس سے کہا۔ ''تم، دھرم ویر کے ساتھ باہر جاؤ گی۔ عادل کچھ فاصلے پر رہ

کر تمہارے قریب ہی رہے گا۔''

''او کے پاپا!'' اس نے فون بند کر دیا۔

مراد نے کہا۔ ''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آرام سے لباس بدل کر آؤں گا۔ ہم آدھے گھنٹے بعد یہاں سے نکلیں گے۔''

اس نے اپنے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فون پر چیپت راؤ کو بتایا کہ میڈونا ٹھیک آدھے گھنٹے بعد کالج سے نکلے گی اور مرینہ سے کہا جائے کہ وہ کالج سے دور اسے کسی دوسری جگہ گھیر لے لیکن اسے جانی نقصان نہ پہنچائے۔ انتظار کرے۔ ادھر مراد ضرور آئے گا۔

مرینہ کو فون پر اطلاع ملی تو اس نے چیپت راؤ سے کہا۔ ''ہاں مجھے پورا یقین ہے، مراد ضرور آئے گا۔ میں حملہ کرنے میں جلدی نہیں کروں گی۔ اسے میڈونا کے آس پاس پہچاننے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ یہ سوچ لیا ہے کہ وہ نظروں میں آئے گا تو پھر میں بھی اس سے پردہ نہیں کروں گی۔''

مراد آدھے گھنٹے سے پہلے ہی کالج کے پچھلے راستے باہر چلا آیا پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر سامنے کی طرف آیا تو میڈونا دھرم ویر کے ساتھ کار میں بیٹھی احاطے سے باہر آرہی تھی۔ وہ ایک بائیک پر تھا۔ کار سے کچھ فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔ وہ کار ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے رک گئی، مراد نے فون پر کہا۔ ''میڈونا! کار میں بیٹھی رہو۔ پہلے میں عمارت کے اندر جا رہا ہوں۔ تم پانچ منٹ کے بعد آؤ۔''

اس نے مطمئن ہو کر کہا۔ ''تھینک یو عادل!''

پھر وہ فون بند کر کے کار کی کھڑکی سے باہر اسے عمارت کے اندر جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

مرینہ اسے دور سے کار کی کھڑکی کے پاس دیکھ رہی تھی۔ وہ دور جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور آس پاس کے لوگوں کو توجہ سے دیکھتے ہوئے مراد کو پہچان لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

جب میڈونا پانچ منٹ کے بعد کار سے نکلی تو اس کے ساتھ دھرم ویر بھی باہر آیا۔ مرینہ اسے دیکھ کر پھر الجھ گئی۔ اس نے پچھلی رات اسے تاریکی میں دیکھا تھا۔ اب دن کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ''کیا یہ مراد ہے؟''

وہ اسے توجہ سے دیکھنے لگی۔ اس کی چال سے اس کے انداز سے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی اور الجھنے لگی۔

دور چھپے ہوئے مراد نے مرینہ کو دیکھا تو اسے شبہ ہوا۔ جب وہ مار دھاڑ کے لیے نکلتی تھی تو اس کے بدن پر چست پتلون اور سلیولیس چرمی جیکٹ ہوتی تھی۔ اس جیکٹ کے اندر اس کا اسلحہ اور ہلمٹس چھپے رہتے تھے۔ ایک بیگ شانے سے لٹکا رہتا تھا۔ اس میں بھی موت کا سامان موجود رہتا تھا۔

اس وقت وہ اسی لباس اور بیگ کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ مراد کو بڑی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ وہ مرینہ ہی ہے۔ پھر وہ میڈونا سے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل رہی تھی اور شبہے کی تصدیق ہو رہی تھی۔

میڈونا دھرم ویر کے ساتھ شاپنگ سینٹر کی دکانوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ مرینہ انتظار کر رہی تھی کہ آس پاس کسی طرف کوئی ایسا جوان نظر آجائے جس پر مراد ہونے کا شبہ ہو سکے۔

میڈونا لباس خریدنے کے لیے ایک بوتیک میں داخل ہوئی۔ مرینہ نے دل میں کہا۔ ''مراد یہی ہے جس کے پیچھے میں کل سے بھاگ رہی ہوں۔ جب یہ میڈونا کے ساتھ ہے تو اور کہیں کیسے نظر آئے گا؟''

وہ بوتیک کے قریب آگئی۔ اندر میڈونا اور دھرم ویر دکھائی دے رہے تھے، مرینہ نے جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر دل میں کہا۔ ''مراد کو بے نقاب کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ میں میڈونا پر گولی چلاؤں گی۔ اسے زخمی کروں گی تو مراد مجھے مزید حملہ کرنے سے روکنے آئے گا۔''

اس نے جیکٹ کے اندر سے ریوالور کو نکالتے ہی میڈونا کو نشانے پر لیا۔ اس کا خیال درست نکلا۔ مراد نظر تو نہیں آیا لیکن ظاہر ہو گیا۔ اس کی ایک گولی نے مرینہ کے ہاتھ سے ریوالور کو گرا دیا۔ وہ انجانے حملے کے باعث لڑکھڑا کر گر پڑی۔ ادھر دھرم ویر نے اچھل کر پلٹتے ہوئے اپنے لباس سے گن نکال لی۔

مرینہ اٹھتے ہوئے فرش پر گرے ہوئے ریوالور تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی دھرم ویر نے ریوالور کو ٹھوکر مار کر اس سے دور کر دیا۔ پھر اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تم کل سے میرے پیچھے پڑی ہو۔ اب موت تمہارے سامنے آگئی ہے۔ مرنے سے پہلے سن لو۔ میں مراد نہیں ہوں۔''

یہ کہتے ہی وہ ٹریگر دبانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے مراد کی گن کا ٹریگر دب گیا۔ چشم زدن میں ایک گولی دھرم ویر کی پیشانی میں آکر پیوست ہو گئی۔ دوسری سینے میں گھس گئی۔ وہ فرش پر گر کر ذرا دیر تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا۔

مرینہ نے چھلانگ لگا کر اس کی گن اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے چیختے ہوئے کہا۔ ''مراد! مجھے بچانے والے صرف تم ہی ہو سکتے ہو۔ نار گاڈ سیک! مجھ سے نہ چھپو۔ میں پاگل ہو رہی

ہوں۔ اپنی وفاؤں کا واسطہ دیتی ہوں، سامنے آجاؤ۔''

وہ پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی دوڑتی ہوئی اسے تلاش کر رہی تھی۔ میڈونا بوتیک میں چھپی ہوئی تھی۔ اسے رنگ ٹون نے مخاطب کیا۔ تھی ہی اسکرین پر عادل نواز کا فون نمبر تھا۔ اس نے فوراً ہی اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''تم کہاں ہو؟ میری جان نکل رہی ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ اب تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم باہر جا کر اپنی کار میں بیٹھو۔ میں مراد کو تلاش کر رہا ہوں۔ ابھی تمہارے پاس آؤں گا۔''

میڈونا نے فون کو بند کر کے بوتیک سے باہر دیکھا۔ اب اسے مرینہ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ مراد کو تلاش کرتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی تھی۔ مراد بہت پہلے ہی اس عمارت سے نکل گیا تھا۔

مرینہ بھی وہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں گن تھی۔ اس لیے کوئی قریب نہیں آرہا تھا۔ لیکن مسلح پولیس کے سپاہی اسے آکر گھیر سکتے تھے۔ اسے بھی مجبوراً وہاں سے جانا پڑا۔

اس نے دل کو سمجھایا۔ ''مراد بھی پولیس والوں سے بچنے کے لیے جا چکا ہے۔ وہ اس عمارت سے زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ میں اسے ڈھونڈ کر رہوں گی۔''

وہ شاپنگ سینٹر کے باہر ذرا دور آس پاس اسے تلاش کرنے لگی۔ مراد میڈونا کے پاس آکر کار میں بیٹھ کر وہاں سے دور نکل آیا تھا۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا مراد نے دھرم ویر کو گولی ماری ہے؟''

''ہاں اور تمہارے پاپا کہہ رہے تھے کہ وہ بہت زخمی ہو کر علاج کے لیے دہلی چلا گیا ہے۔ انہوں نے مطمئن ہو کر تمہیں کالج سے نکلنے کی اجازت دے دی۔ وہ دشمن یہی چاہتا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ شملہ میں ہی ہے۔''

مراد نے کالج میں پہنچ کر یہی بات میکی براؤن سے فون پر کہی۔ ''اس نے آپ کو دھوکا دیا اور آپ فریب میں آگئے۔ آپ کی صاحب زادی اب کالج میں قیدی بن کر رہے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ یہ شملہ سے چلی جائے۔''

وہ بولا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں، میں کل کسی فلائٹ میں سیٹیں کنفرم کراتا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں' مراد آپ کی بیٹی کو ائرپورٹ تک خیریت سے جانے دے گا۔ اس کے ساتھ پتا نہیں اور کتنے شوٹرز ہیں۔ وہ کہاں کہاں پھیلے ہوں گے۔ ٹرین سے اور کار سے بھی یہ جائیں گے تو وہ راستے میں دھماکے کر سکے گا۔''

''میں مانتا ہوں' وہ کسی بھی راستے میں موت بن کر آسکتا ہے لیکن میڈونا کو تو وہاں سے نکالنا ہی ہوگا۔''

''ایک ہی راستہ ہے کہ اسے رازداری سے لے جائیں۔ آدھی رات کے بعد یہاں کی چہل پہل ختم ہو جاتی ہے۔ رات تین بجے کے بعد سب ہی گہری نیند میں ہوتے ہیں۔ میں چار بجے کالج کے پچھلے دروازے سے میڈونا کو کار میں لے جاؤں گا۔ ہم سے پہلے مسلح گارڈز کی ایک گاڑی اس راستے پر آگے جا کر ہمارا انتظار کرے گی۔ ہم اس گاڑی کے پیچھے کل صبح دس یا گیارہ بجے تک دہلی پہنچ جائیں گے۔ میرا مشورہ ہے آپ دہلی سے میڈونا کے لیے سیٹ بک کرائیں۔''

''بے شک ایسی رازداری سے تم میری بیٹی کو میرے پاس لا سکو گے۔ میں ابھی سیکیورٹی افسر کو حکم دیتا ہوں۔ پھر دہلی سے تم لوگوں کے لیے سیٹیں کنفرم کراؤں گا۔''

مراد رابطہ ختم کر کے اپنے کمرے میں آیا پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے چیپت راؤ کو فون پر مخاطب کیا۔ ''ہمیں آج رات چار بجے شملہ سے جانا ہے۔ ابھی گرودیو کے آشرم میں جاؤ۔ درگا سے ملو اور ان گانے بجانے والوں سے بولو کہ وہ بھی ہماری خاطر شملہ چھوڑ دیں۔ ہم ان کے ساتھ ان کی بستی میں جا کر رہیں گے۔''

''کیا وہ میری بات مان لیں گے؟''

''تم وہاں جا کر اپنے فون پر مجھ سے بات کراؤ۔ وہ ضرور مانیں گے۔''

''میں ابھی وہاں جا رہا ہوں۔''

''تم گرودیو کے استھان سے واپس آکر اپنی ایک گاڑی کا انتظام کرو گے۔''

''یہاں ہماری تین گاڑیاں ہیں۔''

''پھر تو گانے بجانے والے بھی آسانی سے سفر کر سکیں گے۔''

وہ تھوڑی دیر تک چیپت راؤ کو اپنی پلاننگ سمجھاتا رہا۔ پھر اس نے رابطہ ختم کر کے میڈونا کے پاس آکر کہا۔ ''کچھ کھا پی کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ میں بھی کچھ نیند لوں گا۔ ہم چار بجے تک یہاں سے نکل جائیں گے۔''

اس نے میڈونا کے ساتھ رات کا کھانا کھایا پھر اپنے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی چیپت راؤ نے فون پر کہا۔ ''یہ لو، ان گانے بجانے والوں کے بوڑھے بابا سے بات کرو۔''

مراد نے کناری اور منجو کے بوڑھے باپ سے بات

کی۔ اس سے کہا کہ وہ چھپنے کے لیے ان کی بستی میں جانا چاہتا ہے۔ اس کے عوض انہیں اتنی رقم ملے گی کہ وہ برسوں تک بیٹھ کر کھائیں گے۔

سکہ رائج الوقت کے آگے کون نہیں جھکتا۔ وہ راضی ہو گئے۔ مراد رات کے گیارہ بجے سو گیا۔ فون کے الارم نے اسے دو بجے جگا دیا۔ اس نے باتھ روم میں آ کر گرم پانی سے غسل کیا۔ تازہ دم ہو کر لباس بدل کر ہتھیاروں سے لیس ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

میڈونا بھی اپنے ضروری سامان کے ساتھ تیار تھی۔ رات کے ساڑھے تین بجے مراد نے سیکیورٹی افسر سے کہا کہ وہ اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ پولیس چوکی سے آگے دو میل کے فاصلے پر رک جائے۔ وہ میڈونا کو کار میں لے کر آئے گا پھر وہ سب ایک ساتھ سفر کریں گے۔

وہ افسر اپنے ماتحت گارڈز کے ساتھ چلا گیا۔ چار بجے سے پہلے ہی مراد میڈونا کے ساتھ کاٹیج کے پچھلے دروازے سے باہر آیا۔ وہاں ایک براؤن کلر کی مزدا کار تھی۔ میڈونا اپنی کار میں نہیں جا رہی تھی کیونکہ اس کے دشمن اس کار سے اسے پہچان سکتے تھے۔ اس مزدا کار کو صرف سیکیورٹی افسر اور گارڈز ہی پہچان سکتے تھے کہ اس میں میڈونا آ رہی ہے۔

مراد نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ پھر آگے جا کر ایک تاریک گلی میں رک گیا۔ وہاں پلاننگ کے مطابق چیپت راؤ ایک کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ درگا اپنے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔

وہ میڈونا سے بولا۔ ''چلو اترو کار سے' ہم دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے گاڑیاں بدل کر جائیں گے۔''

میڈونا نے کہا۔ ''لیکن ہمارے گارڈز تو ہمیں اس مزدا کے ذریعے پہچانیں گے۔''

''مزدا ضروری نہیں ہے۔ ہم دوسری گاڑی میں رہ کر بھی اپنی صورتیں دکھائیں گے تو وہ گارڈز ہمارے ساتھ چل پڑیں گے۔''

وہ دوسری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر مراد کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ چیپت راؤ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ موسم گرما کے باوجود رات کو سردی بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت جیسے پورا شملہ سو رہا تھا۔ مکانات اور عمارتیں خاموش تھیں۔ سڑکیں ویران ہو گئی تھیں۔

پولیس چوکی پر انہیں روکا گیا۔ وہاں صرف دو سپاہی جاگ رہے تھے۔ باقی تھانے کے اندر اپنے افسر کے ساتھ سو رہے تھے۔ چیپت راؤ نے انہیں ایک ہزار کا نوٹ دیا تو انہوں نے تلاشی نہیں لی۔ آگے جانے کی اجازت دے دی۔

وہاں سے آگے نکلتے ہی مراد نے ریوالور نکال کر میڈونا کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں مراد علی منگی ہوں۔''

اس کا منہ حیرت اور خوف سے کھل گیا۔ وہ بولا۔ ''آگے تمہارے گارڈز کی گاڑی سڑک کے کنارے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ چلو سیٹ کے نیچے بیٹھ جاؤ۔ منہ سے ایک ذرا بھی آواز نکالو گی تو سمجھ سکتی ہو کیا ہوگا۔ ایک نہیں کئی گولیاں تمہارے اس خوب صورت چکنے بدن میں گھس جائیں گی۔''

وہ بری طرح سہمی ہوئی ریوالور کو دیکھتی ہوئی سیٹوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھ گئی۔ مراد نے بھی اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے فون پر سیکیورٹی افسر سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''ہمیں کاٹیج سے نکلنے میں دیر ہو رہی ہے۔ مسٹر براؤن کی کال آنے والی ہے۔ ہم اسے اٹینڈ کرنے کے بعد یہاں سے نکلیں گے۔''

فون پر باتیں کرنے کے دوران میں سیکیورٹی افسر نے چیپت راؤ کی گاڑی کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ فون پر کہا۔ ''آل رائٹ سر! ہم یہاں انتظار کرتے رہیں گے۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ گاڑی ان کے سامنے سے گزر گئی۔ انہیں تو براؤن کلر کی مزدا کا انتظار تھا۔ مراد نے میڈونا سے کہا۔ ''اب سیٹ پر آ کر آرام سے بیٹھو اور اپنا فون مجھے دو۔''

وہ اپنا فون دیتے ہوئے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کیا مجھے مار ڈالو گے؟''

''تمہیں مارنا ہوتا تو یہاں تک زندہ نہ لاتے۔ گاڑیاں تبدیل کرنے سے پہلے ہی مار ڈالتے۔''

وہ ذرا اعتماد سے بولی۔ ''میں نے سنا ہے تم عورتوں کو ہلاک نہیں کرتے؟''

''تم میرے احکامات کی تعمیل کرتی رہو گی تو زندہ رہو گی۔''

''مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''کوئی سوال نہ کرو۔ خاموش بیٹھی رہو۔''

وہاں سے آگے منصوبے کے مطابق چیپت راؤ کی دو گاڑیاں ان کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ ان میں گانے بجانے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ چیپت راؤ کے ماتحت انہیں بڑے آرام سے کھلاتے پلاتے لائے تھے۔

انہوں نے گاڑی روک دی۔ مراد پچھلی سیٹ سے باہر آ گیا۔ چیپت راؤ اس کی جگہ آ کر میڈونا کو ریوالور کے نشانے پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ ایک ماتحت درگا کے برابر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور مراد گانے بجانے والوں کی ایک

گاڑی میں آ کر اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔ دوسری گاڑیاں اس کے پیچھے چلنے لگیں۔

مراد کی گاڑی میں کناری' منجو اور ان کا بوڑھا باپ تھا۔ اس نے بوڑھے سے کہا۔ ''میں اپنے دشمن کی بیٹی کو اغوا کر کے لایا ہوں۔ ایسی جگہ چھپنا چاہتا ہوں جو اس راستے سے دور بہت دور ہو۔ دشمنوں کو وہاں تک جانے کا خیال تک نہ آئے۔''

بوڑھے کے بولنے سے پہلے کناری نے کہا۔ ''بھیا! ہم اس راستے سے دور ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں سے یہ گاڑیاں گزر نہیں سکتیں۔ بہت اونچے نیچے راستے ہیں۔ وہاں پیدل چلنا پڑتا ہے۔ جن کے پاس پیسا ہوتا ہے، وہ خچروں پر بیٹھ کر جاتے ہیں۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''بیٹے! بہت تھکا دینے والا راستہ ہے۔ تمہارے ساتھ دو عورتیں ہیں۔ گود میں ایک بچہ ہے۔ کیا وہ عورتیں پیدل چل سکیں گی؟''

مراد نے فون پر چیپت راؤ سے کہا۔ ''آگے ایسی جگہ آئے گی جہاں سے گاڑیاں نہیں جا سکیں گی۔ میں میڈونا کو لے کر آگے جاؤں گا۔ تم درگا اور بچے کو لے کر وہاں سے واپس جاؤ گے۔ اس طرح گاڑیاں بھی وہاں رکی نہیں رہیں گی۔ تم اپنے ماتحتوں کے ساتھ انہیں لے جاؤ گے۔ دشمنوں کو وہاں نہ گاڑیاں نظر آئیں گی نہ وہ سوچیں گے کہ میں اس دشوار گزار پہاڑی راستوں سے میڈونا کو کہیں لے گیا ہوں۔''

چیپت راؤ کو وہی کرنا تھا جو مراد چاہتا تھا۔ آگے اس دشوار گزار راستے تک پہنچ کر گاڑیاں رک گئیں۔ مراد نے دو ریوالور اور ایک شاٹ گن اپنے پاس رکھی۔ بلٹس کے کئی چیمبرز بیگ میں رکھے۔ کناری نے کہا۔ ''ان علاقوں میں بجلی نہیں ہے۔ آپ فون کی بیٹری چارج نہیں کر سکیں گے۔''

فی الحال مراد اور میڈونا کے فون کی بیٹری فل چارج کی ہوئی تھی۔ چیپت راؤ اور اس کے ماتحتوں نے اپنے اپنے فون کی بیٹریاں نکال کر انہیں دیں۔ تاکہ فون کئی دنوں تک کارآمد رہے۔ پھر چیپت راؤ اور درگا بڑی محبت سے مراد کے گلے لگ کر جدا ہو گئے۔ ان کی تینوں گاڑیاں وہاں سے چلی گئیں۔

میڈونا رو رہی تھی کہ پتا نہیں اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کب رہائی ملے گی اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جانے والا ہے۔

☆☆☆

ماروی کے لیے کہیں چھپ کر رہنا محال ہو گیا تھا۔ وہ چاچی اور چاچا کے ساتھ کراچی شہر سے نکل آئی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ بستی سے آگے ریتی میں چاچی کی بہن رہتی ہے، وہاں جا کر رہے گی لیکن مراد ایک بار اسے تلاش کرتا ہوا وہاں گیا تھا۔ محبوب اور سمیرا کو بھی معلوم تھا کہ ریتی میں ماروی کی کوئی عزیزہ رہتی ہے۔

اس نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ آگے کہیں جانے سے پہلے سکھر میں رک گئی تھی۔ وہاں بھی پولیس والے اسے اور چاچی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ چاچی نے کہا۔ ''ہمارے ساتھ یہ مسئلہ رہے گا۔ جس شہر میں بھی جا کر رہیں گے، وہاں کے محلے والے اور تھانے والے کھوج لگائیں گے کہ وہ دو بوڑھے بوڑھی اور ایک جوان عورت کون ہے؟''

چاچا نے کہا۔ ''طرح طرح کے سوالات کیے جائیں گے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کرائے کے مکان میں رہنے آئے ہیں۔ ہم کہاں سے کما کر لاتے ہیں اور کھاتے ہیں؟''

ماروی نے پریشان ہو کر کہا۔ ''ہمارے پاس لاکھوں روپے ہیں۔ یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ ڈاکو آ کر لوٹ کر لے جائیں گے یا پولیس والے حصہ طلب کرتے رہیں گے۔ اس برے وقت میں ہماری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ہمیں بے یار و مددگار دیکھ کر لوگ کتوں کی طرح بھونکتے رہیں گے۔''

چاچی نے کہا۔ ''اس سے تو اچھا تھا کہ ہم کراچی میں ہی رہتے۔ وہاں ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کا نام تک نہیں جانتا۔ کوئی کسی کی ٹوہ میں نہیں رہتا۔ سب ہی دن رات کمانے کھانے کی فکر میں خود کو بھولے رہتے ہیں۔''

ماروی نے کہا۔ ''میں وہاں محبوب سے چھپ کر نہیں رہ سکوں گی۔ تم نے دیکھا ہے، میں عبا اور نقاب میں تھی۔ پھر بھی محبوب کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں اس شہر میں ہوں۔''

وہ تینوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد ماروی نے کہا۔ ''صرف محبوب سے چھپنے کا مسئلہ ہے۔ ورنہ ہم دوسرے پہلوؤں سے محفوظ رہیں گے۔ یہ لاکھوں روپے تم کلیجے سے لگائے رکھتی ہو۔ وہاں گھر میں رکھنے اور چھپانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ رقم پھر بینک میں رکھ دیں گے اور ضرورت کے مطابق کبھی کبھی رقم نکالتے رہیں گے۔''

چاچی نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں' کراچی میں سہولتیں زیادہ ہیں۔ وہاں سوائے محبوب کے اور کوئی ہماری کھوج میں نہیں رہے گا۔''

ماروی نے دل پر ہاتھ رکھ کر مراد کو تصور میں دیکھا پھر کہا۔ ''وہ بھی مجھے وہاں تلاش کر رہا ہوگا۔''

چاچی نے کہا۔ ''تلاش کرنے دو۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ اس کا سامنا کرو۔ دوٹوک فیصلہ کرو۔ کوئی لحاظ نہ کرو۔ اس سے صاف صاف کہہ دو۔ اگر وہ مرینہ کو ٹھکرا کر آئے گا اور مجرموں کی زندگی نہیں گزارے گا تو اس کے ساتھ رہوگی ورنہ اس کا سایہ بھی اپنے اوپر پڑنے نہیں دوگی۔''

چاچا نے کہا۔ ''یہ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ وہ اس پر سوکن لائے گا تو اس سے طلاق لے لے گی۔''

اس نے پھر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''میں طلاق نہیں لوں گی۔''

''وہ تمہاری اس کمزوری کو سمجھتا ہے کہ اسے نہیں چھوڑوگی۔ اسی کے نام سے زندگی گزاروگی۔''

''بیٹی! ایک بار دل پر پتھر رکھ کر طلاق مانگو پھر دیکھو وہ کس طرح تمہارے قدموں سے لپٹ کر رہے گا۔''

وہ مایوس ہوکر بولی۔ ''کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ اب تک مرینہ کو اپنی منکوحہ بنا چکا ہوگا۔''

''اگر ایسا کیا ہوگا تو تمہیں بھی اس پر لعنت بھیجنا ہوگی۔ تمہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہی ہوگا۔''

وہ خیالی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہم اپنے اپنے طور پر اس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ حقیقتاً وہ کہاں ہوگا اور کیا کررہا ہوگا، ہم نہیں جانتے۔''

''کسی طرح جاننا چاہیے۔ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ مرینہ سے نکاح پڑھوا چکا ہے یا نہیں؟''

ماروی کے دل میں بھی ہلچل تھی۔ وہ بھی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ واقعی وہ بے مروت اور بے ایمان ہوچکا ہے یا نہیں؟

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ مراد کے بارے میں ماسٹر کو بوبو سے بہت کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔ ماسٹر جانتا تھا کہ وہ مراد سے نفرت کرتی ہے۔ پھر نفرت کرنے والی اس کے بارے میں کیا پوچھے گی؟

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی پھر اس نے فون اٹھا کر ماسٹر کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی پھر اس کے پی اے کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو، تم کون ہو؟''

اس نے کہا۔ ''ماروی۔۔۔''

یہ مختصر سا نام ہی کافی تھا۔ ماسٹر جیسے دوڑا ہوا آیا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ''ماروی۔۔۔! واقعی یہ تم ہو؟ تم بول رہی ہو؟''

''ہاں، میں ماروی بول رہی ہوں۔''

''وہ تمہیں کال کرتے کرتے مایوس ہوگیا ہے۔ تم وہ سم بدل چکی ہو۔ کیا یہ تمہارا نیا نمبر ہے؟''

''ہاں۔ میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے سم بدل دی تھی۔ جب وہ مرینہ سے شادی کرچکا ہے تو مجھ سے کوئی رشتہ نہیں رہا ہے۔ پھر کیوں مجھے کال کررہا ہے؟''

''کس نے کہا کہ وہ مرینہ سے شادی کرچکا ہے۔ وہ تمہارا دیوانہ ہے۔ اپنا چہرہ بدل کر مرینہ سے دور ہوگیا ہے۔''

یہ ایسی خوش خبری تھی کہ ماروی کے سینے میں دل پاگل سا ہوگیا۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ میں کیسے یقین کروں؟ وہ مجھ پر سوکن لانے والا تھا پھر اس نے ارادہ کیوں بدل دیا؟''

''تمہاری محبت نے اسے بدل دیا ہے۔ وہ تمہاری دوری برداشت نہیں کررہا ہے۔ ابھی میرے ایک بہت اہم کام میں مصروف ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر تمہیں ڈھونڈنے کے لیے پاکستان آئے گا۔ اسے نہ دوڑاؤ ماروی! وہ ایک غلطی کرنے والا تھا، لیکن نہیں کی۔ میری بات کا یقین کرو۔ وہ ہمیشہ کے لیے مرینہ سے دور ہوگیا ہے۔ غصہ تھوک دو۔ اسے گلے لگالو۔''

ماروی نے کھڑکی کی طرف رخ کیا۔ تازہ ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ وہ خوابیدہ سی ہوکر بولی۔ ''میں...... میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''میرا وہ شیر دلیر میدان مار رہا ہے۔ ابھی وہ ایسے پہاڑی علاقے میں ہے جہاں بجلی نہیں ہے۔ فون کی بیٹری ختم ہوگی تو اسے پھر چارج نہیں کرسکے گا۔ میں اس سے تمہاری بات کراتا ہوں۔ اس کا نمبر SEND کررہا ہوں۔ فی الحال اس سے لمبی باتیں نہ کرنا اور ابھی آدھے گھنٹے بعد اسے کال کرنا۔''

ماسٹر نے رابطہ ختم کردیا۔ ماروی نے دھڑکتے ہوئے دل سے وال کلاک کو دیکھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ دل کی دھڑکنوں میں بجنے والا تھا۔ یکلخت پھر اس کی دنیا بدل رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بہت ہی پیچیدہ اور اونچے نیچے تنگ راستوں سے گزر کر گانے بجانے والوں کے ساتھ ان کی ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گیا۔ میڈونا کو ایک خچر پر بٹھا کر لایا گیا تھا۔

وہ بہت ہی خوب صورت علاقہ تھا۔ ایک پہاڑی سے جھرنا بہتا رہتا تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی اور رنگارنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ پیار کرنے والوں کے لیے وہ ایک آئیڈیل جگہ تھی اور دشمنی کرنے والوں کے لیے گہری پستی میں گرنے اور گرانے والی کھائیاں تھیں۔ چٹانوں کے پیچھے سے حملے کرنے اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپنے کے کئی مقامات تھے۔ مراد نے وہاں پہنچتے ہی دور تک جاکر ایک ایک جگہ کو

اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ ایسی جگہ تنہا رہ کر کئی دشمنوں کا مقابلہ کرسکتا تھا۔

گانے بجانے والوں کی طرح وہاں اور کئی لوگوں کی پتھریلی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ چھوٹے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی دیواریں تھیں۔ ان کی چھتیں نیچی تھیں۔ میڈونا تن کر کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ مکان کے اندر جھک کر رہنا ضروری تھا۔ کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹنا پڑتا تھا یا باہر آنا ضروری ہوتا تھا۔

اب وہ سہمی ہوئی نہیں تھی۔ یہ یقین ہوگیا تھا کہ مراد اسے ہلاک نہیں کرے گا۔ وہ چپ چپ سی رہتی تھی۔ مراد نے کہا تھا۔ ''کوئی سوال نہ کیا کرو۔ یہاں جب تک رہنا ہے، تب تک صبر و شکر سے رہو۔ ایک دن اپنے باپ کے پاس ضرور جاؤ گی۔''

مراد نے وہاں پہنچ کر آرام سے ایک چٹان پر بیٹھ کر ماسٹر کو بوبو کو فون پر کہا۔ ''ہیلو ماسٹر! آپ کے لیے خوش خبری ہے۔ میں میڈونا کو سخت سیکیورٹی کی دلدل سے نکال کر ایک ایسی جگہ لے آیا ہوں، جہاں اسے تلاش کرنے والے پہنچ نہیں سکیں گے۔ اگر پہنچ بھی گئے تو میں تنہا ان کا مقابلہ کرسکوں گا۔''

ماسٹر نے خوش ہوکر کہا۔ ''تمہارے لیے شملہ ایک انجانی جگہ ہے۔ تم نے وہاں سے دشمن کی بیٹی کو اغوا کرکے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ میں تمہاری تعریف کیا کروں، تم نے تو مجھے خرید لیا ہے مراد۔''

مراد نے کہا۔ ''آپ میرے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ مجھ سے کبھی یہ توقع نہ کریں کہ میں میڈونا کو قتل کروں گا۔ اس کے باپ نے آپ کی بیٹی اور داماد کو قتل کیا تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہم سب اپنی دشمنی کو گھر کی عورتوں تک نہ جانے دیں۔ ہم انسان ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو سلامتی دینا ہمارا فرض ہے۔''

اس نے کہا۔ ''مراد! تم نے براؤن فیملی کے برنارڈ کو ہلاک کیا۔ پھر اس فیملی کے پہلے سربراہ میکی البرٹ کو دہلی میں موت کے گھاٹ اتارا۔ تمہارے دوست بلّے نے میکی براؤن کے بیٹے رونی براؤن کو لندن میں گولی ماری۔ تم ابتدا سے ہی میرا کلیجا ٹھنڈا کرتے آرہے ہو۔ میں تمہاری بات ضرور مانوں گا۔ میڈونا کو ہلاک کرنے کے لیے نہیں کہوں گا۔ ابھی اس کے باپ سے ڈیل کرنے کے بعد تمہیں کال کروں گا۔''

ماسٹر نے مراد سے رابطہ ختم کرکے میکی براؤن کے

نمبر پنچ کیے۔ ادھر وہ بیٹی کے لیے پریشان تھا۔ شملہ کے سیکیورٹی افسر نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ عادل نواز دشمن ہے۔ دھوکے باز ہے۔ وہ بڑی چالبازی سے میڈونا کو ان کے درمیان سے مکھن کے بال کی طرح نکال کر لے گیا ہے۔

وہ لوگ شملہ میں اور آس پاس کی وادیوں میں انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ رات سے صبح اور صبح سے دوپہر ہوگئی تھی اور ان کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یہ خیال قائم کیا جا رہا تھا کہ وہ میڈونا کو دہلی کی طرف لے گیا ہے۔

ایسے وقت ماسٹر نے اس سے فون پر کہا۔ ''یو میکی براؤن! یو ڈرٹی ڈاگ! تیری بیٹی میرے پاس ہے۔''

میکی کے دماغ میں جیسے پتھر آ کر لگا۔ وہ یکلخت اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ بے یقینی سے بولا۔ ''نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ تمہارے پاس کیسے پہنچ گئی۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''بیٹی کی آواز سن کر یقین ہوجائے گا۔ انتظار کرو۔ وہ ابھی تم سے بولے گی۔''

ماسٹر نے اس سے رابطہ ختم کر کے مراد سے کہا۔ ''میکی براؤن سے باتیں کرو اور اسے بیٹی کی آواز سناؤ۔ مجھے یقین ہے، وہ ذلیل دشمن میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے لیے آئے گا۔''

مراد نے اس سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''ہیلو مسٹر براؤن! کیا عادل نواز کو آواز سے پہچان رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم...... تم کون ہو؟ تم میرے دشمن کیوں ہو؟''

''میں عادل نواز نہیں، مراد علی منگی ہوں۔ اب بولو۔ کیا دشمنی کی وجہ سمجھ میں آگئی؟''

اسے ذرا دیر کے لیے چپ لگ گئی۔ مراد نے کہا۔ ''تم مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے لاکھوں ڈالرز پانی کی طرح بہا رہے ہو۔ تمہارے درجنوں شوٹرز میرے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ تمہارا بہنوئی برنارڈ، تمہارا بھائی میکی البرٹ اور تمہارے بیٹے رونی براؤن کو بھی جہنم میں پہنچا چکا ہوں۔ اب یہ تمہاری لاڈلی بیٹی میرے شکنجے میں ہے۔ پہلے اس سے بات کرو اور یقین کرو کہ یہ میرے جوتوں میں پڑی ہوئی ہے۔''

میڈونا اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہرگز نہ کہنا کہ تم ابھی کہاں ہو۔ اس علاقے کے متعلق کوئی اشارہ بھی دینا چاہو گی تو گولی مار دوں گا۔''

اس نے فون لے کر کان سے لگایا۔ پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مراد نے ریوالور کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی۔ دوسری طرف سے باپ نے تڑپ کر کہا۔ ''میڈونا! باپ کی جان! یہ تم رو رہی ہو؟ تم ہی ہو نا؟''

وہ سسکتی ہوئی بولی۔ ''ہاں پاپا! میں آپ کی بیٹی میڈونا ہوں۔ میرا کیا ہوگا پاپا؟ میں مر جاؤں گی۔''

''کیا وہ تم پر ظلم کر رہا ہے؟''

''نہیں، اس نے مجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے لیکن یہ ظلم کیا کم ہے کہ گھر سے بے گھر ہوگئی ہوں۔ آپ ہی مجھے پھر گھر میں بلا سکتے ہیں۔ ان سے کوئی سمجھوتا کریں پاپا! مجھے جلدی اپنے پاس بلائیں۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔''

مراد نے اس سے فون لے کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''کیا یقین ہوگیا کہ بیٹی میرے پاس ہے؟''

''ہاں۔ یقین ہوگیا ہے۔ پلیز مجھ سے سمجھوتا کرو۔ اسے واپس بھیجنے کے لیے کتنی رقم چاہتے ہو؟''

''سمجھوتا مجھ سے نہیں' ماسٹر سے کرو اور میری یہ بات لکھ لو کہ میڈونا کو تلاش کرنے والے میرے قریب آئیں گے تو میں اسی لمحے میں اسے گولی مار دوں گا۔ بیٹی کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے رابطہ نہ رکھو۔ تمہارا کوئی شوٹر بھی نظر آئے گا تو بیٹی کی آخری ہچکی نہیں سن سکو گے۔ جاؤ ماسٹر سے باتیں کرو۔''

میکی براؤن نے اپنے فون کو دیکھا۔ اب اسے اپنے بدترین دشمن کے آگے جھکنا تھا۔ برتری حاصل کرتے رہنے کی جنگ لڑتے رہنے کے بعد اب کمتر ہوتا تھا۔ اس نے غصے سے تلملا کر اپنی بیوی مارتھا کو ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اسے گالیاں دیتے ہوئے بولا۔ ''تم ماں بیٹی کی ضد مجھے کمزور بنا رہی ہے۔ میں اسے شملہ جانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا لیکن یار سے ملنے کے لیے بیٹی کی جوانی دیوانی ہو رہی تھی اور ماں اسے جانے کے لیے شہ دے رہی تھی۔''

مارتھا نے کہا۔ ''آپ بیٹی کی دیوانگی کو اور ماں کی نادانی کو کب خاطر میں لاتے ہیں؟ حکم تو آپ کا چلتا ہے اور آپ نے خوب سوچ سمجھ کر حکم دیا تھا۔ آپ کو یقین تھا کہ مراد وہاں میڈونا کو نقصان پہنچانے آئے گا تو اپنی مضبوط سیکیورٹی کے ذریعے اور انڈین پولیس اور انٹیلی جنس والوں کی مدد سے وہاں اسے آسانی سے گھیر کر مار سکیں گے۔ مجھ سے یہ حقیقت نہیں چھپے گی کہ مراد کو ہلاک کرنے کے لیے اسے گھیرنے کے لیے بیٹی کو چارا بنا کر وہاں بھیجا تھا۔''

بڑے بیٹے جیکی براؤن نے کہا۔ ''پاپا! حقیقت یہی ہے۔ مام پر غصہ نہ دکھائیں۔ میں نے اور آپ نے مل کر یہی پلاننگ کی تھی۔ ہمیں ناکامی ہوئی ہے۔ ہم میڈونا سے محروم ہوگئے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ لڑکیاں ایک دن پرائی

ہوتی ہیں۔ وہ بھی پرائی ہوگئی ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ آپ ماسٹر کو بوبو کے آگے نہیں جھکیں گے اس سے سمجھوتا نہیں کریں گے۔''

مارتھا نے کہا۔ ''تم کیسے بھائی ہو؟ بہن کی شادی نہیں کی۔ اسے دشمن کے شکنجے میں چھوڑ کر کہتے ہو وہ پرائی ہوگئی ہے۔''

جیکی نے کہا۔ ''میری بہن کو عزت راس نہیں آئی۔ وہ یار سے ملنے گئی۔ میں نے، پاپا نے اور آپ نے راضی خوشی اسے رخصت کیا تھا۔ لہٰذا اس پہلو سے بحث نہ کی جائے۔''

میکی براؤن نے کہا۔ ''میرا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔ مانا کہ وہ میرے جانی دشمن کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے لیکن وہ دشمن ایسا ہے کہ اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میں سمجھوتا نہیں کروں گا، شاید وہ ہمارے پاس کبھی واپس نہیں آئے گی لیکن ہم مطمئن رہیں گے کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔''

اس نے فون اٹھا کر ماسٹر کو بوبو کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ''میں نے اپنی بیٹی سے بات کی ہے۔ یقین ہوگیا ہے کہ وہ اس وقت مراد کے شکنجے میں ہے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارے ایسے ہتھکنڈوں سے جھک جاؤں گا یا ٹوٹ جاؤں گا۔ یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔''

''چلو نکال دیا۔ آگے بولو۔''

''آگے کی بات یہ ہے کہ میں بیٹی کو بھول گیا ہوں۔ اگر تم یاد دلانا چاہتے ہو تو واپس بھیج دو۔ ہم سب بدمعاشوں کی دنیا کے لوگ ہیں۔ ہماری بدمعاشی یہ ہے کہ حالات مجبور کرتے ہیں تو ہم اپنی جوان بیٹیوں کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔''

یہ کہتے ہی اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ ماسٹر نے اپنے فون کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ایک بہت بڑی بازی جیتنے کے بعد وہ خلاف توقع ہارنے والا تھا۔ میکی براؤن نے یہ واضح کر دیا تھا کہ بدمعاشی کے آگے بیٹی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ماسٹر' میڈونا کو قتل کرنے کی دھمکی دے کر اسے اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا تھا۔ اس نے فون پر مراد سے کہا۔ ''تمہاری محنت رائیگاں جا رہی ہے۔ میکی براؤن کو پروا نہیں ہے کہ اس کی بیٹی کو قتل کر دیا جائے گا۔ وہ جھکنے اور سمجھوتا کرنے کے لیے راضی نہیں ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''میکی نے تو بازی ہی پلٹ دی ہے۔ اب ہم میڈونا کا کیا کریں گے؟ میں اسے کتنے دنوں تک یہاں چھپا کر رکھوں گا اور اسے اپنے پاس رکھنے سے حاصل کیا ہوگا؟''

''کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے لیے وبال بوجھ بن گئی ہے۔ اسے مار کر کسی کھائی میں پھینکو اور چلے آؤ۔''

''یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''پھر تم سے کیا ہوگا؟''

''ابھی سوچتا ہوں۔ میرے سامنے آخری راستہ یہی ہوگا کہ اسے سلامتی سے رہا کر دوں۔''

''مراد! مجھے غصہ آ رہا ہے۔ یہ بہت اہم اور بڑی جان جوکھم والی مہم تھی۔ ہم ناکام ہو رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ کبھی ناکامی سے بھی دوچار ہونا چاہیے۔ اگلی مہم میں اس کا بیٹا جیکی براؤن میرے نشانے پر آئے گا۔ آپ اس مہم کے بارے میں سوچیں۔ دل کو اطمینان ہوگا۔''

وہ ماسٹر سے رابطہ ختم کر کے میڈونا کے پاس آیا پھر بولا۔ ''کیا یقین کرو گی؟ تمہارے باپ نے کہہ دیا ہے کہ ماسٹر کے آگے نہیں جھکے گا۔ چاہے تمہیں قتل کر دیا جائے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میرے پاپا میری موت کا تصور کبھی نہیں کریں گے۔''

''ابھی تم اپنے باپ سے بات کرو گی۔ اس سے اپنی رہائی کی بات کرو گی۔ پھر سنو گی کہ سچ کیا ہے؟''

اس نے میڈونا کے فون پر اس کے باپ کے نمبر پنچ کیے۔ اس نے مراد سے فون لے کر کان سے لگایا۔ پھر باپ کی آواز سن کر پوچھا۔ ''پاپا! آپ میری رہائی کے لیے کیا کر رہے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''میں تمہاری رہائی کے لیے اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن دشمن کے آگے کبھی سر نہیں جھکاؤں گا۔ ان کی کوئی شرط تسلیم نہیں کروں گا۔''

''پھر تو یہ مجھے رہا نہیں کریں گے۔ آپ بیٹی کے لیے جان دے کر کیا کریں گے؟ بیٹی کی جان بچانے کی بات کیوں نہیں کر رہے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''میڈونا! تم نے شملہ جانے کی ضد کی۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے۔ اب جہاں بھی ہو، ذرا صبر سے رہو۔ وہ تمہیں کبھی قتل نہیں کرے گا۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میں یقین سے کہتا ہوں' تم جلد ہی واپس آؤ گی۔''

''یعنی آپ جان دینے کا دعویٰ کرنے کے باوجود کچھ نہیں کر رہے ہیں اور دشمن اتنا قابلِ اعتماد ہے کہ آپ مجھے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ رہے ہیں؟''

''تم کچھ بھی سمجھ لو۔ تمہیں اسی کے پاس رہنا ہے۔ اس کا دل جیتو اور چلی آؤ۔''

''آپ بیٹی کو ایک مرد کے بعد دوسرے مرد کو ٹریپ کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور یہ میرے ناز و انداز

سے پگھلنے والا نہیں ہے۔ اب آپ کی بیٹی مرجائے گی لیکن ایک بازاری عورت بن کر رہائی حاصل نہیں کرے گی۔''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر سر جھکا کر فون کو مراد کی طرف بڑھایا۔ اس نے فون لیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ مجرموں کی دنیا میں ماں، بہن اور بیٹی کی اوقات معلوم ہوگئی؟''

''ہاں، یہ معلوم کر کے تکلیف ہورہی ہے۔ پاپا نے میری ضد سے مجبور ہو کر یہاں آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ میرے ذریعے تمہیں ٹریپ کرنا چاہتے تھے۔ وہ مجھے ایک مہرے کی طرح استعمال کر رہے تھے۔''

''باپ خودغرض ہونے کے باوجود تمہارے دل میں رہے گا۔ تم اس کے پاس جانا چاہوگی۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مراد وہاں سے اٹھ کر جاتے ہوئے بولا۔ ''میں سوچتا ہوں تمہیں دہلی تک کیسے پہنچایا جائے۔''

کناری نے آکر کہا۔ ''بھیا! کھانا تیار ہے۔ چلو کھالو۔''

''میں ابھی آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد کھاؤں گا۔''

وہ وہاں سے چلا ہوا، سوچتا ہوا دور ایک چٹان کے سائے میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''یس ماسٹر؟''

وہ خوشی سے چیختے ہوئے بولا۔ ''مراد! تمہارے لیے ایسی خوش خبری ہے کہ سنو گے تو اچھل پڑو گے۔ خوشی کے مارے ناچنے لگو گے۔ آج میں تمہاری وفاداریوں کا ایسا انعام دے رہا ہوں جس کی تم نے توقع نہیں کی ہوگی۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''ایسی کیا خوش خبری ہے۔ ایسا کیا انعام ہے کچھ بولیں تو سہی؟''

''میرے بیٹے...! تم ابھی تھوڑی دیر بعد اپنی ماروی سے باتیں کرنے والے ہو۔''

وہ واقعی خوشی سے اچھل پڑا۔ بے یقینی سے بولا۔ ''کیا کہہ رہے ہو ماسٹر؟ کیا ماروی کا پتا چل گیا؟ کیا وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے؟ واقعی مجھ سے بات کرے گی؟''

''ناراض کیسے ہوگی؟ میں نے اس کو یقین دلایا ہے کہ تم نے مرینہ سے شادی نہیں کی ہے۔ تم اس پر سوکن نہیں لا رہے ہو۔''

''اوہ ماسٹر! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ پلیز ابھی اس سے بات کرائیں۔''

''اپنا فون بند کرو۔ ابھی اس کی کال آئے گی۔''

اس نے فون کو بند کر کے اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے لگا لیا۔ ابھی وہ فون ماروی کے مترنم لب و لہجے میں بولنے والا تھا۔

ادھر ماسٹر نے ماروی سے رابطہ کر کے کہا۔ ''ابھی میں نے مراد کا فون نمبر SEND کیا ہے۔ وہ نمبر پنچ کرو اور اپنے دیوانے سے باتیں کرو۔ وہ انتظار کر رہا ہے۔''

ماروی نے میسیج کا بٹن دبا کر وہ نمبر پڑھے۔ پھر دھڑکتے ہوئے دل سے انہیں پنچ کیا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی جیسے وہ انتظار میں تھا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ''ماروی! میری ماروی! یہ تم ہو؟ یہ تمہارا ہی نمبر ہے نا؟ میری جان! مجھے اپنی آواز سناؤ۔''

اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔ ''دوسری شادی مبارک ہو۔ تیسری کب کر رہے ہو؟''

وہ بڑے جذبے سے بولا۔ ''میری زندگی میں ماروی کی جگہ کوئی نہیں لے سکے گی۔ تمہیں ماسٹر نے بتایا ہے۔ یقین کرو میں نے مرینہ سے نکاح نہیں پڑھایا ہے۔ وہ مجھے تلاش کرتی رہے گی۔ لیکن مجھے نئے بہروپ میں بھی پہچان نہیں پائے گی۔''

''اور کبھی پہچان لے گی تو کیا ہوگا؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم اندیشے میں نہ رہو۔''

''جب تم نظر نہیں آؤ گے تو وہ مجھ پر نظر رکھے گی۔ تم کہیں بھی میرے ساتھ زندگی گزارو گے تو کیا پھر بھی تمہیں نہیں پہچانے گی؟''

وہ ذرا چپ رہا۔ فوراً ہی جواب سمجھ میں نہیں آیا پھر بولا۔ ''ہم سن سٹی میں رہیں گے۔ وہاں ماسٹر اسے قدم رکھنے کی اجازت بھی نہیں دے گا۔''

''یعنی تم ایک عورت کے ڈر سے کبھی میرے ساتھ سن سٹی سے نہیں جاؤ گے۔ ہمارے اپنے پاکستان میں بھی نہیں رہو گے؟''

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ''اور یہ تو ابھی صرف ایک مرینہ سے ڈرنے کی بات کر رہی ہوں۔ ورنہ تمہارا ایسا کون دشمن ہے جس کے پاس میری تصویر نہیں پہنچی ہے۔ تم چہرے بدل بدل کر مراد علی منگی کی صورت کو چھپاؤ گے اور وہ میرے ذریعے تمہیں آسانی سے پہچان لیں گے۔''

وہ بے بسی سے ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ ''ہم سلامتی سے کیسے رہیں گے؟ کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم امن وامان اور سکون سے رہ سکیں؟''

وہ بے بسی سے بولا۔ ''یہ ایک زہریلی سچائی ہے۔ تم

اب تک اس لیے زندہ سلامت ہو کہ مجھ سے دور ہو۔ میں جانتا ہوں، تمام دشمنوں کی نظریں تم پر رہتی ہیں۔ وہ انتظار کر رہے ہیں کہ تم ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے کسی کے ساتھ رہو، میں جس بہروپ میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا، وہ تاک میں رہنے والے مجھے گولی ماردیں گے۔ پھر شاید تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''ہم ایسی دنیا میں رہنے پر مجبور ہیں، جہاں ہم کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔''

''میرے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے۔ اگر تم میرے لیے ایک قربانی دو تو ہمیشہ ساتھ رہ سکیں گے۔''

''کیسی قربانی چاہتے ہو؟''

''میں بڑی رازداری سے تمہارا چہرہ تبدیل کراؤں گا۔ پھر کوئی تمہیں پہچان سکے گا نہ مجھے۔ جب کوئی دشمن ہمیں پہچان نہیں سکے گا تو میں ہتھیار پھینک دوں گا اور ایک پرامن شہری کی طرح تمہارے ساتھ وہ خوب صورت زندگی گزاروں گا جس کے خواب ہم بچپن سے دیکھتے آرہے ہیں۔''

''میں تمہارے لیے قربانیاں دیتی آرہی ہوں۔ یہ قربانی بھی دوں گی۔ میرا یہ چہرہ ماروی کی پہچان ہے۔ میں یہ پہچان مٹا دوں گی، تمہاری یہ تدبیر دل کو لگ رہی ہے۔ ہمیں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ میرے لیے سب سے خوشی کی بات یہ ہوگی کہ تم ہتھیار پھینک دو گے۔ میرے پہلے جیسے مراد بن جاؤ گے۔''

وہ دونوں ایک بہترین اور پرامن زندگی گزارنے کی اچھی پلاننگ کر رہے تھے اور مسرتوں سے سرشار ہو رہے تھے۔ مراد نے کہا۔ ''یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ میں نے سوچا تھا تم سے فون پر باتیں کرنے کے بعد آج ہی یہاں سے روانہ ہو کر کل تک پاکستان آؤں گا۔ تمہیں دھڑکنوں سے لگاؤں گا لیکن سوچتا ہوں کہ ابھی نہیں آؤں گا۔ پہلے دور ہی دور رہ کر رازداری سے تمہارا چہرہ تبدیل کراؤں گا۔''

وہ بولی۔ ''ایک بات یاد رکھو۔ چہرہ تبدیل کرانے کے سلسلے میں ماسٹر سے مدد نہیں لو گے۔ نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے ماسٹر سے بھی تعلق ختم کر دو۔''

''میں یہی کروں گا لیکن ہوسکتا ہے کہ صرف بلے اور اس کی بیوی بشریٰ کو رازدار بنانا پڑے۔ ویسے کوشش کروں گا کہ ان کے بغیر ہی ہم اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جائیں۔''

''جو کرنا ہے، بہت سوچ سمجھ کر کرو۔ مجھ سے ملنے کی بے قراری میں جلدی نہ کرنا۔ میں ایک صاف ستھری نئی زندگی گزارنے کے انتظار میں مہینوں اور برسوں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔''

''میں جو کچھ کرتا رہوں گا، وہ تمہیں فون پر بتاتا رہوں گا۔ ابھی فون بند کر رہا ہوں۔''

اس نے فون کو بند کر کے خوشی سے ایک انگڑائی لی۔ پورے جسم کو کمان کی طرح کھینچ لیا۔ ایک مدت کے بعد چہرہ اور شخصیت تبدیل کرنے کی نئی تدبیر ذہن میں آئی تھی اور وہ ہر حال میں اس پر عمل کرنے والا تھا۔

صحیح راستوں پر چلنے والے اپنے طور پر کوشش کرتے ہیں کہ غلط لوگوں سے کتراتے رہیں لیکن جب تک دنیا میں شیطان ہے اور شیطانیت ہے تب تک ان سے کترانے کے باوجود ٹکراتے رہنا پڑتا ہے، شر سے پنجہ لڑائے بغیر خیر کا راستہ نہیں ملتا۔

☆☆☆

مرینہ اس کی تلاش میں باؤلی ہو رہی تھی۔ اسے یقین کی حد تک شبہ تھا کہ مراد، میڈونا کے کاٹیج میں ہے لیکن دوسری صبح معلوم ہوا کہ وہ کاٹیج خالی ہو چکا ہے۔ اس نے حیرانی سے دیکھا۔ وہاں سے میڈونا اور گارڈز بھی چلے گئے تھے۔

اس نے چپت راؤ سے رابطہ کیا۔ اس وقت چپت راؤ اور درگا پہاڑیوں کے درمیان پیچیدہ اور اونچے نیچے راستوں پر تھے۔ وہ مراد، میڈونا اور گانے بجانے والوں سے رخصت ہو کر دہلی کی سمت جا رہے تھے۔

اس نے فون پر مرینہ کے نمبر پڑھے۔ پھر زیرلب کہا۔ ''اس مصیبت سے کیا بات کروں؟ یہ مجھ سے ملنے کو کہے گی تو بھید کھل جائے گا کہ میں شملہ میں نہیں ہوں۔ اس سے کیا بہانہ کروں؟''

اس نے فون کو چیخنے دیا۔ اسے اٹینڈ نہیں کیا۔ مرینہ نے اپنے فون کو ناگواری سے دیکھا پھر کاٹیج کے مالک کے پاس آکر پوچھا۔ ''کیا یہ کاٹیج کرائے پر مل سکتا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''نہیں۔ یہاں کرائے دار ہیں۔''

وہ بولی۔ ''میں نے کل رات تک مسلح گارڈز کے ساتھ کرائے دار کو دیکھا تھا لیکن اب تو یہاں کوئی نہیں ہے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ میں بھی حیران ہوں۔ پتا نہیں سب کے سب اچانک کہاں چلے گئے ہیں۔''

مرینہ سمجھ رہی تھی کوئی ایسی بات ہوئی ہے کہ مطلوبہ دوست اور دشمن سب ہی غائب ہو گئے ہیں۔ اس نے پھر چپت راؤ کو کال کی۔ پھر اس نے اٹینڈ نہیں کی۔

تب اس کا ماتھا ٹھنکا کہ اس کے ساتھ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ چپت راؤ اور ماسٹر جانتے ہیں کہ مراد شملہ میں کہاں

ہے اور اب یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کاٹیج سے میڈونا کہیں گئی ہے تو مراد بھی اس کے پیچھے گیا ہے۔

چمپت راؤ سے پہلے ماسٹر کا دست راست جگ دیو تھا۔ ان دنوں مراد اور مرینہ کے درمیان دشمنی تھی۔ ماسٹر اور جگ دیو در پردہ مراد سے کام لیتے رہتے تھے اور مرینہ سے حقیقت چھپاتے تھے۔

اب مرینہ یقین سے سوچ رہی تھی کہ ماسٹر اور چمپت راؤ پھر اسے دھوکا دے رہے ہیں۔ اس نے فوراً ہی ماسٹر سے فون پر کہا۔ ''مراد اب تک یہاں نظر نہیں آیا ہے۔ میڈونا کا کاٹیج خالی پڑا ہے اور چمپت راؤ میری کال اٹینڈ نہیں کررہا ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ مجھے بہت بڑا دھوکا دیا جارہا ہے۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''دھوکا ہم سب کھاتے آرہے ہیں۔ مراد نے ہم سب سے چھپ کر ہمیں الجھا دیا تھا۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے اس نے فون پر بتایا ہے کہ اب وہ کاٹیج خالی ہی رہے گا۔ وہ میڈونا کو اغوا کرکے کہیں لے گیا ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا...... اس نے میڈونا کو اغوا کیا ہے؟ اوہ گاڈ! کیسے کیا ہے؟ اسے کہاں لے گیا ہے؟''

''اسے کہیں بھی لے گیا ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے دشمن کی بیٹی کو قتل کردو لیکن وہ کہتا ہے کسی عورت کو ہلاک نہیں کرے گا۔ وہ باغی ہوگیا ہے۔ میرا حکم بھی ماننے سے انکار کررہا ہے۔ اس کے باوجود میرے دشمن کی بیٹی کو اس سے دور کرکے اسے دماغی طور پر ٹارچر کررہا ہے۔ مجھے دوسری طرح خوش کررہا ہے۔ عجیب سر پھرا ہے۔ کچھ ایبنارمل سا ہوگیا ہے۔''

''چمپت راؤ کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔ اسے ایک بار کال کی تھی۔ وہ اٹینڈ نہیں کررہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوگا۔''

''پلیز ماسٹر! مجھے مراد کا فون نمبر دیں، میں اس سے بات کروں گی۔''

''میں نمبر SEND کررہا ہوں لیکن اس سے رابطہ نہیں کرسکو گی۔ وہ سم بدل چکا ہے۔''

ماسٹر نے استعمال میں نہ آنے والی ایک سم کا نمبر اسے SEND کیا۔ مرینہ نے اس نمبر پر کال کی تو پتا چلا واقعی اس نے سم بدل دی ہے۔ رابطہ نہیں ہوا۔

وہ جھانسے میں آنے والی نہیں تھی۔ سوچنے لگی۔ اس نے سم بدل دی ہے یا ماسٹر دھوکا دے رہا ہے۔ چمپت راؤ کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ سب مراد کے حمایتی ہیں۔ اسے مراد سے دور رکھنے کے لیے چالیں چل رہے ہیں۔ وہ غصے سے سوچنے لگی۔

وہ بھی پینترے بدلنا جانتی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر تک اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد میکی براؤن سے رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ ''ہیلو کون ہو تم؟''

''میں مرینہ بول رہی ہوں۔ تمہاری بیٹی کو مراد سے چھین کر واپس لاسکتی ہوں۔''

وہ بے یقینی سے بولا۔ ''تم اور مراد کے خلاف کوئی کام کروگی؟ میں تو کیا کوئی اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ تم کس مقصد کے لیے یہ گیم کھیلنے میرے پاس آئی ہو؟''

''نہ میں دھوکا دے رہی ہوں، نہ تم دھوکا کھاؤ۔ مجھ سے دوستی بھی نہ کرو۔ بیٹی کی واپسی کے لیے میری کوئی شرط نہ مانو۔ میں کسی شرط کے بغیر اسے واپس لاؤں گی، مجھے صرف مراد کا فون نمبر بتادو۔''

''تعجب ہے۔ تم دونوں لیلیٰ مجنوں ہو اور لیلیٰ کو مجنوں کا فون نمبر معلوم نہیں ہے۔''

''اب ہم لیلیٰ مجنوں نہیں رہے۔ اس کا نمبر SEND کردو، فائدے میں رہو گے۔''

''ابھی SEND کررہا ہوں۔''

اس کے پاس نمبر آگیا۔ مرینہ جانتی تھی کہ وہ اس کا فون نمبر پڑھتے ہی اپنا فون بند کردے گا۔ لہٰذا اس نے سم بدل کر اس کے نمبر پنچ کیے۔ پھر اسے کان سے لگایا۔ تھوڑی دیر بعد اس بے وفا بے مروّت کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو، کون ہے؟''

وہ بولی۔ ''کیا بتاؤں کہ کون ہوں؟ میری آواز سنتے ہی تمہارے اندر دھما کا ہورہا ہوگا۔''

وہ چپ رہا۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ ''کچھ تو پچھلی محبتوں اور رفاقتوں کا خیال کرو۔ میں ابھی ملنے کو نہیں کہوں گی لیکن فون پر تو دو باتیں کرلیا کرو۔''

وہ پھر چپ رہا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تم سن رہے ہو؟''

اس کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی لیکن وہ کچھ نہ بولا۔

وہ بولی۔ ''میں نہیں جانتی' تم نے اچانک میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیا ہے؟ اگر میں کوئی غلطی کرتی تو تم مجھ سے شکایتیں کرتے۔ میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان پہنچتا تو مجھ سے انتقام لیتے لیکن نہ میرے خلاف بول رہے ہو، نہ مجھ سے دشمنی کررہے ہو۔ پھر ایسا کیا ہوا ہے کہ اچانک مجھ سے دور ہوگئے ہو؟''

اس نے بڑی دیر بعد کہا۔ ''مرینہ! تم بہت اچھی ہو لیکن میں مجبور ہوگیا ہوں۔ تم سے دور رہ کر تم سے ہر طرح کا رشتہ توڑ کر ہی ماروی کو جیت سکتا ہوں۔ میں اس کے بغیر جی نہیں سکوں گا۔ یار کو منانے کے لیے ساری دنیا کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں سب کو چھوڑ کر اس کی ذات میں گم ہوجاؤں گا۔''

''بچوں جیسی باتیں کررہے ہو۔ تم اور ماروی اپنے چہرے بدلنے کے بعد بھی زیادہ دنوں تک چھپ نہیں سکو گے۔ ہر ملک ہر شہر میں دشمن تمہاری بُو سونگھتے پھریں گے۔ میں اس سلسلے میں بہت کچھ کہہ سکتی ہوں۔ بہت لمبی بحث ہوسکتی ہے۔ میں ابھی صرف کام کی باتیں کروں گی۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ''یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ اب تم ایک بار بھی مجھ سے ملنا نہیں چاہو گے۔ بولو میں درست کہہ رہی ہوں نا؟''

''ہاں۔ میں نے ماروی کو زبان دی ہے۔ تم کبھی مجھے دور سے بھی نہیں دیکھ سکو گی۔''

''تو پھر شرط لگاؤ۔ اگر تمہارے پاس پہنچ جاؤں تو ہار مان کر میرے ہوجاؤ گے؟''

''نہیں۔ قریب آؤ گی تو پھر تم سے دور ہوجاؤں گا۔''

''تو پھر دور رہو۔ یہ یاد رکھو' کسی دن پہنچنے والی ہوں۔ وہ دن تمہاری اسیری کا ہوگا۔ پھر تم رہائی کے لیے جان بھی دینا چاہو گے تو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ میں پھر وہی مرینہ بن جاؤں گی جو تمہاری دشمن بھی تھی اور دیوانی بھی تھی۔ تم یہی چاہتے ہو کہ میں دشمنی کرتے ہوئے محبت کرتی رہوں۔''

مراد نے فون بند کردیا۔ اس کے چیلنج کو اس نے اہمیت نہیں دی۔ وہ جس قدر اس کی دیوانی تھی، اس سے زیادہ وہ عاشق ماروی کا دیوانہ تھا۔

اسی بات پر غصہ آرہا تھا۔ وہ تلملا رہی تھی کہ وہ اتنی محبت اس سے کیوں نہیں کرتا؟

وہ اسے تلاش کرنے کے دوران میں سوچتی رہی تھی کہ جب وہ نہیں ملے گا تو اسے کس طرح اپنے سامنے آنے پر مجبور کرے گی؟

ماروی...... وہی اس دیوانے کی جان تھی۔ وہ ماروی کو ٹریپ کرکے اس کی آدھی جان نکال لے گی۔ باقی آدھی جان ہوکر دوڑتا ہوا اس کے قدموں میں آجائے گا۔

مراد نے آخری بار اسے بتایا تھا کہ ماروی اس سے ناراض ہوکر کراچی چلی گئی ہے اور کہیں گم ہوکر چھپ کر رہنے لگی ہے۔

مرینہ نے فیصلہ کرلیا' وہ کراچی جائے گی اور کسی بھی طرح اس گم ہوجانے والی کی شہ رگ تک پہنچ جائے گی۔

وہ ایک ہندو دھرم پتنی رنجنا کے روپ میں تھی۔ اس روپ میں ابھی تک کسی نے اسے مرینہ کے طور پر نہیں پہچانا تھا۔ آئندہ وہ انڈیا سے لندن جانے والی تھی۔ وہاں سے نئی پلاننگ کے ساتھ کراچی جانے کا ارادہ تھا۔

موجودہ حالت میں اس کے ساتھ ایک خوش نصیبی تھی اور ایک بدنصیبی تھی۔ خوش نصیبی یہ کہ ماروی روپوشی سے باز آگئی تھی اور رہائش کے لیے کراچی آگئی تھی۔ مرینہ کو اس کی تلاش میں بھٹکنا نہ پڑتا۔

اور بدنصیبی یہ تھی کہ ایسے وقت بشریٰ اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں پہنچ گئی تھی۔ مرینہ کے لیے ماروی اب تر نوالہ نہ ہوتی۔ اگرچہ بشریٰ' مرینہ کے مقابلے کی فائٹر تو نہیں تھی پھر بھی اسے لوہے کے چنے چبوا دیتی۔

ماروی' چاچی اور چاچا کے ساتھ یہ مسائل تھے کہ وہ لاکھوں روپے کیش اپنے پاس رکھ کر کسی نئے شہر یا انجانے علاقوں میں نہیں رہ سکتے تھے۔ دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی لوٹنے آجائے گا۔ پھر ماروی جوان تھی۔ اس کا حسن دور ہی سے پکارتا تھا۔ ہر آنکھ اسے دیکھتی تھی اور دیکھنے کے بعد اسے مانگنے لگتی تھی۔ تن کے اور دھن کے لٹیروں سے بچنا محال تھا۔ اس لیے وہ پھر چاچی چاچا کے ساتھ کراچی آگئی تھی۔

وہاں بھی وہی پرانا مسئلہ تھا۔ اپنے نامراد عاشق محبوب علی چانڈیو سے چھپ کر رہتا تھا۔ پچھلی بار اس سے چھپنے کے لیے عبا پہن کر باہر نکلتی تھی۔ منہ پر نقاب رہتا تھا۔ اس کے باوجود انٹیلی جنس کے افسر حماد صدیقی نے اسے دیکھ لیا تھا اور محبوب کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ تقدیر اسے محبوب سے بھی دور نہیں رکھتی تھی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کیوں اس سے چھپ کر رہے؟ وہ بھی شادی کرچکا ہے۔ سمیرا جیسی حسین اور ذہین بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ اب عشق و محبت کی کتاب کو بند ہوجانا چاہیے۔ اس کتاب کو پھر سے کھلنا نہیں چاہیے۔

سمیرا نے ایک بار اس سے جان لیوا دشمنی کی تھی۔ اس کے بعد شرمندہ ہوکر اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ ماروی کے ضد کرنے پر ہی محبوب نے اس سے شادی کی تھی۔ سمیرا کے خواب پورے ہوئے تھے۔ وہ ماروی کی عقیدت مند ہوکر اسے چاہنے لگی تھی۔

ماروی نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ سمیرا نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟ محبوب کہہ رہے تھے کہ اس شہر سے دور کہیں جاکر چھپ گئی ہو۔ آئندہ کبھی یہاں نہیں آؤ گی؟''

''میں واپس آگئی ہوں۔ روپوش رہنے کے کچھ تلخ تجربات سے گزرنے کے بعد میری مجبوریاں مجھے واپس لے آئی ہیں۔ تم کسی طرح کا اندیشہ نہ کرنا' میں محبوب کو بھی اپنے آس پاس بھٹکنے نہیں دوں گی۔''

''ماروی! میں تمہیں بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ تم اپنے مراد سے ناراض ہونے کے باوجود' اس سے دور ہونے کے باوجود محبوب کو بھی قریب آنے نہیں دو گی۔''

''تمہیں یہ خوش خبری سنا دوں کہ مراد سے صلح ہوگئی ہے۔''

''یہ واقعی میرے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ خدا تم دونوں کی دلی مرادیں پوری کرے گا۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں یہاں امن و امان سے رہو اور دشمنوں کا سایہ بھی تم پر نہ پڑے۔''

''جب تک دوا نہ کرو، دعا اثر نہیں دکھاتی۔ اپنے میاں کو لگام دو۔ اسے بتاؤ کہ میں آگئی ہوں لیکن ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھوں گی۔ تمہارا بھی فرض ہے کہ اپنے شوہر کو صرف اپنے نام رکھنے کے لیے اپنے حقوق کے لیے فائٹ کرو۔''

''میں ضرور ایسا کروں گی۔ یہ شاور لے رہے تھے۔ ابھی کمرے میں آئے ہیں۔ میں پھر کسی وقت تمہیں کال کروں گی۔''

سمیرا نے فون بند کردیا۔ محبوب نے تولیے سے گیلے بالوں کو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ ''کس سے باتیں کر رہی تھیں؟''

''ماروی سے...''

وہ مختصر سا جواب ایسا تھا کہ وہ اچھل پڑا۔ ہاتھوں سے تولیا چھوٹ گیا۔ اس کے حلق سے جیسے چیخ نکلی۔ ''ماروی...!''

وہ تیزی سے چلتا ہوا سمیرا کے پاس آیا۔ پھر اس نے فون کو اس کے ہاتھ سے چھین کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ روپوش ہوگئی تھی۔ اس نے اچانک کال کی ہے۔ وہ کسی مشکل میں ہوگی۔''

سمیرا اس کے ہاتھ سے فون لے کر بولی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بہت خوش ہے۔ مراد سے اس کی صلح ہو گئی ہے۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''میں نہیں مانتا۔''

''آپ کیوں نہیں مانتے؟ کیا یہ چاہتے ہیں کہ وہ مراد سے بدظن رہے؟ وہ ایک اچھی ازدواجی زندگی نہ گزارے؟''

''میں یہ تو نہیں کہہ رہا ہوں۔''

''تو پھر ان کے لیے نیک خواہشات رکھیں۔ وہ بہت خوش ہے۔ اسے خوش رہنے دیں۔ اس کے معاملات میں نہ پڑیں۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ کیا اس سے بات نہ کروں؟ اسے مبارک باد نہ دوں؟''

''اگر وہ آپ کو کال کرے' تب آپ اس کے معاملات میں بولیں۔ وہ چاہتی تو مجھے کال نہ کرتی' آپ کو کرتی لیکن وہ آپ سے کترا رہی ہے۔ آپ کو بھی ایک ذرا ریزرو رہنا چاہیے۔''

وہ پھر اس کے ہاتھ سے فون لے کر بولا۔ ''مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے ماروی کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ چند لمحوں کے بعد ہی اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہاں سمیرا...... بولو۔''

وہ چہکتے ہوئے بولا۔ ''میں بول رہا ہوں ماروی! تم اچانک کہاں گم ہوگئی تھیں۔ ابھی تمہاری آواز...''

وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ لائن کٹ گئی تھی یا کاٹ دی گئی تھی۔ اس نے ری ڈائل کیا۔ اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ پھر فون خاموش ہوگیا۔ محبوب نے مایوس ہو کر فون کو دیکھا پھر ری ڈائل کیا۔ پھر وہی ہوا، جو ہونا چاہیے تھا۔

سمیرا نے کہا۔ ''آپ بار بار دستک دیتے رہیں گے۔ وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ میں نے کہا نا' وہ آپ سے بات کرنا چاہتی تو پہلے آپ کو کال کرتی' مجھے نہ کرتی۔ کیا اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟''

''مجھے نہ سمجھاؤ۔ وہ کیا کہہ رہی تھی؟''

''یہی کہ مراد کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ مراد کے ساتھ اچھی گزرتی تو اسے چھوڑ کر سن سٹی سے یہاں تنہا نہ آتی۔''

''میاں بیوی کے درمیان ناراضگی ہوجاتی ہے پھر صلح ہوجاتی ہے۔ ہر گھر میں یہی ہوتا ہے۔''

''ہمارے درمیان ایسا نہیں ہوتا۔ ہم ایک دوسرے سے ناراض نہیں ہوتے۔''

''آپ میرے اندر بیٹھ کر نہیں دیکھتے۔ جب ماروی سے دھیان لگائے رہتے ہیں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے۔ دنیا کی ہر بیوی کو تکلیف ہوتی ہے' جب اس کا شوہر دوسری عورت کا دیوانہ ہوتا ہے۔''

وہ قریب ہو کر بولی۔ ''آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ دوسروں کے دکھ درد کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور انہیں دور بھی کرتے ہیں۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ صرف میری تکلیف نہیں

سمجھتے ..... اور نہ میرے درد کی دوا کرتے ہیں۔''

وہ دور ہو کر الماری سے لباس نکال کر پہنتے ہوئے بولا۔ ''فضول شکایت کر رہی ہو۔ میں دنیا کا ہر عیش و آرام تمہیں دیتا ہوں۔ میری دولت میرا کاروبار سب تمہارا ہے۔''

''آپ تمام دولت اور کاروبار ماروی کو دے دیں۔ صرف اپنا پیار میرے لیے رہنے دیں۔''

''میں نے شادی سے پہلے ہی تمہیں کہہ دیا تھا کہ ماروی میرے دل و دماغ سے کبھی نہیں نکلے گی۔ تم اسے نکالنا چاہو گی تو میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا۔''

وہ لباس پہن چکا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے چلا گیا۔ شوہر یہی کرتے ہیں۔ جو روز حاصل ہوتی رہتی ہے' اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ سمیرا کو اندیشہ تھا کہ وہ ماروی سے اسے دور کرنا چاہے گی تو وہ دیوانہ پاگل اسے طلاق دے دے گا اور وہ ایک ارب پتی شوہر کو چھوڑنے کی نادانی نہیں کرسکتی تھی۔

وہ بے بسی سے تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی۔ محبوب پھر واپس آیا۔ سمیرا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''وہ آج بھی مجھے دل میں چھپا کر رکھتی ہے۔ اس نے مجھے کال نہیں کی تم سے بات کی۔ جانتی ہو کیوں؟ وہ اس لیے کہ تم مجھے بتاؤ گی کہ وہ اب گمشدہ نہیں ہے۔ مری نہیں ہے۔ میرے لیے زندہ ہے۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں اس کے ناز و انداز کو سمجھتا ہوں۔ پہلے ہی دن سے اس کی زبان پر نہ ہے لیکن دل میں ہاں ہے۔ یہ اس کی دل لوٹنے والی ادا ہے۔ وہ زبان سے نہیں بولتی۔ اداؤں سے سمجھا دیتی ہے۔ میں اس کے انکار کے باوجود اسے رفتہ رفتہ شادی کے مرحلے تک لے آیا تھا۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ ٹیوب بے بی کے باعث باپ بننے کا الزام اٹھا کر ناکام رہا۔ لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اندر ہی اندر مجھ سے راضی رہتی ہے۔''

اس نے قریب آ کر پوچھا۔ ''سچ بولو۔ اس نے فون پر کیا کہا تھا؟ کچھ تو میرے متعلق کہا ہوگا؟''

اس نے ہاری ہوئی عورت کی آنکھوں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ ''اس نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ میں آپ کو اس کی طرف جانے سے باز رکھوں۔''

''اس نے بتایا ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟''

''وہ اس شہر میں واپس آگئی ہے۔''

''ہاں۔ یہی اس کی ادائیں ہیں۔ وہ تمہارے ذریعے مجھے بتا رہی ہے کہ اب گمشدہ نہیں ہے۔ میں اسی شہر میں اسے تلاش کرسکتا ہوں۔ اس نے اپنا رہائشی پتا نہیں بتایا ہوگا؟''

''اس نے نہیں بتایا ہے۔''

''وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے پیچھے دوڑوں۔ اسے تلاش کروں۔ یہ تم دیکھتی آ رہی ہو' مجھے اپنے پیچھے لگائے رکھنے کا یہ کھیل وہ شروع سے کھیلتی آ رہی ہے۔''

اس کی بات سمیرا کے دل کو لگ رہی تھی۔ اس نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا کہ ماروی نے کال اسے کی ہے لیکن اس کے ذریعے اپنے دیوانے کو اطلاع فراہم کرچکی ہے کہ اسی شہر میں ہے جب چاہو، آ جاؤ۔

یہ بات بھی سمیرا کے دل کو لگ رہی تھی کہ وہ شروع ہی سے مراد اور محبوب کی محبوبہ بنی ہوئی ہے۔ دونوں کو اپنے پیچھے لگائے رکھتی ہے۔ محبوب سے کہا تھا کہ اس کی عزت کرتی ہے، اسے دل سے چاہتی ہے لیکن شادی مراد سے کرے گی اور ایسا کہہ کر محبوب کو یقین دلایا تھا کہ اس سے شادی نہ کرنے کے باوجود اسے دل سے چاہتی رہے گی۔

اور وہ یہی کر رہی تھی۔ اس نے کراچی واپس آتے ہی سمیرا کے ذریعے اطلاع دی تھی کہ وہ دیوانے کے شہر میں آگئی ہے۔

اگرچہ وہ ماروی کی احسان مند تھی اور اس سے بڑی عقیدت رکھتی تھی لیکن اچانک ہی اس کے خلاف سوچنے لگی۔ اسے اپنا شوہر محبوب بے قصور نظر آ رہا تھا۔ اب قصوروار وہ نظر آ رہی تھی۔ کراچی آتے ہی بڑی چالاکی سے بیوی کے ذریعے شوہر کو ورغلا رہی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ ''آپ کا قصور نہیں ہے۔ آپ ابھی کچھ عرصے تک میرے ساتھ بہت ہی خوب صورت وقت گزار رہے تھے۔ کاروبار میں دل لگا رہے تھے۔ اس نے پھر یہاں آ کر آپ کو بھڑکا دیا ہے۔''

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارا شوہر ہوں۔ تمہارا ہی رہوں گا۔ قانونی طور پر تم ہی میری شریک حیات ہو۔ وہ اس گھر میں نہ بیوی بننے آ رہی ہے، نہ آئے گی۔ مراد کو نہیں چھوڑے گی۔ اگر ہمارے درمیان عشق و محبت کا کھیل جاری ہے تو رہنے دو۔ تمہارا کیا بگڑ رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''مراد مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے، اس کے بے شمار جانے انجانے دشمن ہیں۔ وہ آج نہیں تو کل ضرور مارا جائے گا پھر وہ آپ ہی کی طرف دوڑی چلی آئے گی۔ اسی لیے ابھی سے راستے ہموار کر رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں اسے گلے لگا لوں گا لیکن وہ تمہارے حقوق کبھی حاصل نہیں کرسکے گی۔ اربوں روپے کا

کاروبار نہ کبھی سنبھال سکے گی، نہ کبھی بزنس کمیونٹی میں اور سوسائٹی میں ایک سانس بھی لے سکے گی۔ وہ ایک بے چاری سی سوکن بن کر آئے گی۔ اپنی ایک الگ زندگی گزارتی رہے گی۔ تمہیں ایسی سوکن کی کبھی پروا نہیں کرنی چاہیے جو تمہارے حقوق کبھی چھین نہیں سکے گی۔''

سمیرا اس کی طرف گھوم کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ محبوب اسے بازوؤں میں لے کر محبت دینے لگا پھر بولا۔ ''ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں رہتی ہے؟ اس کے کیا حالات ہیں اور وہ مراد جیسے مجرم کے ساتھ کس طرح آزادی سے زندگی گزار سکے گی۔''

سمیرا نے فون پر اس کے نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی معلوم کرتی ہوں۔''

اس نے فون کو کان سے لگایا۔ رابطہ ہوتے ہی ماروی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو سمیرا......! تم بول رہی ہو؟''

''ہاں، میں بول رہی ہوں۔ محبوب تم سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ تم نے انہیں بُری طرح مایوس کیا ہے۔''

''اس کے باوجود وہ مجھ سے مایوس نہیں ہوں گے۔ تم انہیں سمجھاؤ کہ یہاں مجھے مراد کے ساتھ سکون سے رہنے دیں۔ میرے سامنے کبھی نہ آئیں۔''

''کیا مراد یہاں تمہارے ساتھ ہے؟''

''ابھی نہیں ہے۔ جلد ہی آنے والا ہے۔''

''وہ تمہارے ساتھ یہاں آزادی سے کیسے رہے گا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے اسے گرفتار کرلیں گے۔''

ماروی نے کہا۔ ''ہم نے ساتھ رہنے کی کچھ پلاننگ کی ہے۔ خدا نے چاہا تو مراد پولیس والوں سے اور اپنے دشمنوں سے محفوظ رہیں گے۔ پلیز مجھ سے یہ نہ پوچھنا کہ ہم نے پلاننگ کیا کی ہے؟''

''میں نہیں پوچھوں گی۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا مجھ سے ملنا چاہوگی؟''

''اگر تم تنہا آؤ گی تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''تمہاری رہائش کہاں ہے؟''

ماروی اسے رہائش پتا بتانے لگی۔ وائڈ اسپیکر آن تھا۔ محبوب کو اس کا پتا معلوم ہوگیا۔ وہ دونوں سن رہے تھے اور ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

وہ ماروی سے بولی۔ ''میں آفس کے معاملات میں بہت مصروف ہوں۔ کل کسی وقت آؤں گی۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ سمیرا نے پوچھا۔ ''اب آپ کیا کریں گے؟''

''معلوم کروں گا کہ مراد کے بارے میں وہ کس حد تک سچ بول رہی ہے۔ واقعی اس سے صلح ہوگئی ہے یا نہیں؟ اگر صلح ہوچکی ہے تو مراد کہاں ہے؟ کیا آچکا ہے؟ چھپا ہوا ہے؟ اور اس سے چھپ کر ملتا رہتا ہے یا موجود نہیں ہے؟ یا کبھی نہ کبھی آنے والا ہے؟''

وہ سمیرا کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اللہ تعالیٰ مجھے نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں ماروی کی خاطر مراد سے دشمنی نہیں کروں گا۔ اپنے ذرائع کے مطابق اسے سیکیورٹی دوں گا۔ میں اسے ایک ہنستی کھیلتی زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ بے شک و شبہ ماروی کی خوشیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مراد کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتا تھا اور... اور مراد کے حالات اسے یہ اطمینان دلاتے رہتے تھے کہ وہ زیادہ دن نہیں جیے گا۔ اپنے دشمنوں کی یا پولیس والوں کی گولیوں سے ضرور مارا جائے گا۔

ہائے ری حسرت ....! وہ اسی امید پر ماروی سے آس لگائے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

بشریٰ اور بلا ائرپورٹ کے ویٹنگ ہال میں آگئے۔ وہ بہت خوش تھی۔ اپنی دلی آرزو کے مطابق پاکستان جارہی تھی۔ جہاز ایک ذرا تاخیر سے جانے والا تھا۔ فون کی رنگ ٹون نے بلے کو مخاطب کیا۔ اس نے بشریٰ سے کہا۔ ''میکانو البرٹ بہت بے چین ہے، تیسری بار کال کررہا ہے۔''

وہ بولی۔ ''اسے کب تک نظر انداز کرو گے؟ کال اٹینڈ کرلو اسے اور نہ دوڑاؤ۔ ابھی دوٹوک فیصلہ سنادو۔''

اس نے بٹن کو دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف میکانو شدید اضطراب میں مبتلا تھا، وہ چیخ کر بولا۔ ''مراد! تم نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میرے تینوں بدترین دشمنوں کو ایک ہی دن میں ختم کردیا ہے۔ او گاڈ! میں کن الفاظ میں تمہاری تعریفیں کروں؟ تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں تمہارے لیے خزانے کا منہ کھول دوں گا بولو کیا چاہتے ہو؟ کتنا چاہتے ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ بولا۔ ''تم نے کل یہ کامیابیاں حاصل کیں اور اب تک خاموش رہے۔ اپنی زبان سے مجھے یہ خوشخبری نہیں سنائی۔ ایک کال بھی نہیں کی۔ اور میری بھی کال اٹینڈ نہیں کررہے تھے۔ تم نے اچانک خاموشی کیوں اختیار کی ہے؟''

بلے نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''تم مسلمانوں کے دشمن ہو۔ ڈبلیو اے ایم کے ایک اعلیٰ عہدیدار ہو۔''

ادھر اسے چپ لگ گئی۔ پھر وہ جلدی سے بولا۔ ''نن......نہیں تو میرا بھلا ان سے کیوں تعلق ہوگا۔ وہ لوگ مسلمانوں کے دشمن ہیں اور میں تو تمہارا دوست ہوں۔ تمہارا قدردان ہوں۔ معلوم ہوتا ہے تمہیں کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے۔''

وہ پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''تم مراد علی منگی سے بات کررہے ہو۔ میں آخری بار سچ بولنے کا موقع دے رہا ہوں۔ اگر فون بند کردیا تو کسی بھی وقت تمہاری سانسیں بند ہوجائیں گی۔''

وہ بُری طرح مضطرب ہوکر بولا۔ ''گاڈ بلیس یو۔ دشمن کے لہجے میں نہ بولو۔ آئندہ میرے تمہارے درمیان کروڑوں ڈالرز کی ڈیلنگ ہوگی۔ پلیز مذہبی معاملات کو بیچ میں نہ لاؤ۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''سنو......ایک خدا اور آخری رسول ﷺ میری گھٹی میں مجھے ملے ہیں۔ یہ تو آخری سانس تک نہیں جائیں گے، لیکن میں جب چاہوں گا۔ تم دنیا سے چلے جاؤ گے۔ ایملی نے تمہیں بتایا ہوگا کہ ہارپر کے بنگلے میں میرے ساتھ مسلح افراد آئے تھے۔ سن لو کہ وہ سب دین اسلام کے شیدائی ہیں۔

''میں نے انہیں لاکھوں ڈالرز کے ہیرے مالی امداد کے طور پر دیے ہیں۔ آئندہ تم اس وقت تک زندہ رہو گے جب تک ہر ماہ پچاس لاکھ ڈالرز انہیں پہنچاتے رہو گے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو مراد؟ کیوں مجھ سے دشمنی کررہے ہو۔ ماہانہ پچاس لاکھ ڈالرز بہت ہوتے ہیں۔''

''گرودر مرچکا ہے۔ وہ شیدائی تمہارے بیٹے والٹر کو اس کی قید سے نکال کرلے جائیں گے۔ بیٹے کی بھی خیر مناؤ۔ آئندہ نظام بن عظیم نے تمہارا رابطہ رہے گا۔ میں اپنے فون کی سم بدل رہا ہوں۔ مجھے بھول جاؤ۔ جب تمہاری موت آئے گی تو ایک اندھی گولی کی طرح چلا آؤں گا۔''

اس نے فون بند کرکے سم بدل دی۔ حالات اسے تبدیلی کی طرف لے جارہے تھے۔ آثار کہہ رہے تھے کہ وہ رفتہ رفتہ جرائم کی دنیا سے نکل جائے گا۔ فی الحال اس نے وہ شہر چھوڑ دیا۔

اس نے ایک طویل عرصے کے بعد بشریٰ کے ساتھ اپنی پاک دھرتی پر قدم رکھا۔ وہ لگیج ہال سے اور کسٹم چیکنگ سے گزر کر باہر وزیٹرز لابی میں آکر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کے چہرے، شخصیت اور رکھ رکھاؤ بدل چکے تھے۔ اب وہ انگریزی فرفر بولتے تھے۔ پولیس والے اور دوسرے دشمن انہیں پہچان نہیں سکتے تھے۔

پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات کے مطابق اس کا نام اور پیشہ بدل گیا تھا۔ وہ لندن سے پاؤنڈز کے حساب سے دولت کما کر اپنی بیوی کے ساتھ اپنے وطن واپس آیا تھا۔ ان دونوں پر شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابھی یہ سوچ کر آئے تھے کہ کسی ہوٹل میں رہیں گے پھر ایک چھوٹا سا مکان خرید کر وہاں رہائش اختیار کریں گے اور گم ہونے والی ماروی کو تلاش کریں گے۔

بلے نے فون پر ماسٹر سے کہا۔ ''ہم پلاننگ کے مطابق کراچی آگئے ہیں۔ آج ہی سے ماروی کی تلاش میں نکلیں گے۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''اس کی تلاش میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماروی اسی شہر میں ہے۔ مراد سے اس کی صلح ہوگئی ہے۔ اب تمہیں اس سے دور رہ کر اس کی نگرانی اور حفاظت کرنی ہے۔''

بشریٰ فون سے کان لگا کر سن رہی تھی۔ خوش ہوکر بولی۔ ''بڑا مزہ ہے، اس ملاپ میں۔ جب صلح ہوجائے، جنگ ہوکر۔''

بلے نے فون پر ہاتھ رکھ کر ڈانٹا۔ ''کیا تیرا بولنا ضروری ہے؟ چپ کر۔ بات کرنے دے۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ جانتے ہیں، ماروی اس شہر میں کہاں رہتی ہے؟''

ماسٹر نے کہا۔ ''مراد کو معلوم ہوگا۔ میں اس کا موجودہ فون نمبر دے رہا ہوں۔ اس سے بات کرو۔''

مراد وہاں میڈونا کو رہائی دے کر جلد سے جلد اپنی اور ماروی کی پلاننگ پر عمل کرنے والا تھا۔ اس نے گانے بجانے والے ہارمونیم ماسٹر سے کہا۔ ''تم میڈونا کو دہلی تک پہنچادو۔ یہ وہاں سے خود ہی باپ کے پاس چلی جائے گی۔''

وہ خود میڈونا کے ساتھ ادھر جاکر دشمنوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس سے دور رہ کر اس کے پیچھے خود دہلی جانے والا تھا۔ میڈونا نے اس سے رخصت ہوتے وقت بڑی عقیدت سے کہا۔ ''تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔ میں تمہیں کبھی بھلا نہیں سکوں گی۔''

اس نے کہا۔ ''اچھائی کو اور نیکیوں کو سمجھتی رہو گی تو باپ کی مجرمانہ زندگی پر لعنت بھیج دو گی لیکن ایسا نہیں کرو گی۔ پیدائشی یہودی ہو۔ یہاں سے جاتے ہی نیکی اور انسانیت کو بھول جاؤ گی۔ بہرحال جاؤ یہاں سے۔''

وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے اپنا سفری

بیگ اٹھایا۔ کناری، منجو اور ان کا بوڑھا باپ سب ہی رونے لگے۔ کناری اور منجو نے اس سے لپٹ کر کہا۔ ”بھیا! ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ آپ کے بغیر یہ زندگی اب خالی خالی لگے گی۔“

اس نے کہا۔ ”تم سب دیکھ رہی ہو۔ میں خطرے سے بھرپور زندگی گزار رہا ہوں۔ میں نے اپنا فون نمبر لکھ کر دیا ہے۔ ایک فون خرید کر اپنے پاس رکھو۔ جب کناری اور منجو کی شادی ہو تو مجھے فون کرنا۔ میں یہاں آنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور یہاں سے جاتے ہی اپنی دونوں بہنوں کے لیے پانچ پانچ لاکھ روپے بھیج دوں گا۔“

دونوں بہنوں نے اسے چوم لیا۔ وہ انہیں روتا چھوڑ کر ایک خچر پر بیٹھ کر وہاں سے چل پڑا۔ اونچے نیچے خطرناک راستوں سے گزرنے کے دوران بلّے نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”ہاں بلّے! کہاں ہو تم؟“

”میں کراچی آ گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ ماروی کہاں ہے؟ میں دور ہی دور سے اس کی نگرانی کرتا رہوں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”یہ اچھا ہوا کہ تم وہاں پہنچ گئے ہو۔ محبوب اور اس جاسوس افسر حماد صدیقی پر نظر رکھو۔ میں ابھی ماروی سے باتیں کرنے کے بعد اس سے تمہاری بات کراؤں گا۔ کوئی بھی ماروی کے لیے پرابلم بنے گا تو وہ فوراً تمہیں اطلاع دے گی۔ فون بند کرو۔ میں ابھی کال کرتا ہوں۔“

مراد خچر سے اتر کر ایک چٹان کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فون پر ماروی کو مخاطب کیا۔ اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”تم خیریت سے ہو نا؟“

”خدا کا شکر ہے۔ خیریت سے ہوں۔ آج یا کل کسی فلائٹ سے لندن جاؤں گا۔ پھر وہاں بڑی رازداری سے تمہیں بلاؤں گا۔ تم تنہا آؤ گی۔ جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تم کسی کی نظروں میں نہیں آئی ہو اور کوئی چھپ کر ہماری نگرانی نہیں کر رہا ہے تب کسی ماہر سرجن سے تمہارا چہرہ تبدیل کراؤں گا۔“

وہ بڑی بے تابی سے بولی۔ ”میں اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کروں گی۔“

”ابھی ضروری بات یہ ہے کہ میرا قابل اعتماد ساتھی میرا دست راست بلال احمد عرف بلاّ اپنی بیوی کے ساتھ تمہیں سیکیورٹی دینے آیا ہے۔ تم اسے پہچانتی ہو۔“

”ہاں، وہ دو بار تمہاری ہدایت کے مطابق مجھ سے لاکھوں روپے لینے آیا تھا۔ میں اسے پہچانتی ہوں۔“

”اب نہیں پہچانو گی۔ اس کی بھی صورت بدل چکی ہے۔ ابھی وہ تمہیں کال کرے گا۔ اس سے باتیں کرو۔ اگر رازداری سے مل سکتی ہو تو ضرور اس سے ملاقات کرو۔ تم کسی بھی معاملے میں اس پر اندھا اعتماد کر سکتی ہو۔ میں اسے تمہارا فون نمبر دے رہا ہوں، ابھی وہ کال کرے گا۔“

پھر اس نے بلّے سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”ماروی کو کال کرو۔ وہاں فی الحال میکی براؤن کے آدمیوں سے خطرہ نہیں ہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی تمہیں نہیں پہچانیں گے لیکن مجھے محبوب کھٹک رہا ہے۔ تم محبوب اور حماد صدیقی پر کڑی نظر رکھو گے۔ مجھے بتاتے رہو کہ وہاں کیا کر رہے ہو۔“

اس نے ماروی کا فون نمبر بتا کر رابطہ ختم کر دیا۔ پھر خچر پر بیٹھ کر آگے جانے لگا۔

ماروی کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ننھی سی اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ وہ سمجھ گئی بلاّ ہی ہوگا۔ اس نے بٹن کو دبا کر فون پر کہا۔ ”ہیلو کون؟“

بلّے نے کہا۔ ”بھابی! میں ہوں، بلال احمد.... ابھی مراد نے آپ کا یہ نمبر دیا ہے۔“

”ہاں مراد نے مجھ سے کہا تھا، تم کال کرنے والے ہو اور یہ کہ تم مجھے سیکیورٹی دینے یہاں آئے ہو۔“

”میں ابھی اپنی بلّی کے ساتھ پہنچا ہوں۔ ائرپورٹ کی وزیٹرز لابی میں بیٹھا ہوں۔ کہیں رہنے کی جگہ بنانے سے پہلے آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”تم ابھی تک اسے بلّی کہتے ہو؟“

”کیا کروں، بلّی کی طرح پنجے مارتی ہے۔ یہ نام اس پر جچتا ہے۔ ابھی مجھ سے چپک کر فون سے کان لگائے بیٹھی ہے۔“

وہ اونچی آواز میں بولی۔ ”بھابی! السلام علیکم۔ میں آپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ مجھے بہن سمجھ کر اپنے پاس بلائیں۔ میں اڑتی ہوئی چلی آؤں گی۔“

ماروی نے کہا۔ ”انشاء اللہ ہم ضرور ملیں گے اور ملنے کے لیے ضروری ہے کہ دشمنوں کی نظروں سے چھپ کر رہیں۔“

بلّے نے بشریٰ سے کہا۔ ”خدا کے لیے مجھے بات کرنے دے۔ معلوم تو ہو کہ یہ کہاں رہتی ہیں اور ہمیں یہاں سے جا کر کہاں رہنا چاہیے۔“

ماروی نے کہا۔ ”میں یہاں ناظم آباد کے علاقے میں ہوں۔ تم کہاں رہنا چاہو گے؟“

”آپ کے قریب ہی رہوں گا۔ اس علاقے میں کرائے کا کوئی مکان حاصل کروں گا۔“

”میں چاچا سے کہتی ہوں۔ وہ آس پاس کوئی مکان

ڈھونڈیں گے۔ یہ رازداری اچھی رہے گی۔ پہلے ہم اجنبی محلے دار ہوں گے۔ پھر شناسائی ہوگی پھر دوستی ہو جائے گی۔ کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہوگا۔“

یہ اچھی تدبیر تھی۔ وہ عمل کرنے والے تھے اور دوسری طرف مرینہ اپنی تدبیر پر عمل کر رہی تھی۔ وہ شملہ سے روانہ ہو کر دہلی کی سمت جا رہی تھی۔ ارادہ تھا کہ مراد یہاں نہ ملا تو کل تک لندن جائے گی پھر وہاں سے کراچی ماروی تک پہنچے گی۔

اسے دہلی تک جانے کے لیے ہوائی جہاز میں سیٹ نہیں ملی۔ اس نے دوسرے دن کا انتظار نہیں کیا۔ نیرو گیج ٹرین کے ذریعے وہاں سے چل پڑی۔ وہ جلد سے جلد دہلی پہنچنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مراد میڈونا کو بائی ٹرین یا بائی روڈ لے گیا ہوگا۔ دہلی کے ائرپورٹ میں اس سے ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

بعض اوقات اندازے درست ہوتے ہیں۔ وہ کھلونے جیسی ٹرین دس کلومیٹر جانے کے بعد ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ وہاں مرینہ میڈونا کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ ایک ہندوستانی غریب آدمی کے ساتھ اسی کمپارٹمنٹ میں سوار ہوئی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر آ کر ایک سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میڈونا تنہا آزادی سے کیوں سفر کر رہی ہے؟ اسے اغوا کرنے والا مراد کہاں ہے؟

وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کمپارٹمنٹ میں ہر طرف نظر دوڑانے لگی۔ عقل کہہ رہی تھی کہ وہ میڈونا کے آس پاس کہیں ہوگا۔ وہ کمپارٹمنٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام مردوں کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

ان میں کئی ایسے تھے جن کی مردانہ وجاہت اور شخصیت کے باعث ان پر مراد کا شبہ کیا جا سکتا تھا لیکن وہ قد میں چھوٹے تھے یا پھر مراد کی طرح صحت مند نہیں تھے۔ اس سے مشابہت رکھنے کے باوجود یا تو دبلے پتلے تھے یا موٹے اور بھدے سے تھے۔

اسے مایوسی ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میڈونا کے قریب آ کر رک گئی۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھی کھڑکی کے باہر منہ کیے فون کو کان سے لگائے باتیں کر رہی تھی۔ ہارمونیم ماسٹر اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مرینہ نے اس سے بیٹھنے کے لیے جگہ مانگی تو وہ ایک طرف ذرا کھسک گیا۔ وہ میڈونا کے شانہ بشانہ بیٹھ گئی۔

وہ فون پر بول رہی تھی۔ ”پاپا! آپ نے تو مجھے دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ فرشتہ نہ ہوتا تو میں ابھی زندہ نہ ہوتی۔“

وہ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد بولی۔ ”ہاں۔ اس کی نیکی آپ کی نظروں میں حماقت ہے۔ اس نے دشمن کی بیٹی کو رہا کر دیا۔ ایسے فرشتوں کو جرائم کی دنیا میں نہیں رہنا چاہیے۔“

وہ باپ کی باتیں سننے کے بعد بولی۔ ”میں اس سے متاثر ضرور ہوں لیکن آپ میرے پاپا ہیں۔ چاہے جیسے بھی ہوں۔ آپ ہی سے محبت کرتی رہوں گی۔ آپ یہ بتائیں، مجھے اپنے پاس کس طرح بلا رہے ہیں؟ میں آج رات دہلی پہنچوں گی۔“

وہ باپ کی باتیں سننے لگی۔ مرینہ کو یہ معلوم ہوا کہ مراد نے دشمن کی بیٹی کو رہا کر دیا ہے۔ اس سے لاتعلق ہو گیا ہے۔ اب میڈونا کے آس پاس اسے تلاش کرنا حماقت ہوگی۔

اس نے سوچا۔ ’لیکن میں میڈونا کو پھر ٹریپ کر کے مراد کو چیلنج کر سکتی ہوں۔ اس کی نیکی برباد کروں گی تو وہ جوابی کارروائی کے لیے مجھ سے ٹکرائے گا، تب اس سے نمٹ لوں گی۔‘

اس نے اپنے فون پر میکی براؤن کے نمبر پنچ کیے۔ وہاں سے اٹھ کر ذرا دور آ گئی۔ دوسری طرف کال بیل جا رہی تھی۔ پھر فون خاموش ہو گیا۔ وہ مرینہ کو لفٹ نہیں دے رہا تھا۔ اس نے دوسری بار کال کی۔ میکی نے پھر لائن کاٹ دی۔

مرینہ نے گھور کر اس کی بیٹی کو دیکھا۔ ذرا سوچا پھر اس کے پاس آ کر بولی۔ ”میرے فون میں کچھ پرابلم ہے۔ کیا ایک منٹ کی کال کے لیے اپنا فون دو گی؟“

میڈونا نے اسے فون دیا۔ مرینہ نمبر پنچ کرتی ہوئی ذرا دور آ گئی۔ جلد ہی دوسری طرف سے میکی کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں بولو میڈونا...... میں بہت مصروف ہوں۔“

مرینہ نے بڑی سنگدلی سے کہا۔ ”تمہاری بیٹی کے فون سے اس کی موت بول رہی ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”تم...؟“

”تم نے دو بار میری کال کو کاٹا۔ میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اب تو تمہارا باپ بھی باتیں کرے گا۔“

وہ پھر بیٹی کو جیت کر ہارنے والا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”تم... تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں چاہتی ہوں، ابھی میڈونا سے فون پر کچھ نہ بولو۔ وہ اپنی موت سے بے خبر ہے۔ پہلے مجھے کال کرو۔“

اس نے فون کو بند کیا۔ پھر میڈونا کے پاس آ کر اسے

شکریہ کے ساتھ فون واپس کر دیا۔ اب اس کے اپنے فون سے کالنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ اس نے پھر میڈونا سے دور ہو کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''یہ کہاوت صحیح ہے کہ ٹیڑھی انگلی سے گھی نکلتا ہے۔ کیا اب لائن کاٹ سکتے ہو؟ مجھ سے باتیں کرنے سے انکار کر سکتے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''میری بیٹی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ تمہارا جو بھی مطالبہ ہوگا، وہ پورا کروں گا۔''

''میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ میرا ایک چھوٹا سا کام کرو گے تو بیٹی سستے میں چھوٹ جائے گی۔''

''کام بتاؤ؟''

''میں تمہارے دشمن مراد کو ٹریپ کرنا چاہتی ہوں۔ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم بھی یہی چاہتے ہو۔''

''یہ تو سو فی صد میرے دل کی بات کہہ رہی ہو۔ بولو تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''مراد کو فون پر کہو کہ مرینہ اس کی نیکی برباد کر رہی ہے۔ تمہاری بیٹی اس کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ اسے خدا کا واسطہ دے کر التجا کرو کہ وہ میڈونا کو مجھ سے نجات دلائے۔ اس طرح وہ میرے مقابلے پر آئے گا۔ میں اسے نئے بہروپ میں دیکھ سکوں گی۔''

''میں تمہاری چال سمجھ گیا ہوں۔ ابھی اسے کال کرتا ہوں۔''

مراد ایک ٹیکسی کرائے پر حاصل کر کے دہلی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ تیز و تیج ٹرین جس میں مرینہ اور میڈونا سفر کر رہی تھیں' اس سے کئی کلومیٹر آگے جا رہی تھی۔ اس نے اپنے فون پر میکی براؤن کے نمبر پڑھ کر اسے اٹینڈ کیا پھر کہا۔ ''تمہاری بیٹی نے بتایا ہوگا کہ میں نے اسے آزاد کر دیا ہے؟''

''ہاں۔ اس نے مجھے بتایا ہے۔ میں تم سے جانی دشمنی کر رہا ہوں اور تم نے میری بیٹی کو جان کی سلامتی دی ہے۔ لیکن تمہاری یہ مہربانی یہ احسان ادھورا رہ گیا ہے۔ وہ کم بخت مرینہ اس کے قریب پہنچ گئی ہے۔ میڈونا ابھی اس دشمن کی قربت سے بے خبر ہے۔ فار گاڈ سیک اسے اس وچ لیڈی سے بچاؤ۔''

مراد نے پوچھا۔ ''کیا مرینہ نے کوئی مطالبہ کیا ہے؟''

''ہاں، وہ چاہتی ہے کہ میں تمہیں فون پر بتاؤں کہ وہ تمہاری نیکی کو خاک میں ملانے والی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ میڈونا کے ذریعے تمہیں ٹریپ کرنا چاہتی ہے۔''

''میں اس کے ہتھکنڈوں کو سمجھتا ہوں۔ میں نے میڈونا کو اغوا کیا، اسے اس کے گھر پہنچانا میرا فرض ہے۔ میں ابھی یہ ذمے داری پوری کر دوں گا۔''

مراد نے فون بند کر دیا' میکی براؤن مسکرانے لگا۔ مراد اور مرینہ دونوں ہی اس کے خطرناک دشمن تھے اور وہ ابھی آپس میں ٹکرانے والے تھے۔ ان کے ٹکراؤ سے اسے فائدہ پہنچنے والا تھا۔

دہلی میں اس کے کئی تابعدار اور شوٹرز تھے۔ اس نے فون کے ذریعے ان سے کہا۔ ''تیار رہو' مراد اور مرینہ ادھر آنے والے ہیں۔ وہ دونوں میڈونا کے آس پاس ہوں گے اور شاید ایک دوسرے سے دشمنی کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ تم سب انہیں میڈونا کے ذریعے پہچان سکو گے۔''

مراد نے میکی سے بات کرنے کے بعد کچھ سوچا۔ پھر ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔ ''ٹرین ہم سے بہت آگے جا رہی ہوگی۔ کیا تم رفتار بڑھا کر اس ٹرین تک پہنچ سکتے ہو؟''

وہ رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو کھلونے کی طرح چلتی ہے۔ جیسے اسے چابی دے کر چھوڑ دیا گیا ہو۔ ہم ایک گھنٹے میں اس سے آگے نکل جائیں گے۔''

''اس سے آگے نہیں جانا ہے۔ وہ جس اسٹیشن پر رکے گی، وہیں میں یہ ٹیکسی چھوڑ دوں گا اور ٹرین سے آگے جاؤں گا۔ تمہیں پورا کرایہ ملے گا۔''

اس نے ٹیکسی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ مراد نے مرینہ کے فون نمبر پنچ کیے۔ وہ اپنے فون پر اس کے نمبر پڑھتے ہی خوش ہو گئی۔ میڈونا سے دور ہو کر فون کو کان سے لگا کر بولی۔ ''میں اپنے بیل کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچنا جانتی ہوں۔ آخر کھنچے چلے آئے میرے سرکار میرے در پر۔''

وہ چپ رہا۔ اس نے پوچھا۔ ''چپ کیوں ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم بولتی جاؤ۔ میں سن رہا ہوں۔''

''میں نہیں چاہتی' جسے تم نے جان کی سلامتی دی ہے اسے مار ڈالوں۔ اس کی سلامتی چاہتے ہو، اسے بخیریت گھر پہنچتے دیکھنا چاہتے ہو تو میرے سامنے آ جاؤ۔''

''میں نے ہر بار تمہیں معاف کیا۔ جان سے نہیں مارا۔ زخمی کر کے چھوڑ دیا۔ اس بار تم سیدھی اوپر جاؤ گی۔ بے وقوف عورت! تم نے اس وقت میکی براؤن کے ذریعے یہ اطلاع دے کر غلطی کی ہے کہ تم اسی ٹرین میں میڈونا کے پاس ہو جس میں میں سفر کر رہا ہوں۔ میں نے تمہیں نئے بہروپ میں دیکھ لیا ہے۔ اب مجھ سے چھپ نہیں سکو گی اور مجھے بھی پہچان نہیں سکو گی۔''

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ اس کا سوئچ آف کر دیا۔ وہ یہ سن کر پریشان ہو گئی اور گھبرا گئی کہ مراد اسی ٹرین میں ہے اور اسے نئے چہرے کے ساتھ پہچان چکا

ہے۔ وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں نے پورے کمپارٹمنٹ میں تمہیں تلاش کیا ہے۔ تمہارے قد اور تمہاری جسامت کا کوئی...''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ فون بند کر چکا ہے۔ اس نے سہم کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مراد اسے دیکھ لے اور وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ عقل میں بات آئی کہ اس نے ایک کمپارٹمنٹ میں اسے ڈھونڈا تھا۔ پوری ٹرین میں تلاش نہیں کیا تھا۔

مراد نے اسے اچھی طرح الجھا دیا تھا۔ وہ اسے تلاش کیے بغیر ایک جگہ سکون سے نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر کمپارٹمنٹ سے باہر آ گئی۔ ٹرین اپنی مخصوص دھیمی رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ ٹرین سے اتر کر دوڑتی ہوئی دوسرے کمپارٹمنٹ میں آ گئی۔ پھر وہاں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک ایک مسافر کو توجہ سے دیکھنے لگی۔

اسے ایک نہیں تین قد آور صحت مند جوان نظر آئے۔ وہ ایک دوسرے سے دور مختلف سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے جس جوان پر نظر گئی، وہ کچھ مراد جیسا ہی لگ رہا تھا۔ عاشق مزاج تھا۔ اپنے سامنے بیٹھی ہوئی ایک مسافر لڑکی سے لطف لے رہا تھا۔

اس جوان کی نظریں مرینہ سے ملیں تو وہ ذرا ہچکچایا۔ اس سے نظریں چرا کر لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسری عورت کو دیکھنے سے لڑکی ناراض ہو جائے۔

مرینہ نے سوچا، یہ مجھ سے نظریں چرا رہا ہے۔ چور پکڑا گیا ہے۔ گھبرا رہا ہے۔ وہ خوش ہو گئی کہ اس نے مراد کو بھی نئے بہروپ میں دیکھ لیا ہے۔ وہ بے چارہ پریشان ہو رہا تھا۔ چور نظروں سے مرینہ کو اپنے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔

وہ قریب آ کر اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس کی طرف جھک کر بولی۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ اپنے بیل کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچنا جانتی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''کک...... کون ہو تم؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

وہ فتح مندی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں نے ڈھونڈ نکالا ہے تو اب تمہاری زبان لڑکھڑا رہی ہے۔''

وہ لڑکی اپنے عاشق کو غصے سے دیکھنے لگی۔ وہ اپنے ایک کان کو چھو کر بولا۔ ''ماں قسم میں نہیں جانتا یہ کون ہے؟''

لڑکی نے ناراضگی سے منہ پھیر لیا۔ وہ نوجوان سے بدظن ہو گئی تھی۔ وہ مرینہ کی طرف گھوم کر بولا۔ ''تم کون ہو؟ کیوں مجھ سے فری ہو رہی ہو؟ کیا پاگل خانے سے آئی ہو؟''

وہ اس کی طرف جھک کر رازدارانہ انداز میں بولی۔ ''ابھی تمہارے سامان کی تلاشی لوں گی تو گن اور بلٹس نکلیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ یہاں ہماری اصلیت ظاہر ہو جائے۔''

اس نے اپنا بیگ مرینہ کو دیا۔ پھر سیٹ کے نیچے سے ایک اٹیچی کو کھینچ کر کہا۔ ''لو، یہ میرا سامان ہے۔ ان سب میں گن اور بلٹس بھرے ہیں۔ چلو مجھے گرفتار کراؤ۔''

مرینہ نے پریشان ہو کر سوچا' یہ مراد ہوتا تو اسلحے کی نمائش کے لیے نہ کہتا۔ یہ تمام مسافر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے کوئی بات بنانی ہوگی'

اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ''میں سی آئی اے کی ایک افسر ہوں' مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس ٹرین میں ایک دہشت گرد اپنے گروہ کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ اس کا چہرہ اور حلیہ اس جوان کی طرح بتایا گیا ہے۔ میں اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہوں۔''

وہ بیگ اور اٹیچی کی تلاشی بس یونہی لینے لگی۔ ٹرین ایک اسٹیشن پر رک رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مراد کو پہلے ہی وہاں پہنچا دیا تھا۔ اس نے فون پر میڈونا سے پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاس کوئی عورت بیٹھی ہوئی ہے؟''

وہ بولی۔ ''نہیں...... مگر تھوڑی دیر پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں چلی گئی ہے۔''

''تم فوراً باہر آؤ۔ وہ عورت تم لوگوں کی جانی دشمن مرینہ ہے۔ ایک لمحے کی دیر نہ کرو۔ میں پلیٹ فارم پر ہوں۔ فوراً آؤ۔''

میڈونا کو اپنے محسن پر اعتماد تھا۔ وہ ہارمونیم ماسٹر کے ساتھ ٹرین سے اتر کر باہر آئی۔ مراد پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی اسٹیشن سے باہر آ گئی۔ مراد نے ٹیکسی ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا تھا۔ وہ میڈونا کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے ہارمونیم ماسٹر سے بولا۔ ''اب تمہاری ضرورت نہیں ہے، تم واپس جاؤ۔''

ٹیکسی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ مرینہ نے ناکام تلاشی کے بعد وہاں سے اٹھتے ہوئے اس نوجوان سے کہا۔ ''سوری، میں نے تمہیں پریشان کیا ہے۔ میں اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہوں۔''

وہ وہاں سے چلتی ہوئی کمپارٹمنٹ سے باہر آ گئی۔ فی الحال میڈونا اس کے لیے اہم تھی۔ وہ اس کمپارٹمنٹ میں واپس آئی تو اس کی سیٹ خالی تھی۔ اس نے ایک مسافر سے پوچھا۔ ''یہاں ایک انگریز عورت بیٹھی ہوئی تھی، وہ کہاں گئی؟''

اس نے کہا۔ ''ابھی اتر کر اسٹیشن کے باہر گئی ہے۔''

وہ پلٹ کر تیزی سے دوڑتی ہوئی اسٹیشن کے باہر آئی۔ اس نے دور تک دیکھا۔ جو ہاتھ سے نکل گئی تھی، وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔ ''ادھر ایک انگریز عورت آئی تھی، وہ کدھر گئی ہے؟''

وہ بولا۔ ''جو ادھر ٹرین سے پہلے پہنچنا چاہتے ہیں، وہ ٹیکسی میں جاتے ہیں۔ وہ بھی ٹیکسی میں ادھر گئی ہے۔''

وہ دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''فوراً اس کے پیچھے چلو۔''

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر تیز رفتاری سے جانے لگا۔ مرینہ نے پوچھا۔ ''اس کے ساتھ اور کون تھا؟''

''وہ دو آدمیوں کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آئی تھی۔ ایک غریب سا آدمی بس میں جاکر بیٹھ گیا تھا۔ دوسرا کوئی جنٹلمین تھا۔ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔''

وہ سمجھ گئی کہ مراد نے اسے الو بنایا ہے۔ وہ ٹرین میں نہیں تھا۔ اسے میڈونا سے دور جاکر پوری ٹرین میں ڈھونڈنے کی ترغیب دی۔ وہ باؤلی ہوکر اسے تلاش کرنے گئی تھی اور میڈونا کو ہار گئی تھی۔

اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کیا اس رفتار سے اس ٹیکسی تک ہم پہنچ سکیں گے؟''

''میڈم! یہ پہاڑی راستے ہیں۔ تیز رفتاری خطرناک ہوگی۔ آگے وہ ٹیکسی بھی سست رفتاری سے جارہی ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں، میں بھی بھی رفتار بڑھاتا رہوں گا۔''

تھوڑی دیر بعد ہی آگے جانے والی ٹیکسی نظر آنے لگی۔ مرینہ نے کہا۔ ''شاباش! تھوڑی رفتار بڑھاؤ پھر اس سے آگے نکل کر اس کا راستہ روک دو۔''

وہ پریشان ہوکر بولا۔ ''میڈم! کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟''

وہ لباس کے اندر سے گن نکالتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جو کہہ رہی ہوں، وہ کرتے رہو۔''

مراد میڈونا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پیچھے سر گھما کر دیکھا ایک ٹیکسی آرہی تھی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ پھر وہ قریب سے گزرتی ہوئی ان سے آگے جانے لگی۔ ایسے وقت اس نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھا جسے ایک بار شملہ میں دیکھ چکا تھا۔ اسے شبہ ہوا تھا کہ وہ مرینہ ہوسکتی ہے۔

اب وہی عورت پھر نظر آئی تھی۔ اس کی ٹیکسی ذرا آگے گئی تھی پھر ترچھی ہوکر راستہ روک کر کھڑی ہوگئی تھی۔ یوں راستہ رُکتے ہی مراد چونک گیا۔ وہ عورت ہاتھ میں گن لیے دروازے سے نکل کر دوڑتی ہوئی ٹیکسی کی دوسری طرف جارہی تھی۔

اس نے بھی ایک لمحے کی دیر نہیں کی۔ اپنی سیٹ پر سے تڑپ کر باہر آیا۔ وہ ٹیکسی بھی ذرا ترچھی ہوکر رک گئی تھی۔ وہ اپنی گن نکالتا ہوا میڈونا سے بولا۔ ''سیٹ کے نیچے لیٹ جاؤ۔''

وہ ٹیکسی کے پیچھے آگیا۔ ادھر مرینہ نے اپنی ٹیکسی کو ڈھال بنا لیا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں ہاتھوں سے گن تھامے مراد سے کہنے لگی۔ ''اب ہم ایک دوسرے سے چھپ کر نہیں رہیں گے۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور تم بھی مجھے پہچان رہے ہو۔''

مراد نے کہا۔ ''ہم پہلے دوست تھے۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ دوست بن کر رہو اور فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔''

وہ بولی۔ ''دوست ساتھ چھوڑنے کے لیے نہیں ہوتے۔ ساتھ رہنے سے دوستی اور محبت بڑھتی رہتی ہے۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میری محبتوں کا مرکز صرف ماروی ہے۔ میں اس کا حق کسی کو نہیں دوں گا۔''

''اور تم میری محبتوں کا مرکز ہو۔ بائی گاڈ! میری زندگی کے پہلے اور آخری مرد ہو۔''

وہ اپنی گن کو تھپکتے ہوئے بولی۔ ''میں جان کی بازی لگا کر بھی تمہیں اپنا بنا کر رہوں گی۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ کیا میں اتنا کمزور ہوں کہ مجھے جبراً اپنا بنا لوگی؟''

''یاد کرو۔ ایک بار بنالیا تھا۔ تمہیں زخمی کرنے کے بعد ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ اگر محبت سے نہیں مانو گے تو آج بھی وہی کروں گی۔''

''تو پھر آؤ۔ مجھے گھیر تو لیا ہے۔ اب پہلے کی طرح گولیوں سے زخمی کرو اور اپاہج بنا کر لے جاؤ۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی پہاڑوں کی ویرانی میں ایک فائر کی آواز گونجی۔ مرینہ نے پہلی گولی چلاتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھو! اگر میں تمہیں اپاہج بنا کر نہ لے جاسکی اور مجھے یہاں سے فرار ہونا پڑا۔ تب میں پاکستان جاؤں گی اور ماروی کے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دوں گی۔ پھر نہ وہ رہے گی اور نہ تمہاری دیوانگی۔''

مراد نے گولی چلائی۔ اس کی ٹیکسی کا ایک پہیا دھماکے سے ناکارہ ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ لو نہ ٹیکسی رہے گی۔ نہ فرار ہوسکو گی۔ نہ میری ماروی تک پہنچ سکو گی۔ کم آن...... اور چلاؤ گولی۔''

''میری گاڑی کو ناکارہ بنا کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس ویرانے سے جانے کے لیے ایک تمہاری ہی ٹیکسی رہ گئی ہے۔ اب تو اسے بھی حاصل کرنا ہوگا۔''

اس نے بڑی مکاری سے باتوں میں الجھاتے ہوئے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ بے شک اسے نشانہ بازی میں مہارت حاصل تھی۔ مراد بال بال یوں بچا کہ گولی ٹیکسی کی چھت سے ٹکرا کر بہک گئی۔ اس کے سر کے بالوں کو چھو کر گزر گئی۔ گویا اس میدانِ جنگ میں موت نے پہلی آنچ دی تھی۔

وہ زمین پر لیٹ گیا۔ دور اس ٹیکسی کے نچلے حصے میں مرینہ کے دونوں پاؤں نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنی ٹیکسی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر نشانہ لیا۔ پھر تڑاتڑ کی شور مچاتی ہوئی آوازوں کے ساتھ مسلسل تین گولیاں چلائیں۔ مرینہ کی چیخ ابھری۔ دونوں پیروں میں گولیاں لگی تھیں۔ وہ کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ زمین پر گر پڑی۔

تھوڑی دیر تک اس فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہیں پھر سناٹا چھا گیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی ذرا دور چلی گئی تھی۔ مراد کو نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ کھڑی نہیں رہ سکے گی لیکن میدان چھوڑنے والی عورت نہیں تھی۔ رینگتی ہوئی مقابلہ کرسکتی تھی۔

مراد نے کہا۔ ''مرینہ! اب تم کھڑے رہنے کے بھی قابل نہیں رہیں۔ زندہ رہنا چاہتی ہو تو ہتھیار میری طرف پھینک دو۔''

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ''آہ! میں اٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔ فار گاڈ سیک مجھے فوراً کسی اسپتال میں لے چلو۔ یہ لو میں گن پھینک رہی ہوں۔''

اس دوسری ٹیکسی کے پیچھے سے ایک گن فضا میں اُڑتی ہوئی آکر مراد کی ٹیکسی کے سامنے گری۔ وہ زمین سے اٹھ کر بولا۔ ''ایک پستول تمہاری جانگھ سے بندھا رہتا ہے۔ اسے بھی پھینکو۔''

وہ پستول بھی سامنے آکر گرا۔ وہ واقعی ہار مان چکی تھی۔ مراد نے کہا۔ ''تم رینگتی ہوئی میرے سامنے آسکتی ہو۔''

وہ دونوں گھٹنوں سے اور دونوں ہاتھوں سے رینگتی ہوئی کراہتے ہوئے کبھی گرتی کبھی سنبھلتی ہوئی اس کی نگاہوں کے سامنے آئی پھر اوندھے منہ زمین پر گر پڑی۔ تب وہ مطمئن ہوکر ٹیکسی کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آیا۔ اپنی گن کی نال کو نیچے کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری ضد نے تمہیں دونوں پیروں سے اپاہج بنا دیا ہے۔ اب تم کئی ہفتوں اور مہینوں تک چل پھر نہیں...''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ایک گولی اس کے شانے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ آفت کی پرکالہ مرتے مرتے بھی مارنا جانتی تھی۔

وہ اوندھے منہ زمین پر اسی لیے گری تھی کہ لباس کے اندر سے تیسری گن نکال سکے۔ مراد کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر ذرا فاصلہ پر جا گری تھی۔ اس جنگ باز عورت نے اسے نہتا کر دیا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے بھی گن چلا سکتا تھا۔ وہ اسے زمین سے اٹھانے کے لیے جھکا تو دوسری گولی نے اس کے قدم اُکھاڑ دیے۔ گولی اس کے ایک گھٹنے میں آکر لگی تھی۔

مرینہ نے اسے اپنے سے زیادہ ناکارہ بنا دیا۔ وہ زمین پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ ''مراد! وقت خود کو دہرا رہا ہے۔ میں پھر تمہیں اپاہج بنا کر ہتھکڑیاں پہنا کر اپنی زلفوں کا اسیر بناؤں گی۔''

اس نے تیسری گولی چلائی۔ وہ مراد کے دوسرے پاؤں میں لگی۔ وہ زمین پر چاروں شانے چت ہوگیا۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس کا نشانہ لے کر بولی۔ ''ایک گولی اور پھر تم ہوش میں آنے کے بعد خود کو زنجیروں میں دیکھو گے۔''

مرینہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنی زخمی لات چلا سکے گا۔ ایک لات پڑتے ہی اس کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ فضا میں اڑتی ہوئی دور چلی گئی۔ وہ لنگڑی گھٹنوں کے بل ادھر جانا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے لنگڑے نے اسے دبوچ لیا۔

وہ زبردست فائٹر تھی لیکن مراد کے شکنجے سے نکل نہیں پارہی تھی۔ مراد نے اس پر سوار ہوکر ایک ہاتھ سے اس کی گردن کو جکڑ لیا تھا۔ وہ سانس نہیں لے پارہی تھی۔ اس کے نیچے پھڑ پھڑا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ جیسے دم نکل گیا ہو۔ مراد نے کہا۔ ''اب میں تمہارے فریب میں نہیں آؤں گا۔ تم آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑو گی۔ دیکھو میں کیا کرتا ہوں؟''

وہ اچانک ہی اسے چھوڑ کر زمین پر لڑھکتا ہوا اپنی گن کے پاس آیا۔ وہ بھی مکاری دکھا رہی تھی۔ نجات پاتے ہی لڑھکتی ہوئی اپنی گن کے پاس آگئی۔ اسے اٹھا کر پلٹ کر فائر کرنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی مراد کی گولی نے پھر اس کے ہاتھوں سے گن کو گرا دیا۔ گولی اس کی پسلی میں لگی تھی۔ دوسری گولی بھی ظالم تھی۔ اس کے شانے میں آکر لگی۔

اب وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ جیسے آخری

سانسیں لیتی ہوئی مراد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''میں نے اپنی ماروی کو بہت دکھ دیے ہیں۔ اب نہیں دوں گا۔ اس کے ساتھ ایک نیا گھر بسانے اور ساری دنیا سے چھپ کر رہنے کے لیے اس کے دشمنوں کو ختم کردوں گا۔ تم ماروی کو ختم کرنے کی حسرت لے کر جاؤ۔''

یہ کہہ کر اس نے آخری گولی اسے ماری۔ پھر وہاں سے لنگڑاتا ہوا ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر میڈونا کے پاس آکر گر پڑا۔ دشمن کی بیٹی تو دشمن ہی ہوتی ہے۔ دوست نہیں ہوسکتی۔ وہ پچھلی سیٹ کے کنارے کھڑکی سے لگ گئی تھی۔

مراد وہاں آکر گرا تو اس کا سر میڈونا کے زانو پر آگیا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے گہری سانس لی۔ اسی قربت کے لیے وہ ترستی رہی تھی اور وہ منہ پھیرتا رہا تھا۔

اب حالات نے اس کی گود میں اسے پہنچا دیا تھا۔ تقدیر مہربان تو سنگدل محبوب قربان۔ وہ جیسے قربان ہونے کے لیے خود ہی اس کی آغوش میں آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹنے والی تھی۔ میڈونا نے فوراً ہی اسے لپک لیا۔ ہتھیار ہاتھ میں آتے ہی اس نے فاتحانہ انداز میں اپنے مطلوب کو اپنے محسن کو دیکھا پھر ڈرائیور سے کہا۔ ''اس ناکارہ ٹیکسی کو دھکا دے کر ایک طرف کرو اور فوراً یہاں سے چلو۔ ہری اپ، دیر نہ کرو۔''

مرینہ جس ٹیکسی میں آئی تھی، وہ راستہ روکے کھڑی تھی۔ اس کا ایک پہیا بے کار ہوچکا تھا۔ دونوں ڈرائیوروں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف کیا۔ وہ کھڑکی کے باہر مرینہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پتھریلی زمین پر ایک لاش کی طرح بے حس وحرکت پڑی ہوئی تھی۔ میڈونا جاکر دیکھنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ مرچکی ہے یا ابھی اس میں جان باقی ہے؟

مراد کی بھی جان نکلی جارہی تھی۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی موت کی تصدیق کرتا۔ وہ زخموں سے چور تھا۔ اس نے پچھلی سیٹ پر میڈونا کے پاس آکر گرتے ہوئے کہا۔ ''فار گاڈ سیک! مجھے اسپتال پہنچاؤ۔''

دوسری ٹیکسی کو ایک طرف ہٹادیا گیا۔ راستہ صاف ہوگیا۔ وہ ٹیکسی تیز رفتاری سے آگے جانے لگی۔ میڈونا پریشان ہوکر سوچنے لگی۔ 'اسے کہاں لے جاؤں؟ کیا اسپتال پہنچاؤں؟'

ایک خیال آیا۔ 'کیا پاپا کو بتاؤں کہ ان کا بدترین دشمن میری آغوش میں نیم مردہ ہے؟ اور اس کا ریوالور میرے ہاتھوں میں ہے۔ میں فاتح ہوں۔ یہ شکست خوردہ ہے۔ کیا پاپا کو بولوں کہ ابھی یہ دشمن میرے نشانے پر ہے جس نے آپ کے درجنوں شوٹرز کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میرے بھائی رونی براؤن کو مار ڈالا ہے۔ لیکن مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ ہائے...! یہی احسان پاگل کررہا ہے۔ بے شک یہ عورتوں کے لیے فرشتہ ہے۔ اس نے میرے بدن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔'

اس نے سر جھکا کر مراد کو دیکھا۔ اس کا سر اس کے زانو پر رکھا ہوا تھا۔ خون بہت بہہ گیا تھا۔ کمزوری کے باعث اس کی آنکھیں بند ہورہی تھیں۔ دل اس کی طرف کھنچا جارہا تھا۔

وہ اس پر جھک کر اس کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھتے ہوئے بولی۔ ''پاپا خود غرض ہوگئے تھے۔ انہوں نے مجھے تمہارے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں تو پاپا کے لیے ایک طرح سے مرچکی ہوں۔ ان کے دشمن مراد نے میری عزت سے کھیل کر مجھے مار ڈالا ہے۔ ان لمحات میں یہ میری نئی زندگی ہے اور میری آغوش میں یہ ایک فرشتہ ہے۔ میں اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔''

وہ زیرلب بول رہی تھی۔ اس کے چہرے کو اپنے چہرے سے سہلا رہی تھی۔ اسے بڑے جذبے سے چوم رہی تھی۔ وہ ذرا سا کسمسایا۔ اس میں یہ بولنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ ایسا نہ کرو۔

مراد کے گہرے زخم زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے اور وہ بھوکی اسے مانگ رہی تھی۔ انسان اپنی اپنی بھوک کے مطابق خوراک مانگتا ہے۔

میڈونا کو بڑے نصیب سے یہ موقع ملا تھا۔ اگر کہیں تنہا ہوتی تو جانے اس کے ساتھ کتنی حسرتیں پوری کرتی۔ اس وقت تو مال غنیمت کی طرح وہ جس حد تک میسر تھا، اتنا ہی کافی تھا۔

''ہائے کیا مرد میدان ہے۔ درجنوں مسلح گارڈز اور کئی شوٹرز کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے کاٹیج سے نکال لایا تھا۔

''اس نے مرینہ جیسی خطرناک دشمن سے مجھے بچایا ہے اور اس حال کو پہنچ گیا ہے۔ میں اسے بچانے کے لیے اس پر قربان ہوجاؤں گی۔ اسے کسی بھی قریبی اسپتال میں پہنچاؤں گی۔''

اس نے سلگتے ہوئے لبوں کو اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اس کے وجود میں جذب ہونے لگی۔ وہ اس کے جذبات سے بے خبر نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی احسان مند ہونے والی اس کے لیے پاگل ہورہی ہے۔

ٹیکسی تیز رفتاری سے بھاگی جارہی تھی۔ میڈونا کے اندر بھی جذباتی بھاگ دوڑ جاری تھی۔ آخر وہ کالکا کے اسپتال میں پہنچ گئی۔ وہاں کے بڑے ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ پولیس کیس ہے۔ جب تک تھانے دار نہیں آئے گا، ہم اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔''

مراد نے اسے رہا کرتے وقت تیس ہزار دیے تھے۔ اس نے پانچ ہزار روپے ڈاکٹر کی جیب میں رکھے تو اس نے فوراً ہی اس کی مرہم پٹی کی۔ اس کے جسم میں نیا خون پہنچانے لگا۔ ڈاکٹر اور اس کے ماتحتوں نے پولیس والوں تک یہ بات پہنچنے نہیں دی کہ کوئی گولیوں سے زخمی ہوکر آیا ہے۔

وہ بے ہوش پڑا تھا۔ زخم گہرے تھے۔ جلدی بھرنے والے نہیں تھے۔ دونوں پاؤں بے کار ہوگئے تھے۔ ایک گولی شانے کی ہڈی توڑ کر گزری تھی۔ اس ہڈی کے جڑنے میں بھی کئی ہفتے یا مہینے لگ جاتے۔

میڈونا نے مراد کے سفری بیگ میں دیکھا۔ اسلحہ اور ہلٹس کے علاوہ اچھی خاصی رقم تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو مزید دس ہزار روپے دیے۔ وہ خوش ہوگیا۔ اس نے مراد کو ایک الگ کمرا رہنے کے لیے دیا۔ میڈونا نے اس سے کہا۔ ''اسے جلد سے جلد چلنے پھرنے کے قابل بناؤ۔ میں بیس ہزار روپے دوں گی۔''

ڈاکٹر نے وعدہ کیا کہ دن رات اس کے علاج میں مصروف رہے گا۔ میڈونا نے اس کے جانے کے بعد دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ ایسے وقت عقل نے سمجھایا کہ وہ محض جذباتی ہورہی ہے۔ اس سے لگی رہے گی اور علاج کراتی رہے گی تو کسی دن کسی بھی وقت اس کے باپ کے زرخرید شوٹرز وہاں پہنچ جائیں گے۔

ایسے ہی وقت اس کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ میکی براؤن کال کررہا تھا۔ اس نے فون کے بٹن کو دبایا۔ اسے کان سے لگایا۔ باپ کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو باپ کی جان! سو سوری۔ میں دوسرے معاملات میں مصروف ہوگیا تھا۔ تمہیں کال نہ کرسکا۔ تمہیں تو کرنا چاہیے تھی۔''

وہ بولی۔ ''پاپا! آپ مجھے باپ کی جان نہ کہا کریں۔ بیٹی سے خوامخواہ شدید محبت ظاہر نہ کریں۔ میں آپ کی نمائشی محبت کو اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔''

''پلیز میڈونا...! باپ کو غلط نہ سمجھو۔''

''آپ کو غلط سمجھ لینے کے باوجود باپ کا مان مرتبہ دوں گی۔ آخر بیٹی ہوں۔ میں دہلی پہنچنے کے بعد آپ کو کال کروں گی۔ ابھی فون بند کررہی ہوں۔''

''جسٹ اے منٹ' وہ عورت کہاں ہے جس نے تمہارا فون لے کر مجھ سے بات کی تھی؟''

''آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ ایک عورت نے میرے فون پر آپ سے باتیں کی تھیں۔''

''اس نے دھمکی دی تھی کہ تمہیں اس کی اصلیت نہ بتاؤں۔''

''اور آپ نے دھمکی میں آکر مجھے اس ظالم عورت کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ وہ مرینہ تھی۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ... وہ میڈونا...! وہ بات یہ ہے کہ اس نے...''

وہ بولی۔ ''اپنی صفائی پیش نہ کریں۔ آپ کو بتادوں کہ پھر ایک بار مراد نے آکر مجھے اس سے نجات دلائی ہے۔''

وہ حیرانی سے چیخ کر بولا۔ ''اوہ گاڈ! کیا سچ بول رہی ہو؟ کیا مراد تمہارے ساتھ ہے؟''

وہ دشمن باپ کو یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ شہ زور اس کے رحم وکرم پر ہے۔ اس نے کہا۔ ''نہیں، وہ پھر کہیں چلا گیا ہے۔ جب تک میں دہلی نہیں پہنچوں گی اور کسی فلائٹ سے آپ کی طرف نہیں آؤں گی، وہ دور ہی دور سے چھپ کر میری حفاظت کرتا رہے گا۔ میں آپ سے کہتی ہوں۔ میری فکر نہ کریں اور نہ ہی اپنے ماتحتوں کو میری نگرانی اور حفاظت کے لیے بھیجیں۔ اگر مراد سے ان کا ٹکراؤ ہوگا تو پھر گولیاں چلیں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ مجھے رہا کرنے والا دوست پھر سے دشمن بن جائے۔''

''جب وہ دہلی تک تمہاری نگرانی کرتا رہے گا تو وعدہ کرتا ہوں میرا کوئی شوٹر اس سے ٹکرانے نہیں آئے گا۔''

''اور میں یقین سے کہتی ہوں کہ آپ کے شوٹرز کی فوج دہلی میں موجود ہوگی جس نے میری عزت کو میلا نہیں کیا، مجھے رہائی دی۔ دوسری بار مجھے مرینہ سے بچایا' اسے آپ زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اسے ہلاک کرنے کے لیے آپ ایک عرصے سے پاگل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اسے بیٹی کا سہارا لے کر ضرور ٹریپ کریں گے۔''

''تم خوامخواہ دشمن بن کر بول رہی ہو۔ شملہ میں ہی تمہارا دل اس پر آگیا تھا۔ اس لیے تم نے ایمان علی کی چھٹی کردی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی تمہیں قبول کرلیا

ہے۔ سچ بتاؤ وہ کہاں ہے؟ تم ابھی اس کے ساتھ کہاں ہو؟''

میڈونا نے پریشان ہو کر مراد کو دیکھا۔ وہ اپنی طرف آنے والے دشمنوں سے بے خبر تھا اور میکی براؤن کو شبہ ہو گیا تھا کہ بیٹی اس کے ساتھ کہیں وقت گزار رہی ہے۔

وہ بولی۔ ''آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ وہ صرف اپنی ماروی کا دیوانہ ہے۔ مجھ سے اب بھی دور کہیں ہے۔ میں اس وقت کالکا کے ریلوے پلیٹ فارم پر ہوں۔ میری سیٹ ہو چکی ہے۔ پندرہ منٹ بعد ٹرین یہاں سے دہلی کے لیے روانہ ہو گی۔''

''میرے بارے میں تمہارا خیال درست ہے۔ کالکا سے آگے میرے شوٹرز کسی اسٹیشن پر اس ٹرین میں آئیں گے۔ تمہاری نگرانی کریں گے اور اسے ٹرین میں تلاش کریں گے۔''

یہ کہہ کر باپ نے فون بند کر دیا۔ میڈونا نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے معلوم تھا کہ پندرہ منٹ بعد وہاں سے دہلی کے لیے ٹرین جانے والی ہے۔ اس کے باپ کے شوٹرز اس ٹرین میں اسے اور مراد کو تلاش کرنے کے لیے بھٹکتے رہیں گے پھر ادھر پلٹ کر نہیں آئیں گے۔ کل دہلی میں ان کا انتظار کریں گے۔

اس نے عارضی طور پر دشمنوں کو مراد سے دور کیا تھا۔ یہ مسئلہ پریشان کن تھا کہ وہ یورپی حسینہ وہاں لاکھوں میں پہچانی جاتی تھی۔ مراد اس کے ساتھ محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ آج نہ سہی، کل یا پرسوں یا کسی دن بھی اس کے پاپا کے آدمی پلٹ کر ادھر آ سکتے تھے۔

اب تو درگا کا سابقہ شوہر جے بھاسکر بھی میکی کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کے آدمی بھی ایک انگریز عورت کو دیکھ کر یہی کہتے کہ وہ میڈونا ہے۔

یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ مراد کو اپنے ساتھ چھپا کر نہیں رکھ سکے گی۔ وہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی پھر کھنچی ہوئی اس کے پاس بیڈ پر آ گئی۔ اس سے لگ کر لیٹ گئی۔ دل مچل رہا تھا۔ اس سے لپٹ گئی۔ اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں کیا کروں؟ تمہیں ہمیشہ کے لیے حاصل نہیں کر سکوں گی۔ میں کیا کروں؟ تم ہوش میں آنے کے بعد مجھے قریب آنے نہیں دو گے۔ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے تو پھر مجھے چھوڑ کر غائب ہو جاؤ گے۔''

وہ اسے چومتی اور سہلاتی ہوئی اس پر چھا گئی۔ ہوس کہہ رہی تھی کہ بس یہی موقع ہے۔ جس حد تک اسے حاصل کر سکتی ہے، کر لے۔ کچھ تو تسلی ہو گی کہ اسے پا لیا ہے۔

اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنے والے ماہرین یہی کہتے کہ وہ ایک جنسی مریضہ ہے۔ اس کے اندر جذبات چیختے رہتے ہیں۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔

وہ بے ہوش پڑا تھا۔ یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ایسے وقت وہ چونک گئی۔ یوں لگا، چوری پکڑی گئی ہے۔ کوئی اس کی تنہائی میں آ گیا تھا۔

فون کی ننھی سی اسکرین نے بتایا کہ ایمان علی آیا ہے۔ اس کی زندگی سے نکالے جانے کے بعد وہ پہلی بار اسے کال کر رہا تھا۔ وہ نصف مراد کے سحر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسے وقت اسے اہمیت نہیں دے سکتی تھی، جسے چھوڑ چکی تھی۔ اس نے کال کٹ کر دی۔

پھر اچانک ہی اس کے ضمیر نے کہا۔ ''مجھے پہلے مراد کی سلامتی کی فکر کرنی چاہیے اور میں ایمان علی کے ذریعے اسے تحفظ فراہم کر سکتی ہوں۔ وہ یہاں آ کر اسے لے جائے گا۔ اس کا علاج کرائے گا۔ میں اس سے دور ہو جاؤں گی تو کوئی دشمن نہ اسے پہچان سکے گا، نہ اس کے قریب آ کر اسے نقصان پہنچا سکے گا۔''

وہ مراد سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے دل پر جبر کیا پھر ہوس پر قابو پا کر ایمان علی کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ''میں نے ابھی کال کی تھی تم نے لائن کاٹ دی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، تم اچانک بے وفا کیوں ہو گئیں؟ مجھے اپنی زندگی سے کیوں نکال دیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''میری ایک بات مانو گے؟''

وہ محبت کے جوش میں بولا۔ ''ہزار باتیں مانوں گا۔''

اس نے کہا۔ ''مجھے بھول جاؤ ایمان!''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔ میں ہوس کی ماری تھی۔ تمہارے ساتھ جو بھی وقت گزرا ہے، اسے بھول جاؤ۔ میں مراد کی طلب میں پاگل ہو رہی ہوں۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''کیا تمہارا کوئی دین ایمان نہیں ہے؟ مراد کے بعد پھر کسی اور کی آغوش میں چلی جاؤ گی۔''

''ہرگز نہیں۔ مراد مل جائے گا تو پھر کسی کی تمنا نہیں کروں گی اور کوئی خواہش نہیں کروں گی۔''

''ہوس میں مبتلا رہنے والوں کی کوئی خواہش آخری نہیں ہوتی۔ یہ لکھ لو کہ وہ کبھی تمہیں گھاس نہیں ڈالے گا۔''

''تم رقیب بن کر بول رہے ہو۔''

''میں دوست بن کر سمجھا رہا ہوں۔ وہ صرف اور صرف... اپنی ماروی کا دیوانہ ہے۔''

"مجھے کوئی تدبیر بتاؤ کہ وہ میرا ہو جائے۔ میں اس کی خاطر اپنے باپ سے بغاوت کر رہی ہوں۔ اس نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ یہ مجھے پاگل کر رہا ہے۔ اس وقت زخموں سے چور ہو کر کالکا کے ایک اسپتال میں پڑا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ وہ میرا یار ہے ابھی کہاں ہے؟ تم کیسے جانتی ہو کہ وہ اسپتال میں ہے؟"

اس نے مختصر سی روداد سنائی کہ اس کے اور مراد کے ساتھ اب تک کیا ہو چکا ہے۔ پھر کہا۔ "میں چاہتی ہوں تم یہاں آؤ اور کسی طرح مراد کو علاج کے لیے دہلی لے جاؤ۔ میں اس کے ساتھ رہوں گی تو پاپا کے شوٹرز میرے ذریعے اسے پہچان لیں گے۔ ابھی اسے موجودہ بہروپ میں کوئی نہیں پہچانتا۔"

"میں اپنے یار کو لینے ابھی آؤں گا۔"

"ابھی کیسے آ جاؤ گے؟"

"تمہارے باپ نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں فوراً تمہیں چھوڑ کر شملہ سے چلا جاؤں۔ ورنہ پچھتاؤں گا۔ میں اپنی سلامتی کے لیے شملہ سے کالکا آ گیا۔ مجھے شاک پہنچا ہے۔ میں ابھی دہلی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے تین دنوں سے یہاں ایک ہوٹل میں ہوں۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ یہاں ہوں۔ تم مراد کے ساتھ کس اسپتال میں ہو۔ مجھے بتاؤ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

اس نے اسپتال کا نام اور پتا بتا کر فون بند کر دیا۔ پھر بڑی حسرت سے مراد کو دیکھا۔ وہ اس کی سلامتی کے لیے اس سے بچھڑنے والی تھی۔

وہ پھر اس کے بیڈ پر آ گئی۔ اس پر چھا گئی پھر اس سے لپٹ کر اسے پیار کیا تو اس غصے سے آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے کہ اسے حاصل نہیں کر سکے گی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس پتھر کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ جان دے کر بھی اسے جیت نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

ایک بیاہتا عورت کتنا غصہ دکھا سکتی ہے؟

نہیں دکھا سکتی۔ کچھ کر دکھانے کے لیے اپنی طاقت یا اپنی اہمیت سے کام لینا ہوتا ہے۔ وہ شہ زور نہیں تھی کہ مرینہ کی طرح ہاتھا پائی کرتی۔ ایک بار مرینہ نے بندوق کے زور پر مراد کو حاصل کیا تھا۔ وہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی عام سی گھریلو عورت تھی۔

پچھلی کہاوت کے مطابق رفتہ رفتہ گھر کی مرغی دال برابر ہونے لگتی ہے۔ اسے اخلاقاً شریک حیات تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن وہ اپنے حقوق منوانے والی اہمیت سے محروم ہو جاتی ہے۔

وہ مراد کو غصہ دکھا کر اس سے دور ہو کر اس سے وصل کے رنگین لمحات چھین کر اسے جدائی کی سزا دے کر گئی تھی۔

تب یہ عقل آئی کہ سزا تو وہ خود کو بھی دے رہی ہے۔ خود کو وصل کے رنگین لمحات سے محروم کر کے ایک طویل جدائی کا عذاب اٹھا رہی ہے اور جسے سزا ملنی چاہیے، وہ آتی جاتی سوکنوں کے ساتھ شاد و آباد ہے۔

ہر بیاہتا کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب اس کی انا زخمی ہوتی ہے۔ خوش فہمی ختم ہوتی ہے اور وہ حالات سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

بشریٰ اور بلے کو اسی محلے میں مکان مل گیا تھا۔ وہ ماروی سے کچھ فاصلے پر آ کر آباد ہو گئے۔ انہوں نے معمولی سا فرنیچر اور چولہے ہانڈی کا سامان خرید لیا تاکہ وہ پوری طرح گھر گرہستی والے نظر آتے رہیں۔

انہوں نے فون پر ماروی کو اطلاع دی کہ وہ اسی گلی کے تیسرے مکان میں آ گئے ہیں۔ ماروی نے چاچی چاچا سے کہا۔ "بلا اپنی بیوی کے ساتھ آ گیا ہے۔ آپ دونوں وہاں جائیں۔ انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو ان کی ہر ضرورت پوری کریں۔ اس بہانے میل ملاپ شروع ہوگا۔"

وہ بہت محتاط ہو کر وہاں رہنا چاہتے تھے۔ چاچی نے کئی گھنٹے کے بعد آ کر کہا۔ "گھر کا نیا سامان سیٹ کرنے میں اتنی دیر ہو گئی۔ بشریٰ تو تمہاری دیوانی ہے۔ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ میں نے رات کے کھانے پر انہیں بلایا ہے۔"

ماروی کا دھیان مراد کی طرف تھا۔ اس نے صبح فون پر کہا تھا کہ وہ دہلی جا رہا ہے۔ وہاں سے لندن جائے گا پھر بڑی رازداری سے اپنی جانِ حیات کو وہاں بلا کر اس کا چہرہ تبدیل کرائے گا۔

آئندہ انہیں بڑے اہم مراحل سے گزرنا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ بڑی کامیابی سے روپوش رہ کر امن و امان سے ایک خوش حال زندگی گزار سکتے تھے۔

وہ پھر اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ شام تک وہ خود ہی اسے فون کرے گا۔

شام ہوتے ہی بشریٰ اور بلا آ گئے۔ بشریٰ نے ماروی کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ پھر اس کے رخسار کو چوم کر بولی۔ "جگ جگ جیو میری بھابی۔ میں نے لندن میں کتنی بار بلے سے کہا کہ تمہارے پاس لے

چلے لیکن کیا کریں، بڑی مجبوریاں تھیں۔"

وہ ہاتھ نچا کر بول رہی تھی اور اچھی لگ رہی تھی۔ ماروی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم تو مجبوریاں جانتی ہو۔ ہم سب چوروں کی طرح چھپ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنے محبت کرنے والوں سے بھی مل نہیں سکتے۔ لیکن ربّ چاہے تو کسی کو بھی کسی وقت ملا دیتا ہے۔ یہی دیکھو کہ ہم کتنی الجھنوں سے گزرنے کے بعد یہاں آ کر مل رہے ہیں۔"

بلے نے کہا۔ "بلی! خدا کے لیے چپ ہو جا۔ جب بولتی ہے تو ریکارڈ کی طرح بجتی چلی جاتی ہے۔ چپ ہونا جانتی ہی نہیں۔"

ماروی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بولنے دو۔ بہت پیاری لگتی ہے۔ تم نے یہ بولنے والی مینا کہاں سے لی ہے؟"

"اس کی بات رہنے دیں۔ میں آپ سے ملتے ہی بہت اہم بات کہنا چاہتا تھا لیکن یہ ڈھول کی طرح بجنے لگی تھی۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "اب تو چپ ہوں۔ بھابی کو میرا بولنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ یہ مجھے مینا کہہ رہی ہیں مگر تم تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو جب میں بولتی ہوں۔"

اس بات پر سب ہی ہنسنے لگے۔ بلے نے کہا۔ "بھابی! محبوب کو کیسے معلوم ہوا ہے کہ آپ یہاں رہتی ہیں۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے یہاں دیکھا ہے۔"

اس نے اچانک ہی چونکا دینے والا سوال کیا تھا۔ ماروی نے باہر گلی کے دروازے کو پریشان ہو کر دیکھا پھر حیرانی سے پوچھا۔ "محبوب اور یہاں...؟"

"ہاں، وہ ایک چھوٹی سی کار ڈرائیو کرتا ہوا آپ کے مکان کی طرف دیکھتا ہوا گیا ہے۔"

اس نے کہا۔ "یا خدا...! سمیرا مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے یہاں کا پتا بتایا تھا۔"

بشریٰ نے کہا۔ "آپ نے گھر والی کو پتا بتایا۔ گھر والا دیوانہ ہو کے چلا آیا۔ یہ مرد ایک ہی عورت کے ساتھ زندگی کیوں نہیں گزارتے۔ دوسری کے پیچھے بھاگے چلے جاتے ہیں۔"

بلے نے کہا۔ "محبوب بہت اچھے انسان ہیں۔ انہیں ہر پہلو سے فرشتہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن عشق کے معاملے میں وہ خبطی ہو جاتے ہیں۔ انہیں عقل سے سوچنا سمجھنا چاہیے۔ ان کا فرض ہے کہ بیاہتا عورت کی نیک نامی کا خیال کریں۔ اسے عزت سے اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے دیں۔"

بشریٰ نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "کیا ان کی بیوی سے کوئی عشق کرے گا تو انہیں تکلیف نہیں ہوگی؟ تب انہیں اپنے اعمال پر شرم نہیں آئے گی؟"

ماروی نے کہا۔ "تم دونوں ذہانت کی، عقل کی بات کر رہے ہو اور عشق عقل سے نہیں دل سے ہوتا ہے۔ دل کو لاکھ سمجھاؤ، یہ کسی کی نہیں مانتا۔ یہ ایسا روگ ہے کہ جنون میں مبتلا کر کے دین و دنیا سے بیگانہ کر دیتا ہے۔"

اس نے فون پر سمیرا کو مخاطب کیا پھر پوچھا۔ "آج تم مجھ سے ملنے کے لیے یہاں آنے والی تھیں۔ تم تو نہیں آئیں، تمہارے میاں صاحب میری گلی کے چکر لگا رہے ہیں۔"

سمیرا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تم یہی چاہتی ہو کہ تمہارے ایک نہیں دو دیوانے ہوں اور وہ دن رات تم سے تمہیں مانگتے ہوں۔ تم نے شروع ہی سے دونوں کو پاگل بنا رکھا ہے۔"

ماروی نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو سمیرا؟"

"جو سچ ہے، وہی کہہ رہی ہوں۔ تم روپوش ہو گئی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد بھی روپوش رہ سکتی تھیں لیکن تم نے میرے ذریعے محبوب کو اطلاع دی کہ آ گئی ہو۔ میں بھی نادان تھی۔ یہ نہ سمجھ سکی کہ میرے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہی ہو اور محبوب کو پھر دیوانہ بنا رہی ہو۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تم میرے طریقہ کار کو غلط زاویے سے بیان کر رہی ہو۔"

"تم اپنی صفائی میں کچھ بھی کہہ لو لیکن شروع سے یہ ثابت کرتی آ رہی ہو کہ ایک مرد سے تمہارا گزارہ نہیں ہو رہا ہے اسی لیے دوسرے کو بھی اپنے آنچل سے باندھ کر رکھتی ہو۔"

وہ غصے سے بولی۔ "بکواس مت کرو۔ تمہیں محبوب کی محبت اور توجہ نہیں مل رہی ہے تو غصہ مجھ پر اتار رہی ہو۔ آئندہ ہوش و حواس میں رہ کر شرافت سے گفتگو کرو گی تو فون اٹینڈ کروں گی ورنہ جاؤ، محرومی کے جہنم میں جلتی رہو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ بشریٰ نے کہا۔ "میں سمجھ گئی۔ وہ میاں کو لگام دینے میں ناکام ہو رہی ہے اور اس کے بہکنے کا الزام آپ کو دے رہی ہے۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "ہاں، وہ بہت ہی شرمناک باتیں کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ ایک مرد سے میرا دل نہیں بھرتا ہے۔ میں نے دو کو پھانس رکھا ہے۔"

ماروی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ بشریٰ نے تڑپ کر کہا۔ "میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔ ایسی بات کہنے کی اسے جرأت کیسے ہوئی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ وہ رہتی کہاں ہے، مجھے بتائیں؟"

ببلے نے کہا۔ ''اے...... تو جوش میں نہ آنا۔ سمیرا نے بھابی کی توہین کی ہے۔ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔''

ماروی نے کہا۔ ''ایک عورت سے نمٹ کر ساری دنیا کی زبان بند نہیں کرسکو گے۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ ''میں ایک عرصے سے محبوب کے ساتھ بدنام ہوتی آرہی ہوں۔ سب ہی کہتے ہیں کہ دو مردوں کے درمیان عیش و عشرت سے زندگی گزار رہی ہوں۔''

وہ بڑے کرب سے بولی۔ ''میں سنتی ہوں تو مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے' یہ میرا خدا ہی جانتا ہے۔''

پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''میں نے سوچا تھا کہ مراد سے شادی ہونے کے بعد لوگوں کو چپ لگ جائے گی۔ لیکن محبوب کی دیوانگی ختم نہیں ہورہی ہے اور وہ سمجھ نہیں رہے ہیں کہ میرے لیے ان کی جو محبتیں ہیں، وہ پھر سے عذاب بن رہی ہیں۔''

اس نے فون اٹھا کر محبوب کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا ''میں بول رہی ہوں۔''

وہ خوش ہوکر بولا۔ ''میں ابھی دعا مانگ رہا تھا کہ تم کسی طرح مجھ سے بولنے لگو۔ میں جانتا ہوں' تم کہاں رہتی ہو۔ تھوڑی دیر پہلے تمہاری گلی سے گزر کر آیا ہوں۔''

ماروی نے پوچھا۔ ''مجھے بدنام کرنے کے لیے اور آپ کیا کیا کریں گے؟ آئیں، میری گلی میں میرے دروازے کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ جائیں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں اور تمہیں بدنام کروں گا؟ نہیں' اس سے پہلے مر جاؤں گا۔''

''کیا آپ کی یاد داشت کمزور ہے؟ کیا میں پہلے ایک داشتہ کے طور پر بدنام نہیں ہوتی رہی؟ کیا اس وقت آپ نے مجھے نیک نامی... دی تھی؟ کیا میری گلی سے گزر کر سوئی ہوئی رسوائی کو پھر سے بیدار کرنے نہیں آئے تھے؟''

وہ بڑی ندامت سے بولا۔ ''یا خدا...! مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ میں کتنا خود غرض ہو جاتا ہوں؟ دیوانگی طاری ہوتی ہے تو تمہاری بدنامی کو بھول جاتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ اب تم پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔''

''انگلی اٹھ چکی ہے۔ ابھی تمہاری شریک حیات نے فون پر کہا ہے کہ ایک مرد سے میرا گزارہ نہیں ہورہا ہے اس لیے دوسرے کو اپنے آنچل سے باندھنے آئی ہوں۔''

''کیا......؟'' وہ چیخ پڑا۔ اس کی چیخ بتارہی تھی کہ وہ پھٹ پڑا ہے۔ ''کیا سمیرا نے ایسی بات کہی ہے؟''

''اس پر غصہ دکھا کر آپ ساری دنیا کی زبانیں بند نہیں کرسکیں گے۔ ہیلو... محبوب...! ہیلو...''

ماروی نے اپنے گونگے فون کو دیکھا پھر پریشان ہوکر کہا۔ ''یا خدا......! وہ تو پاگل ہوگئے ہوں گے۔ پتا نہیں سمیرا کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔''

بشریٰ نے نفرت سے کہا۔ ''اچھا ہے' اسے لاتیں جوتے پڑیں گے۔ اسے ضرور سزا ملنی چاہیے۔''

''میں نہیں چاہتی ان کی ازدواجی زندگی میں دراڑ پڑے۔'' وہ پریشان ہو رہی تھی۔ ''یا خدا...! میں کیا کروں؟ یہ بتانا ضروری تھا کہ ان کے گھر سے ہی میری بدنامی شروع ہورہی ہے۔ لیکن نہیں بتانا چاہیے تھا۔ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔''

ببلے نے کہا۔ ''جو سچ ہے وہ کہنا تھا، آپ نے کہہ دیا لیکن محبوب بیوی پر غصہ اتارے گا۔ یہ نہیں سمجھے گا کہ آپ اسی کی حرکتوں سے بدنام ہورہی ہیں۔ کوئی اپنے غلط رویے کو نہیں سمجھتا۔ وہ بھی نہیں سمجھے گا۔''

چاچی نے دسترخوان لگا دیا۔ وہ سب کھانے کے لیے بیٹھ گئے، ماروی نے کہا۔ ''میں صبر کررہی ہوں۔ مراد یہاں آجائیں گے تو ساری بدنامیاں اور پریشانیاں ختم ہوجائیں گی۔ ہم یہاں سے کہیں دور بہت دور چلے جائیں گے۔''

وہ چپ چاپ کھانے لگے۔ کھانے کے دوران سب ہی اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے۔ ماروی کا مسئلہ سب ہی کا مسئلہ تھا۔ سب ہی پریشان ہورہے تھے۔ بلاول میں کہہ رہا تھا۔ ''بھابی...! آپ مراد کے ساتھ کتنی دور جائیں گی؟ اس کے ساتھ چھپ کر رہنا ممکن نہیں ہے۔ بدنامی اور دشمنی پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔''

ماروی نے ببلے جیسے رازدار سے بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنا چہرہ تبدیل کرے گی تو پھر کوئی اس کے ذریعے مراد تک نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ بڑی رازداری سے محتاط رہ کر دوستوں اور دشمنوں کی نظروں سے گم ہونے والے تھے۔ کیسے کیسے خواب ہوتے ہیں' جن کی تعبیر نہیں ملتی۔ کیسے کیسے ارادے ہوتے ہیں جو تکمیل کے مرحلے تک پہنچ نہیں پاتے۔ پھر بھی انسان خواب دیکھتا ہے اور ارادے باندھتا رہتا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ناممکن کو ممکن بناتا رہتا ہے۔

ماروی نے کھانے کے بعد کہا۔ ''مراد نے کہا تھا' جلد ہی مجھے کال کرے گا لیکن صبح سے شام اور شام سے رات ہوگئی ہے۔ وہ خاموش کیوں ہے؟ کال کیوں نہیں کررہا ہے؟''

اس نے فون اٹھا کر اس کے نمبر پنچ کیے۔ پھر اسے

کان سے لگایا۔ جلد ہی دوسری طرف سے کسی اجنبی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

ماروی نے پوچھا۔ ''ہیلو، آپ کون ہیں؟''

''میں بھی یہی پوچھ رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

''میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں جس کا فون آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

''یعنی آپ مراد سے باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ جسٹ اے منٹ...''

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ''آپ ماروی ہیں نا؟ میں ایمان علی بول رہا ہوں۔ شاید مراد نے کبھی میرا ذکر کیا ہوگا۔''

''ہاں، میں نے آپ کا نام سنا ہے۔ مراد کہاں ہیں؟''

''میں کیا بولوں، آپ کو یہ سن کر صدمہ ہوگا کہ یہ بولنے کے قابل نہیں ہے۔''

ماروی کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے اسے؟ وہ بولنے کے قابل کیوں نہیں ہے؟''

ماروی کی یہ بات سن کر بشریٰ اور ببلے چونک گئے۔ پریشان ہوکر اس کے فون کو دیکھنے لگے۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلتی ہوئی بول رہی تھی۔ ''اسے کیا ہوگیا ہے؟ وہ بولنے کے قابل کیوں نہیں ہے؟ سننے کے تو قابل ہے؟ اپنا فون اس کے کان سے لگاؤ۔ میں بولوں گی تو وہ سنے گا۔''

ایمان علی نے کہا۔ ''پلیز حوصلہ کریں۔ میری بات سنیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہوش میں آیا ہے۔ ڈاکٹر نے ٹریٹمنٹ دی ہے، اسے جوس پلایا گیا ہے۔ ابھی یہ گہری نیند میں ہے۔ اسے جگانا مناسب نہیں ہے۔''

وہ سن رہی تھی۔ پریشان ہورہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟ وہ بے ہوش کیوں ہوگیا تھا؟''

وہ بولا۔ ''ہماری زندگی میں پھول برستے ہیں۔ اس کی زندگی میں گولیاں برستی رہتی ہیں۔ اس بار مقابلہ دشمنوں سے نہیں ہوا تھا۔ دوست بن کر رہنے والی مرینہ سے ہوا تھا۔ آپ کے لیے یہ اچھی خبر ہے کہ سوکن کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ مراد نے اسے جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ اچھی کے ساتھ بری خبر یہ ہے کہ مرینہ نے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔''

اس سے بڑی خوشخبری کوئی ہو نہیں سکتی تھی کہ وہ سہاگن کا گھر جلانے اور دل جلانے والی عورت مرگئی تھی اور جس یار سے شکایت تھی' اسی نے اس سے نجات دلا کر ثابت کیا تھا کہ وہ بے وفا اور ہرجائی نہیں ہے۔ اس کی خاطر حسین ترین عورتوں کو ٹھوکر مار سکتا ہے۔

حیرت انگیز

کیا آپ کو پتا ہے؟ ایک ایسا جملہ...... جسے آپ ہونٹوں کو حرکت دیے بغیر کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہے......

لاالٰہ الا اللہ۔

آپ جانتے ہیں کیوں؟

کیونکہ سائنس کہتی ہے جب کوئی انسان مر رہا ہوتا ہے تو وہ اپنے ہونٹوں کو ہلانے کی طاقت کھو دیتا ہے لہٰذا اللہ پاک نے انسان کے لیے مرتے وقت بھی یہ کلمہ کہنا آسان بنا دیا۔ سبحان اللہ۔

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

یہ بہت بڑی خوش خبری تھی اور ساتھ ہی یہ دل دہلا دینے والی خبر تھی کہ مرینہ نے مرتے مرتے اس کے مراد کو گولیوں سے چھلنی کردیا تھا۔ اسے بھی زندگی اور موت کے درمیان لٹکا کر گئی تھی۔

''یا اللہ...!'' وہ سن رہی تھی اور صدمے سے کانپ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''میرے بھائی...! وہ کس حال میں ہے۔ زیادہ تشویش ناک حالت تو نہیں ہے؟''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ خطرے سے باہر ہے۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ یہ ہفتوں اور مہینوں تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو سکے گا اور تب تک اسے دشمنوں سے چھپا کر رکھنا ہے۔''

ماروی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بشریٰ اس کے پاس آکر خاموشی سے اسے تھپک رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ اسے دشمنوں سے کیسے چھپائیں گے؟ میرا دل ڈوب رہا ہے۔''

''میں نے کہا نا' پریشان نہ ہوں۔ میں دشمنوں کو اپنے یار کی ہوا بھی لگنے نہیں دوں گا۔ یہاں سے دہلی سات آٹھ گھنٹے کا سفر ہے میں نے ایک ایمبولینس کرائے پر حاصل کی ہے۔ اسے آرام سے لے جاؤں گا۔ مراد کو موجودہ بہروپ میں دشمن نہیں پہچانیں گے۔''

''بھائی! آپ رحمت کا فرشتہ ہیں۔ آپ دوستی کا فرض ادا کررہے ہیں۔ میں آپ کے اور مراد کے لیے دعائیں مانگتی رہوں گی۔ آپ وعدہ کریں۔ وہ جیسے ہی نیند سے بیدار ہوں گے آپ ان سے میری بات کرائیں گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایمبولینس آگئی ہے۔ میں اسے لے کر جا رہا ہوں۔ یہ جیسے ہی بیدار ہوگا، میں آپ کو

کال کروں گا۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ ماروی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ بشریٰ نے اس کے سر کو اپنے شانے پر رکھ کر کہا۔ ''بھابی حوصلہ کریں۔ بھائی کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ وہ زندہ ہیں اور دشمنوں سے دور ہیں۔ کوئی رحمت کا فرشتہ ان کے ساتھ ہے۔ وہ کون ہے بھابی؟''

''وہ مراد کا ایک دوست ایمان علی ہے۔ اسے علاج کے لیے دہلی لے جارہا ہے۔ کہتا ہے دشمن اسے پہچان نہیں سکیں گے۔''

بلّے نے کہا۔ ''پھر تو آپ کو مطمئن ہونا چاہیے۔ کیا اس نے بتایا ہے کہ کن لوگوں نے اس پر گولیاں چلائی تھیں؟''

وہ بولی۔ ''اس بار دشمنوں سے نہیں' داشتہ بن کر رہنے والی مرینہ سے مقابلہ ہوا تھا۔ مراد نے اسے مار ڈالا ہے۔ اس کا قصہ ہی ختم کر دیا ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ مراد کو آپ سے چھیننے والی فنا ہو چکی ہے۔''

بلّے نے کہا۔ ''آپ مراد کو اسی لیے چھوڑ کر آئی تھیں کہ وہ مرینہ سے نکاح پڑھوانے والا ہے۔ دیکھ لیں بھابی! وہ آپ کا کیسا دیوانہ ہے۔ اس نے آپ کو حاصل کرنے کی خاطر اسے جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ کیوں بشریٰ! مانتی ہو کہ مرد وفادار ہوتے ہیں؟''

''کوئی نہیں ہوتے۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''بھابی نے غصہ دکھا کر' منہ پھیر کر' ن سٹی سے یہاں آ کر' روپوش ہو کر اپنی قدر و قیمت بڑھائی ہے۔ تب بھائی کو عقل آئی ہے۔''

ماروی نے کہا۔ ''پلیز! بحث نہ کرو۔ مراد میری قدر نہ کرتے' ڈھیٹ بن کر مرینہ کو میری سوکن بنا دیتے تو میں غصہ دکھا کر' روپوش ہو کر کیا حاصل کر لیتی؟ یہ میں بچپن سے دیکھتی آرہی ہوں۔ وہ میرے دیوانے ہیں۔ ہر حال میں میرے ہی رہیں گے۔''

ماروی کے فون نے اسے پکارا۔ ننھی سی اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''ہیلو! آپ کون ہیں؟''

ایمان علی کی آواز سنائی دی۔ ''میں اپنے فون سے بول رہا ہوں۔ آپ یہ نمبر SAVE کر لیں۔ میں اس وقت ایک ایمبولینس میں مراد کو لے جارہا ہوں۔ بہت لمبا سفر ہے۔ صبح کسی وقت دہلی پہنچوں گا۔ آپ کسی طرح کی فکر نہ کریں۔''

''کیا وہ ابھی تک گہری نیند میں ہیں؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے نیند میں کسمسایا تھا۔ اس نے ایک ذرا آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ پھر نیند میں ڈوب گیا ہے۔ اچھا ہے' جب تک وہ گہری نیند ہوتا رہے گا' اسے زخموں کی تکلیف سے نجات ملی رہے گی۔''

وہ بڑے جذبے سے بولی۔ ''بھائی! میں بہت..... بے چین ہوں۔ میں اسے سننا چاہتی ہوں' فون اس کے قریب کریں۔ میں اپنے شیر دلیر کی سانسیں سنوں گی۔''

واہ۔ محبت کرنے والی کی کیا بے چینی تھی؟ کیسے تڑپ رہی تھی۔ ایمان علی نے اپنا فون مراد کی ناک اور منہ کے قریب کیا۔ اس باؤلی کو بھاری بھرکم سانسیں سنائی دینے لگیں۔ اس کا یار دلدار زندہ تھا۔ اس کے پاس آنے کے لیے سانسیں لے رہا تھا۔

ماروی کا دل پاگل ہو کر دھڑک دھڑک کر سینے کی دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے آواز دی۔ ''مراد......! ماروی کی جان......! بولو۔''

وہ ضد کرنے لگی۔ ''میری جان...! اپنی ماروی سے بولو.....''

بھلا غفلت بھری نیند میں کوئی سنتا ہے؟

وہ سنا رہی تھی۔ ''بولو مراد...! نہیں تو میں مر جاؤں گی۔''

اسے نیند میں کراہنے والی آواز سنائی دی۔ ماروی کی التجا اس کے خوابیدہ دماغ کو چھو رہی تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ما......ر......وی۔''

ایمان علی نے حیرانی سے دیکھا اور سنا۔ اس نے گہری نیند میں ماروی کا نام لیا تھا۔ ادھر وہ خوشی سے کھل گئی تھی۔ رو رو کر بشریٰ اور بلّے سے کہہ رہی تھی۔ ''میں اس کی نیند میں ہوں۔ اس کے خواب میں ہوں۔ وہ میرا ہے۔ مجھے کبھی بھول نہیں سکتا۔ ابھی نیند میں میرا نام لے رہا ہے۔''

وہ ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ ایمان علی نے کہا۔ ''ماروی! یہ پیار بھرے جذبات اور احساسات ہیں۔ اس نے نیند میں تمہارا نام لیا ہے۔ لیکن حقیقت کو سمجھو۔ تم اس کی نیند میں مداخلت کر رہی ہو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے' اسے زیادہ سے زیادہ گہری نیند میں رہنا چاہیے۔''

ماروی نے تسلیم کیا۔ ''آپ درست کہتے ہیں۔ میں اپنے مراد کے جاگنے کا انتظار کروں گی۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ یہ اطمینان ہو گیا کہ بیدار ہونے کے بعد اس سے باتیں ہو سکیں گی۔ لیکن یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ دہلی تک لمبا سفر ہے' وہاں پہنچنے تک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

آدمی سوچتا کچھ ہے لیکن کچھ اور ہو جاتا ہے۔ مراد نے ہمیشہ چھپ کر رہنے کے لیے بڑی اچھی پلاننگ کی تھی۔ وہ لندن جا کر وہاں اپنی ماروی کو بلا کر پلاننگ پر عمل کرنے

والا تھا مگر کچھ اور ہو گیا۔ وہ ہفتوں اور مہینوں کے لیے اپاہج ہو گیا تھا۔ یہ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو گا۔

محبت کرنے والے ساری دنیا سے لڑ جاتے ہیں مگر...... اپنی تقدیر سے لڑ نہیں پاتے۔

☆☆☆

سمیرا ڈرائنگ روم میں بیٹھی معروف تجلی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس وقت محبوب نے اپنے بیڈ روم میں ماروی سے فون پر بات کی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ سمیرا کے سامنے آکر سخت لہجے میں بولا۔ ''اٹھو...''

وہ اس کے تیور دیکھ کر سہم گئی۔ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے ماروی سے یہ کہا ہے کہ ایک مرد سے اس کا گزارہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ دوسرے کو اپنے آنچل سے باندھنے آئی ہے؟''

وہ پریشان ہو گئی کہ کیا جواب دے۔ اس کا چہرہ اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مارنے مرنے کے لیے آیا ہے۔

وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ''چپ کیوں ہو؟ اگر سچ نہیں بولو گی' باتیں بناؤ گی' قسمیں کھاؤ گی' تب بھی یقین نہیں کروں گا۔ ماروی نہ ہیرا پھیری جانتی ہے' نہ جھوٹ بولتی ہے۔''

سمیرا نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''آپ ماروی پر ایمان لا چکے ہیں۔ اس کے آگے میں جھوٹی ہی کہلاؤں گی۔ اس لیے آپ جو سمجھتے ہیں' وہی سچ ہے۔''

محبوب نے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اس کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔ وہ لڑکھڑا کر صوفے پر گر پڑی۔ معروف تجلی تیزی سے چلتا ہوا ان کے درمیان آگیا۔ سمیرا کے آگے ڈھال بنتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''کیا تعلیم یافتہ اور مہذب شوہر اپنی بیوی پر اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ شیم آن یو۔ تم اس کے عشق میں پاگل تو ہو ہی گئے تھے' اب جاہل گنوار اور جلاد بھی بن رہے ہو۔''

وہ غصے سے سمیرا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ پہلے اس سے پوچھیں۔ اس نے یہ جو ماروی سے انتہائی شرمناک بات کی ہے' کیا یہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہے؟''

وہ معروف کی طرف گھوم کر بولا۔ ''میں جہالت کا جواب جہالت سے دے رہا ہوں۔ میں اس عورت کو برداشت نہیں کروں گا۔ اس نے ماروی کو دو مردوں سے دل بہلانے والی بے حیا اور بدچلن عورت کہا ہے۔ میں اسے ابھی طلاق دیتا ہوں۔''

معروف نے اسے ایک طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔ ''خبردار طلاق کا لفظ زبان پر نہ لانا۔ یہ میری بیٹی ہے۔''

یہ ایک نئی اور انہونی سی بات ہوئی۔ معروف تجلی خواہ کتنا ہی بزرگ' قابلِ اعتماد اور وفادار مشیر ہو' آخر ملازم تھا۔ اس نے آقا کو طمانچہ مارا تھا۔

ایسی جرأت ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ لیکن وہ مغرور اور بد دماغ آقا نہیں تھا۔ معروف تجلی کو باپ کی طرح مانتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''آپ میرے بزرگ ہیں۔ مجھے اور ماریں لیکن میں ایک ہی بات جانتا ہوں' یہ ماروی کی دشمن ہے۔ میں اسے دوسری طلاق دیتا ہوں۔''

سمیرا نے دھاڑیں مار کر روتے ہوئے کہا۔ ''نہیں میں مر جاؤں گی۔''

معروف نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے طلاق نہیں دے سکتے۔''

وہ اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''میں دوں گا۔ آپ بھی مجھے نہیں روک سکیں گے۔ ماروی کو گالی پڑی ہے' وہ بھی آکر مجھے نہیں روک سکے گی۔''

معروف نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''غدار بک رہا ہے' اسے طلاق نہیں ہو سکے گی۔ یہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

محبوب کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے چونک کر سمیرا کو دیکھا۔ وہ صوفے پر اوندھی پڑی رو رہی تھی۔ وہ بھی چونک کر سر اٹھا کر معروف کو دیکھنے لگی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''حاملہ عورت کو طلاق نہیں ہوتی۔ تم تین بار نہیں' تین سو بار طلاقیں دیتے رہو' وہ قابلِ قبول نہیں ہوں گی۔''

یہ چونکا دینے والی اور خوش کرنے والی بات تھی۔ وہ ایک بچے کا باپ بننے والا تھا لیکن ماروی کے آگے تمام خوشیاں ہیچ تھیں۔ اس نے کہا۔ ''میں دوں گا۔ آج نہ سہی' بچے کی ڈلیوری کے بعد دوں گا۔ اس نے ماروی کو گالی دی ہے۔ میں اسے طلاق کی گالی دوں گا۔ اسے ایک لمحے کے لیے اپنے گھر میں برداشت نہیں کروں گا۔ اے چل اٹھ یہاں سے۔ اپنی اوقات میں آجا۔ جو سامان لے جا سکتی ہے' یہاں سے لے جا۔''

معروف نے کہا۔ ''تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔ یہ مت بھولو کہ یہ صرف تمہاری شریک حیات ہی نہیں ہے۔ تمہارے بزنس کی ''ماسٹر کی'' ہے۔ یہ بزنس کی کمزوریوں کو ہی نہیں' تمہارے کاروباری چور کھاتوں اور کالے دھن کو بھی

جاتی ہے۔ یہ جائے گی تو دیکھتے ہی دیکھتے اربوں کا کاروبار دوکوڑی کا ہوجائے گا۔"

"معروف صاحب! آپ مجھے نہ ڈرائیں۔ میں ماروی کو پانے کے لیے اپنی تمام کشتیاں جلا چکا ہوں۔ بہت پہلے ہی کاروبار سے غافل ہو چکا ہوں۔ ماروی نہیں تو یہ کاروبار بھی نہیں۔ یہ دنیا نہیں۔ میں دنیاداری چھوڑ کر جوگ لے لوں گا۔ کہہ دیا نا، ماروی نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اس کے لیے جوگی بن کر پھرتا رہوں گا۔"

وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "اس چھت کے نیچے اس عورت کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ دو گھنٹے بعد واپس آؤں تو یہ مجھے یہاں نظر نہ آئے۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک گم صم سے رہے۔ پھر معروف نجی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ معروف نے کہا۔ "یہ لاعلاج ہو چکا ہے۔ ماروی نے اسے اچھی طرح پاگل بنا دیا ہے۔"

وہ اسے اپنے شانے سے الگ کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم نے بھی ایجوکیٹڈ ہو کر جہالت کی انتہا کی ہے۔ تم نے ماروی کے لیے جو الفاظ کہے ہیں، کیا وہ تمہیں زیب دیتے ہیں؟"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "جب یہ اچھی طرح سمجھ میں آگیا کہ وہ پھر محبوب کو زیپ کرنے دوبارہ یہاں آئی ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ اگر میں نے گالی دی ہے تو یہ جھوٹ نہیں ہے۔ اسے ایک ذرا احساس نہیں ہے کہ وہ محبوب اور مراد کے درمیان گالی بن گئی ہے۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "نہ ماروی کو احساس ہوگا نہ محبوب دیوانگی سے باز آئے گا۔ اوہ گاڈ...! ابھی وہ بہت ہی تباہ کن اور جاہلانہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اگر میں نہ کہتا کہ تم ماں بننے والی ہو تو ابھی تمہیں طلاق ہو چکی ہوتی۔"

وہ بولی۔ "میں آپ کے منہ سے یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ بائی گاڈ! آپ بہت ہی ذہین اور حاضر دماغ ہیں۔ آپ نے اچانک جھوٹ بول کر مجھے ڈوبنے سے بچالیا ہے۔"

"آئندہ نہیں بچا سکوں گا۔ آگے دو چار ماہ میں بھید کھل جائے گا کہ تمہیں اس کی جہالت سے بچانے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ ماروی کو ملنے والی گالی اس کے دماغ میں گونجتی رہے گی۔ جھوٹ کھلتے ہی وہ تمہیں طلاق دے دے گا۔"

وہ بے بسی سے رونے کے انداز میں بولی۔ "معروف صاحب! میں کیا کروں؟ میرا پورا کیریئر تباہ ہوجائے گا۔ وہ ذلیل کمینی مرتی کیوں نہیں ہے؟"

اچانک ہی معروف نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اس کی موت لازمی ہے۔ ہمارا جھوٹ کھلنے سے پہلے اسے مرجانا چاہیے۔"

سیرا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایک بڑا قدم اٹھانا ہوگا۔ میں اس کے باپ کے زمانے سے کاروباری مشیر ہوں۔ یہ میرے بچے جیسا ہے۔ میں اس کی بہتری چاہتا ہوں اور یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری جیسی لائف پارٹنر ہی اسے اور اس کے کاروبار کو سنبھال سکتی ہے۔"

وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ "جاؤ، اپنا ضروری سامان لے آؤ۔ ہم ایک نئے منصوبے کے مطابق کام کریں گے۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ وہ خلا میں تکتے ہوئے سوچنے لگا۔ اپنے ذہن میں ایک منصوبے کو پکانے لگا۔ پھر اس نے فون پر حماد صدیقی سے پوچھا۔ "کیا بہت مصروف ہو؟"

اس نے کہا۔ "ایک کرمنل کی فائل کی اسٹڈی کر رہا ہوں۔ کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔ آپ حکم کریں۔"

"تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک اہم معاملہ درپیش ہے۔"

"آپ جہاں کہیں کے ملنے آجاؤں گا۔"

"آدھے گھنٹے بعد سیرا کے مکان میں آجاؤ۔"

"اوکے۔ آرہا ہوں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ ایک ملازم سیرا کا سامان باہر گاڑی میں پہنچا رہا تھا۔ اب وہ لائف پارٹنر کے محاذ سے نکل کر بزنس پارٹنر کے محاذ سے جنگ جیتنے جارہی تھی۔

☆☆☆

محبوب نے ساحل سمندر پر آکر گاڑی روک دی۔ وہاں تمام رات عورتوں، مردوں اور بچوں کا میلا لگا رہتا تھا۔ اسپاٹ لائٹس کے ذریعے ساحل اور سمندر دور تک دکھائی دیتے تھے۔ محبوب کا دماغ گرم تھا۔ ماروی کے بارے میں ایسی شرمناک بات کہی گئی تھی کہ وہ اب تک پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے دماغ کو سکون پہنچانے اور رس بھری آواز سننے کے لیے اس کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہوتے ہی کہا۔ "میں بول رہا ہوں۔"

ماروی نے کہا۔ "آپ کو کیا ہوگیا تھا؟ آپ نے باتیں کرتے کرتے اچانک ہی لائن کاٹ دی تھی۔ آپ کو میری پوری بات تو سنی چاہیے تھی۔"

"اور سننے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ گالی تمہیں

نہیں، مجھے پڑی ہے۔ اس وقت بھی میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔"

"آپ کے عشق کے پہلے دن سے یہ کیچڑ مجھ پر اچھالی جارہی ہے۔ لیکن آج اس لیے طیش میں آگئے کہ غصہ اتارنے کے لیے ایک بیوی گھر میں ہے۔ سچ بولیں آپ نے سیرا سے کوئی زیادتی تو نہیں کی ہے؟"

"میں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"کیا؟" وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اسے واپس لے کر آئیں۔"

"میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں تو ابھی اسے طلاق دے رہا تھا۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "کیا آپ پاگل ہوگئے ہیں؟"

"ابھی نہیں دی ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ حاملہ عورت کو طلاق نہیں دی جاتی۔"

"یاخدا! آپ اپنے ہونے والے بچے کی ماں پر ظلم کرنے والے تھے؟"

"وہ تو کروں گا۔ تم سے شرمناک باتیں کہنے والی کو معاف نہیں کروں گا۔ نو ماہ بعد ہمیشہ کے لیے اس کی چھٹی کر دوں گا۔"

وہ حیرانی سے منہ کھولے سن رہی تھی پھر غصے سے بولی۔ "آپ سچ مچ پاگل ہوگئے ہیں۔ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ اسے طلاق دے کر مجھے خوش کر دیں گے؟"

"اسے سزا ملنی چاہیے۔"

وہ سخت لہجے میں چیخ کر بولی۔ "میں ایک بیاہتا کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گی۔ آپ ابھی قسم کھائیں، مجھ سے وعدہ کریں۔ آپ سیرا کی غلطی معاف کر دیں گے۔ کبھی طلاق کا لفظ زبان پر نہیں لائیں گے۔"

"تم نے ایک بار پہلے بھی قسم دی تھی۔ مجھے سیرا سے شادی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ آج میں قسم نہیں کھاؤں گا۔ کوئی وعدہ نہیں کروں گا۔"

"تو پھر سن لیں۔ آج کے بعد فون پر بھی میری آواز نہیں سنیں گے۔ میں پھر کہیں جا کر گم ہوجاؤں گی۔"

وہ عاجز ہو کر بولا۔ "تم مجھے کیوں مجبور کر دیتی ہو۔ میں تمہاری توہین کرنے والی عورت کے ساتھ نہیں رہوں گا۔"

"میری توہین آپ کر رہے ہیں۔ دیوانے ہو کر میرے پیچھے آتے ہیں اور مجھے بدنام کرتے ہیں۔ یااللہ...! آپ کو اپنی غلطی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ معروف صاحب ایک بار کہہ رہے تھے کہ پوری بزنس کمیونٹی میں یہی چرچا ہوتا ہے کہ میں دو مردوں سے کھیلنے والی عورت ہوں۔ آپ کتنے لوگوں کی زبانیں بند کریں گے؟ کیا مجھے دل و دماغ سے نکال کر بھول نہیں سکتے؟ آپ نے میرے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ کیا مجھے بدنامی سے بچانے کے لیے اور قربانی نہیں دے سکتے؟ صرف مجھے بھول جانا ہے۔ میں آپ سے یہی ایک قربانی چاہتی ہوں۔"

وہ ذرا چپ رہا۔ پھر بڑے کرب سے بولا۔ "تم ایسی قربانی چاہتی ہو، جو میرے لیے ناممکن ہے۔ تمہیں بھولنے کا مطلب ہے میں مر جاؤں۔ نہ رہوں گا، نہ یاد کروں گا، نہ پیچھے آؤں گا، نہ تمہاری بدنامی ہوگی۔"

"خبردار محبوب! مرنے کی بات نہ کریں۔ آپ زندہ رہیں گے۔ میں اپنی قسم دے رہی ہوں۔ بولیں آپ زندہ رہیں گے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تم نے ہر طرح سے الجھا دیا ہے۔ مجھے سوچنے دو۔ ابھی دس منٹ بعد کال کروں گا۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ سوچنے لگی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟

مراد نے پھر سے اس کا پیار پانے کی خاطر اسے مرینہ جیسی سوکن سے نجات دلائی ہے۔ محبوب اس کی توہین نہ برداشت کرتے ہوئے سیرا کو طلاق دینا چاہتا ہے۔

اس بیاہتا کو جیتے جی طلاق کے نام پر مردہ بنانے والا تھا۔ دونوں ہی اس کے طالب تھے۔ دونوں ہی اس کے عشق میں جنون کی حد سے گزر رہے تھے۔

تہذیب کی آنکھ سے دیکھا جائے تو محبوب کی طلب جائز نہیں تھی۔ اب اسے بیاہتا ماروی کی طلب سے باز آجانا چاہیے تھا۔ لیکن دیوانے خود کو بھول جاتے ہیں تو تہذیب کو کیا یاد رکھیں گے؟

اسے کوئی سمجھا نہیں سکتا تھا۔ وہ پیار کے پہلے دن سے ماروی کے لیے اپنا سب کچھ ہارتا چلا آرہا تھا۔ ہر طرح کی قربانیاں دیتا آرہا تھا۔ اب آخری قربانی دینے والا تھا۔

اس نے دس منٹ کے بعد فون پر کہا۔ "تم چاہتی ہو میں تمہیں بھول جاؤں اور زندہ بھی رہوں۔"

"خدا کے لیے ایک بار ملنے والی زندگی کی قدر کرو۔"

"میں آخری بار تمہاری یہ بات مان لیتا ہوں لیکن میں اس طرح بھول سکتا ہوں کہ تم بھی مجھے بھول جاؤ۔ میرے بارے میں نہ سوچو کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں؟"

"یہ تو ضرور معلوم کروں گی کہ مجھے بھول کر زندہ سلامت رہتے ہو یا نہیں؟"

"اس شہر میں نہیں رہوں گا تو کیسے معلوم کروگی؟ کسی سے میرے بارے میں پوچھو گی تو پھر بدنام ہونے لگو گی کہ دوسرے مرد کے پیچھے پڑ گئی ہو۔"

"آپ اس شہر میں کیوں نہیں رہیں گے؟"

"تمہیں یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اپنی طبعی عمر تک زندہ رہوں گا۔ اس کے بعد اپنی کوئی بات منواؤ گی تو نہیں مانوں گا۔"

"میں جانتی ہوں۔ آپ زبان کے سچے ہیں۔ مجھ سے وعدہ کیا ہے تو سلامتی سے زندہ رہیں گے۔ میں اور کوئی بات نہیں منواؤں گی۔"

"یہ لو۔ میں تمہیں بھولنے کی ابتدا کر رہا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ گویا اسے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ دوسرے لفظوں میں اس کی زندگی سے نکل گیا۔

یہ تو ماننے والی بات نہیں تھی۔ وہ اس کی زندگی سے تو شاید نکل سکتا تھا لیکن اسے اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتا تھا۔

چونکہ اپنے تن سے 'من سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہیں گوشہ نشین ہونے جا رہا تھا۔ شہر چھوڑنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ شاید مجنوں کی طرح کہیں صحرا میں بھٹکنے والا تھا۔ وہ وہاں سے کار ڈرائیو کرتا ہوا اپنی کوٹھی میں آیا۔ وہ کوٹھی سمیرا کے وجود سے خالی ہو چکی تھی۔

سمیرا کے گھر کے ڈرائنگ روم میں معروف تجلی اور حماد صدیقی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ معروف اسے محبوب' ماروی اور سمیرا کی موجودہ روداد سنا رہا تھا۔ سمیرا انہیں کھلانے پلانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس وقت گرما گرم کافی پلا رہی تھی۔

حماد صدیقی نے تمام روداد سننے کے بعد کہا۔ "محبوب صاحب تمام دنیاوی معاملات میں بے حد ذہین ہیں لیکن ماروی کے معاملے میں وہ ذہانت سے بالکل ہی محروم ہو جاتے ہیں۔"

اس نے سمیرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اپنی ذہین اور باصلاحیت شریک حیات کو طلاق دینا چاہتے ہیں۔"

معروف نے کہا۔ "میں نے ایک جھوٹ بول کر تین چار ماہ کے لیے طلاق کے معاملے کو کھٹائی میں ڈال دیا ہے لیکن اس کے بعد وہ وہی کرے گا جو اس کے دماغ میں سما گیا ہے۔"

"ہم ایسا اندھیر نہیں ہونے دیں گے۔"

"تم کیا کر لو گے حماد؟ میں اس کا بزرگ مشیر ہوں۔ وہ ایک بیٹے کی طرح میری عزت کرتا ہے۔ مجھے اپنا باپ مانتا ہے لیکن ماروی کے معاملے میں میری کوئی بات نہیں سنتا۔"

سمیرا نے کہا۔ "محبوب کو اپنے کاروبار کی پروا نہیں ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ جتنی دیانت داری سے میں کاروبار سنبھال رہی ہوں' کوئی اس طرح نہیں سنبھالے گا۔"

معروف نے کہا۔ "میں بڑھاپے میں کب تک اتنے بڑے بزنس سیٹ اپ کو قائم رکھ سکوں گا۔ اسے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ کاروبار بیٹھ جائے گا اور وہ کنگال ہو جائے گا۔"

"مجھے تو فکر ہے۔ میں ان کی شریک حیات ہوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، کیا کروں؟ دو چار مہینوں میں یہ جھوٹ کھل جائے گا کہ میں حاملہ نہیں ہوں۔ پھر تو وہ اور زیادہ طیش میں آ کر مجھے ٹھکرا دیں گے۔"

معروف نے کہا۔ "حماد! تم محبوب کے وفادار ہو۔ میرے ذہن میں ایک ہی راستہ ہے' جہاں سے محبوب واپس آ سکتا ہے اور ہمارا ہی ہو کر رہ سکتا ہے۔"

حماد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ معروف نے پوچھا۔ "کیا اس کی بہتری کے لیے وہ کرو گے' جو میں کہوں گا؟"

"میں ان کی بہتری کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

معروف نے کہا۔ "ماروی کے وجود کے بارے میں سوچو۔ وہ بیاہ کر مراد کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی تھی۔ اس کا وجود یہاں نہیں رہا تھا، تب محبوب رفتہ رفتہ نارمل ہو گیا تھا اور کاروبار میں پوری طرح دلچسپی لے رہا تھا۔"

حماد نے تائید میں سر ہلایا۔ معروف نے کہا۔ "اب وہ آئی ہے تو پھر ابنارمل ہو گیا ہے۔ پہلے سے زیادہ پاگل ہو رہا ہے۔ ماروی کا وجود پھر نہیں رہے گا تو وہ پھر نارمل ہو جائے گا اور میں چاہتا ہوں' ماروی نہ رہے۔"

اس نے حماد کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ حماد اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اس مصیبت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔"

سمیرا نے چونک کر معروف تجلی کو دیکھا۔ حماد نے ایک گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ "سمجھ لیں، مصیبت ختم ہو چکی ہے۔"

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



تحفہ

بابر نعیم

دل ہار کے کسی کو پانے کی خواہش کرنا اور... خواہشوں کے جنون میں کسی کے آگے اپنی ذات کو ہارنے میں زمین آسمان جیسا فرق ہوتا ہے... بس یہی فرق اس نادان نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اور... یہی بے پروائی اس کے عشق، حسن حتیٰ کہ زندگی کی بھی دشمن بن گئی۔

مٹھی میں دنیا کو قید کرنے کے جنون میں مبتلا ایک ہوس زدہ حسینہ کا ماجرا

ہیرس بوگر کوئی شریف آدمی نہیں تھا اور یہ میں بہت پہلے سے جانتی تھی۔ دراصل ہم دونوں اتنی تیزی سے قریب آئے تھے کہ مجھے کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں اس کی شخصیت نہیں بلکہ دولت سے مرعوب ہو گئی تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ میں نے بھی اس کی دست درازی کا برا نہیں منایا جس سے اس کا حوصلہ بڑھا اور پھر ہم ہفتے میں ایک یا دو بار اس کے اپارٹمنٹ میں ملنے لگے، گو کہ اس کی شخصیت میں اتنی کشش نہیں تھی لیکن اس کے

اپارٹمنٹ کی خوب صورتی اور آرائش نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ اونچی اونچی منقش چھتیں، وسیع و عریض بالکونی اور نیویارک کا دلکش نظارہ یہ سب کچھ میرے لیے سحر زدہ تھا۔

پہلی ملاقات کے تین ماہ بعد بھی ہیرس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پھر اس نے اپنا مطلب نکل جانے کے بعد مجھے ایک جانب دھکیل دیا۔ میں اپنے جسم کو چادر سے لپیٹ کر بستر کے کنارے پر چلی گئی اور وہ اطمینان سے بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ سگریٹ کے دھوئیں کی بو سے لگتا تھا کہ وہ کوکین سے بھرا ہوا ہے۔

"بہتر ہوگا کہ تم مارلین کے گھر آنے سے پہلے چلی جاؤ۔"

مارلین اس کی بیوی کا نام تھا جو وال اسٹریٹ کے کسی دفتر میں کام کرتی تھی۔ میں نے اس کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہارے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کے ارادے سے آئی تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ اس طرح کے مواقع مشکل سے ہی ملتے ہیں۔"

اس نے مجھے غصے سے گھورا اور اپنے موٹے موٹے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "کیا ابھی تمہارا دل نہیں بھرا؟"

"تم چاہو تو میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔" اس نے جواب میں کہا لیکن مجھے اس کی آواز میں کھوکھلا پن محسوس ہوا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ مارلین کی برائیاں کرتا رہتا تھا۔ وہ بہت بدمزاج اور بےجھوری ہے۔ اسے نشہ کرنے کی عادت ہے۔ وہ ہر وقت ہیرس کو موٹا ہونے کا طعنہ دیتی رہتی ہے اور اس کا بالکل خیال نہیں رکھتی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں سن کر میں سوچتی کہ اگر وہ اتنی ہی بری ہے تو ہیرس اسے گھر سے کیوں نہیں نکال دیتا۔ ان کا تو کوئی بچہ بھی نہیں تھا جس کی وجہ سے ہیرس کو یہ قدم اٹھانے میں دشواری ہوتی۔ مارلین اتنی بےوقوف نہیں تھی کہ ہیرس جیسے دولت مند شخص کو چھوڑ کر چلی جاتی۔ اس کا تعلق بھی ایک دولت مند گھرانے سے تھا اور یقیناً اس کے پاس آمدنی کے اور ذرائع بھی ہوں گے۔ اس کے باوجود ہیرس کی جان کو چمٹی ہوئی تھی۔ بہرحال میں سر کھپانا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے تو صرف اپنے منصوبے پر عمل کرنا تھا۔

"ڈارلنگ! مجھے بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟" میں ایک ادا سے بولی۔ "اس وقت تمہیں کس چیز کی خواہش ہے؟"

اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا۔ "تم جانتی ہو کہ مجھے اس وقت کس چیز کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔"

میرا خیال تھا کہ ابھی اس کی تشنگی باقی ہے اور وہ مجھ سے کوئی خاص فرمائش کرنے والا ہے، لہٰذا اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ "جانتی ہوں کہ تم کیا چاہ رہے ہو۔"

"مجھے اس وقت فرنچی کے یہاں کا بنا ہوا برگر چاہیے۔" وہ بستر پر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

میں بستر کی قیمتی چادر کا حشر دیکھ کر گھبرا گئی جس پر سگریٹ کی گرم راکھ پڑنے سے جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے لیکن ہیرس کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی، وہ ان کی جگہ لینن کی چادریں بچھا لیتا جن کی قیمت میرے ڈربا نما فلیٹ کے ایک ماہ کے کرایے سے بھی زیادہ تھی۔

"فرنچی کا برگر۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔ جانتی تھی کہ وہ عام برگر کے مقابلے میں بہت مہنگا ہوتا ہے اور پیسے والے لوگ بھی خاص خاص مواقع پر ہی اس سے شوق فرماتے ہیں۔

"ہاں۔" ہیرس کے جبڑوں کی سختی اب مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں ایک ندیدے بچے کی سی طلب نظر آنے لگی تھی۔ "تم اپنے لیے بھی منگوا لو۔"

"نہیں مجھے اس کی خواہش نہیں ہے۔" میں نے اپنے خوب صورت اور چھریرے بدن پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر میں دونوں ہی کھا لوں گا۔" اس کے چہرے پر برہمی کے آثار نمودار ہونے لگے اور وہ نچلا ہونٹ دباتے ہوئے بولا۔ "کیا تم بھی مارلین کی طرح مجھے مٹاپے کا طعنہ دو گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ موروثی ہے اور کھانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

اس نے اپنا سگریٹ سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاس میں بجھایا اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں نہانے جا رہا ہوں تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

"خدا حافظ۔" میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔ جیسے مجھے اس سے بچھڑنے کا افسوس ہو رہا تھا۔ جبکہ مجھے خود بھی غسل کی خواہش ہو رہی تھی لیکن جیسے ہی باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آئی تو میرا ارادہ بدل گیا۔ میں بستر سے اتری اپنا حلیہ درست کیا اور جوتے پہن کر مارلین کے ڈریسنگ روم میں داخل ہو گئی۔ اس کمرے کی خوب صورتی اور سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دیواروں پر قدِ آدم آئینے لگے ہوئے تھے اور فرش پر قیمتی پھول دار قالین بچھایا گیا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ بہت بڑا شیلف نصب تھا جس میں دنیا بھر کے قیمتی برانڈز کے جوتے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک جوتا اٹھا کر دیکھا لیکن وہ گیارہ نمبر کا تھا یعنی میرے ناپ سے تین نمبر زیادہ۔ میں نے مایوس ہو کر اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا پھر میں نے اسکارف اتارا اور اسے ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے پر

اس طرح لٹکا دیا کہ مارلین اسے کسی بھی طرح نظر انداز نہ کر سکے۔ اب میری نگاہوں کا مرکز اس کی ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ مارلین کو چیزیں ترتیب سے رکھنے کی عادت تھی۔ اس لیے تمام سامان قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ وہ بہت ہوشیار اور عقل مند تھی اور اسی لیے اپنے تمام زیورات الماری میں بند کر کے جاتی تھی لیکن اس کے باوجود سنگھار میز پر جو سامان رکھا ہوا تھا وہ میرے لیے کسی قیمتی خزانے سے کم نہ تھا۔ میں نے ایک کریم کی شیشی اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی قیمت پانچ سو ڈالرز تھی۔ میں نے جلدی سے وہ شیشی اپنے بیگ میں ڈال لی۔ مجھے پرفیوم کا زیادہ شوق نہیں تھا لیکن میں اس کرسٹل کی بوتل کو کیسے نظر انداز کر سکتی تھی جس کی قیمت سترہ سو ڈالرز تھی۔ ان چیزوں کے غائب ہو جانے پر مارلین ضرور پریشان ہوگی اور سمجھ جائے گی کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی عورت اس کے اپارٹمنٹ میں آتی رہی ہے اور میرا مقصد بھی یہی تھا۔

اچانک ہی میری نظر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پڑ گئی جو ایک بوتل کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ لکھا تھا۔ "بدچلن عورت، تم میرے شوہر کے لیے بہت مناسب ہو۔"

میرا خون غصے سے کھول اٹھا۔ گویا وہ میرے اور ہیرس کے تعلق کے بارے میں جانتی تھی لیکن اس نے میرے منہ پر کبھی یہ بات نہیں کہی حالانکہ وہ میری موجودگی میں دو مرتبہ دفتر آ چکی تھی لیکن وہ میرے سامنے سے گزر کر ہیرس کے کمرے میں چلی گئی اور اس نے مجھے ہیلو تک کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس لمحے میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ میں فوراً ہی اس اپارٹمنٹ سے چلی جاؤں۔ وہ کسی وقت بھی واپس آ سکتی تھی اور مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میں ڈریسنگ روم سے باہر آئی اور اس کا دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ باتھ روم سے ابھی تک پانی کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ہیرس کئی ہفتوں سے نہیں نہایا تھا۔ گو کہ وہاں مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن میں خود اپنے آپ کو چور محسوس کر رہی تھی پھر جب میں اس کے لیونگ روم میں داخل ہوئی تو وہاں کی سجاوٹ اور نفاست دیکھ کر یہ احساس ماند پڑ گیا۔ اس میں فرانسیسی نوادرات کے ساتھ ساتھ نادر ایشیائی اشیا بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس گھر کی مالکن بن جانے کے بعد کیا تبدیلیاں لاؤں گی تاہم اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا تاکہ اس گھر پر میری چھاپ آ سکے۔

میں نے کچن کے فون سے فرنچی کو برگر لانے کے لیے کہا۔ ایک سو پچاس ڈالرز کا برگر خریدنا ہیرس کے لیے معمولی بات تھی۔ اس کے لیے پیسوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ ایک نوعمر لڑکے کی طرح برگر کھانے کا شوقین تھا۔ فون پر آرڈر دینے کے بعد میں نے الماری سے ایک گلاس نکالا اور اسے اپنے ہونٹوں سے اس طرح لگایا کہ اس پر میری لپ اسٹک کا نشان آ جائے پھر میں نے وہ گلاس کاؤنٹر پر رکھ دیا تاکہ اس پر نظر پڑتے ہی مارلین کو یقین آ جائے کہ میں نے رات اسی کے فلیٹ میں گزاری تھی۔ اگر وہ اپنا بھرم برقرار رکھنا چاہتی ہے تو اسے یہ گھر چھوڑنا ہی ہوگا۔

دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے پُرشوق نگاہوں سے لیونگ روم کی طرف دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے پہلے سے ہی یہاں رہ رہی ہوں۔ یہ احساس میرے لیے خوش گوار ہونے کے ساتھ ساتھ اذیت ناک بھی تھا۔ میں یہاں رہنے کے لیے ہر قیمت دینے کو تیار تھی، چاہے وہ ہیرس کا ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

☆☆☆

ففتھ ایونیو سے باہر آنے .... اور سینٹرل پارک کے ساتھ ساتھ چلنے کے دوران بھی میں اسی تصور میں کھوئی رہی۔ میں اپنے آپ کو صبح کے وقت سینٹرل پارک میں جاگنگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی پھر میں نے اپنے آپ کو جم میں یوگا کی مشق کرتے ہوئے دیکھا۔ میں قرب و جوار کے ہوٹلوں میں لنچ کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی پھر میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اپنے آپ کو آرٹ میوزم کی میٹنگ میں شرکت کرتے دیکھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ دوسری معزز خواتین کی طرح صرف کرسی پر بیٹھ کر سر نہیں ہلاؤں گی بلکہ میوزیم کے لیے عملی کام بھی کروں گی۔

آرٹ سے مجھے ویسے بھی بہت دلچسپی تھی۔ جب شروع شروع میں نیویارک آئی تو مجھے کئی آرٹ گیلریوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ میرا خیال تھا کہ ان گیلریوں میں آرٹ کے دلدادہ امیر کبیر نوجوان آتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی میری زندگی کا ساتھی بن جائے لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ وہاں آنے والے بھی میری طرح خستہ حال تھے۔ وہ گیلری کا چکر لگاتے، تصویروں پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے واپس چلے جاتے۔ ایک دو نے مجھ سے بےتکلف ہونے کی کوشش کی لیکن ان کی مالی پوزیشن مجھ سے بھی بدتر تھی۔ چھ سال تک جدوجہد کرنے کے بعد میں نے دفتر میں ملازمت کر لی۔ وہاں میرا واسطہ بھانت بھانت کے لوگوں سے پڑا لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے

معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور اب میں تینتیس سال کی ہو چکی تھی۔ ایک دولت مند اور اسمارٹ شخص کے ملنے کی امید ختم ہوتی جارہی تھی چنانچہ مجھے بھی اپنی خواہشات کی فہرست میں ترمیم کرنا پڑی اور اب مجھے دولت کے علاوہ کسی شے کی آرزو نہیں تھی۔

ہیرس سے راہ و رسم بڑھانے کا مطلب بھی یہی تھا کہ میرا معیار کس حد تک پست ہو چکا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی بھی لڑکی اسے پسند نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا قد درمیانہ تھا لیکن اس نسبت سے اس کا وزن کہیں زیادہ تھا۔ صرف اڑتیس سال کی عمر میں اس کے سر کے کافی بال جھڑ گئے تھے۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر رہتی تھیں اور جسم سے بدبو آتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے دانتوں سے ناخن کترنے کی عادت تھی لیکن وہ پیسے کمانے کا ہنر جانتا تھا اور یہی وہ خوبی تھی جس کی وجہ سے میں اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

☆☆☆

کام کے دوران وہ مجھے نظر انداز کر دیتا جبکہ میں زیادہ سے زیادہ اس کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ مجھے اس کے دفتر میں استقبالیہ کلرک کی ملازمت مل گئی تھی۔ مجھ سے پہلے اس جگہ پر کام کرنے والی لڑکی ایک دولت مند تاجر سے شادی کر کے چلی گئی تھی چنانچہ میں نے بھی اُس کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کرلیا لیکن مجھے ہیرس کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ وہ میری جانب ضرور متوجہ ہوگا لیکن دو دن گزر جانے کے باوجود بھی اس نے مجھے لفٹ نہیں کروائی تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد اس کے کمرے میں چلی گئی۔

”میں تمہیں بہت یاد کر رہی ہوں ڈارلنگ۔“ میں نے کسی شوخ محبوبہ کی طرح اٹھلاتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری اس ادا پر پاگل ہو جائے گا لیکن وہ انتہائی رکھائی سے بولا۔

”اس وقت میں مصروف ہوں۔“ اس کی نگاہیں کمپیوٹر اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی میز پر تین کمپیوٹر رکھے ہوئے تھے جن کی مدد سے وہ دنیا بھر کی مارکیٹوں میں ہونے والے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھ سکتا تھا۔ پورا کمرا سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا حالانکہ دفتر میں سگریٹ پینے پر پابندی تھی لیکن مالکان اپنے چہیتے منیجرز کو ناراض نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ انہیں بھاری منافع کما کر دیتے تھے۔

”کیا تم آج کی شام میرے ساتھ گزارنا پسند کرو گے؟“ میں نے بے شرم بن کر کہا۔

”نہیں۔“

اگر میں اس کی باتوں کی پروا کرتی تو یقیناً میرے جذبات مجروح ہو جاتے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”جی چاہتا ہے کہ تمہیں اس کھڑکی سے دھکا دے دوں؟“ لیکن اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”کوئی بات نہیں اگر تم مصروف ہو تو میں کل آجاؤں گی۔“

”نہیں۔“ ایک بار پھر اس نے انکار کر دیا۔

میرے لیے یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا کہ اس نے ایک مرتبہ بھی آنکھ اٹھا کر میری جانب نہیں دیکھا۔ ایک عورت کی اس سے زیادہ توہین کیا ہو سکتی ہے لیکن میں بھی انکار کی وجہ جانے بغیر اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہاری بیوی گھر پر ہی ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے بے زاری سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کیا عنقریب اس کا کہیں باہر جانے کا ارادہ ہے؟“

”ہاں، وہ اگلے ہفتے مجھے چھوڑ کر پولو کا میچ دیکھنے... بارباڈوس جارہی ہے۔“

میں نے اس کے لہجے میں چھپے کرب کو واضح طور پر محسوس کیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی عدم توجہی کی وجہ سے افسردہ ہے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”حیرت ہے، وہ تمہیں اس طرح چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے۔“ میں موقع ملتے ہی اس کی ران پر بیٹھ گئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”اسے تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ قدرت نے اسے تم جیسا شوہر دیا۔“

وہ میری قربت سے پگھل گیا اور اس کی ساری مصروفیت دھری کی دھری رہ گئی۔ جب ہم ایک چھوٹے سے ڈرامے کے بعد فارغ ہوئے تو اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ البتہ میری حالت نسبتاً بہتر تھی۔

میں نے دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور میک اپ درست کرنے لگی۔ میری خواہش تھی کہ دفتر کا کوئی فرد ہم دونوں کو اس حالت میں دیکھ لے اور موقع کا گواہ بن کر بعد میں میرے کام آسکے۔

”تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر مجھے لطف آیا۔“ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”جب میری بیوی شہر سے باہر جائے گی تو تمہیں بتا دوں گا۔ اس طرح ہمیں کچھ وقت مزید ساتھ گزارنے کے لیے مل جائے گا۔“

میں کہنا چاہ رہی تھی کہ تم جیسے آدمی کے ساتھ ایک پل گزارنا بھی میرے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے لیکن اپنی غرض

کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اس لیے منافقانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولی۔ ”ڈارلنگ! میں اتنا انتظار نہیں کر سکتی۔“

اگر اس کی جگہ کوئی ذہین شخص ہوتا تو میرے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو سمجھ لیتا لیکن وہ اپنی ذات میں مگن اور خود پسند بندہ تھا۔ اس لیے اس نے میرے لہجے پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جب میں واپس جانے کے لیے اٹھی تو اس نے آواز دے کر کہا۔ ”میرے لیے پیزا منگوا دو اور اگر تمہیں خواہش ہو رہی ہو تو اپنے لیے بھی......“

☆☆☆

اگلی مرتبہ جب میں ہیرس کے اپارٹمنٹ میں گئی تو پوری طرح ہتھیاروں سے لیس تھی تاکہ وہ مکمل طور پر میری زلف کا اسیر ہو جائے اور مارلین کو کسی بوسیدہ ردی کے کاغذ کے مانند اپنی زندگی سے نکال دے۔ میں نے انتہائی نفاست سے میک اپ کیا اور اپنے جسم کو ایک مخصوص خوشبو سے مہکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک رومانی شاعری کی کتاب بھی خریدی جسے میں اپنے منصوبے کے مطابق ہیرس کے بستر پر سائڈ ٹیبل پر چھوڑ آتی۔ مارلین اچھی طرح جانتی تھی کہ ہیرس کو ایسی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس طرح میں اسے یہ پیغام دینا چاہتی تھی کہ وہ یہ جنگ ہار رہی ہے۔ اس کے علاوہ میرا ارادہ تھا کہ واپس آنے سے پہلے اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر ایک تحریر چھوڑ آؤں گی جس پر لکھا ہوگا۔ ”تنہائی تمہارا مقدر بن چکی ہے۔“

جب میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اس کی سنگھار میز پر گئی تو وہاں پہلے سے ہی کریم کی شیشی کے نیچے ایک چھوٹا سا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ ”میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دو۔ یہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

مجھے بڑے زور کی ہنسی آگئی اور میں سوچنے لگی کہ کیا یہ عورت پاگل ہو گئی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس طرح کی تحریروں سے میں خوف زدہ ہو جاؤں گی۔ اس کے انداز سے گھبراہٹ عیاں تھی اور وہ جان گئی تھی کہ میں اس کے گھر میں نقب لگا چکی ہوں۔ اب اس کے پاس اپنے دفاع کا واحد راستہ یہی تھا کہ اس طرح کے دھمکی آمیز پیغامات سے مجھے ڈرانے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے میری اس گھر میں آمد خطرے کی علامت تھی۔ وہ میرا نام نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اسے میرے بارے میں کوئی اور معلومات تھیں لیکن وہ اتنا ضرور سمجھ گئی تھی کہ اس کھیل میں میرا پلہ بھاری ہے۔

ابھی تک یہ واضح نہیں تھا کہ میں اس جیت کا انعام کس طرح وصول کروں گی۔ یہ سچ ہے کہ میں نے مارلین کی غیر موجودگی میں اس کے قیمتی لباس پہن کر دیکھے لیکن میں اپنے لیے اس طرح کے کپڑے خود خریدنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی سنگھار میز سے قیمتی کریمیں اور لوشنز چرائے لیکن میری تسلی نہیں ہوئی۔ میں اپنے آپ کو مارلین کی جگہ رکھ کر اپنی مرضی سے ان چیزوں کی خریداری کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس کی سنگھار میز ان عورتوں کے لیے کسی طرح بھی ایک بڑے اسٹور سے کم نہ تھی جو اپنے آپ کو پرکشش اور جوان رکھنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔

”بہتر ہوگا کہ تم اس کی طرح بے مقصد اور کھوکھلی نظر آنے کی کوشش نہ کرو۔“ ہیرس نے ایک دن مجھ پر ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ اس وقت میں سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی غور سے ان ہلکی ہلکی لکیروں کو دیکھ رہی تھی جو میری آنکھوں کے نیچے نمودار ہوتی جارہی تھیں۔ اگر ہیرس کی نظر ان پر پڑ جاتی تو وہ فوراً مجھے اپنی زندگی سے نکال دیتا۔ میں اس کے مزاج سے واقف ہوتی جارہی تھی۔ وہ من مانی کرنے کا عادی تھا۔ میں نے ایک ہفتہ اس کے ساتھ رہ کر جان لیا کہ وہ ایک حیوان صفت انسان تھا۔ اسے ظالم تو نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ کسی دوسرے کی ضرورت کا احساس نہیں کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنے لیے کھانے کا آرڈر دیتے وقت میرے بارے میں بھول جاتا اور جب میں شکایتی نظروں سے اس کی جانب دیکھتی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔ قربت کے لمحات میں بھی وہ مجھ سے غلاموں جیسا سلوک کرتا لیکن میں اسے خوش رکھنے کے لیے اپنے آپ کو مطمئن و مسرور ظاہر کرتی۔ ایک رات جب اس نے کوکین کا نشہ پورا کرنے کے لیے بستر کی دوسری جانب دھکیلا تو مجھے غصہ آگیا اور میں نے جل کر کہا۔

”کیا تم اپنی بیوی کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتے ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”کیوں؟“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا اس سے بہت محبت کرتے ہو؟“

”پتا نہیں، لیکن ہمیں اس طرح کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ اس لیے میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنے پر مجبور ہوں۔“

’دوسری لڑکیاں‘ میں چونک اٹھی اور میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ”گویا تمہارے دوسری لڑکیوں سے بھی تعلقات ہیں۔ تم انہیں بھی یہاں بلا لو ہم مل کر پارٹی منائیں گے۔“ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”فی الحال میں تمہارے علاوہ کسی اور سے نہیں مل رہا۔“ اس نے اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجھ سے پہلے تمہارے دوسری لڑکیوں سے تعلقات رہے ہیں۔“ میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

''ہاں۔'' اس نے ایک نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''پھر ان کا کیا بنا؟ ان تعلقات کے ختم ہونے کی کیا وجہ تھی؟''

''کبھی میں اکتا گیا اور کبھی انہوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہر تعلق کے ختم ہونے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔''

''کیا تم نے کبھی مارلین سے تعلق ختم کرنے کے بارے میں سوچا؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''لیکن تم نے ابھی تک اس پر عمل نہیں کیا؟''

''ایک دفعہ یہ کوشش کر چکا ہوں۔'' اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''واقعی؟'' میرا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''میں ایک اور لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا اور ہم دونوں شادی کرنے والے تھے لیکن یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا اور ہمارے تعلقات ختم ہو گئے۔''

''کیا مطلب...... میں کچھ سمجھی نہیں۔''

ہیرس نے جواب میں کچھ نہ کہا بس بستر سے ٹیک لگائے چھت کو گھورتا رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''میں نے کہا نا کہ ہماری بات نہ بن سکی اور وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔''

''اور اس طرح مارلین تمہاری زندگی میں دوبارہ واپس آ گئی۔''

''ہاں اس کے ساتھ زندگی گزارنا آسان نہیں حالانکہ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر دوسری عورتوں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع فراہم کرتی ہے چنانچہ میں اسے برداشت کر رہا ہوں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بیوی کو بھی میری قربت گوارا نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ اسے تمہاری خوشی کا کچھ خیال نہیں؟'' میں اس کے اوپر جھکتے ہوئے بولی۔

''وہ تمہارے جیسی نہیں ہے۔'' ہیرس میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''تم نے تو مجھے نہال کر دیا ہے اگر وہ چلی گئی تو کیا تم اس کی جگہ لینا پسند کرو گی؟''

''کیا تم یہ بات مجھ سے پوچھ رہے ہو؟'' میں اپنے اندر کے جوش کو دباتے ہوئے بولی۔ تمام تر ناگواری اور کراہیت کے باوجود میں اس کے لیے تیار تھی اور اس کے خوب صورت اپارٹمنٹ میں رہنا چاہتی تھی۔

''ہاں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اکیلا نہیں رہنا چاہتا۔ اگر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو تمہیں فوراً یہاں آنا ہوگا۔''

''میرا خیال ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔''

''تمہارے ساتھ رہنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا کیونکہ تم ہر وقت میرے پاس رہو گی اور مارلین کی طرح کئی کئی دنوں کے لیے مجھے چھوڑ کر سیر سپاٹے کے لیے نہیں نکل جاؤ گی، وعدہ کرو۔''

''کبھی نہیں۔'' میں نے اپنے سینے پر کراس بناتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''تب پھر میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا وقت بہت اچھا گزرے گا۔''

میرا دل چاہا کہ اس کے منہ پر تھپڑ مار دوں۔ اس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے یہ فیصلہ صرف اسی کا ہو۔ اس میں میری مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ دراصل اسے اپنی ملازمت اور دولت پر بہت غرور تھا اور میں اسی دولت میں سے اپنا حصہ وصول کرنے کی خاطر اسے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔

''میں تمہیں مارلین سے کہیں زیادہ خوش رکھوں گی۔'' میں نے منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ہیرس کے اپارٹمنٹ میں کافی وقت گزارنے کے بعد جب باہر آئی تو کافی خوش تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس کی بے مروتی اور خود غرضی پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اسے اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ مجھے گھر تک جانے کے لیے ٹیکسی کا کرایہ ہی دے دیتا۔ گو کہ اس کی کسر میں نے مارلین کی سنگھار میز سے پوری کر لی تھی اور میرا بیگ چھوٹی موٹی کئی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن میں قیمتی پرفیوم، جلد کو نکھارنے والے لوشنز اور کریمیں، میک اپ کا سامان اور چاندی کی بالیوں کی ایک جوڑی بھی شامل تھی جنہیں مارلین نے تالے میں بند کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیرس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات میرے لیے اضافی خوشی کا باعث تھے۔

میں جانتی تھی کہ وہ ہیرس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اس لیے سیر و تفریح کے بہانے گھر سے باہر نکل جاتی ہے تاہم وہ اس سے علیحدگی یا طلاق نہیں چاہتی اور اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ میرے ساتھ راتیں گزار رہا ہے تو وہ گھر میں ہی رہنے کو ترجیح دیتی۔

اس خیال کے آتے ہی میں خوف زدہ ہو گئی اور اگر ایسا ہوا تو میری ساری محنت رائگاں چلی جائے گی۔ میں نے اپنے گھر جانے کے لیے زیر زمین راستے کی جانب دیکھا لیکن مجھ میں اس

کی سیڑھیاں اترنے کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے ان لمحوں سے خوف آ رہا تھا جب اپنے تنگ و تاریک سیلن زدہ کمرے میں قدم رکھتی۔ میں اس جگہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دینا چاہتی تھی۔ میرے قدم گھر جانے کے بجائے ایک گرجا کی طرف اٹھ گئے اور تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آپ کو گرجا کے ہال میں پایا۔

میں کئی سالوں بعد کسی گرجا میں گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ کبھی مجھے اعتراف کا خیال ہی نہیں آیا اور شاید اب بھی میں اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہاں اور بھی کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید پادری کا وعظ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اپنا بیگ کھول کر مارلین کی لکھی ہوئی تحریر نکالی جس پر لکھا ہوا تھا۔

''میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دو، یہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

میں سوچنے لگی کہ اس سے پہلے مارلین نے نہ جانے کتنی عورتوں کے لیے یہ تحریر چھوڑی ہوگی جن کے ساتھ اس کا شوہر بے ایمانی کرتا رہا۔ میں اس قطار میں سب سے آخر میں کھڑی تھی اور پھر اچانک ہی مجھے یہ سب کچھ فضول لگنے لگا۔ مجھے ہیرس سے محبت نہیں تھی لیکن میں اس کے اپارٹمنٹ میں رہ کر اس جیسی زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن میں آنے والے وقت کا تصور کر کے کانپ اٹھی جب ہیرس کا دل مجھ سے بھر جاتا یا اس کی زندگی میں کوئی اور عورت آ جاتی تو وہ مجھے دھتکار دیتا جیسا کہ وہ اب تک دوسری عورتوں کے ساتھ کرتا آیا تھا۔ میں یہ سب کچھ غلط کر رہی تھی اور اس کا جو نتیجہ نکلتا اس کے بعد کہیں کی نہ رہتی۔

''یہیں رک جاؤ۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ہیرس کے علاوہ بھی اس دنیا میں امیر لوگ موجود ہیں، میں کسی بھی شریف آدمی کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر سکتی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ ہیرس کی مزید چاپلوسی نہیں کروں گی اور اگر اس نے میرا پیچھا کیا تو کسی اور کا دامن تھام لوں گی جو مجھے تحفظ اور عزت دے سکے۔ مجھے کوئی نہ کوئی بہتر شخص مل ہی جائے گا۔

☆☆☆

میں تقریباً تین ماہ تک اپنے ارادے پر قائم رہی۔ اس نے کئی بار مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی لیکن میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے ٹال دیتی۔ بالآخر ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ مجھ سے الجھ پڑا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ہم نے بہت اچھا وقت ساتھ گزارا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں میرا بہت خیال ہے۔''

''تم شادی شدہ ہو اور میں کسی ایسے شخص میں دلچسپی نہیں رکھتی۔''

اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہونے لگے جیسے میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میں اس کی بے بسی سے محظوظ ہوتی رہی۔

اسی دوران نیگال سے میرے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ وہ بھی ہیرس کی طرح فنڈ منیجر تھا۔ اس کے ساتھ میرا ایک مہینا بہت اچھا گزرا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں جنت میں پہنچ گئی ہوں پھر ایک دن ایسا آیا جب میں واقعی مرنے کے قریب پہنچ گئی۔ وہ مجھے ایک پرائیویٹ جہاز میں برمودا لے گیا۔

''تمہاری یہی بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ تم کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کرتیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے پیار سے میری گردن پر ہاتھ پھیرا پھر اچانک ہی میرا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ میں نے چلانا چاہا لیکن میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ اس کی سبز آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں اور میری تکلیف کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں کی چمک بھی بڑھتی گئی پھر میں بے ہوش ہو گئی جب ہوش آیا تو میں فرش پر پڑی ہوئی تھی اور وہ کرسی پر بیٹھا سگار کے کش لگا رہا تھا۔

''گو کہ تم بری طرح زخمی ہو گئیں لیکن مجھے بہت مزہ آیا۔'' وہ سفاک لہجے میں بول رہا تھا۔

اس کی مضبوط گرفت کی وجہ سے میری گردن پر گہرا نشان پڑ گیا تھا لیکن اب وہ نیکلس کے نیچے چھپ گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد ہیرس مجھے دوبارہ اچھا لگنے لگا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ وہ ہر طرح سے مجھے منانے میں لگا ہوا تھا۔ وہ مجھے فون کرتا اور پھول بھیجتا رہتا پھر اس نے میرے لیے ایک خوب صورت بریسلیٹ خریدا۔ جب اس سے بھی بات نہ بنی تو ہیری ونسٹن کے یہاں سے یہ نیکلس لے کر آ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میرے دور ہونے کی وجہ کیا ہے لیکن مجھے حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار تھا جب اس نے یہ بات مجھ سے کہی تو میں نے شرط عائد کر دی کہ وہ مارلین کو اپنے گھر سے چلتا کر دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔

دوسرے ہی دن میں اس کے اپارٹمنٹ میں چلی آئی۔ مارلین نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اس نے نہ تو کوئی گلاس توڑا، اور نہ ہی گھر کی کسی چیز کو نقصان پہنچایا۔ اس کے برعکس اس نے اپنے کپڑے، جیولری اور دوسرا ذاتی سامان سمیٹا اور گھر سے چلی گئی۔ ہیرس کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ البتہ اس کے کچھ کپڑے اور جوتے یہیں رہ گئے تھے مگر سنگھار میز کا سارا قیمتی سامان وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ حسب عادت وہ

میرے لیے بھی ایک تحریر چھوڑ گئی تھی جس پر لکھا تھا۔
''اب وہ مکمل طور پر تمہارا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس سے لطف اندوز ہوتی رہو۔''

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس نے کوئی جھگڑا نہیں کیا اور شور شرابا کیے بغیر یہاں سے چلی گئی۔ کیا اس نے میرا مذاق اڑانے کے لیے یہ تحریر چھوڑی تھی یا وہ مجھے عدم تحفظ اور مجرم ہونے کا احساس دلانا چاہ رہی تھی جبکہ میرے خیال میں یہ اس کی شکست تھی۔ میں نے اس تحریر کے پرزے پرزے کیے اور اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

ہیرس کے بارے میں میرے خدشات بہت جلد حقیقت کا روپ دھار گئے۔ اس کے ساتھ رہنے کا مطلب پکنک منانا نہیں تھا جب سے اس کے اپارٹمنٹ میں آئی تھی میرا پرس خالی تھا۔ ہیرس نے مجھے کبھی پیسے نہیں دیے۔ ایک دو مرتبہ میں نے اس سے پیسے مانگے تو کہنے لگا۔

''تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے لیتا آؤں گا۔''

میں نے پہلے ہی اپنی مطلوبہ اشیا اور ضروری کاموں کی فہرست تیار کر رکھی تھی جن میں سب سے اوپر ایک ماہر جلد کا نام تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ عورتوں کی بڑھتی ہوئی عمر اور اس کے اثرات کو روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہیرس وہ فہرست دیکھتے ہی بھڑک اٹھا اور بولا۔ ''کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو، مارلین بھی اس طرح کے فضول شوق پر کافی پیسے ضائع کرتی تھی اب ایسا نہیں ہوگا۔''

البتہ اس نے میرے کپڑوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور میرے لیے کچھ ملبوسات کا آرڈر دے دیا دوسرے روز ہی وہ کپڑے آگئے۔ ان کے ساتھ مارلین کے لیے بھی ایک باکس تھا جو کسی ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے آیا تھا اور اس کے میک اپ کا سامان تھا جو وہ ہر مہینے منگواتی تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس میں پیرس کے مشہور برانڈ کی کریمیں اور لوشن موجود تھے۔ اس لوشن کی قیمت چھ سو ڈالر فی اونس تھی اور یہ جلد کے مردہ خلیوں کو تیزی سے بحال کر دیتا تھا۔

اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اب مجھے کسی جلد کے ماہر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہ شیشی لے کر تیزی سے باتھ روم کی طرف بھاگی۔ اپنا چہرہ پانی سے دھویا اور اس پر تھوڑا سا لوشن لگایا فوراً ہی میری جلد میں کانٹے سے چبھنے لگے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لوشن اپنا کام کر رہا ہے۔ میں نے کریم کی شیشی کھولی اور انگلیوں کی مدد سے اپنے چہرے پر آہستہ آہستہ کریم ملنے لگی۔ میرے چہرے اور انگلیوں میں سنسناہٹ ہونے لگی تو میں یہی سمجھی کہ یہ کوئی بہت ہی مؤثر کریم ہے پھر میں نے ایک بام کی شیشی اٹھائی جو جلد کو نرم کرنے کے لیے تھا لیکن اسے چہرے پر لگاتے ہی شدید جلن ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے میری جلد کی اوپری تہ اتار دی ہو۔ میں چلائی اور پانی سے اپنا چہرہ دھونے لگی لیکن جب میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو میری چیخیں نکل گئیں۔ میرے چہرے کی جلد مکمل طور پر سرخ ہو چکی تھی اور میری آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

''تیزاب سے لگے ہوئے زخم آسانی سے نہیں بھرتے۔'' ڈاکٹر نے میری جانب تاسف سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ بات انہوں نے مجھے کافی دنوں بعد بتائی جب میرے درد کی شدت میں کمی آگئی تھی اور میں قدرے پرسکون ہوگئی تھی۔ میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی لیکن انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔

''پلاسٹک سرجری سے تمہارا چہرہ اصل حالت میں واپس آسکتا ہے لیکن اس کے لیے ہمیں کئی آپریشن کرنا ہوں گے جبکہ ان کے اخراجات انشورنس کمپنی سے ملنے والے معاوضے سے پورے نہیں ہوسکتے۔ کیا کوئی شخص تمہاری مالی مدد کرسکتا ہے؟''

''ہاں، میرا بوائے فرینڈ۔'' میں بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی کیونکہ میرے ہونٹ بھی جھلس گئے تھے۔

''ٹھیک ہے، جب وہ تم سے ملنے آئے گا تو ہم اس سے بات کرلیں گے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

ہیرس صرف ایک بار مجھے دیکھنے کے لیے آیا۔ وہ بھی اس وقت جب میں سو رہی تھی۔ یہ بات مجھے ایک نرس نے بتائی۔ میں اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرتی رہی پھر نرس سے کہہ کر اسے فون کروایا پھر میں نے خود بھی اسے فون کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے رابطہ نہ ہوسکا۔ ہیرس کبھی نہیں آیا پھر ایک شام نرس نے مجھے ایک لفافہ لاکر دیا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھول کر کاغذ پر نظر ڈالی اس پر لکھا ہوا تھا۔

''پیاری لیسی! مجھے افسوس ہے کہ ہمارے درمیان معاملات درست انداز میں نہ چل سکے ...... مگر میں تمہاری بہتری کے لیے دعا گو ہوں۔''

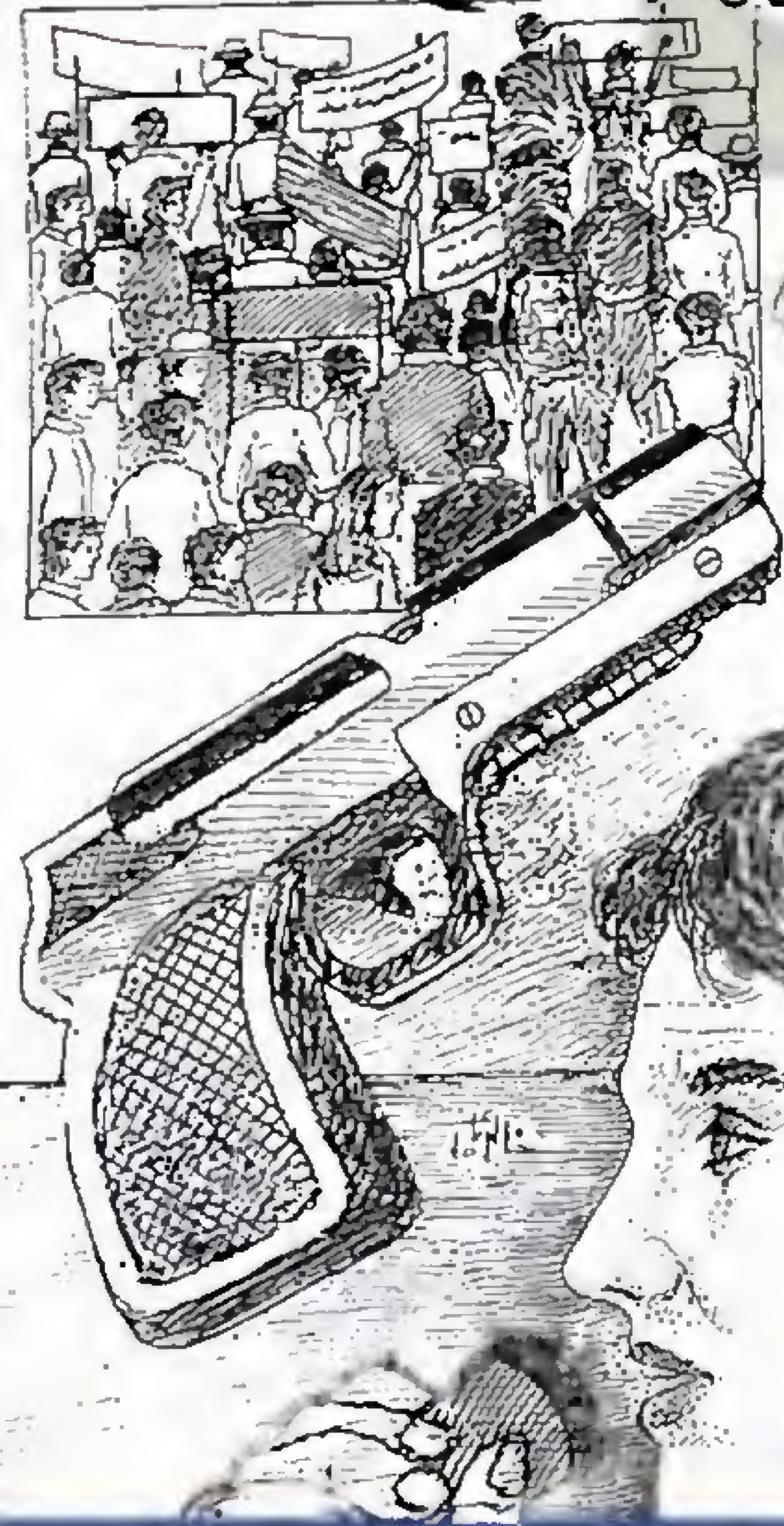
اس خط پر کسی کا نام نہیں لکھا ہوا تھا لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ میں مارلین کی لکھائی اچھی طرح پہچانتی تھی۔

مضبوط فیصلے

مسریم کے حنان

اکثر دل کے نزدیک رہنے والے اپنے مطلوب کی ہر اچھی بری بات سے آگاہ اور ہر راز سے واقف ہوتے ہیں... مگر جب یہی جان کاری ان کے لیے ایسا ہتھیار بن جائے جس سے مطلوب کی زندگی تباہ اور خواب بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں تو دل پر بہت شدید چوٹ لگتی ہے... چاہتوں کی شدتیں ہمیشہ کہیں سنوارتی ہیں اور کہیں بگاڑ کی انتہا کر دیتی ہیں۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس کے حصے میں ایسی چاہت آئی کہ بقا قائم رہی اور نہ ہی وفا سلامت رہی۔

محبت کا انتقام محبت سے لینے والی ایک حسینہ کی نفرتوں کی انتہا



بارش بہت تیز تھی اور حادثہ بہت شدید تھا۔ کئی ٹن وزنی ریل انجن نے اس مضبوط گاڑی کے پرخچے اڑا دیے تھے کم سے کم اگلا حصہ تو بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ گاڑی کے پرزے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک مرد کی شکستہ لاش پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور گاڑی کی نشست کے ساتھ بندھی اور اس سے چپک جانے والی عورت کی لاش تھی۔ یہ حصہ بھی گاڑی سے الگ ہو گیا تھا۔ شاید تیسری لاش ایک نوجوان لڑکی کی تھی جو گاڑی کے بیچ جانے والے حصے

چھجے کے کھلے دروازے سے سر کے بل الٹی باہر تک آرہی تھی۔ اوپر سے برستا پانی اس کے خون کے ساتھ مل کر نیچے گر رہا تھا۔ تیز بارش اور رات کی تاریکی کے باوجود پھاٹک کے ساتھ کھمبے پر جلتی تیز روشنی میں یہ سارا منظر واضح نظر آرہا تھا۔ ریل لائن کے ساتھ ہی ایک کار صحیح سالم کھڑی تھی اور اس کے ساتھ کھڑا نوجوان بارش میں بھیگتا ہوا موبائل پر ریسکیو والوں کو کال کر کے حادثے کی اطلاع دے رہا تھا۔ اس ریلوے کراسنگ پر بیریئر نہیں تھا اور شاید اسی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا تھا۔

☆☆☆

اعلیٰ درجے کے ہائی وے ریستوران میں پھول دار پودوں کے بڑے گملوں سے گھری اس میز پر چار افراد تھے۔ ایک معمر مرد اور ایک معمر عورت، ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکا تھا۔ وہ سب میز پر سجے ہوئے ڈنر سے انصاف کرتے ہوئے ہوئے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ معمر جوڑا میاں بیوی کا تھا۔ نوجوان لڑکی فرحانہ ان کی بیٹی تھی اور نوجوان لڑکا عامر ان کی بیٹی کا امیدوار تھا۔ فرحانہ نے حال ہی میں گریجویشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ یہ ڈنر اصل میں اسی خوشی میں تھا مگر ڈنر سے ایک دن پہلے فرحانہ نے ماں باپ سے کہا کہ وہ ان سے کسی کو ملانا چاہتی ہے۔ پھر ماں کے توسط سے اس نے ان پر واضح کر دیا کہ وہ عامر کو پسند کرتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

ریاض علی ملک ایک روشن خیال اور اوپری طبقے کے انسان تھے جو شخصی آزادی پر پورا یقین رکھتے تھے۔ ان کی بیگم ریحانہ بھی ہم خیال تھی۔ فرحانہ ان کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ اسے ہر صورت خوش دیکھنا چاہتے تھے مگر یہ اطلاع ان کے لیے غیر متوقع تھی کیونکہ فرحانہ نے آج تک اشارتاً بھی نہیں کہا تھا کہ وہ کسی کو پسند کرتی ہے۔ اب وہ کہہ رہی تھی کہ وہ کسی لڑکے کو پسند کرتی ہے اور اس سے شادی بھی کرنا چاہتی ہے۔ ریاض اور ریحانہ نے آپس میں مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ فرحانہ کو کوئی ناگوار تاثر نہیں دینا چاہیے مگر وہ اس رشتے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ضرور کریں گے۔ اسی سوچ کے ساتھ وہ شہر سے ذرا فاصلے پر اس ریستوران تک آئے۔ ریاض علی اکثر دارالحکومت سے صوبائی دارالحکومت جاتے ہوئے موٹر وے سے ذرا دور اس ریستوران میں کھانے کے وقت ضرور رکتے تھے۔ انہیں یہاں کا ماحول اور ڈشز بہت پسند تھیں۔ دوست احباب اور رشتے داروں کو بھی اکثر وہ یہاں کھانے پر مدعو کرتے رہتے تھے۔

فرحانہ نازک خدوخال اور گلابی رنگت والی بہت پیاری سی لڑکی تھی۔ قد دراز اور جسم چھریرا مگر تمام نسوانی خوبیوں سے بھرپور تھا۔ اس کی عمر بیس سال سے ذرا اوپر تھی مگر اپنے معصومانہ نقوش کی وجہ سے سترہ اٹھارہ سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ ریاض اور ریحانہ کو اپنی بیٹی کی خوب صورتی پر ناز تھا۔ ان کے خیال میں اس کے لیے شوہر بھی ایسا ہی خوبرو ہونا چاہیے۔ جب عامر سامنے آیا تو انہیں دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ فرحانہ نے اس معاملے میں ان کی پسند کا خیال رکھا تھا۔ سرخی مائل سفید رنگت اور کسی قدر لمبے براؤن بالوں کے ساتھ وہ خوبرو اور مضبوط جسامت والا نوجوان تھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آنکھیں بہت نرم تاثر لیے ہوئے تھیں۔ فرحانہ نے اس کا تعارف کرایا۔ ریاض ڈنر کے لیے عامر کے آنے سے پہلے کہہ چکا تھا مگر اس نے اخلاقاً پوچھ لیا کہ وہ کیا لینا پسند کرے گا۔

''یہی سب۔'' عامر نے مینیو دیکھ کر کہا۔ ''اتفاق سے سب مجھے پسند ہے۔''

ڈنر کا آغاز ہوا تو ریاض اور ریحانہ نے سرسری سے انداز میں عامر سے اس کے بارے میں سوالات شروع کیے۔ اس نے بتایا کہ وہ آٹو انجینئر ہے اور اپنی ورکشاپ چلاتا ہے۔ اس کی ورکشاپ دارالحکومت کے ایک پوش سیکٹر کے کمرشل ایریا میں تھی۔ اس کی رہائش اسی سیکٹر کے ایک اپارٹمنٹ میں تھی جو اس نے حال ہی میں خریدا تھا۔ اس کا خاندان دوسرے شہر میں تھا۔ فرحانہ سے اس کی ملاقات اس کی ورکشاپ پر ہوئی تھی۔ اس نے بھی سرسری سے انداز میں بتایا کہ وہ بہت دولت مند نہیں ہے مگر اتنا خوشحال ضرور ہے کہ ایک بیوی کو تمام تر آسائشوں کے ساتھ رکھ سکے مگر ریحانہ اور ریاض نے اس کی بات کو خاص اہمیت نہیں دی۔ ریاض علی ایک ارب پتی صنعت کار تھا اور اس کے نزدیک ایک آٹو انجینئر یقیناً اس کی اکلوتی بیٹی کے لائق نہیں تھا مگر وہ بات کو احسن طریقے سے اپنے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لیے دورانِ ڈنر وہ صرف سوالات تک محدود رہا۔

فرحانہ اپنے ماں باپ کو اچھی طرح جانتی تھی اس لیے وہ کھٹک گئی تھی مگر خاموشی سے کھاتی رہی۔ ڈنر ختم ہوا تو ویٹرز پلیٹیں اٹھانے لگے۔ ان کارش ختم ہوا تو ریاض علی نے پہلے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک جدید ترین آئی فون نکال کر فرحانہ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ تمہاری ماما اور میری طرف سے تمہارے پاس ہونے کا گفٹ ہے۔''

''تھینک یو پاپا اینڈ ماما۔'' فرحانہ نے بنا کسی خاص خوشی کے اظہار کے آئی فون لے لیا۔

ریاض علی نے بکس سے ایک سگار نکال کر سلگایا اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''عامر! تم سے مل کر خوشی ہوئی کہ تم بہت کم عمری میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو، اپنا بزنس چلا رہے ہو۔ یقیناً آنے والے دنوں میں تم بہت آگے جاؤ گے۔ اس حوالے سے ہمیں تمہارے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن......''

''لیکن کیا؟'' عامر نے پوچھا۔

اس کا جواب ریحانہ نے دیا۔ ''لیکن ہم چاہتے ہیں کہ فرحانہ اپنی تعلیم مکمل کرے اور اس کے بعد اپنا گھر بسائے۔''

''مام! میں نے گریجویشن کرلیا ہے۔'' فرحانہ بولی۔

''ہاں مگر گریجویشن آج کل کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم کم سے کم ایم بی اے کرو۔ ان پروفیشنل سینس، یونو ہمارا جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے اور ہمارے بعد تم نے ہی سب ہینڈل کرنا ہے۔''

فرحانہ احتجاج کرنا چاہتی تھی مگر عامر نے اس سے پہلے کہا۔ ''ایک عورت کو گھر چلانے کے لیے جتنی تعلیم چاہیے ہوتی ہے، فرحانہ یقیناً اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔''

''بات صرف گھر کی نہیں ہے۔ اس کے پاپا کا بہت بڑا بزنس ہے اور ہمارے بعد یہی اس کی وارث ہے۔''

فرحانہ نے باغی لہجے میں کہا۔ ''میں آپ دونوں سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''دلچسپی ہو یا نہ ہو، اسے آپ نے ہی دیکھنا ہے۔'' ریاض علی نے نرمی سے کہا۔

''پاپا......''

''میرا خیال ہے بات ہوگئی ہے۔'' ریاض علی نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور پھر عامر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

عامر اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے کسی قدر توقف کے بعد کہا۔ ''میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے فیملی ڈنر میں مجھے شریک کیا۔''

وہ کرسی کھسکاتے ہوئے کھڑا ہوا تو فرحانہ بھی اس کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اس نے ریاض علی سے ہاتھ ملایا اور ریحانہ کو اللہ حافظ کہا تو اس نے زیرلب جواب دیا۔ فرحانہ یہ سب دیکھ رہی تھی اور جب عامر باہر جانے لگا تو وہ اس کے پیچھے لپکی۔ ریحانہ نے اسے روکنا چاہا مگر ریاض علی نے اشارے سے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ریلیکس...... ویٹ اینڈ سی۔''

عامر ہوٹل سے باہر آیا، پارکنگ میں ایک طرف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں اس کی سیاہ اسپورٹس کار بھی تھی۔ اس کا مضبوط جالی دار بمپر آگے نکلا ہوا تھا۔ اس کار کا پرانا ماڈل عامر نے اپنی ورکشاپ میں ری نیو کیا تھا۔ فرحانہ اسے آوازیں دے رہی تھی اور وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ کار کے نزدیک فرحانہ نے اسے روک لیا۔ ''میری بات تو سنو۔''

''اب کیا سننے کو رہ گیا ہے۔'' وہ گھٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمہارے ماں باپ نے انکار کر دیا ہے۔''

''نہیں، انہوں نے صرف ایک وجہ پیش کی ہے۔''

''اس وجہ کے پیچھے اپنا انکار بہت خوب صورتی سے چھپا دیا ہے۔''

اسی لمحے بادل گرجے۔ فرحانہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''عامر! یہ انجام نہیں ہے۔''

''ہاں! یہ ان کے انکار کا آغاز ہے۔ ابھی یہ نرم ہے جیسے جیسے تم اصرار کرو گی، ان کی طرف سے سختی آتی جائے گی۔''

''وہ مجھ سے سختی نہیں کر سکتے۔'' فرحانہ نے یقین سے کہا۔

''ہاں، انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ تم پر جذباتی دباؤ ڈالیں گے۔ تمہاری تعلیم کو اپنی خواہش کہیں گے تو کیا تم ان کی خواہش پوری نہیں کرو گی؟''

''پلیز......'' فرحانہ نے التجا کی۔ اسی لمحے آسمان جیسے پھٹ پڑا۔ اور بہت تیز بارش ہونے لگی۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے شیڈ تک آئے۔ عامر نے اس سے کہا۔

''او کے...... مگر اب بات کو آگے بڑھانا تمہاری ذمے داری ہے۔''

فرحانہ نے سر ہلایا۔ ''تم فکر مت کرو، میں ماما پاپا کو ہینڈل کرلوں گی۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔''

دونوں شیڈ میں آتے آتے کسی قدر بھیگ گئے تھے۔ عامر نے کہا۔ ''تم اندر جاؤ۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب ہم بھی چلیں گے۔'' فرحانہ نے کہا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا جب اندر سے ریاض اور ریحانہ نکلے۔ وہ عامر اور فرحانہ کو آمنے سامنے اور پاس دیکھ کر چونکے۔ عامر نے ان دونوں کو دیکھ کر سر کی جنبش سے خدا حافظ کہا اور بھاگتا ہوا اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ ریحانہ چھتری لائی تھی کیونکہ شام سے بارش کی پیش گوئی تھی۔ وہ چھتری تلے گاڑی تک آئے۔ یہ نئے ماڈل کی طاقتور پراڈو تھی۔ عام طور سے ریاض علی ڈرائیور کے ساتھ نکلتے تھے مگر اس فیملی ڈنر کے لیے انہوں نے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ راستے میں

کچھ معاملات زیر بحث آئیں گے۔ وہ ملازموں کے سامنے گھر کے معاملات پر بات نہیں کرتے تھے۔ ریاض علی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ریحانہ ان کے برابر میں آ گئیں۔ فرحانہ پیچھے آ گئی۔ اس نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی کیونکہ وہ تھکن محسوس کر رہی تھی۔ آج صبح سے اسے ایک لمحہ آرام کا نہیں ملا تھا۔ گاڑی چلی تو چند منٹ بعد وہ سو چکی تھی۔ سفر پون گھنٹے کا تھا۔ ریحانہ نے مڑ کر اسے سوتے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

''یہ لڑکا فرحی کے قابل نہیں ہے۔''

''لڑکے میں برائی نہیں ہے۔'' ریاض علی نے اس کا دفاع کیا۔ ''مگر فرحی ابھی میچور نہیں ہوئی ہے۔ شادی کے لیے اسے مزید وقت چاہیے۔''

ریحانہ نے مڑ کر محبت سے دیکھا۔ ''میری بیٹی میں کوئی کمی ہے کیا! اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ آئے گا۔''

فرحانہ کا بیگ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور اس سے اس کا نیا آئی فون جھانک رہا تھا۔ ریحانہ نے ہاتھ بڑھا کر آئی فون نکال لیا اور اس کا کیمرا آن کر کے سوتی فرحانہ کی ویڈیو بنانے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''یہ میری خوب صورت اور معصوم بیٹی ہے۔''

''جو تم پر گئی ہے۔'' ریاض علی ہنسا۔ ''شکر ہے مجھ پر نہیں گئی ہے۔''

''مگر ہے یہ آپ کی بیٹی۔'' ریحانہ ویڈیو میں خود کو اور ریاض کو بھی شامل کرنے لگی۔

''میرا خیال ہے وہ ہمارے پیچھے ہے۔'' ریاض نے عقبی آئینے میں عامر کی اسپورٹس کار دیکھ کر کہا۔ ریحانہ کا منہ بن گیا۔

''پلیز اس کا ذکر مت کرو، اس وقت میں بہت اچھے موڈ میں ہوں۔''

ریاض علی ہنسا۔ ''او کے نہیں کرتا۔''

پراڈو ریلوے کراسنگ کے پاس پہنچ گئی تھی جہاں سرخ بتی جل رہی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ ٹرین آنے والی ہے۔ کراسنگ پر بیریئر نہیں تھا اور ابھی ٹرین نہیں آئی تھی۔ پیچھے عامر کی کار بھی آ کر رکی تھی۔ ریحانہ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم کراس کر سکتے ہیں، ابھی ٹرین دور ہے۔''

☆☆☆

فرحانہ کو ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی۔ اس کے بازو سے ایک کینولا لگا ہوا تھا اور بائیں بازو پر کلائی پلاستر میں جکڑی ہوئی تھی۔ ماتھے پر پورے سر کو گھیرنے والی پٹی لگی تھی۔ اس نے ذہن پر زور دیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا مگر اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ آخری یاد جو اس کے ذہن میں تھی کہ وہ گاڑی میں بیٹھی تھی اور وہ لوگ گھر جا رہے تھے۔ پھر وہ سو گئی اور اب اس کی آنکھ کھلی تو وہ یہاں تھی۔ وہ یہاں کیوں تھی؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ کیا پاپا کی گاڑی کو کوئی حادثہ پیش آیا تھا؟ وہ ابھی سوچ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کے ساتھ ایس پی حامد علی اندر آیا۔ وہ وردی میں تھا۔ اس کے پیچھے اس کی بیوی نائمہ تھی۔ وہ اسے ہوش میں دیکھ کر تیزی سے آگے آئی۔ ''فرحی! کیسی ہو تم؟''

''ٹھیک ہوں لیکن میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

حامد خاموش رہا کیونکہ اس دوران میں ڈاکٹر فرحانہ کو چیک کر رہا تھا۔ اس نے فرحانہ سے چند سوالات کیے اور اسے ٹھیک قرار دے کر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حامد آگے آیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ ''چچا جان کی گاڑی کو ریلوے کراسنگ پر حادثہ پیش آیا۔ وہ ریل انجن سے ٹکرا گئی تھی۔''

فرحانہ کو لگا کہ اس کا دل رک گیا ہے۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''پاپا اور ماما...... وہ کہاں ہیں؟''

نائمہ اسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی اور حامد ہچکیوں سے رونے لگا۔ اس کے آنسو ساری کہانی سنا رہے تھے۔ ریحانہ اس کی خالہ تھی اور ریاض چچا...... اسے دونوں طرف سے صدمہ ہوا تھا۔ جب اس کی پوسٹنگ وفاقی پولیس میں ہوئی تو وہ ریاض علی کی کوٹھی میں رہ رہا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کے پاس ایک پورشن تھا۔ نائمہ نے سائیکالوجی میں ایم فل کیا تھا اور ان دنوں یونیورسٹی میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ پی ایچ ڈی کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ فرحانہ ماں باپ کی وفات کا سن کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ نائمہ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہ مشکل اس کی آواز رکی مگر آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ ڈاکٹر آ گیا اور اس نے کہا۔ ''پلیز انہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

''میں انجکشن نہیں لوں گی۔'' فرحانہ نرس کو انجکشن تیار کرتے دیکھ کر بولی۔ حامد آگے آیا۔ اس نے فرحانہ کا بیگ اس کے پاس رکھا۔

''اس میں تمہاری چیزیں ہیں جو جائے حادثہ سے ملی تھیں۔''

''آپ مت جائیے گا۔'' فرحانہ نے اس سے التجا کی۔

''تم فکر مت کرو، میں یہیں رہوں گا۔'' حامد نے اسے تسلی دی۔ انجکشن لگنے کے ایک منٹ کے اندر فرحانہ

گہری نیند میں جا چکی تھی۔ حامد نے نائمہ سے کہا۔ ''تم یہاں رکو، میں کوٹھی سے آتا ہوں۔ خاندان کے دوسرے لوگ آنا شروع ہو گئے ہوں گے۔ پھر چچا اور چچی کی باڈیز اسپتال سے بھی لینی ہیں۔''

''تم جاؤ، میں دیکھ لوں گی۔'' نائمہ نے کہا۔ وہ تقریباً چھبیس برس کی دبلی اور کسی قدر طویل قامت عورت تھی۔ اس کا چہرہ استخوانی تاثر دیتا تھا مگر اس میں ایک خاص نوع کی کشش تھی۔ رشتے میں وہ حامد کی دور کی خالہ زاد تھی۔ ان کا رشتہ خاندان والوں کی مرضی سے ہوا تھا۔ اس خاندان میں زیادہ تر شادیاں آپس میں ہوتی تھیں۔ حامد کو ریاض سے بہت محبت تھی کیونکہ باپ کے مرنے کے بعد ریاض علی نے ہی اسے پالا تھا۔ کرمنالوجی میں ماسٹر کے بعد اس نے سول سروس کا امتحان دیا اور کامیاب ہو کر پولیس سروس جوائن کی تھی۔ ریاض علی کی خواہش تھی کہ وہ بزنس میں اس کے ساتھ شامل ہو مگر جب اس نے سروس کرنے ...... کا فیصلہ کیا تو ریاض علی نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ وہ اس پر بیٹے کی طرح اعتماد کرتا تھا۔ حامد فرحانہ سے دس سال بڑا تھا۔ ایک سال پہلے ریاض اور ریحانہ نے اس سے فرحانہ کے لیے بات کی تھی مگر اس نے اسی وقت واضح کر دیا تھا کہ فرحانہ اس کے لیے صرف بہن ہے اور وہ ساری عمر اس کی بہن رہے گی۔ یہ بات فرحانہ کے علم میں نہیں تھی جو حامد کو بچپن سے بھائی سمجھتی اور کہتی آئی تھی۔

☆☆☆

فرحانہ یونیورسٹی سے نکل رہی تھی تو شام ہو گئی۔ آج کلاسز سے زیادہ اس کا وقت لائبریری میں گزرا تھا۔ ماسٹر کا آخری سمسٹر قریب تھا۔ دو سال پہلے اس کے ماما پاپا کی تدفین کے بعد عامر اس سے تعزیت کرنے آیا تو اسے امید تھی کہ وہ اب شادی کر سکیں گے مگر فرحانہ نے اس سے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ وہ پہلے اپنے ماں باپ کی آخری خواہش پوری کرے گی۔ یعنی ماسٹر کرے گی اور اس کے بعد وہ شادی کا سوچے گی۔ اس نے عامر سے کہا۔ ''میں جانتی ہوں دو سال بہت طویل عرصہ ہے لیکن میں تم پر زور نہیں ڈالوں گی۔ اگر تم اتنے عرصے رک سکتے ہو تو......؟''

''میں انتظار کروں گا۔'' عامر نے اسی وقت فیصلہ سنا دیا۔ ''تم دو سال کی بات کر رہی ہو، میں دو سو سال انتظار کر سکتا ہوں۔ مرتے دم تک انتظار کر سکتا ہوں۔''

فرحانہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ گریجویشن میں اکنامکس اس کا مضمون تھا مگر ماسٹر کے لیے اس نے سوشیالوجی چنا۔ ویسے اس کی کلاسز صبح ہوتی تھیں مگر کچھ اچھے لیکچرارز دوپہر اور شام کے وقت آتے تھے اس لیے کبھی کبھی اسے یونیورسٹی میں دیر ہو جاتی تھی۔ اس دن بھی وہ نکلی تو شام ہو چکی تھی اور سردیوں کے مختصر دن تیزی سے رات میں ڈھل جاتے تھے۔ وہ پارکنگ تک آئی اور گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی کہ اسے لگا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے چونک کر آس پاس دیکھا تو باڑ کے پاس ایک ہیولا سا نظر آیا اور جیسے ہی فرحانہ نے اسے دیکھا، وہ تیزی سے باڑ کے پیچھے روپوش ہو گیا۔ اس نے اپر پہن رکھا تھا اور اس کا سرپوش اس کے سر پر تھا۔ اس لیے فرحانہ اس کی صورت دیکھنے میں ناکام رہی لیکن وہ کوئی لڑکا تھا۔ کم سے کم جسامت سے تو ایسا ہی لگا تھا۔ فرحانہ ڈر گئی، وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھی اور گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ وہ گھر پہنچی تو حامد علی اسے لاؤنج میں مل گیا۔ وہ کافی کا مگ تھامے کسی سوچ میں گم تھا۔ فرحانہ کو دیکھ کر اس نے کہا۔

''آج تم نے دیر کر دی؟''

''ہاں، لائبریری میں دیر ہو گئی۔'' فرحانہ بیگ رکھ کر اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی اور ناک سکیڑ کر بولی۔ ''کافی...... اف! مجھے اس وقت کافی کی کتنی شدید خواہش ہے۔''

''میں نے خود بنائی ہے تمہارے لیے بھی بناتا ہوں۔'' حامد نے پیشکش کی اور اٹھ کر کچن والے حصے میں آیا۔ فرحانہ میز پر ٹک گئی۔ ''تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟''

حامد کی بات پر فرحانہ چونکی۔ ''نہیں پریشان تو نہیں ہوں لیکن آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں یونیورسٹی سے نکل رہی تھی اور اپنی کار میں بیٹھنے لگی تو میں نے ایک اپر پہنے شخص کو دیکھا۔ مجھے لگا وہ میری نگرانی کر رہا ہے۔''

حامد چونکا۔ ''نگرانی...... یہ احساس کیوں ہوا؟''

''پتا نہیں، میں نے جب دیکھا تو اس نے فوراً جھاڑیوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔''

''ممکن ہے یونیورسٹی کا کوئی لڑکا ہو، شرارت کر رہا ہو۔''

فرحانہ نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ہاں، شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

اس حادثے کے بعد فرحانہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔ وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھی اور عام طور سے کھانے کے وقت ہی کمرے سے باہر آتی تھی۔ ماں باپ کی حادثاتی موت نے اس پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ حامد کو ریاض نے ساتھ رکھا تھا، اب نہ وہ رہا تھا اور نہ

ہی ریحانہ اس لیے حامد کو۔یہاں رہنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔اس نے فرحانہ کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ چاہے تو حامد اور نائمہ اپنا بندوبست کر سکتے ہیں مگر فرحانہ نے سختی سے منع کر دیا۔''میرے پاس اب آپ ہی تو ہیں، اکیلے رہ کر میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔''

ریاض علی کی گیس کے گھریلو آلات بنانے کی فیکٹری تھی جس کی مصنوعات ایک مشہور برانڈ کے تحت فروخت کی جاتی تھیں۔فیکٹری کے معاملات اب حامد دیکھتا تھا اور تمام ضروری فیصلوں کی منظوری فرحانہ دیتی تھی۔ کاغذات پر سائن بھی اسی کے ہوتے تھے۔دو سالوں سے بزنس ٹھیک چل رہا تھا۔جنرل منیجر اور دوسرا اسٹاف ریاض علی کے پرانے اور بااعتماد افراد پر مشتمل تھا جو ابھی تک بزنس کو بہترین انداز میں چلا رہے تھے۔فرحانہ مطمئن تھی کہ اسے اس طرف توجہ نہیں دینا پڑتی تھی۔اس نے ابھی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔اس کی ساری توجہ ماسٹر مکمل کرنے پر تھی۔حامد نے اس کے سامنے کافی کا مگ رکھا تو وہ چونکی۔اس نے شکریہ کہہ کر مگ اٹھالیا۔حامد نے کہا۔''تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا؟''

''نہیں۔'' وہ بولی۔

حامد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔''میرا خیال ہے تمہیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔تم اس بارے میں سوچو۔''

فرحانہ حامد کا مطلب سمجھ رہی تھی۔وہ پہلے بھی اسے ڈھکے چھپے انداز میں مشورہ دے چکا تھا کہ اب اسے شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔اسی لمحے نائمہ باہر سے آئی۔ وہ انہیں دیکھ کر ٹھٹکی اور پھر آگے آئی۔ حامد نے اس سے پوچھا۔''تم بھی کافی پیوگی؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں کرسی پر ٹک گئی۔''آج بہت تھکا دینے والا دن تھا۔تین لیکچر اور پھر اپنے وائیوا کی تیاری۔''اس نے فرحانہ کی طرف دیکھا۔''اور تم سناؤ۔''

وہ زبردستی مسکرائی۔''میں ٹھیک ہوں۔''

حامد نے اس کے لیے کافی بنا کر میز پر رکھی اور لاؤنج کی طرف چلا گیا۔اس نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔نائمہ نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔''اسے بیوی کے پاس بیٹھنا گوارا نہیں ہے۔''

فرحانہ پہلے ہی خفیف ہو رہی تھی۔اس نے کہا۔''تم جا کر بیٹھ جاؤ۔''

''میں اسی کے پاس تو آئی تھی۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی اور اپنا مگ اٹھا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔فرحانہ محسوس کر رہی تھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے نائمہ کا رویہ عجیب سا تھا اور وہ اکثر یوں بات کرتی تھی جیسے اسے یا حامد کو کچھ سنا رہی ہو۔فرحانہ نے پہلے توجہ نہیں دی تھی مگر جب کئی بار ایسا ہوا تو وہ توجہ دینے پر مجبور ہو گئی۔ پھر وہ بھی اپنا مگ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔نیچے کا پورشن اس کا تھا۔اوپر والا مکمل پورشن حامد اور نائمہ کے پاس تھا۔نائمہ زیادہ تر اپنے پورشن تک محدود رہتی تھی البتہ حامد دونوں حصوں میں آزادانہ گھومتا پھرتا تھا۔کوٹھی میں چار مستقل ملازم تھے۔ ایک گارڈ، ایک مالی، ایک خادمہ اور ایک باورچی جو اسی خادمہ کا شوہر تھا۔یہ تمام افراد سرونٹ کوارٹرز میں رہتے تھے۔فرحانہ کے پاس نئی کار تھی۔ ریاض علی نے حادثے سے چند مہینے پہلے ہی اسے دلائی تھی۔فرحانہ نے اسے بہت اچھی طرح استعمال کیا تھا اور آج تک اس پر ایک اسکریچ بھی نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

عامر ورکشاپ میں ایک گاڑی کا انجن دیکھ رہا تھا۔یہ بہت مہنگی اور اعلیٰ درجے کی گاڑی تھی۔اس کی ورکشاپ میں عام طور سے ایسی ہی گاڑیاں مرمت کے لیے آتی تھیں۔اس کے علاوہ بھی وہ اچھی قسم کی پرانی یا حادثہ شدہ گاڑیاں لے کر ان کو ری کنڈیشنڈ کر کے فروخت کرتا تھا۔فروخت کے لیے اس نے سڑک کے پار موجود آٹو شوروم کے مالک ممتاز ہاشمی سے معاہدہ کر رکھا تھا۔ممتاز ہاشمی اسی علاقے میں رہتا تھا اور اپنے بیٹے بلال کے ساتھ بزنس چلا رہا تھا۔یہ سڑک اسی قسم کے کاموں کے لیے مخصوص تھی۔ یہاں کئی شوروم اور ورکشاپس تھیں۔عقب میں کوئی گاڑی رکی اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو عامر مڑے بغیر جان گیا کہ فرحانہ آئی ہے۔اس نے پوچھا۔''آج کیسے نصیب جاگ گئے میرے؟''

''تم جان گئے؟'' فرحانہ اس کے پاس آئی۔

''ہاں تم جو مخصوص خوشبو لگاتی ہو، وہ تمہاری اپنی خوشبو سے مل کر منفرد ہو جاتی ہے۔میں نے اسے پہچان لیا۔''

فرحانہ کا رنگ گلابی ہوا۔''تمہیں انجینئرنگ کے بجائے شاعری پڑھنی چاہیے تھی۔''

''اب پڑھ رہا ہوں۔'' عامر نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔''کہو کیسے آنا ہوا؟''

''میری کار کے بریک کچھ مسئلہ کر رہے ہیں۔'' وہ بولی۔''لگانے پر ذرا دیر سے لگتے ہیں۔''

عامر اس کی کار تک آیا اس نے بریک سسٹم کا معائنہ

کیا اور چند منٹ میں فالٹ پکڑ لیا۔ ڈسک ذرا لوز ہو گئی تھیں۔اس نے ٹائٹ کیں اور فرحانہ سے ٹرائل لینے کو کہا۔ اس نے کار چلا کر چیک کی، بریک ہر بار درست لگے۔وہ واپس پلٹ کر آئی۔''اب او کے ہے۔''

''لیکن میں او کے نہیں ہوں۔'' عامر کھڑکی پر جھکا۔ ''تمہارا فائنل سیمسٹر نزدیک ہے۔''

فرحانہ نے اس سے آنکھیں چرائیں۔''ہاں۔''

''اس کے بعد؟''

''ابھی میں نے سوچا نہیں۔''

''تو سوچو۔'' عامر نے اصرار کیا۔''تم نے اپنے ماما پاپا کی خواہش پوری کر دی ہے۔''

''ہاں، وہ پوری ہو گئی ہے۔''

''تب مجھے کیوں ترسا رہی ہو؟''

فرحانہ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ ''سوچوں گی۔''

فرحانہ نے گاڑی آگے بڑھائی تو اس کی نظر بلال پر گئی۔ بلال نے اسی یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا جہاں وہ پڑھ رہی تھی اور بلال چھ مہینے پہلے ڈگری ہولڈر ہوا تھا۔ یونیورسٹی میں اس سے سامنا ہوتا رہتا تھا مگر فرحانہ کی اس سے زیادہ ہیلو ہائے نہیں تھی۔وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ یونیورسٹی میں فرحانہ نے محسوس کیا کہ بلال اس سے بات کرنا چاہتا ہے مگر وہ اس کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔وہ خوش شکل اور اچھی جسامت کا نوجوان تھا لیکن لڑکیوں سے گھبراتا تھا۔فرحانہ کی ساتھی لڑکیاں جو ذرا شوقین مزاج تھیں، ان کے الفاظ میں بلال دبولڑکا تھا۔آج کل لڑکیاں اس قسم کے لڑکوں کو پسند نہیں کرتی ہیں۔آج کے دن بھی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ان کے گروپ کا ایک وزٹ تھا۔

وہ ایک کچی آبادی گئے تھے جہاں انہیں عورتوں کو صاف پانی کی اہمیت اور پینے کے پانی کو صاف کرنے کے طریقوں پر سمجھانا تھا۔وہ شام تک وہیں رہے تھے۔ان کے گروپ کے لڑکے سامان لے کر گئے تھے اور انہوں نے آبادی کے لیے موجود ...... کنویں کو لکڑی کی مدد سے یوں ڈھک دیا کہ اب کوئی چیز کنویں میں نہیں جا سکتی تھی۔ لڑکیاں آبادی کی عورتوں کو بتا رہی تھیں کہ وہ کن عام سے طریقوں پر عمل کر کے خود کو اور اپنے گھر والوں کو پانی سے پھیلنے والی بیماریوں سے بچا سکتی ہیں۔ یہ وزٹ ان کے تھیسس کا ایک حصہ تھا۔فرحانہ شام کو وہاں سے نکلنے لگی تو اس کی ایک دوست بھی اس کے ساتھ تھی۔وہ ایک عام گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے پاس ذاتی کنوینس نہیں تھی۔ فرحانہ اسے ڈراپ کرتی۔گھر پہنچ کر اس نے اصرار کر کے فرحانہ کو ایک کپ چائے پر روک لیا۔فرحانہ وہاں سے نکلی تو تاریکی چھا گئی تھی۔وہ گھر کی طرف روانہ ہوئی تو راستے میں حامد کی کال آ گئی۔

''تم کہاں ہو؟''

''راستے میں۔'' اس نے جواب دیا۔''آج وزٹ تھا، ابھی فارغ ہوئی ہوں۔''

''او کے۔'' حامد نے اتنا کہا تھا کہ فرحانہ کی نظر عقبی آئینے پر گئی اور اس کے منہ سے چیخ نکلی۔گاڑی لہرائی اور فٹ پاتھ پر چڑھ کر گرین بیلٹ کے ساتھ لگی لوہے کی گرل سے جا ٹکرائی۔

☆☆☆

حامد اور نائمہ آپس میں بات کر رہے تھے۔نائمہ کہہ رہی تھی۔''حادثے کے اثرات ابھی تک پوری طرح اس کے ذہن سے نکلے نہیں ہیں۔''

''اس کا ان اثرات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' حامد بولا۔''کوئی گاڑی کی پچھلی نشست پر تھا کیونکہ فٹ میٹ پر مٹی کے نشانات موجود ہیں۔''

''ممکن ہے وہ پہلے کی ہو۔''

''مٹی تازہ اور نم تھی۔''

''تب وہ آدمی کہاں گیا؟''

''حادثے کے بعد کچھ دیر کے لیے فرحانہ کے حواس گم ہو گئے تھے، اس سے فائدہ اٹھا کر وہ فرار ہو گیا۔''

''اگر وہ سچ مچ اسے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تھا تو اس کے پاس بہترین موقع تھا۔''

''نہیں، حادثہ ہوتے ہی کئی لوگ اس طرف آئے تھے اور دو گاڑیاں بھی رکی تھیں۔اس کے پاس صرف فرار کا موقع تھا۔''

''کسی نے اسے فرار ہوتے دیکھا؟''

''نہیں۔'' حامد نائمہ کی جرح سے جھنجلا گیا تھا۔نائمہ کا خیال تھا کیپ پوش فرحانہ کا وہم تھا۔جبکہ حامد کے خیال میں وہ کوئی حقیقی شخص تھا جو فرحانہ کے پیچھے پڑا تھا۔اس سے پہلے کہ ان کی بحث آگے بڑھتی، کال بیل بجی۔کچھ دیر بعد عامر لاؤنج میں داخل ہوا۔اسے دیکھتے ہی حامد کے تاثرات سخت ہو گئے تھے۔عامر کے ہاتھ میں موجود بوکے بتا رہا تھا کہ وہ فرحانہ کو دیکھنے آیا ہے۔عامر نے آگے آ کر حامد سے ہاتھ ملایا تو اس نے بلا تمہید کہا۔

"ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے کو کہا ہے۔"

عامر مایوس ہوا اس نے بو کے حامد کی طرف بڑھایا۔ "او..... کوئی بات نہیں، یہ اسے میری طرف سے دیجیے گا۔"

"میرا خیال ہے وہ مل سکتی ہے۔" خلافِ توقع نائمہ نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

عامر خوش ہو گیا اور حامد گہری سانس لے کر رہ گیا۔ فرحانہ بیڈ پر سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ نائمہ نے اندر آکر کہا۔ "عامر ملنے آیا ہے۔"

فرحانہ اٹھ بیٹھی۔ "بلالو۔"

عامر اندر آیا اور اس نے بو کے اس کی طرف بڑھایا۔ "کیسی ہو اب؟"

"ٹھیک ہوں۔" فرحانہ نے کہا۔ اسے نائمہ کی موجودگی سے بے چینی ہو رہی تھی۔ اس نے بھانپ لیا اور بولی۔

"عامر! تمہارے لیے چائے کافی کیا بھجواؤں؟"

"نو تھینکس۔" اس نے کہا۔ "میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔"

نائمہ دروازہ بند کرتی ہوئی چلی گئی۔ عامر نے اب نظر جما کر فرحانہ کو دیکھا تو اس کا رنگ سرخ ہونے لگا۔ "ہوا کیا تھا؟"

"بہت اچانک ہوا۔ میں گھر آرہی تھی اور حامد بھائی کی کال آئی تھی کہ میں نے بیک مرر میں ایک اپرپوش کو بیک سیٹ پر دیکھا۔ میں بدحواس ہو گئی اور اسی میں گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ کر لوہے کے جنگلے سے ٹکرا گئی۔ میرا سر اسٹیئرنگ پر لگا اور مجھے ہوش نہیں رہا۔"

"کتنی دیر بے ہوش رہیں؟"

"مشکل سے ایک منٹ۔"

"جب تمہیں ہوش آیا تو پچھلی سیٹ پر کوئی نہیں تھا؟"

"وہ جو بھی تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ چکا تھا۔"

عامر ہچکچایا۔ "فرحی! ممکن ہے یہ تمہارا وہم ہو۔"

فرحانہ کو غصہ آگیا۔ "خدا کے لیے تم مجھے نائمہ کی طرح نفسیاتی مریض مت سمجھو۔"

"نائمہ......" وہ چونکا۔

فرحانہ نے سر ہلایا۔ "اس کا خیال ہے میں اس کی بات سے بے خبر ہوں مگر میں جانتی ہوں وہ سمجھ رہی ہے کہ... اپرپوش میرا وہم ہے اور اس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ گاڑی میں کیسے آیا؟"

"وہ میرا پیچھا کر رہا ہوگا اور جب میں اپنی فیلو کو اس کے گھر ڈراپ کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اندر گئی تو اسے گاڑی میں گھسنے کا موقع مل گیا۔"

عامر نے سر ہلایا۔ "پولیس نے گاڑی میری ورکشاپ پہنچا دی ہے۔ اس کے پیچھے دونوں دروازوں کے لاک درست حالت میں پائے گئے ہیں۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" فرحانہ بولی۔ "وہ اترتے ہوئے بٹن دبا کر دروازہ لاک کر سکتا تھا۔"

"مین لاک بھی ٹھیک ہے اور اس میں گڑبڑ کے آثار نہیں ہیں۔"

فرحانہ کسی قدر جھنجلا گئی۔ "میں کیا کہہ سکتی ہوں مگر میں نے جو دیکھا مجھے اس پر پورا یقین ہے۔"

"میں تمہیں غلط نہیں سمجھ رہا۔" عامر نے نرمی سے کہا۔ "میں صرف اتنا بتا رہا ہوں کہ اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔"

"حامد بھائی نے بتایا ہے کہ فٹ میٹ پر تازہ مٹی کے نشان ملے ہیں۔"

"مگر اس سے اس شخص کی نشان دہی نہیں ہوگی۔ آخر وہ کیوں تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے؟"

"میں نہیں جانتی مگر اب میرے دل میں خوف بیٹھ گیا ہے۔ میں شاید پہلے کی طرح بے خوفی سے باہر نہیں جا سکوں گی۔"

عامر نے بیڈ کے کنارے بیٹھتے ہوئے اس کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لیا۔ "میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں مسئلہ ہو تو مجھے ایک کال کر دینا، میں جہاں بھی ہوا آجاؤں گا۔"

فرحانہ نے آگے ہو کر اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔

"عامر! مجھے تمہارا بہت سہارا ہے۔"

عامر نے اس کے بال سہلائے۔ "میں جانتا ہوں اور اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد میری زندگی میں آجاؤ تاکہ میں ہر طرح سے تمہاری دیکھ بھال اور حفاظت کر سکوں۔"

"بس میرے پیپرز ہو جائیں، پھر میں جلد فیصلہ کر لوں گی۔" فرحانہ نے اس سے وعدہ کیا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور حامد اندر آیا تو فرحانہ جلدی سے عامر سے دور ہو گئی اور وہ کھڑا ہو گیا۔ حامد کا چہرہ تن گیا تھا مگر اس نے صرف اتنا کہا۔

"فرحی! تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"اوکے میں چلتا ہوں۔" عامر نے کہا۔

"بائے۔" فرحانہ بولی اور عامر باہر نکل آیا۔ حامد اس کے پیچھے تھا۔ وہ دروازے تک اس کے ساتھ آیا اور

اسے روک کر کہا۔

"میری بات سنو۔"

عامر اس کی طرف مڑا۔ "کہیے ایس پی صاحب۔"

"فرحانہ میری بہن نہیں ہے لیکن بہن جیسی ہی ہے اور کوئی بھائی پسند نہیں کرتا کہ کوئی ایسا شخص اس کی بہن کے نزدیک آئے جو اس کا استحقاق نہیں رکھتا ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"سمجھ رہا ہوں۔"

"بس تو آئندہ اس کا خیال رکھنا۔"

عامر باہر نکل گیا اور حامد نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ مڑا تو نائمہ نزدیک ہی کھڑی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم فرحانہ کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہے ہو۔ وہ کوئی بچی نہیں ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا لیکن ہماری ایک تہذیب اور رسم و رواج ہیں۔ اس میں مرد و عورت کا اس قدر گھلنا ملنا اچھی بات نہیں ہے۔" حامد سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں یاد ہوگا جب ہماری بات طے ہوئی تو اس کے بعد شادی تک میں نے تمہاری ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی حالانکہ ہم بچپن سے ساتھ کھیلے ہیں۔"

"ہاں مگر فرحانہ شہر اور مختلف ماحول میں پلی بڑھی ہے۔" نائمہ اس کے پیچھے آئی۔ "سب سے بڑھ کر وہ... خودمختار ہے اور اپنی مرضی کر سکتی ہے۔"

حامد نے رک کر نائمہ کو دیکھا۔ "فرحی کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتی جو اس کے کردار کو گرا دے۔"

☆☆☆

عامر فرحانہ کی کار کا معائنہ کر رہا تھا کہ اسے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو بلال پاس کھڑا ہوا تھا۔ عامر نے ہاتھ ہلایا۔ اس نے جواباً ہاتھ ہلایا اور بولا۔ "یہ فرحانہ کی کار ہے نا؟"

عامر چونکا۔ "ہاں لیکن تم کیسے جانتے ہو؟"

بلال مسکرایا۔ "تم بھول رہے ہو، میں اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھ چکا ہوں اور وہ اکثر یہاں تمہاری ورکشاپ میں آتی ہے۔ میرا خیال ہے وہ یہیں سے گاڑی ٹھیک کراتی ہے۔"

عامر کو اس کے منہ سے فرحانہ کا ذکر اتنی بے تکلفی سے سن کر غصہ آنے لگا۔ اس نے کہا۔ "میں صرف اس کی گاڑی ٹھیک نہیں کرتا ہوں، میں اس کا منگیتر بھی ہوں۔"

ہیلمٹ

دو دوست پریشانی کے عالم میں گلی کے کونے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

ایک نے کہا۔ "یار! ڈاکوؤں نے بقول تمہارے تمہیں لوٹا مگر وہ نقدی اور موبائل وغیرہ چھوڑ کے چلے گئے۔ پھر تم یہاں بیٹھے کیوں رونا رو رہے ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری قیمتی چیزیں بچ گئیں اور ڈاکو خالی ہاتھ لوٹ گئے۔"

دوسرے نے کہا۔ "نہیں یار! وہ میری سب سے قیمتی چیز لے اڑے۔"

پہلے نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کیا۔"

دوسرے نے روہانسی آواز میں کہا۔ "میرا ہیلمٹ!"

مرسلہ۔ اطہر حسین، کراچی

بلال نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "واقعی؟"

عامر کا غصہ بے قابو ہونے لگا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "فرحانہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے بہتر ہوگا اس کا ذکر کرنے سے بھی گریز کرو۔"

وہ کہہ کر اندر چلا آیا۔ فرحانہ کی گاڑی میں خاصا کام تھا۔ سامنے کا بونٹ، بمپر اور ریڈی ایٹر تباہ ہو گیا تھا۔ مرمت کے ساتھ ڈینٹنگ پینٹنگ کا کام بھی تھا۔ اس نے فرحانہ کو کال کی۔ "گاڑی بننے میں ایک ہفتہ لگ جائے گا، کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ میرے پاس ایک وٹز ہے۔ ابھی مکمل کی ہے۔ اے ون کنڈیشن میں، میں وہ بھیج دیتا ہوں جب تک تم اسے استعمال کرو۔"

"ضرورت نہیں ہے۔ صبح حامد بھائی مجھے چھوڑ دیں گے اور شام میں کسی کولیگ کے ساتھ آجاؤں گی۔"

عامر نے کہا۔ "اوکے، ویسے اگر تم محسوس کرو کہ ضرورت ہے تو مجھے کال کر دینا۔ میں اسی وقت بھیج دوں گا۔ جب تک تمہاری گاڑی ٹھیک نہیں ہو جاتی، میں اسے ہاشمی صاحب کے شوروم میں نہیں بھیجوں گا۔ تم ہاشمی صاحب کو جانتی ہو، ان کا بیٹا بلال تمہاری ہی یونیورسٹی میں پڑھ چکا ہے۔"

فرحانہ نے کسی قدر توقف کے بعد کہا۔ "جانتی

ہوں مگر سرسری سا۔‘‘
’’وہ تو تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔‘‘
’’جانتا ہو گا۔‘‘ فرحانہ نے بے پروائی سے کہا۔ ’’ویسے بھی وہ دوسرے ڈپارٹ میں تھا اور ہمارا سامنا بھی کم ہوتا تھا۔‘‘
’’او کے اپنا خیال رکھنا۔‘‘ عامر نے کہا اور موبائل رکھ دیا۔ وہ سڑک کے پار ممتاز ہاشمی کے شوروم کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے باہر نئی اور استعمال شدہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کی مالیت کروڑوں میں تھی۔

☆☆☆

فرحانہ بیڈ پر نیم دراز ہوئی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر کے چینل گھمانے لگی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے اور وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ شاید اس لیے اس نے ٹی وی لگا لیا۔ ایک نیوز چینل لگایا تو رک گئی۔ اس پر رات کی تاریکی میں آگ کا منظر دکھا رہے تھے۔ شعلوں سے لگ رہا تھا کہ آگ بہت پھیلی ہوئی ہے اور کسی بڑی جگہ لگی تھی۔ فرحانہ نے خبر سننے کے لیے آواز تیز کی۔ موقع سے خبر دینے والا رپورٹر کہہ رہا تھا۔ ’’آگ ایک گھنٹا پہلے لگی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اس پورے آٹو شوروم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آگ گاڑیوں کے فیول ٹینکس تک پہنچی تو اس میں مزید شدت آگئی۔ فائر بریگیڈ کی مزید گاڑیاں یہاں آ رہی ہیں۔ مگر ایسا لگ رہا ہے، آگ ان کے قابو سے باہر ہو گئی ہے۔‘‘
پس منظر میں فائر بریگیڈ کا سائرن بھی سنائی دے رہا تھا۔ کیمرا گھوما اور اس نے نئی آنے والی گاڑی کو دکھایا تو اس کے پیچھے اے اے آٹوز کا بورڈ دکھائی دیا۔ اے اے آٹوز عامر کی ورکشاپ کا نام تھا اور اس کے مخالف سمت میں ممتاز ہاشمی کا آٹو شوروم تھا۔ آگ اسی میں لگی ہوئی تھی۔ فرحانہ کے پاس بلال کا نمبر تھا۔ اس نے سوچا اور پھر اسے کال کی۔ ’’بلال! میں فرحانہ بات کر رہی ہوں، ٹی وی پر دکھا رہے ہیں کہ تمہارے شوروم میں آگ لگ گئی ہے۔‘‘
وہ موقع پر موجود تھا اور روہانسا ہو رہا تھا۔ ’’ہم تباہ ہو گئے، پاپا کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ وہ اسپتال میں ہیں۔‘‘
’’میرے خدا! مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔ مگر یہ ہوا کیسے ہے؟‘‘
’’پتا نہیں، یہاں کا چوکیدار غائب ہے۔‘‘
’’ممکن ہے آگ کسی حادثے کی وجہ سے لگی ہو۔‘‘
’’کسی بھی وجہ سے لگی ہو لیکن ہم تباہ ہو گئے۔ شوروم میں دو کروڑ کی گاڑیاں تھیں اور اس میں سے کچھ نہیں بچا ہے۔‘‘

فرحانہ نے پھر افسوس کیا اور کال کاٹ دی۔ اسی لمحے اس کا موبائل بولا۔ عامر کی کال تھی۔ ’’تم کس سے بات کر رہی تھیں؟‘‘
’’بلال سے۔‘‘ فرحانہ نے جواب دیا۔ ’’ابھی میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے، ان لوگوں کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔‘‘
’’کاروبار میں انسان کو نقصان بھی ہوتا ہے۔‘‘ عامر نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ’’میں بھی یہیں ہوں۔ ٹی وی پر دیکھ کر آیا ہوں۔‘‘
’’تمہاری ورکشاپ کو تو خطرہ نہیں ہے؟‘‘
’’نہیں، یہ سڑک کے پار اور محفوظ ہے۔‘‘ عامر نے کہا۔ ’’اب میں گھر جاؤں گا۔‘‘
’’بائے۔‘‘ فرحانہ نے کہا۔

☆☆☆

عامر اپنی کار کی طرف جا رہا تھا اور اس نے دروازہ کھولا تھا کہ عقب سے کسی نے اس کا بازو پکڑا۔ وہ چونک کر مڑا۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والا بلال تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’تم نے اچھا نہیں کیا۔‘‘
عامر نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ’’کیا اچھا نہیں کیا؟‘‘
بلال کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے شعلوں میں گھرے شوروم کی طرف اشارہ کیا۔ ’’میں اس کی بات کر رہا ہوں۔‘‘
’’تمہارا دماغ خراب ہے، میں ایسا کیوں کروں گا۔‘‘
’’کیونکہ میں جانتا ہوں یہ تم ہی کر سکتے ہو۔ بس کل ذرا پولیس رپورٹ آنے دو پھر میں تم سے بات کروں گا۔‘‘ بلال نے کہا اور جھٹکے سے مڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ عامر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا مگر اس کے چہرے پر غصے کے بجائے مسکراہٹ تھی۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اگلے دن وہ ورکشاپ پہنچا تو کچھ دیر بعد ہی ایک انسپکٹر اس کے پاس آیا۔ شوروم میں لگی آگ بجھ چکی تھی مگر اس نے وہاں مزید جلنے کے قابل کچھ چھوڑا نہیں تھا۔ عمارت اور اندر موجود تمام گاڑیاں جل کر ملبے کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ چھت گرنے سے کچھ گاڑیاں پچک کر رہ گئی تھیں۔ راکھ اور فائر بریگیڈ کی طرف سے ڈالا جانے والا پانی اب سیاہ کیچڑ بن کر سڑک پر جمع تھا جسے صاف کیا جا رہا تھا۔ انسپکٹر نے پہلے اس سے تعارف لیا اور کچھ سوالات کے بعد بولا۔
’’تمہارے ممتاز ہاشمی سے کیسے تعلقات ہیں؟‘‘

’’کاروباری۔‘‘ عامر نے جواب دیا۔ ’’میں گاڑیاں ری کنڈیشنڈ کر کے ان کے شوروم کے توسط سے فروخت کرتا ہوں۔‘‘
’’لیکن گزشتہ رات شوروم میں تمہاری کوئی گاڑی نہیں تھی۔‘‘
’’میں عام طور سے مہینے دو مہینے میں ایک گاڑی بنا کر دیتا ہوں۔ میں نے کبھی ایک سے زیادہ گاڑیاں نہیں دیں۔ ابھی ایک گاڑی تیار ہے مگر میں نے پرسنل یوز کے لیے اسے روک کر رکھا ہے۔ شاید اسی وجہ سے یہ بچ گئی۔‘‘ عامر نے اندر کھڑی ونز کی طرف اشارہ کیا۔
’’ممتاز ہاشمی کے بیٹے بلال ہاشمی نے الزام لگایا ہے کہ یہ تمہارا کام ہے۔‘‘
عامر نے برہمی سے کہا۔ ’’اس کا دماغ خراب ہے۔ میں ایسا کام کیوں کرنے لگا؟ یہ تو اپنے پیٹ پر لات مارنے والی بات ہو گی۔ اب میرا کام بھی تو رک گیا ہے۔ بلال نے وجہ نہیں بتائی کہ میں ایسا کیوں کروں گا؟‘‘
انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’اس نے کوئی وجہ نہیں بتائی۔‘‘
’’میرا تعلق ممتاز ہاشمی سے ہے۔ بلال سے میری بہت کم بات ہوئی ہے۔ شاید اسی لیے وہ مجھے پسند نہیں کرتا ہے اور اس نے میرا نام لے دیا۔ ممتاز صاحب کا کیا بیان ہے؟‘‘
’’وہ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے آئی سی یو میں ہیں۔‘‘ انسپکٹر نے جاتے ہوئے کہا۔ عامر نے دیکھا کہ پولیس والے جائے وقوع کا معائنہ کر رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد انسپکٹر دوبارہ آیا اور اس بار اس کے ہاتھ میں ایک میلا سا کپڑا تھا۔ یہ تولیا نما کپڑا تھا جو عامر اپنی ورکشاپ میں صفائی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ وہ یہ کپڑا ہول سیل سے وزن کے حساب سے خریدتا تھا۔ ہاتھ پاؤں کے بعد اس سے فرش اور پرزے صاف کیے جاتے تھے اور جب کپڑا بالکل ہی میلا ہو جاتا تو اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیا جاتا تھا۔ انسپکٹر نے کپڑا عامر کو دکھایا۔ ’’یہ تمہاری ورکشاپ میں استعمال ہوتا ہے؟‘‘
’’لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔‘‘ عامر نے کہا۔ ’’لیکن یہاں موجود تمام ورکشاپس اور آٹو شوروم کو یہی کپڑا سپلائی کیا جاتا ہے۔‘‘
’’جلے ہوئے شوروم سے ایسے کم سے کم دو کپڑے ملے ہیں جو آگ لگا کر اندر پھینکے گئے تھے لیکن کسی وجہ سے ان کی آگ بجھ گئی۔ کئی جگہوں سے ایسی راکھ ملی ہے جو اسی قسم کے کپڑے کے جلنے سے بنتی ہے۔‘‘
عامر نے حیرت سے کہا۔ ’’آپ کا مطلب ہے کہ کسی نے شوروم میں آگ لگائی ہے؟‘‘
’’بالکل...... اب یہ طے شدہ ہے۔‘‘
’’مگر میرا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔‘‘ عامر نے ہاتھ اوپر کیے۔ ’’چوکیدار کیا کہتا ہے؟‘‘
’’اس کا کہنا ہے کہ وہ پانی لینے نزدیکی مارکیٹ تک گیا تھا اور جب واپس آیا تو یہاں آگ لگائی جا چکی تھی۔ کام کسی ایسے فرد کا ہے جو چوکیدار کی روانگی سے واقف تھا۔‘‘
’’میں قطعی بے خبر تھا اور میں شام سات بجے تک ورکشاپ بند کر کے گھر چلا جاتا ہوں۔‘‘
’’کل بھی تم سات بجے چلے گئے تھے؟‘‘
’’ہاں شاید سوا سات بجے تک۔‘‘
’’اس کے بعد تم واپس نہیں آئے؟‘‘
’’آگ لگنے کی نیوز ٹی وی پر دیکھی تو آیا تھا مگر پھر چلا گیا تھا۔‘‘
’’کوئی ایسا فرد جو گواہی دے سکے کہ تم سات سے گیارہ کے درمیان گھر میں تھے؟‘‘
عامر نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’کوئی گواہ نہیں ہے۔ میں اکیلا رہتا ہوں اور اتفاق سے کسی سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔‘‘
انسپکٹر چلا گیا اور عامر سوچ رہا تھا کہ بلال نے فرحانہ کے حوالے سے ہونے والی تلخ کلامی کا ذکر انسپکٹر سے کیوں نہیں کیا؟ جبکہ اس کے خیال میں عامر نے شوروم میں آگ اسی وجہ سے لگائی تھی۔ وہ فرحانہ کی کار پر کام کر رہا تھا اور اس کا مڑ جانے والا چیسس سیدھا کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس میں نیا ریڈی ایٹر لگنا تھا۔ بونٹ الگ کر کے اس کے ورکر ٹھیک کر رہے تھے۔ مرمت کا مکمل ہو جانے کے بعد پینٹ کیا جاتا۔ وہ کام کر رہا تھا کہ ایک کار آ کر رکی اور اس سے فرحانہ اتری۔ اسے دیکھ کر عامر کھل اٹھا۔ وہ ہاتھ صاف کرتا ہوا باہر آیا۔ فرحانہ نے پہلے افسوس سے جلے ہوئے شوروم کو دیکھا اور پھر اس کی طرف آئی۔ ’’کیسے ہو تم؟‘‘
’’ٹھیک ہوں۔‘‘ عامر نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ’’بلال نے مجھ پر الزام لگا دیا ہے کہ میں نے شوروم میں آگ لگائی ہے۔‘‘
فرحانہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ’’سچ میں؟‘‘
’’بالکل سچ لیکن میرے لیے یہ جوک آف دی ڈے ہے۔‘‘
’’وہ احمق ہے۔ تمہیں بھلا یہ کرنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ شوروم سے تمہارا بھی بزنس چلتا ہے۔‘‘
’’تھا۔‘‘ عامر نے شوروم کی طرف دیکھا۔ ’’اب اگر ممتاز ہاشمی نے اسے دوبارہ سے بنا لیا تب بھی میں اس سے

بزنس نہیں کروں گا۔''

''میں تمہیں بتانے آئی ہوں کہ کل سے کلاسز آف ہو رہی ہیں اور دو ہفتے بعد پیپرز ہیں۔''

عامر ذرا آگے جھکا۔''اور اس کے بعد؟''

فرحانہ کا رنگ گلابی ہو گیا۔''میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کے فوراً بعد ہم شادی کرلیں گے۔''

عامر کے چہرے پر ناقابل یقین خوشی نمودار ہوئی۔ اگر وہ سرعام نہ ہوتے تو شاید وہ کوئی حرکت کر جاتا۔ اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر ہلکی سی چیخ ماری۔''یس۔''

''میں آج حامد بھائی کو بھی بتا دوں گی۔''فرحانہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔

''ایس پی صاحب لازی رکاوٹ ڈالیں گے۔'' عامر نے یقین سے کہا۔

''تم حامد بھائی کی فکر مت کرو۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور میری مرضی میں خوش ہوں گے۔''

''وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔''

''ماما پاپا بھی تمہیں پسند نہیں کرتے تھے۔''ماں باپ کا ذکر کرتے ہوئے فرحانہ کا لہجہ دھیما ہو گیا تھا۔''مگر میں تمہاری ہونے والی ہوں۔ اسی طرح کسی اور کی پسند ناپسند سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

وہ اپنے جوش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔''میں ابھی سے تیاری شروع کر دیتا ہوں۔''

''عامر! میں کتنی ہی آزاد خیال اور بولڈ سہی لیکن ہماری کچھ روایات ہیں۔''

''کیسی روایات؟''

''ایک تو یہ کہ ہم اب شادی سے پہلے نہیں ملیں گے۔''

''مجھے منظور ہے...... مگر سب طے کون کرے گا؟''

''حامد بھائی۔''فرحانہ نے جواب دیا۔''شادی سادگی سے ہوگی اور اس میں دونوں طرف سے بس چند لوگ شریک ہوں گے۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''اور ہم شادی کے فوراً بعد ہنی مون منانے پہاڑوں میں تمہارے کاٹیج پر جائیں گے۔''

عامر چونکا۔''اتنی جلدی...... ہم بعد میں بھی جا سکتے ہیں۔''

''نہیں، ہم شادی کے فوراً بعد جائیں گے۔''فرحانہ نے حتمی لہجے میں کہا۔''میری خواہش ہے کہ ہماری شادی کی پہلی رات وہیں گزرے۔''

عامر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔''ٹھیک ہے اور کوئی شرط۔''

''اس میں کوئی بھی شرط نہیں ہے، میری خواہش ہے، کیا تم میری خواہش پوری نہیں کرو گے؟''فرحانہ نے یوں کہا کہ عامر پگھل گیا۔

''کیوں نہیں کروں گا۔''

''تب شادی تک کے لیے بائے۔''

''رکو...... میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔''

فرحانہ منع کرنے والی تھی مگر عامر کی ملتجی صورت دیکھ کر رک گئی۔''ٹھیک ہے، گاڑی نکالو۔''

عامر جلدی سے گاڑی نکال لایا۔ اس نے راستے میں کہا۔''شادی کے بعد تو تم میرے ساتھ رہو گی۔''

فرحانہ نے سر ہلایا۔''بالکل...... میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

''تھینک یو کیونکہ میں سسرال میں رہنے کا بالکل بھی قائل نہیں ہوں۔''

''میں بھی اسی بات کی قائل ہوں کہ بیوی شوہر کی ذمے داری ہوتی ہے۔''

''ایس پی صاحب اور ان کی بیگم کوٹھی میں رہیں گے؟''

''ہاں جب تک وہ اس شہر میں ہیں، یہیں رہیں گے۔ یہ پاپا کی اور اب میری خواہش ہے۔ یوں سمجھ لو کہ حامد بھائی ہی میرا میکا ہوں گے۔''

عامر نے فرحانہ کو اس کی کوٹھی پر چھوڑا اور واپس ورکشاپ آ گیا۔ اب اسے انتظار تھا کہ کب حامد اس کے پاس آتا ہے۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اگلے ہی دن حامد اس کی ورکشاپ پر آیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا اور اس نے اندر آنے کے بجائے عامر کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ حامد نے بلاتمہید کہا۔''تم جانتے ہو یہ شادی فرحانہ کی خواہش پر ہو رہی ہے۔''

''میری تو خواہش ہے کہ آپ سب بھی اس میں خوش ہوں۔''

حامد نے اس کی بات نظر انداز کی۔''اگلے اتوار تک تم اپنے گھر والوں کو لے آؤ تاکہ بات پکی ہو جائے اور سب کچھ طے ہو جائے۔''

عامر کہتے کہتے رک گیا کہ آپ کی لاڈلی بہن سب طے کر چکی ہے اور اس کے گھر والوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے پھر سر ہلایا۔''میں لے آؤں گا۔''

''فرحانہ کو فرنیچر میں دوں گا۔ اپنا ایڈریس دے دو فرنیچر وہاں پہنچ جائے گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''اس بار عامر کا لہجہ بھی

سرد تھا۔ ''میرا... گھر نیا فرنش ہوا ہے اور یہ سب فرحانہ کو پسند آئے گا۔''

حامد نے اصرار نہیں کیا۔ اس نے نظر جما کر عامر کو دیکھا۔ ''فرحانہ معصوم لڑکی ہے۔ اس نے دنیا بہت زیادہ نہیں دیکھی ہے مگر میں آدمی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یاد رکھنا اگر اسے ذرا بھی تکلیف ہوئی تو تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا۔''

''میں اس سے محبت کرتا ہوں اور آدمی جس سے محبت کرتا ہے اسے تکلیف نہیں دیتا۔''

''بعض اوقات وہی آدمی دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف دیتا ہے جس سے محبت کی جائے۔'' حامد نے کہا اور رخصت ہوگیا۔ سڑک کے پار چند مزدور جلے ہوئے شوروم کا ملبا اٹھا کر ایک ٹرک میں ڈال رہے تھے۔ بلال کھڑا ہوا ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ عامر اس کی طرف بڑھا۔ بلال نے اسے نظرانداز کیا مگر وہ خود اس کے پاس پہنچ گیا۔

''ہاشمی صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ شوروم میں کسی نے آگ لگائی مگر یقین کرو وہ میں نہیں ہوں۔''

بلال نے منہ پھیر لیا۔ اس کا اشارہ واضح تھا کہ وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہ رہا مگر عامر بھی اس سے بات کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ اسے اطلاع دینے آیا تھا۔ ''دو ہفتے بعد میری اور فرحانہ کی شادی ہے۔''

بلال نے جھٹکے سے اس کی طرف دیکھا۔ اس لمحے عامر کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نظر آئی۔ اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چلے جاؤ یہاں سے...... اس سے پہلے کہ میرا ضبط جواب دے جائے۔''

عامر یوں مسکرایا جیسے بلال نے اسے مبارکباد دی ہو۔ ''ویسے تو کم لوگ ہوں گے مگر تم بھی شریک ہوئے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

بلال ایک قدم آگے آیا مگر عامر آگے بڑھ گیا تھا۔ بلال رک کر اپنے ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔

☆☆☆

حامد اور نائمہ کے فلور سے ان کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ فرحانہ نیچے بیٹھی تھی اور وہ جانتی تھی کہ موضوع گفتگو وہی ہے۔ کچھ دیر پہلے حامد اس سے بات کر کے گیا تھا۔ وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ عامر سے شادی کا فیصلہ بدل دے۔ حامد کا کہنا تھا کہ عامر وہ نہیں، جو نظر آتا ہے۔ اگر شادی کے بعد اس کی اصل شخصیت سامنے آئی تو فرحانہ کو دھچکا لگے گا۔ اس لیے بہتر ہے وہ ابھی فیصلہ کر لے۔ مگر فرحانہ نے حامد سے کہا۔ ''مجھے عامر پر پورا اعتماد ہے اور میں اسے اب سے نہیں برسوں سے جانتی ہوں اور جہاں تک ظاہر و باطن میں فرق کی بات ہے تو آپ جانتے ہیں، تقریباً ہر شخص کے ظاہر و باطن میں فرق ہوتا ہی ہے۔ مجھے یقین ہے میں شادی کے بعد اس کے ساتھ خوش رہوں گی۔''

حامد ناکام ہو کر اوپر گیا تو نائمہ اس سے الجھنے لگی کہ اسے فرحانہ کو سمجھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بچی نہیں ہے۔ اپنا اچھا برا سمجھتی ہے۔ حامد نے جواب دیا اور بات بڑھتی گئی۔ اب دونوں چیخ چیخ کر لڑ رہے تھے۔ ان کی آوازوں سے قطع نظر فرحانہ سکون سے بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد نائمہ اوپر سے ایک بیگ لے کر اتری اور اس نے شرربار نظروں سے فرحانہ کو دیکھا۔ ''میں اس گھر سے جا رہی ہوں۔''

''ضرور جائیں۔'' فرحانہ نے خلافِ توقع اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ''آپ نے حامد بھائی کو سوائے ٹینشن کے اور دیا ہی کیا ہے؟''

نائمہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''جس عورت کے شوہر کو سوائے اس کے دنیا کی ہر عورت کی فکر ہو تو اسے ٹینشن کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں۔ وہ شوہر میرا ہے لیکن یہاں تمہارے ساتھ رہنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔''

''آپ کی اس گھٹیا بات کا جواب ہے میرے پاس مگر کیچڑ میں پتھر مارو تو چھینٹے خود پر آتے ہیں۔'' فرحانہ نے آرام سے کہا۔ ''بہتر یہی ہوگا آپ چلی جائیں۔''

نائمہ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی اور کچھ دیر بعد اوپر سے حامد نیچے آیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ فرحانہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کس مشکل میں ہیں۔ میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اگر نائمہ الگ رہنا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''تم نے اس کا رویہ دیکھا۔'' حامد کا لہجہ شکایتی تھا۔ ''میں نے اس سے کہا کہ بس چند دن انتظار کر لے۔ تمہاری شادی ہو جائے تو میں اسے الگ گھر لے کر دے دوں گا مگر وہ یہاں رہنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہے۔''

''وہ ٹھیک ہو جائے گی۔''

''وہ ٹھیک نہیں ہوگی۔'' حامد نے تلخی سے کہا۔ ''وہ سائیکالوجی پڑھ رہی ہے مگر وہ خود سائیکو ہو چکی ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے۔''

فرحانہ نے حامد کو صوفے پر بٹھایا اور خود اس کے برابر بیٹھ گئی۔ ''اگر وہ چلی گئی ہے تو میں ہوں نا آپ کے پاس۔''

حامد نے چونک کر فرحانہ کو دیکھا۔

☆☆☆

''فرحانہ ولد ریاض علی تمہیں عامر حسین ولد احمر حسین سے نکاح قبول ہے؟'' نکاح خواں نے اس سے پوچھا اور تین بار پوچھنے کے بعد جب فرحانہ نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے نکاح کا اعلان کر دیا۔ نکاح نامے پر سائن پہلے ہی ہو چکے تھے۔ تقریب میں دونوں طرف سے مشکل سے ایک درجن افراد شریک تھے۔ عامر کے گھر والوں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ صرف بیٹے کی وجہ سے ایسی شادی پر آمادہ ہوئے تھے ورنہ ان کے ہاں سادگی سے شادی گناہ سے کم نہیں سمجھی جاتی۔ حامد نے تمام انتظامات کیے تھے۔ اس نے کھانے کے لیے کیٹرنگ والوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ نائمہ نے شادی میں آنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ خاندان کے چند ایک قریبی ممبر شریک تھے۔ ان میں حامد کی ماں بھی تھی جو فرحانہ کی خالہ تھی۔ اسی نے سرپرست کی حیثیت سے فرحانہ کو رخصت کرنا تھا۔ تقریب دن کی تھی اور شام کے وقت رخصتی تھی۔ فرحانہ کا ذاتی سامان عامر کی گاڑی کی ڈکی میں رکھ دیا گیا تھا۔ رخصتی سے پہلے حامد، عامر کو ایک طرف لے گیا اور بولا۔

''میری بات یاد رکھنا، فرحانہ کو کوئی تکلیف ہوئی تو اس کی ادائیگی تمہیں کرنا ہوگی۔''

''فکر مت کریں، اب وہ میری ذمے داری ہے۔'' عامر نے جواب دیا۔ روانگی کے وقت اس کا موڈ اس دھمکی پر کچھ دیر خراب رہا تھا مگر جب وہ کوٹھی سے نکل آئے تو برابر میں بیٹھی فرحانہ کے پاس سے آتی خوشبو نے خود بہ خود اس کا موڈ اچھا کر دیا۔ وہ چپ تھی اور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ عامر کی باتوں کے مختصر جواب دے رہی تھی۔ اس کی جھجک محسوس کرتے ہوئے عامر خود بھی خاموش ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شرما رہی ہے۔ عامر کا فیملی کاٹیج دارالحکومت سے کچھ دور پہاڑوں میں تھا۔ ایک گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ کاٹیج کی دیکھ بھال کے لیے ایک چوکیدار ہوتا تھا۔ کاٹیج میں نیچے ایک بیڈروم، ایک لاؤنج اور ایک کچن تھا۔ ایک اٹیچ باتھ اور ایک کامن تھا۔ اوپری منزل میں ایک بیڈروم اور تھا۔ وہ ایک گھنٹے سے بھی پہلے وہاں پہنچ گئے۔ رات ہو چکی تھی۔ چوکیدار موجود تھا۔ عامر نے اس سے کاٹیج کی چابی لی اور حال احوال پوچھ کر اسے رخصت کر دیا اور خود فرحانہ کا سامان نکال کر اندر لایا۔ فرحانہ نے شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور میک اپ بھی نارمل تھا۔ وہ دلہن تو نظر نہیں آرہی تھی مگر عامر کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ اب وہ اس کی تھی۔ حامد نے ان کے لیے کھانا بھی پیک کروایا تھا۔ عامر نے فرحانہ سے پوچھا۔

''کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''بھوک لگی ہے۔''

وہ کچن میں آگئے۔ عامر پیکٹ کھول کر گرم کرنے لگا پھر اس نے میز پر لگایا۔ فرحانہ خاموش بیٹھی رہی۔ کھانے کے دوران عامر نے اس سے پوچھا۔ ''تم خاموش کیوں ہو؟''

''مجھے ماما پاپا یاد آرہے ہیں۔''

''اوہ۔'' عامر نے گہری سانس لی۔ ''یہ فطری امر ہے۔''

''عامر! اس روز وہاں کیا ہوا تھا؟'' فرحانہ نے پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہے۔''

''ہاں لیکن میں تمہاری زبانی سننا چاہتی ہوں۔ میں نے آج تک تم سے نہیں پوچھا۔''

عامر سوچ کر کہنے لگا۔ ''میری کار تمہاری گاڑی کے پیچھے تھی...... بارش بہت تیز تھی...... جب ہم کراسنگ کے پاس پہنچے...... سگنل ریڈ تھا اور ٹرین آنے والی تھی...... مگر اس کی روشنی ابھی نظر نہیں آئی تھی...... اصل میں بارش کے شور میں نہ اس کی آواز آئی اور تیز بارش کی وجہ سے روشنی بھی دکھائی نہیں دی تھی...... شاید تمہارے پاپا نے سوچا کہ ٹرین کے آنے سے پہلے وہ لائن کراس کر لیں گے...... انہوں نے گاڑی آگے بڑھائی اور اسی وقت ٹرین آگئی......'' عامر بولتے بولتے رکا۔ ''اس کے بعد تمہیں معلوم ہے۔''

فرحانہ کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ ''پتا نہیں میں کیسے بچ گئی۔''

''تم پچھلی سیٹ پر تھیں اور ٹرین نے گاڑی کے اگلے حصے کو ٹکر ماری تھی جہاں تمہارے ماما پاپا تھے۔''

فرحانہ نے ہاتھ روک لیا۔ ''بس میں نے کھا لیا ہے۔''

فرحانہ نے برتن اٹھائے اور سنک میں رکھنے لگی۔ عامر اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ وہ دونوں کچن کی کھڑکی کے سامنے تھے۔ شیشے کے پار لوہے کی گرل لگی تھی۔ اچانک کوئی گرل کے سامنے سے گزرا اور فرحانہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ عامر نے بھی دیکھا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں۔''

''نہیں۔'' فرحانہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''یہ وہی اپر پوش تھا، میں نے خود دیکھا ہے۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' عامر نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ وہ بیڈ روم میں گیا اور اس نے اپنا پستول نکالا۔ وہ کاٹیج میں اسلحہ رکھتا تھا کیونکہ یہ جنگل تھا اور بعض اوقات یہاں ریچھ بھی آجاتے تھے۔ فرحانہ پریشان تھی۔ عامر نے باہر جانے سے پہلے اس سے کہا۔ ''دروازہ اندر سے بند کرلو اور جب تک میری آواز نہ سنو دروازہ مت کھولنا۔''

عامر کے باہر جاتے ہی اس نے اندر سے دروازہ بند کرلیا اور اپنا آئی فون نکالا۔ یہ وہی آئی فون تھا جو ریاض علی نے اسے گفٹ کیا تھا۔ اس نے اب تک اسے سنبھال کر رکھا تھا۔ اس نے حامد کو کال کی اور روہانسے لہجے میں بولی۔ ''وہ یہاں بھی آگیا ہے۔''

''کون؟'' حامد بے چین ہوگیا۔ ''تم ٹھیک ہونا؟''

''وہی اپر پوش اور عامر اسے دیکھنے باہر گیا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''تم نے دروازہ اندر سے بند کیا ہے؟''

''ہاں.....'' فرحانہ نے کہا اور اسی لمحے فائر کی آواز آئی۔

☆☆☆

حامد نے بھی فائر کی آواز سنی۔ وہ فرحانہ کو پکارنے لگا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ لائن موجود تھی مگر فرحانہ اس کو جواب نہیں دے رہی تھی۔ حامد نے موبائل جیب میں رکھا اور اٹھ کر الماری سے اپنا سروس پستول نکالا۔ وہ نیچے آیا اور اپنی گاڑی نکالی۔ گیٹ سے باہر آتے ہی وہ ہر ممکن تیزی سے روانہ ہوگیا۔ عامر کے کاٹیج کی لوکیشن اس کے علم میں تھی۔ اس نے ہائی وے پر آتے ہی مقامی ہیڈ کوارٹر کال کی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے اس نے آپریٹر کو ہدایت کی کہ وہ اس پہاڑی علاقے کے پولیس اسٹیشن کال کرے، وہاں سے پولیس کو فوری طور پر مذکورہ پتے پر جانے کو کہے۔ وہاں ایمرجنسی تھی اور کچھ لوگوں کی جان خطرے میں تھی۔ حامد جانتا تھا کہ عام طور سے پولیس کسی کی جان بچانے کے لیے بہ مشکل ہی وقت پر حرکت میں آتی تھی مگر اس نے ایس پی کی حیثیت سے کال کی تھی اس لیے امید تھی کہ اس کا فوری ردعمل ہوگا۔

☆☆☆

عامر پستول لیے کاٹیج کے اس طرف آیا جہاں اس نے اور فرحانہ نے اپر پوش کو دیکھا تھا۔ وہ بہت محتاط تھا اور اس نے پستول آگے کیا ہوا تھا۔ اچانک اسے درختوں کے درمیان کسی کی جھلک دکھائی دی اور اس نے بے ساختہ فائر کیا۔ مگر وہ بس ایک جھلک تھی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی نہ جانے کہاں گئی تھی۔ وہ درختوں کی طرف بڑھا۔ کاٹیج اس پہاڑ کی ڈھلان پر سڑک سے کوئی سو گز اوپر تھا اور اس کے اوپر دور تک پہاڑ پر گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے میں درخت کاٹنے پر پابندی تھی اس لیے یہاں کا جنگل محفوظ تھا۔ عامر کو جھلک اوپر کی طرف دکھائی دی تھی۔ درختوں کے پاس آکر وہ سست ہوگیا۔ یہاں تاریکی تھی اور روشنی کی ضرورت تھی مگر اس کے پاس سوائے موبائل کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے موبائل نکال کر اس کا ایل ای ڈی فلیش آن کرلیا۔ اس کی روشنی محدود تھی مگر کچھ فاصلے تک دکھا رہی تھی۔ وہ بالکل تاریکی میں نہیں تھا۔

ڈھلان زیادہ نہیں تھی مگر اسے قدم جما کر رکھنے پڑ رہے تھے۔ یہاں گرنے کی صورت میں چوٹ اور نیچے لڑھکنے کا پورا امکان تھا۔ عامر اندر سے جھنجلا رہا تھا۔ آج اس کی زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ اس دن کے لیے اس نے کیا نہیں کیا تھا اور کتنے خواب دیکھے تھے مگر جب یہ دن آیا تو ساتھ ہی کوئی منحوس اس کی خوشیوں کا دشمن بن کر چلا آیا تھا۔ اس وقت عامر کے دل میں اتنا طیش تھا کہ اپر پوش سامنے آتا تو وہ اسے شوٹ کرنے سے گریز بھی نہ کرتا۔ اس نے گولی چلا کر اپنے عزائم کا اظہار کردیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پہلی جھلک کے بعد اپر پوش نے اس کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ عامر کان لگا کر سن رہا تھا کہ شاید اپر پوش کے قدموں کی آواز سنائی دے مگر کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ خاصا اوپر آگیا تھا۔ اچانک ہی نیچے کاٹیج کی طرف سے ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی۔ اسے لگا کہ چیخ فرحانہ کی تھی۔ وہ بے تحاشا نیچے کی طرف بھاگا۔

کاٹیج کے پاس آتے ہی وہ چیخ چیخ کر فرحانہ کو آوازیں دینے لگا مگر اس کی طرف سے جواب نہیں آرہا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ آندھی طوفان کی طرح کاٹیج میں داخل ہوا۔ اس کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ فکرمند ہوچکا تھا اور اس کا خدشہ درست ثابت ہوا جب اس نے اندر فرحانہ کو نہیں پایا۔ دروازے کے سامنے فرش پر بچھی موٹی دری یوں سمٹ گئی تھی جیسے کسی کو اس پر کھینچ کر لے جایا گیا ہو۔ عامر پاگل ہونے لگا۔ اس کے منہ سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ وہ پھر کاٹیج سے باہر آیا اس نے دہاڑ کر کہا۔ ''کہاں ہو تم، فرحانہ کو چھوڑ دو...... وہ میری ہے صرف میری..... کوئی اس کے اور میرے بیچ میں آیا تو میں اسے قتل کردوں گا..... سنا تم نے.....''

''جیسا کہ تم نے میرے ماں باپ کو کیا تھا؟'' عامر کو عقب سے فرحانہ کی آواز آئی تو وہ بھڑک کر اس کی طرف مڑا۔ فرحانہ کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ عامر اس کی طرف بڑھا تھا کہ عقب سے کوئی چیز اس کی پشت چیرتی ہوئی اس کے جسم میں داخل ہوگئی۔ وہ کراہ کر زمین پر گرا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو بلال کو پا کر حیران ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا اور اس نے اپر پہن رکھا تھا جس کا ہڈ اب اس کے شانوں پر تھا۔ اس نے اسی خنجر سے عامر کی پشت پر وار کیا۔

''تم۔'' عامر نے نفرت سے کہا اور پستول والا ہاتھ اٹھانا چاہا مگر اس سے پہلے کہ وہ پستول سیدھا کرتا فرحانہ نے اس سے پستول چھین لیا۔ وار کاری تھا اور وہ کمزور ہوگیا تھا۔ فرحانہ نے بلال سے کہا۔

''تم کاٹیج میں جاؤ، مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں..... اس سے پہلے کہ یہ مرجائے۔''

بلال خاموشی سے اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فرحانہ نے عامر کے پاس بیٹھتے ہوئے آئی فون نکالا اور اس پر ایک ویڈیو چلائی۔ یہ وہی ویڈیو تھی جو ریحانہ نے بنائی تھی۔ فرحانہ سو رہی تھی اور اس کے ماں باپ اس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ریاض علی نے گاڑی کراسنگ پر روکی ہوئی تھی۔ ٹرین نزدیک آرہی تھی۔ اچانک ان کی گاڑی کو جھٹکا لگا اور ریاض علی چلایا۔ ''یہ کیا ہے؟''

ریحانہ نے مڑ کر دیکھا اور دہشت زدہ لہجے میں بولی۔ ''میرے خدا.....! وہ اپنی کار سے ہماری گاڑی کو لائن پر دھکیل رہا ہے۔''

ریاض علی اور ریحانہ دونوں چلانے لگے۔ ریاض نے بریک دبائے مگر عامر کی اسپورٹس کار کا طاقتور انجن... بہ آسانی وزنی گاڑی کو لائن پر لے آیا اور اسی لمحے ٹرین آگئی۔ ریاض اور ریحانہ کو نکلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس کے بعد ویڈیو الٹ پلٹ گئی اور اس میں انسانوں اور دھات کی سمع خراش آوازیں شامل ہوگئیں۔ فرحانہ کانپ رہی تھی وہ جب یہ ویڈیو دیکھتی اس کی یہی حالت ہوجاتی تھی۔ عامر پر سکتہ طاری تھا۔ اس کا جرم سامنے تھا، وہ انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی جواز تھا۔ اس نے کانپتا ہوا ہاتھ فرحانہ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ میں نے تمہارے لیے کیا۔''

''میرے لیے۔'' وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ''ذلیل شخص! تم نے میرے لیے میرے ماں باپ کو اتنے اذیت ناک طریقے سے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''اور میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ جس دن میں نے پہلی بار یہ ویڈیو دیکھی، مجھے تم سے شدید ترین نفرت ہوگئی اور ہر گزرتے دن اس نفرت میں اضافہ ہوتا رہا۔''

''تب یہ سب کیا تھا؟'' عامر اب نڈھال ہوگیا تھا۔ خنجر نے عقب سے اس کے دل کی اوپری شریان کو چھید دیا تھا اور وہ خون بہنے سے رفتہ رفتہ موت کی طرف جارہا تھا۔ ''مجھ سے شادی کیوں کی؟''

فرحانہ اس کی طرف جھکی۔ ''تاکہ تم بھی وہی اذیت محسوس کرو جو میرے ماں باپ نے مرتے وقت محسوس کی... ہوگی۔ وہ بہت خوش تھے اور تم بھی آج بہت خوش ہو۔ میں نے اسی لیے اس کاٹیج میں آنے پر اصرار کیا تھا کہ تمہارے گھر میں، میں یہ سب نہیں کرسکتی تھی۔ میں تمہیں خود کو چھونے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔''

''تم نے بلال کو کیسے ساتھ ملایا؟''

''اس کے شوروم کو آگ لگا کر۔'' فرحانہ بولی۔ ''وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ یونیورسٹی میں اپر پوش وہی تھا۔ وہ چھپ کر مجھے دیکھتا تھا مگر گاڑی والا ڈراما میں نے خود کیا تھا تاکہ دوسروں کو یقین آجائے کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ بلال کو تمہارے خلاف استعمال کرنے کے لیے شوروم کو آگ لگائی اور اس کا شک تم پر گیا۔''

''مگر کیوں؟''

''تاکہ میں تمہیں یوں ٹھکانے لگا سکوں کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔'' فرحانہ نے کہا اور اپنے موبائل سے ویڈیو ڈیلیٹ کردی۔ اب اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عامر کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔

''فرحی! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

فرحانہ اسے دیکھتی رہی۔ اس کے موبائل نے وائبریشن کی۔ اس پر حامد کی کال آرہی تھی مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ عامر نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ ''تمہیں بلال پسند ہے؟''

''نہیں، مجھے اس سے بھی نفرت ہے۔'' فرحانہ بولی۔ ''اس نے میری ایک یونیورسٹی کی دوست کو محبت میں دھوکا دیا اور اس نے خودکشی کرلی۔ وہ اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جلد وہ بھی اپنے کیے کا مزہ چکھے گا۔''

''لیکن میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا..... کل بھی تم سے محبت کی تھی اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔''

عامر کا جسم جھٹکے لینے لگا تھا۔ فرحانہ نے منہ پھیر لیا۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے منہ سے خون کے بلبلوں کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکل رہے تھے۔ ''آئی..... لو

یو...... فرحی۔''

فرحانہ نے جواب نہیں دیا اور عامر نے آخری جھٹکا لے کر دم توڑ دیا۔ فرحانہ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اسی لمحے کاٹیج کی طرف سے بلال آتا دکھائی دیا۔ اس نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا کر رہی ہو؟ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کرسکتا، مجھے واپس بھی جانا ہے۔''

''اب تمہیں انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔'' فرحانہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ مر چکا ہے۔''

بلال کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ اس نے فخر سے کہا۔ ''مجھے خنجر استعمال کرنے میں مہارت ہے۔ میں نے ناپ تول کر وار کیا تھا۔''

''تم اس کے قاتل ہو، میرے شوہر کے قاتل۔'' فرحانہ کھڑی ہوگئی۔ اسی لمحے نیچے ہائی وے پر کسی گاڑی کی روشنی نمودار ہوئی۔ بلال نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟ میں نے اسے تمہارے کہنے پر قتل کیا ہے۔''

''ہاں مگر اس کے قاتل تم ہی ہو۔'' فرحانہ نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور ٹریگر دبانے لگی۔ ہر بار گولی لگنے پر بلال کا جسم جھٹکا کھاتا۔ تیسری گولی پر وہ نیچے گر گیا مگر فرحانہ نے ہاتھ نہیں روکا۔ وہ اس وقت تک گولیاں چلاتی رہی جب تک کہ پستول خالی نہیں ہوگیا۔ پھر وہ کاٹیج کی طرف لپکی اور اس نے کھلے دروازے سے اپنا موبائل اندر پھینکا اور واپس آگئی۔ اس نے جھک کر بلال کو چیک کیا۔ وہ مر چکا تھا۔ پھر وہ عامر کی لاش کی طرف بڑھی اور جب حامد کی گاڑی آکر کاٹیج کے پاس رکی تو وہ عامر کی لاش کے پاس دوزانو بیٹھی رو رہی تھی۔ خالی ہوجانے والا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ حامد دوڑتا ہوا آیا۔ پھر وہ عامر اور بلال کی لاشیں دیکھ کر ٹھٹکا مگر فرحانہ کو ٹھیک پا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے جلدی سے اپنی جیکٹ اتار کر لرزتی فرحانہ کے گرد لپیٹی اور اسے اٹھاتے ہوئے کاٹیج کی طرف بڑھا۔ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

''اٹس اوکے...... سب ٹھیک ہے۔ تم پریشان مت ہو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

☆☆☆

حامد نے کافی کا مگ فرحانہ کے سامنے رکھا۔ آج تیسرا دن تھا۔ تمام کارروائیاں ختم ہو چکی تھیں۔ عامر کی تدفین اس کے آبائی شہر میں ہوئی تھی جبکہ بلال کی لاش اس کا باپ اپنے علاقے میں لے گیا تھا۔ حامد کی زیر نگرانی پولیس نے اس واقعے کا چالان عدالت میں پیش کرنے کی تیاری کرلی تھی اور امید تھی کہ اولین پیشی پر فرحانہ کو باعزت بری کردیا جائے گا۔ اس نے اقرار کیا تھا کہ اپنے شوہر کے قتل کے بعد اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے اس نے بلال کو اپنے شوہر کے پستول سے قتل کیا تھا۔ دیگر شواہد بھی اس کے خلاف تھے۔ پستول پر اس کی انگلیوں کے نشانات تھے اور اس کے ہاتھ پر بارود کی ذرات پائے گئے تھے۔ مگر بلال کا جرم بھی واضح تھا۔ اس کی انگلیوں کے نشانات خنجر پر پائے گئے تھے اور یہ اسی کا خنجر تھا۔ بلال کا عامر کے خلاف بیان ریکارڈ پر تھا۔ اپر پوش والی اسٹوری بھی پولیس کے علم میں تھی۔ اس لیے حامد کو یقین تھا کہ فرحانہ باعزت بری ہوجائے گی۔ حامد نے اس سے پوچھا۔

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' فرحانہ نے جواب دیا۔ ''میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' حامد بولا۔

فرحانہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''اس حیثیت سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے جو کبھی آپ چاہتے تھے مگر میری وجہ سے پیچھے ہٹ گئے تھے۔''

حامد چونکا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ''تم جانتی ہو؟''

فرحانہ نے سر ہلایا۔ ''کون لڑکی ہوگی جو اپنی طرف اٹھنے والی پسند کی نظر نہ پہچان سکے۔ آپ تو میرے رشتے دار ہیں، بچپن سے ساتھ رہے ہیں۔''

حامد نے گہری سانس لی۔ ''تو تم جانتی تھیں تو یہ بھی جانتی ہوگی کہ میں نے چچا جان اور خالہ کے سامنے تمہیں بہن کیوں قرار دیا تھا؟''

''ہاں کیونکہ آپ جان گئے تھے کہ میں عامر سے محبت کرتی ہوں۔''

''اور اب......'' حامد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''اب وہ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ میں آپ سے کبھی یہ بات نہ کہتی مگر میں جانتی ہوں نائمہ آپ سے خلع لے رہی ہے اور اس کے بعد آپ میری طرح اکیلے رہ جائیں گے۔ میں اکیلے نہیں رہ سکتی اور میں نہیں چاہتی کہ آپ اکیلے رہیں۔''

حامد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے فرحانہ کے نازک ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ یہ نازک ہاتھ کتنے مضبوط فیصلے کرتا ہے۔

شیخ سماء الدین

ضیا تسنیم بلگرامی

انسان کو اللہ نے اتنی قدرت دی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے لیے رستوں کا انتخاب کرسکتا ہے لیکن ہدایت کا یہ تحفہ قسمت والوں کو ہی ملتا ہے... آپ کا شمار بھی انہی خوش نصیب لوگوں میں ہوا جن کی کرامات و برکات سے بنی نوع انسان نے فیض حاصل کیا... کم عمری میں ہی آپ کی ذات میں پوشیدہ وہ تمام اشارے نظر آنے لگے تھے جن کی بدولت آپ کا شمار ولیوں میں ہونے لگا۔

فانی دنیا اور باقی آخرت کے فلسفے کو دل میں اتارنے والی ایک برگزیدہ ہستی کی داستان



ملتان کے شیخ سماء الدین کی عمر ابھی بارہ سال کی تھی کہ ہر ایک پر یہ بات واضح اور ثابت ہوگئی کہ لڑکا غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے اور روحانی اور باطنی فیوض و برکات میں بے مثل ہے۔ صغر سنی ہی سے عبادت اور ریاضت میں انہماک اس طرح ظاہر ہوچکا تھا کہ ہر نماز سے پہلے وضو ضرور فرماتے۔ پاکی و طہارت کا خاص خیال رکھتے۔ اب شیخ سماء الدین کی ماں اور بھائی شیخ اسحاق اس فکر میں رہنے لگے تھے کہ اس باکمال شخص کو کس پیر کامل کی مریدی میں دیا جائے۔

ورنہ اس جوہرِ کامل کی تربیت میں کوتاہی کے خطاکار ٹھہریں گے۔

جب شیخ کے والد کو اپنی زندگی کے بارے میں شک وشبہ ہونے لگا تو انہوں نے ایک شب، جبکہ یہ نصف گزر چکی تھی...... انہیں...... بستر سے اٹھایا اور کہا۔ ''بیٹے سماء الدین! آ میرے ساتھ چل۔''

سماء الدین چپ چاپ اٹھ کر باپ کے ساتھ ہو لیے۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں لے گئے اور فرمایا۔ ''بیٹے سماء الدین! میں کچھ دنوں کے لیے دہلی جانا چاہتا ہوں۔ وہاں کسی سرائے میں قیام کروں گا اور کوشش کروں گا کہ وہیں کسی مضافات میں زمین لے کر باغ لگاؤں، کاروبار کروں اور سامانِ عیش وعشرت مہیا کروں۔''

سماء الدین نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ دہلی میں کتنے دن قیام کریں گے؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''چند ہفتے یا پھر ماہ ڈیڑھ ماہ۔''

سماء الدین کو ہنسی آگئی، بولے۔ ''باوا جان! آپ مجھ سے مذاق تو نہیں فرما رہے؟''

باپ نے پوچھا۔ ''اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''جب آپ ہفتوں یا ماہ ڈیڑھ ماہ کے لیے دہلی جائیں گے اور وہاں کی کسی سرائے میں قیام فرمائیں گے تو پھر یہ زمین اور باغات کی آپ کو کیا سوجھی؟ کاروبار اور عیش وعشرت کے منصوبے کیسے؟''

باپ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''بیٹے! میں تم سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، میرے نزدیک اس کے لیے یہ بہترین پیرایہ بیان تھا۔ یہ دنیا چاہے کتنی لمبی عمر رکھتی ہو مگر انسان لمبی عمر لے کر...... نہیں آتا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ اس سرائے میں چند روزہ قیام کا یقین رکھنے کے باوجود اگر انسان ایسے منصوبے بنائے گویا اسے یہاں ہمیشہ رہنا ہے تو یہ اس کی حماقت نہیں تو اور کیا کہلائے گی۔ میں نے اس دنیا میں سرائے کے مسافر کی طرح قیام کیا ہے۔ تمہیں بھی یہی کرنا ہے۔ جب تک زندہ رہو اپنے رب کو مت بھولو اور انسانوں کے کام آؤ کیونکہ انسان کے ذمے دو قسم کے حقوق واجب الادا ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ کا تعلق اللہ اور انسان کے درمیان ہے اور حقوق العباد کا تعلق انسان اور انسان کے درمیان ہے۔ اگر تم نے محض حقوق اللہ پر زور دیا اور حقوق العباد کو فراموش کر دیا تو واللہ تم بہت خسارے میں رہو گے اور ناقابلِ تلافی نقصان اٹھاؤ گے۔ اس لیے کامیاب انسان وہی ہے جو حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد میں بھی پورا اترتا ہے۔''

باپ کی پُراثر باتوں نے سماء الدین کو بہت متاثر کیا، دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں، پوچھا۔ ''باوا جان! پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''کسی مرشدِ کامل کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کی راہنمائی میں اپنی منزلِ مراد کو پہنچو۔''

سماء الدین کی ابھی عمر ہی کیا تھی، پھر بھی انہوں نے اپنے ماحول میں کسی مرشدِ کامل کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ان کی نظرِ انتخاب اس عہد کے مشہور صوفی شیخ المشائخ شیخ اسماعیل پر پڑی۔ شیخ اسماعیل صدر الدین راجو قتال کے ولی عہد تھے۔ صدر الدین راجو قتال ان کی ماں کے پیرو مرشد تھے۔

سماء الدین کسی کو وسیلہ بنائے بغیر شیخ اسماعیل کی خدمت میں پہنچ گئے اور نہایت ادب سے عرض کیا۔ ''حضرت! میں بڑی امیدیں لے کر حاضر ہوا ہوں، امید ہے کہ آپ اس پر ضرور غور فرمائیں گے اور مجھ کو مایوس نہیں کریں گے۔''

شیخ اسماعیل روشن ضمیر تھے، بولے۔ ''شاید تو یہ چاہتا ہے کہ میں شفقت اور مہربانی سے تیری پرورش کروں اور اپنی نصیحتوں سے تیری پریشانیاں دور کر دوں۔''

سماء الدین نے جواب دیا۔ ''بیشک میرا یہی مدعا ہے اگر آپ سے مجھے فیض پہنچے گا تو اس سے آپ کے کمالات میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

شیخ اسماعیل نے فرمایا۔ ''میرے بھائی شیخ فضل اللہ بڑے اہلِ کمال اور صاحبِ حال ہیں اگر تم رضامندی ظاہر کرو تو میں ان کے پاس پہنچا دوں گا اور ان سے خرقہ بھی دلوا دوں گا۔''

سماء الدین نے سکوت اختیار کیا اور شیخ اسماعیل کے پاس ہی رہنے لگے۔

چند دنوں بعد سماء الدین نے پھر وہی درخواست کی اور شیخ اسماعیل نے پھر وہی جواب دیا اور وہی پیشکش دہرائی۔

سماء الدین نے بڑی عاجزی اور محبت سے عرض کیا۔ ''آقا! پیری مریدی اور ارادت کا جہاں تک تعلق ہے، ان کا معاملہ دل اور محبت سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں، میں نے جب بھی اپنے دل کو ٹٹولا وہاں آپ کے سوا کوئی بھی نہیں ملا، اس لیے اگر آپ میری پرورش اور تربیت کی ذمے داری قبول فرمائیں گے تو خیر ورنہ میں اسی طرح زندگی بھر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔''

شیخ اسماعیل نے بے ساختہ اٹھ کر انہیں سینے سے لگا لیا اور اپنے حجرے میں لے گئے۔ وہاں کچھ دیر ذکر کی تلقین کرتے رہے اس کے بعد دوگانہ ادا کرایا اور خرقۂ خاص عطا فرمایا۔ سماء الدین نے محسوس کیا جیسے کوئی کہہ رہا ہے۔ ''یہ اللہ کا فضل ہے جس کو جتنا چاہے دے دے۔''

یہ اپنے پیر کی صحبت میں رہنے لگے اور ان کی پوری توجہ صفائی قلب اور باطنی علوم کی تحصیل پر رہنے لگی۔ اگر کسی لمحہ ظاہری علوم کی تحصیل کا خیال بھی آیا تو یہ سوچ کر جھٹک دیا کہ فی الحال اس کو ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔

ایک دن شیخ اسماعیل نے سماء الدین کو اپنے حجرے میں بلا کر پوچھا۔ ''سماء الدین! کیا بات ہے، تم بار بار اپنے دل سے علوم ظاہری کا خیال کیوں نکال دیتے ہو؟''

سماء الدین نے جواب دیا۔ ''حضرت! جس کو باطنی علوم حاصل ہو جائیں، اسے ظاہری علوم کی کیا ضرورت؟''

شیخ اسماعیل نے فرمایا۔ ''سماء الدین! یہ کیسا خیالِ خام دل میں سمایا ہے۔ شرع کی بنیاد اور دین کی اساس علوم ظاہری پر ہے۔ میری خواہش اور کوشش یہ ہے کہ تم لوگوں کو علوم ظاہری اور علوم باطنی سے یکساں فائدے پہنچاؤ مگر تم، معلوم نہیں کیوں اس سے گریز کر رہے ہو۔''

سماء الدین سخت شرمندہ ہوئے اور اس دن سے علوم ظاہری کی حصولیابی میں بھی کوشاں نظر آنے لگے۔

☆☆☆

سماء الدین کو رات کی تاریکی میں کھلے آسمان تلے کھڑا کر دیا گیا۔ ان کے والد نے ایک خاص ستارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سماء الدین! اس خاص ستارے اور اس کے محلِ وقوع کو پہچان لو۔ یہ جب بھی تمہیں اس جگہ نظر آئے تم یہ سمجھ لینا کہ اب تہجد کا وقت ہو چکا ہے۔''

سماء الدین نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے حجرے میں چلے گئے۔ چند دنوں بعد نہیں معلوم کس نے یہ اطلاع دی کہ سماء الدین تہجد والے ستارے کو دیکھے بغیر ہی نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب ان سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔

''میں تہجد کے ستارے کو اپنے حجرے میں سے ہی دیکھ لیتا ہوں۔ بس اس لیے تہجد کی نماز پڑھنے لگتا ہوں۔''

جب لوگوں نے اس کا تجربہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سماء الدین نے تہجد کا ستارہ حجرے ہی میں سے دیکھ لیا تھا اور وہ یہیں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید لوگوں کو پہلی بار ان کے کشف اور بزرگی کا علم ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ سماء الدین کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی اور انہیں بھی ان کے ارادت مندوں نے گھیرنا شروع کر دیا۔

دہلی اور اس کے مضافات کے لوگ ان کا غائبانہ ذکر سن سن کر بلانے لگے۔ آخر انہیں بیانہ جانا پڑا۔ بیانہ کے لوگوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے مرید ہونے لگے۔ بیانہ کے بعد آپ ناگور چلے گئے اور وہاں بھی آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے دلوں میں جگہ دی۔ ایک نیک اور پارسا عورت نے آپ سے درخواست کی کہ اسے کچھ خدمت کا موقع دیا جائے۔

آپ نے پوچھا۔ ''تو میری کیا خدمت کرنا چاہتی ہے؟''

عورت نے عرض کیا۔ ''حضرت! میرے پاس ایک گائے کے سوا کچھ بھی نہیں، چنانچہ میں نے یہ سوچا تھا کہ اس کا کچھ دودھ آپ کو پہنچا دیا کروں لیکن آپ کی اجازت اور منظوری سے۔ اس کے بغیر نہیں۔''

آپ نے اجازت دے دی۔ ''اچھا جب تک میں ناگور میں ہوں تجھ کو اجازت ہے کہ مجھے دودھ پہنچا دیا کرو۔''

اس کے بعد وہ عورت آپ کی بندۂ بے دام ہو گئی۔ آپ کچھ دن بعد گجرات تشریف لے جانے لگے۔ اس عورت کو

بڑا قلق ہوا اور روہانسی ہوگئی۔ پوچھا۔ ''حضرت! آپ پھر...... میرا مطلب ہے آپ دوبارہ کب تشریف لائیں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جب خدا حکم دے گا تو آجائیں گے۔''

چنانچہ آپ کچھ عرصہ ناگور میں رہے اور یہاں سے گجرات چلے گئے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد عورت کی گائے کوئی چرا کر لے گیا۔ یہ بہت پریشان ہوگئی اور اس پریشانی میں اس کی نیند اڑ گئی۔ عورت نے تین شب و روز اس کرب میں گزارے، اس کے بعد وہ سکون کی خاطر نوافل ادا کرنے لگی۔

ایک دن وہ نوافل ادا کرنے کے بعد آنکھیں بند کرکے پڑ رہی۔ کچھ دیر بعد نیند نے اسے مدہوش کردیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا گویا شیخ سماء الدین اس کے پاس کھڑے ہیں اور پوچھ رہے ہیں۔ ''عورت! کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''آپ مجھ سے میری پریشانی کا سبب پوچھ رہے ہیں حالانکہ آپ روشن ضمیر ہیں۔''

آپ نے اصرار کیا۔ ''اگر تو اپنی پریشانی خود اپنی زبان سے بیان کردے گی تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔''

عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں عرض کیا۔ ''حضرت! جس گائے کا دودھ اور دہی وغیرہ میں آپ کو پہنچایا کرتی تھی، آپ کی عدم موجودگی میں کوئی اس کو چرا کر لے گیا۔ بتائیے اب میں کیا کروں؟''

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''بس اتنی سی بات نے تجھ کو اداس کر رکھا ہے؟''

عورت نے کہا۔ ''حضرت! یہ اتنی سی بات نہیں ہے، یہ بہت بڑی بات ہے میرے لیے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مت اداس ہو، وہ گائے تجھے واپس کی جارہی ہے۔ اس کو سنبھال کے رکھ۔''

عورت کی فرطِ خوشی میں آنکھ کھل گئی۔ وہ بے چینی سے کھڑی ہوگئی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اتنے میں اس کے کانوں نے گائے کی آواز سنی۔ اس کو اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آیا لیکن گائے برابر بولتی رہی۔ عورت مکان کے اس حصے میں گئی جہاں گائے باندھی جاتی تھی۔ وہاں اس نے گائے کو بندھا ہوا دیکھا۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے گائے کی پشت اور پیٹ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنا شروع کردیا۔ وہ حیران تھی کہ آخر یہ گائے آئی کہاں سے۔ وہاں کوئی آس پاس ایسا شخص بھی نہیں تھا جو اس کی کسی بات کا جواب دے سکتا۔ آخر اس نے گائے سے سوال کیا ''تجھے کون لے گیا تھا؟''

گائے نے بڑی معصومیت سے عورت کی طرف دیکھا اور جگالی کرنے لگی۔

عورت نے دوسرا سوال کیا۔ ''اور اب تجھے لایا کون ہے؟''

گائے نے جگالی کرتے ہوئے گردن ہلا کر سر کی مکھی اڑائی اور بھیں بھیں کرنے لگی۔

عورت نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں تجھے یہاں کون لایا ہے؟ اس میں یقیناً حضرت شیخ سماء الدین کا ہاتھ ہوگا۔ ان کے سوا دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' اتنے میں کسی شخص نے دستک دی۔ عورت نے دروازے کی آڑ سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

باہر سے کسی نے جواب دیا۔ ''بی بی! ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک شخص کو گائے کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک باہر واپس نہیں آیا۔''

عورت حیران تھی کیونکہ اندر کوئی شخص بھی نہیں تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''بھائی یہاں تو کوئی بھی نہیں، حالانکہ میری گمشدہ گائے موجود ہے۔''

یہ معما کبھی حل نہیں ہوسکا کہ وہ مرد کون تھا۔

☆☆☆

شیخ سماء الدین کو جو لوگ ملے تھے ان میں حامد بن فضل اللہ جمالی کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ جمالی بذاتِ خود عالم تھے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزارا تھا مگر جب شیخ سماء الدین سے ملے تو انہی کے ہو رہے۔ آپ جمالی سے بے حد محبت کرتے تھے۔ آپ بیانہ میں قیام کے دوران حاضرین اور معتقدین کے سامنے وعظ فرمایا کرتے تھے اور جب نماز کا وقت آتا تھا تو خود یا کسی اور کو امامت کے لیے کھڑا کردیتے۔ عصر کی نماز کے بعد مغرب کا وقت آیا تو آپ نے حاضرین پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور بیانہ کے حاکم قاضی بدرالدین کو حکم دیا کہ مغرب کی نماز پڑھائیں۔

قاضی صاحب نے انکساری سے کام لیا، بولے۔ ''حضرت! آپ کی موجودگی میں، میں امامت کروں۔ واللہ یہ

کتنی عجیب سی بات ہے جو سنے گا کیا کہے گا؟''

آپ نے نرمی سے فرمایا۔ ''قاضی بدرالدین! آج تو آپ ہی امامت کریں گے۔''

جمالی نے عرض کیا۔ ''حضرت! قاضی صاحب بجا فرماتے ہیں۔ آپ کی موجودگی میں کوئی اور امامت کیوں کرے؟''

قاضی صاحب کو شہ ملی تو پھر بولے۔ ''حضرت! میں ایک عاجز اور گناہ گار بندہ آپ کی موجودگی میں کس طرح امامت کرسکتا ہوں۔''

آپ نے جمالی سے کہا۔ ''جمالی! کیا تو میری مخالفت کرسکتا ہے؟''

جمالی نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''کوئی سوال نہیں پیر و مرشد۔''

آپ نے فرمایا۔ ''پھر تو خاموش رہ۔'' اس کے بعد پھر قاضی کو حکم دیا۔ ''آپ نماز پڑھائیں۔''

قاضی صاحب مزید انکار نہیں کرسکے۔ امامت کے لیے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے بہ آواز بلند آیات قرآنی پڑھنا شروع کردیں۔ قاضی علم تجوید سے نابلد تھا اس لیے آپ کے عالم مرید جمالی کو قاضی کی قرأت پسند نہیں آئی۔ جمالی کو ایسا لگا گویا کوئی شہسوار گھوڑا بھگائے چلا جارہا ہے۔ آواز کی سختی اور لہجے کی درشتی، قرأت کی تیز رفتاری نے سب سے زیادہ جمالی کو بدمزہ کردیا تھا چنانچہ جیسے ہی نماز ختم ہوئی اور قاضی نے سلام پھیرا، جمالی نے کھڑے ہوکر قاضی کو ڈانٹ دیا، پوچھا۔ ''اے قاضی! کیا اس طرح نماز پڑھائی جاتی ہے؟''

قاضی نے کہا۔ ''کیوں، میری قرأت اور تلاوت میں تمہیں کیا خامی یا خرابی نظر آئی؟''

جمالی نے جواب دیا۔ ''اے مخدوم! عجیب صف شکن امام ہو کہ اپنے تیز رفتار قرأت کے گھوڑے کو اتنا تیز بھگا دیا کہ نمازیوں اور مقتدیوں کی صفیں درہم برہم ہوگئیں۔''

قاضی شرمندہ ہوگیا اور کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

جمالی کا یہ اندازِ تخاطب شیخ سماء الدین کو ذرا بھی پسند نہیں آیا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر اس وقت جمالی سے کچھ بھی نہ کہا۔ دوسرے دن صبح جمالی کو اپنے حجرے میں طلب کیا اور سوال کیا۔ ''جمالی! تو عالم ہے اس لیے یہ ضرور جانتا ہوگا کہ دل آزاری کتنا بڑا گناہ ہے۔''

جمالی نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں میں دل آزاری کے گناہ سے واقف ہوں۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''کل تو نے قاضی کا بڑا دل دکھایا۔ میں تو اسی وقت لرز گیا تھا۔''

جمالی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر مجھ سے یہ گناہ سرزد ہوگیا تھا تو آپ مجھ کو ڈانٹ سکتے تھے۔ اسی وقت ٹوک دیتے، میں ہرگز برا نہ مانتا۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''جمالی! میں صرف اس لیے خاموش رہا کہ تو خود جس گناہ کا مرتکب ہوا تھا میں اس کا ارتکاب کیوں کروں۔ اگر میں تجھ کو سب کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ دیتا تو، تو بہتوں کے سامنے ذلیل ہوجاتا۔ تو نے قاضی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔''

جمالی نے پوچھا۔ ''حضرت! پھر اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''یہ کہ آؤ ہم دونوں قاضی کے پاس چلیں اور اس سے معافی مانگیں۔ اگر وہ ہمیں معاف کردے گا تو خدا بھی ہمیں معاف کردے گا لیکن اگر اس نے معاف نہ کیا تو تمہیں روزِ قیامت بڑی شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔''

جمالی کو رونا آگیا۔ شیخ سماء الدین کی باتوں نے جمالی کو رلا دیا تھا۔ وہ دونوں اٹھے اور قاضی کے گھر پہنچ گئے جب قاضی کو یہ معلوم ہوا کہ شیخ سماء الدین اپنے مرید جمالی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں تو وہ نہایت مؤدبانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پوچھا۔ ''حضرت! آپ نے زحمت کیوں کی؟ مجھ کو بلوا لیا ہوتا، میں خود آجاتا۔''

شیخ نے جمالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''قاضی صاحب! کل اس نے آپ کی شان میں جو گستاخی کی تھی اور جس طرح شرمندہ کیا تھا، آپ کو اس کا پورا پورا حق پہنچتا ہے کہ اس کو بھرے مجمع میں اسی طرح شرمندہ کریں۔''

قاضی نے کہا۔ ''حضرت! میں غلطی پر تھا، میں قاضی ہوں اور بیانہ کی حکومت پر بھی فائز ہوں، مجھ کو علم تجوید سے واقف ہونا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ میں نہیں جانتا۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''وہ کچھ بھی سہی مگر جمالی کو اس لب و لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں اس کے ساتھ اس لیے آیا ہوں کہ تم سے معافی دلواؤں، خدا کے لیے تم اس کو معاف کردو ورنہ اس کی آخرت برباد ہوجائے گی اور یہ کہیں کا بھی نہیں رہ جائے گا۔''

قاضی نے عاجزی سے کہا۔ ''حضرت! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ جمالی عالم ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ انہیں معاف کروں اور پھر یہ کہ بھائی جمالی سے کوئی غلطی بھی تو ہوئی ہو۔''

شیخ نے اصرار کیا۔ ''قاضی! اگر معاف نہیں کرو گے تو میں جمالی کے ساتھ یہیں تمہارے در پر رہ پڑوں گا اور اس وقت تک پڑا رہوں گا جب تک کہ تم معاف نہیں کردو گے۔''

قاضی نے تنگ آکر کہا۔ ''اچھا جناب میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔'' اس کے بعد پوچھا۔ ''اب تو آپ خوش ہوئے اور ہمیں معاف کیا۔''

شیخ نے کہا۔ ''ہاں اب میں خوش ہوں، بے حد خوش۔''

آپ جمالی کے ساتھ گھر چلے گئے اور راستے بھر یہی سمجھاتے رہے کہ خبردار آئندہ کسی کی دل آزاری نہ کرنا۔ اگر کرو گے تو بھگتو گے۔

جمالی نے بھی وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں سرزد ہوگی۔

☆☆☆

آپ نے بیانہ بھی چھوڑ دیا اور دہلی چلے گئے۔ یہ جگہ آپ کو بہت اچھی لگی اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہیں آپ نے شادی بھی کرلی۔ جمالی یہاں بھی موجود رہے۔ انہیں اپنے پیر کی لحہ بھر کی جدائی بھی گراں گزرتی تھی۔ ان دنوں گجرات میں شیخ وجیہہ الدین گجراتی کا بڑا چرچا تھا۔ ان کی بابت یہ مشہور تھا کہ صاحب کشف بزرگ ہیں۔ شیخ سماء الدین نے سوچا۔ 'چلو ان سے ملاقات کرلو چل کر۔'

شیخ سماء الدین نے ایک عام اور غیر معروف آدمی کی حیثیت سے گجرات کا سفر کیا اور پوچھتے پوچھتے شیخ وجیہہ الدین کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت شیخ مذکور اپنے ارادت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ انہوں نے جیسے ہی شیخ سماء الدین کو دیکھا ادب سے کھڑے ہوگئے اور بے اختیار ان کی طرف بڑھے اور ان سے بغل گیر ہوگئے۔ شیخ سماء الدین نے اس ایک سو تیس سالہ بزرگ کو سینے سے جو لگایا تو ایک عجیب سی فرحت محسوس ہوئی اور سینہ طمانیت سے لبریز ہوگیا۔

شیخ سماء الدین نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ نے مجھ کو پہچانا؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''اے دین کے آسمان تجھ کو کون نہیں پہچانے گا۔ میں تجھ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب تو اس خاکدان میں آیا بھی نہیں تھا۔''

وجیہہ الدین نے سبحان اللہ کا نعرہ لگایا اور شیخ سماء الدین کے ساتھ بیٹھ گئے۔ آخر میں جب یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو بے حد خوش اور مسرور نظر آتے تھے۔ پھر تو ان دونوں کی ملاقاتیں ہر روز ہی ہونے لگیں۔

ایک دن شیخ سماء الدین نے شیخ وجیہہ سے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کی بابت کچھ باتیں مشہور ہیں، میں انہیں آپ کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔''

شیخ وجیہہ الدین نے پوچھا۔ ''کون سی باتیں؟'' وہ مسکرا رہے تھے۔

شیخ سماء الدین نے جواب دیا۔ ''یہ کہ آپ نے اس کوچے میں کس طرح قدم رکھا تھا؟ اور وہ کون سے غیر معمولی واقعات تھے جن کے زیر اثر آپ نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی؟''

شیخ وجیہہ الدین نے نظریں جھکالیں۔ فرمایا۔ ''اب میں اپنے فسق و فجور کے ماضی کو کیا دہراؤں۔''

شیخ سماء الدین نے کہا۔ ''حضرت! اس میں بڑی عبرتیں ہیں۔ اگر سنا دیں گے تو میں ان سے عبرت پکڑوں گا اور ان غلطیوں سے بچ جاؤں گا جن سے آپ بچ کر نکل آئے۔''

شیخ وجیہہ الدین ذرا سی دیر کے لیے چپ ہوگئے۔ پھر فرمانے لگے۔ ''سماء الدین! یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں ملک اختیار الدین کا بیٹا ہوں اور ملک موصوف فیروز شاہ تغلق کے رشتے دار تھے۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تو میں

اٹھارہ سال کا ان کا واحد فرزند تھا۔ میرے باپ کی ساری جائداد میرے قبضے میں آئی۔ ان دنوں میرے حسن کا بڑا چرچا تھا اور میں جدھر سے بھی گزرتا، لوگ مجود دیدہ ہوجاتے۔ عورتیں اور لڑکیاں میری راہ روک کر کھڑی ہوجاتیں اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگتیں۔ ان دنوں میں شراب بھی بہت پیا کرتا تھا عورتیں، شراب اور جوا، یہی میرے مشغلے تھے۔

ان دنوں صوفی بابو اسحاق کا بھی بڑا چرچا تھا۔ ایک دن میں اپنے گھوڑے پر سوار بابو اسحاق کی خانقاہ کے پاس سے گزرا اس وقت بابو اسحاق خانقاہ کے در پر اپنے مریدوں میں گھرے کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے جو دیکھا تو بولے تو کچھ بھی نہیں، بس ایک ننھا منا سا ڈھیلا اٹھا کر میرے رسید کردیا۔ اس ڈھیلے کی چوٹ نے مجھ کو بے ہوش کردیا اور میں اپنے گھوڑے سے گر گیا۔ بابو اسحاق میرے پاس آئے اور میرے کان میں کہا۔ ''وجیہہ! یہ فسق و فجور کب تک؟ آخر تو اس طرح کب تک بھٹکتا بھٹکتا رہے گا میں تیرا انتظار کررہا ہوں۔''

میں نے یہ آواز خواب و خیال کی طرح سنی اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے چنانچہ جب میں ہوش میں آیا تو اپنے آپ پر بابو اسحاق کو جھکا ہوا دیکھا وہ مجھے نصیحتیں کررہے تھے اور یہ نصیحتیں میرے دل و دماغ میں خون کی طرح گردش کررہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا۔ ''بابا! میں تائب ہوا۔ میں نے توبہ کی اور آئندہ آپ یا کوئی بھی مجھ کو فسق و فجور میں مبتلا نہیں دیکھے گا۔''

اس کے بعد انہوں نے مجھے سہارا دیا اور اپنے حجرے میں لے گئے اور اپنے کسی مرید سے پانی طلب کیا۔ تھوڑا سا پانی خود پی لیا اور بقیہ مجھے پلادیا۔ بس یہ جھوٹا پانی مجھ میں انقلاب کا سبب بن گیا۔ مجھ کو دنیا اور مال و دولت سے نفرت سی پیدا ہوگئی۔ میں کئی دن تک ان کی خانقاہ میں پڑا رہا آخر ایک دن میں نے ان سے اپنے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔

بابو اسحاق نے پوچھا۔ ''گھر جاکر کیا کرو گے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''بابا میں ان تمام چیزوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں، جنہوں نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا تھا۔''

میں اپنے گھر گیا اور اپنا سارا مال و اسباب لاکر بابو اسحاق کے قدموں میں ڈھیر کردیا۔ کہا۔ ''بابا! آپ اس کو اپنے ہاتھوں سے مستحقین میں تقسیم فرمادیں۔''

بابا نے اسے تقسیم کرکے مجھے مبارک باد دی کہ اب میں اس لائق ہوں کہ مجھ پر اعتبار کیا جائے۔

شیخ سماء الدین نے اپنے بزرگ صوفی کی پُراثر آپ بیتی سنی تو بے حد خوش ہوئے اور انہیں ان کی کامیابی پر مبارک باد پیش کی۔ شیخ وجیہہ نے کہا۔ ''بابا سماء الدین! مجھ سے زیادہ خوش قسمت تو تم ہو کہ کسی تلقین اور تبلیغ کے بغیر ہی اپنی منزلِ مراد پالی، ایسا بہت کم ہوتا ہے۔''

شیخ سماء الدین نے فرمایا۔ ''یہ اللہ کا فضل ہے جس کو جتنا چاہے دے دے۔''

شیخ سماء الدین واپس دہلی پہنچے تو وہاں ایک ہجوم کو اپنا منتظر پایا۔ یہ پٹھان فرماں روا بہلول لودھی کا زمانہ تھا۔ آپ کی خانقاہ میں ہر قسم کے لوگ جمع ہوگئے۔ ان میں سلطان بہلول کے فرمان نویس شہاب خان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''تو یہاں کیوں آیا ہے؟''

شہاب خان نے جواب دیا۔ ''حضور سے ملاقات کرنے، حضور کی زیارت کی خاطر۔''

آپ نے بیزاری سے فرمایا۔ ''او بدبخت تو یہاں جاسوسی اور مخبری کی خاطر آیا تھا۔ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرو ورنہ خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے گا۔''

شہاب خان نے جواب دیا۔ ''حضرت! جو چاہیں فرمادیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں مخبری کے لائق نہیں ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بہرحال شہاب خان! اگر تو ایسا کرے گا تو بہت برا کرے گا۔''

شہاب خان آپ کے پاس کچھ دیر رہا۔ اس کے بعد اٹھ آیا۔ اس نے مخبری اور جاسوسی کے لیے ایک ایسے نوجوان کا انتخاب کرلیا کہ ادھر کسی کی نظر کسی قسم کی چغلی کھائے گی اور شہاب خان کا بیٹا اس کو لے کر اپنے باپ کے پاس چلا جایا کرے گا۔

آپ نے اس سے پوچھا۔ ''نوجوان! تیرا نام کیا ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''بندے کو محمد کہتے ہیں۔''
آپ نے منہ بنا کر کہا۔ ''تجھے یہ متبرک نام نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اس کے آگے پیچھے بھی کچھ ہونا چاہیے تھا۔''
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! اس کو اس کے باپ شہاب خان نے بھیجا ہے۔ فقرا کی محفل میں جاسوسوں اور مخبروں کا کیا کام؟''

آپ نے فرمایا۔ ''نہیں، ایسا نہ کہو۔ اس کو محفل میں رہنے دو یہ ہمارا کیا لے گا۔''

جمالی نے غصے میں کہا۔ ''حضرت! یہ کوئی اچھا نوجوان نہیں ہے، میں اس کو یہاں نہیں دیکھ سکتا۔ ابھی نکال باہر کرتا ہوں۔''

آپ نے جمالی کو روکا، فرمایا۔ ''جمالی! صبر صبر، جلد بازی اور جوش سے مت کام لے۔''

جمالی نے سوچا، ذرا دیر بعد جب شہاب خان کا بیٹا یہاں سے جانے لگے گا تو یہ باہر نکل کر اس سے وہ سب چھین لیں گے جس میں جاسوسی اور مخبری کی باتیں لکھی ہوں گی۔

آپ نے جمالی کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''جمالی! اب تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ ایک کام سے میں نے تمہیں روک دیا تو اب اسے دوسری طرح سے کرنے کا ارادہ کیوں؟''

جمالی نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں نے توبہ کی اور باز آیا مگر آپ اس کو بھی تو کچھ کہیے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ہر جگہ اپنے محبوب کا طالب موجود ملے گا وہ ہوشیار ہو یا مست، اسی طرح ہر جگہ، مقامِ عشق ہے، وہ مسجد ہو یا کلیسا۔''

شہاب خان کے بیٹے محمد کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ وارفتہ وازخود رفتہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قدموں میں گر گیا، رو رو کر بولا۔ ''حضرت! مجھے معاف کر دیجیے میں بہت شرمندہ ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو اپنا کام کر، میں نے تو تجھے نہیں روکا۔''

محمد نے جواب دیا۔ ''اب اور کیا کیجیے گا، میرے اندر ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ کیجیے، ورنہ میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا رہوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اچھا اب چپ چاپ بیٹھ جا اور توبہ واستغفار کر، خدا بہتر کرے گا۔''

اس نے توبہ کی تو اسے سکون ملا، وہ یہاں سے اٹھ کر باپ کے پاس گیا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ شیخ سماء الدین کا مرید ہو چکا ہے۔ اس لیے ان خدمات کی بجا آوری کی اس سے امید نہ کی جائے جواب تک انجام دیتا رہا ہے۔ اب وہ تائب ہو چکا ہے۔

شہاب خان کو بڑی مایوسی ہوئی لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس نے سلطان بہلول لودھی کو بھی سماء الدین کے حلقہ بگوشوں میں دیکھا۔ آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے اور انہیں نصیحتیں فرما رہے تھے۔ اسی دوران ایک مرید باہر سے اندر داخل ہوا اور عرض کیا۔ ''سلطان بہلول لودھی اذنِ باریابی چاہتا ہے، کیا حکم ہے؟''

آپ اٹھ کر اپنے حجرے میں جاتے ہوئے بولے۔ ''اس کو میرے پاس بھیج دو۔''

کچھ دیر بعد مریدوں اور ارادت مندوں نے دیکھا۔ سلطان نہایت عاجزی وانکساری سے اندر داخل ہوا اور آپ کے حجرے میں چلا گیا۔ سلطان نے خود کو شیخ سماء الدین کے قدموں میں گرا دیا۔ لیکن آپ نے اس کو اٹھا کر اپنے سامنے بٹھالیا۔ پوچھا۔ ''کیا بات ہے سلطان۔ تو پریشان تو نہیں؟''

سلطان نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں نادم ہوں کہ اتنی قربت ہونے کے باوجود میں حضور کی خدمت میں حاضری دینے سے قاصر رہا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس کی کوئی ضرورت تو نہ تھی۔ پھر بھی اگر اس میں تیری کوئی منشا ہو اور تجھ کو کسی قسم کا فائدہ پہنچ

سکتا ہو تو میں حاضر ہوں۔''

سلطان نے کہا۔ ''حضرت! میں آپ کی شفقت اور محبت کا امیدوار ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''عدل سے حکومت کر اور اللہ کے خوف سے دل کو آباد رکھ، پھر دیکھ اللہ تیرے لیے کیا کچھ کرتا ہے۔''

سلطان نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں نے یہ سن رکھا ہے کہ یہ دنیاوی حکمراں بادشاہ نہیں ہوتے اصل بادشاہ تو درویش ہوتے ہیں اور دنیا کے بادشاہ درویشوں کی صورت کے ریزہ چیں ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''سلطان! بادشاہ کو چاہیے کہ اگر وہ اندر سے درویش نہیں ہے تو ظاہر میں درویش کی وضع قطع اختیار کرے کیونکہ یہ وضع قطع اس کو برائیوں سے بچائے گی۔'' اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ ''سلطان تین قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔ اول وہ بوڑھا، جو بوڑھا ہونے کے باوجود گناہ آلود زندگی گزارے۔

''دوسرا وہ جوان جو توبہ پر یقین رکھتا ہو اور اس امید پر گناہ میں گرفتار ہو کہ جب چاہے گا توبہ کرلے گا اور نیک بن جائے گا۔

''تیسرا وہ بادشاہ جو اپنی ہر مراد کی حصولیابی پر قادر ہو مگر پھر بھی اپنی سلطنت کے چراغ کو جھوٹ کی آندھی سے گل کردے۔''

سلطان نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''اب حضور والا اس کی وضاحت بھی فرمادیں تو بڑا کرم ہوگا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں گناہ گار بوڑھے کو حکم دوں گا اور سرزنش کروں گا کہ اے سفید بالوں والے سیاہ باطن! اس انحطاط پذیر اور روبہ زوال دور میں تو کس امید پر گناہ کر رہا ہے۔ کیا تو یہ امید کرسکتا ہے کہ تیرے بڑھاپے کی دیوار کسی طرح مضبوط ہو سکے گی؟ جب یہ امید نہیں ہے تو پھر تو غفلت میں پھنس کر گناہوں کی قوت سے اس کی قوت کو کیوں کھوئے دے رہا ہے۔

''میں جوان کو اس طرح سرزنش کروں گا کہ اے غافل اور ناتجربہ کار نوجوان! موت اور زندگی کا اختیار خدا کو حاصل ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں اور موت کا کوئی وقت نہیں پھر تو اس امید میں کہ جوانی میں گناہ کر کے بڑھاپے میں توبہ کرلی جائے گی؟ بلاوجہ کیوں صحرائے معصیت میں گھوم رہا ہے۔ تو اپنے انجام پر نظر رکھ اور اس فریب میں مت مبتلا رہ کہ تو واقعی کبھی بوڑھا بھی ہوگا۔

''غافل بادشاہ کو اس طرح متنبہ کیا جائے کہ اے غافل بادشاہ! جھوٹ کا تعلق اور اس کا فائدہ محض اس دنیا تک ہے۔ کام وہ کر جو آخرت میں بھی ساتھ دے، اپنے اعمال کی کھیتی میں دروغ کا بیج ڈالنے والا احمق ترین انسان ہے۔''

اس کے بعد آپ نے اچانک سلطان بہلول لودھی کو مخاطب کیا۔ ''اے سلطان! تجھ کو بڑھاپے میں سلطنت ملی ہے اس لیے تو اپنے دل کو اللہ کے خوف سے آگاہ رکھ۔ اور ممکنہ حد تک خدا کا شکر ادا کرتا رہ کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے کہ اگر تم نے شکر ادا کیا تو میں تمہیں زیادہ عطا کروں گا۔ برخلاف اس کے اگر تو نے غفلت اختیار کی اور گناہوں میں مشغول ہو گیا تو اس کے لیے بھی خدا کا ڈراوا موجود ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ اگر تم نے کفر کیا تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔''

سلطان کے دل پر آپ کی نصیحتوں کا اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ رونے لگا۔ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ اس نے نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ ''اے حضرت مخدوم! گناہوں سے انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی درویشوں کی محبت میرے دل میں آہستہ آہستہ ترقی کر رہی ہے شاید یہی بات میری بخشش اور نجات کا سبب بن جائے۔''

شیخ کے مریدوں کو باہر بڑی بے چینی ہو رہی تھی کہ اندر پیرومرشد اور سلطان بہلول میں معلوم نہیں کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مریدوں نے ایک ساتھ آپ کے حجرے میں داخلے کا منصوبہ بنایا اور اجازت کے بعد اندر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سلطان کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ اس طرح رو رہا تھا کہ اس کے دونوں ہونٹ بری طرح تھرتھرا رہے تھے اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

آپ نے سلطان کو حکم دیا۔ ''اے نیک دل سلطان! جا اور اسی طرح خشیتِ الٰہی سے حکومت کرتا رہ۔''

کچھ دیر بعد سلطان چلا گیا۔

جونپور کا فرماں روا سلطان حسین شرقی دہلی پر نظریں لگائے پورے ہندوستان کی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں سازش کا بھی سہارا لیا اور سلطان بہلول لودھی کے امرا میں سے بعض کو توڑ لیا اور یہ حرص وطمع میں سازشیں کرنے لگے۔ لودھی دربار کا امیر سلطان احمد جلوانی سازشی اور غدار امرا کا روحِ رواں تھا۔

ایک دن سلطان احمد جلوانی شیخ سماء الدین کی خدمت میں مؤدب کھڑا ہوگیا اور عاجزی سے عرض کیا۔ ‘‘حضرت! آپ سبھی کے کام آتے ہیں، میری بھی مدد فرمائیں۔’’

آپ نے فرمایا۔ ‘‘سلطان احمد! تو، تو خود لودھی دربار کا اتنا بڑا امیر ہے کہ دوسروں کے کام آسکتا ہے میں تیری کیا مدد کروں۔’’

سلطان احمد جلوانی نے آپ کے مریدوں کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔ ‘‘حضرت! میں کچھ تخلیہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔’’

آپ نے فرمایا۔ ‘‘اگر قلب میں کسی قسم کی کھوٹ نہیں ہے تو اس کا اظہار سب کے سامنے بھی ہوسکتا ہے لیکن شاید ایسا نہیں ہے۔’’ اس کے بعد آپ نے مریدوں کو اشارے سے حکم دیا کہ باہر چلے جائیں۔

جب بالکل تخلیہ ہوگیا تو سلطان احمد جلوانی نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں عرض کیا۔ ‘‘حضرت! بات دراصل یہ ہے کہ جونپور کا فرماں روا سلطان حسین شرقی خاصا طاقت ور اور دبدبے کا فرماں روا ہے۔ اس وقت اس کی طاقت کا کوئی دوسرا حکمراں نہیں۔ ان خصوصیات کے علاوہ وہ بلا کا مردم شناس بھی ہے۔ اس نے اپنے اردگرد نہایت لائق آدمی جمع کر رکھے ہیں۔ اب اس کا ارادہ ہے کہ پورے ہندوستان پر حکومت کرے۔ اس نے لودھی دربار کے امرا کو یقین دلایا ہے کہ انہیں شایانِ شان مناصب دیے جائیں گے چنانچہ لودھی دربار کے بیشتر امرا نے یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ سلطان حسین شرقی کی مدد کریں، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر وہ پورے ہندوستان کا بادشاہ ہوگیا تو اسلام کی بڑی خدمت کرے گا اور دین کے لیے جاگیریں وقف کردے گا۔’’

آپ نے پوچھا۔ ‘‘مگر تو یہ تو بتا کہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟’’

جلوانی امیر نے جواب دیا۔ ‘‘آپ بس سلطان حسین شرقی کے حق میں فتح ونصرت کی دعائیں۔’’

آپ نے دوسرا سوال کیا۔ ‘‘اچھا جلوانی امیر میرے ایک سوال کا اور جواب دے دے پھر میں فیصلہ کردوں گا کہ تیری مدد کروں یا نہ کروں۔’’

جلوانی امیر نے پوچھا۔ ‘‘کیجیے سوال۔ میں، اللہ نے چاہا تو ضرور جواب دوں گا۔’’

آپ نے فرمایا۔ ‘‘بہلول لودھی نے اب تک اسلام کے خلاف کتنے کام کیے ہیں؟’’

جلوانی امیر نے جواب دیا۔ ‘‘شاید ایک بھی نہیں۔’’

آپ نے فرمایا۔ ‘‘اس نے کبھی کسی کو نقصان پہنچایا؟’’

جلوانی نے جواب دیا۔ ‘‘شاید نہیں، لیکن وہ ترقیاں جلدی جلدی نہیں دیتا۔ ہم لوگ کب تک اس کا انتظار کریں گے۔’’

آپ نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے جلوانی امیر کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔ فرمایا۔ ‘‘سلطان احمد جلوانی! تو نے اور تیرے باپ نے لودھی دربار کا نمک کھایا ہے اس لیے اپنے آقا کے خلاف اس طرح سوچنا اور اس کے دشمن کا ساتھ دینا نمک حرامی اور غداری ہے۔ جو کہ کسی شریف شخص کو زیب نہیں دیتی۔ جاؤ اور سلطان بہلول لودھی کا ساتھ دو کیونکہ لوحِ محفوظ میں سلطان حسین شرقی کی شکست اور بہلول لودھی کی فتح تحریر ہے پھر ایسے شخص کا ساتھ کیوں دیا جائے، جس کا خدا خود ساتھ نہیں دے رہا۔’’

چنانچہ آپ بہت دیر تک جلوانی امیر کو سمجھاتے رہے اور پیش آمدہ واقعات کی خیال اور قیاسی نظر کشی کرتے رہے، آخر میں فرمایا۔ ‘‘جلوانی! تو یہ بات یاد رکھ کہ دور کے ڈھول سہانے، سلطان حسین شرقی تجھ سے کیے ہوئے وعدے میں سے ایک پر بھی پورا نہیں اترے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ تجھے اور تیرے ساتھی امیروں کو غداری کے جرم میں قتل کرا دے کیونکہ جو لوگ اپنوں کا ساتھ نہیں دیتے، ان پر دنیا کے فاتح بھی اعتبار نہیں کرتے۔ اس لیے میرا مخلص مشورہ یہ ہے کہ تم

سب سلطان بہلول لودھی کا ساتھ دو اور جو کچھ بھی لینا ہے اس سے لو۔’’

سلطان جلوانی خاموش ہوگیا۔ آپ نے اس کو ایک بار پھر سمجھایا اور اس کے دل ودماغ میں یہ بات بٹھادی کہ اس جنگ میں سلطان بہلول لودھی حق پر ہے اور خدا اس کے ساتھ ہے۔

چنانچہ جلوانی مان گیا اور دوسرے سازشی اور باغی امرا نے بھی جلوانی امیر کا ساتھ دیا اور آپ نے ان سب کے حق میں بڑی دعائیں کیں۔ جب تک سلطان بہلول لودھی زندہ رہا، اس کو اس سازش کا حال نہیں معلوم ہوسکا۔

☆☆☆

ایک دن آپ تخت پر بیٹھے کھچڑی کھا رہے تھے۔ اس وقت ان کے مرید خاص جمالی بھی وہاں پہنچ گئے۔ آپ نے انہیں مسکرا کر دیکھا اور مزاج پرسی کی، پھر پوچھا۔ ‘‘جمالی! میرے ساتھ کھانا پسند کرو گے؟’’

جمالی نے عرض کیا۔ ‘‘اس سے زیادہ میری خوش قسمتی کیا ہوگی کہ میں آپ کا الش کھاؤں نہ کہ یہ آپ کے ساتھ تناول کروں۔ زہے قسمت، زہے نصیب۔’’

آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ‘‘میں جو کچھ کھا رہا ہوں، اگر تم بھی اسے کھاؤ گے تو اس کے لیے ریاضت درکار ہے۔’’

جمالی نے جواب دیا۔ ‘‘میں ہر قسم کی ریاضت کے لیے تیار ہوں۔’’

آپ نے ایک بار پھر مسکرا کر فرمایا۔ ‘‘جمالی! سوچ لو میں تو پابندی کی بات کر رہا ہوں۔’’

جمالی نے پھر وعدہ کیا۔ ‘‘میں وعدہ جو کر رہا ہوں ریاضت کا۔’’

آپ نے کھانے میں جمالی کو شریک کرلیا۔ جمالی نے جیسے ہی پہلا لقمہ منہ میں رکھا، منہ بنانے لگے۔ پتلی مریضوں والی کھچڑی، کچی بھی تھی اور بودار بھی۔ کھچڑی میں جو روغن استعمال ہوا تھا، وہ تلخ تھا جمالی نے منہ بنا کر باورچی کو آواز دی۔ ‘‘سازدار (خانساماں) کدھر چلا گیا، ذرا ادھر تو آتا۔’’

سازدار بھاگا بھاگا آیا اور ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ بولا۔ ‘‘ارشاد۔’’

جمالی نے اس کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ ‘‘او بدبخت یہ کھانا تو نے پکایا ہے؟’’

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ‘‘ہاں، کیوں، کوئی خاص بات؟’’

جمالی نے کہا۔ ‘‘ذرا چکھ کر تو دیکھ۔’’

اس نے جواب دیا۔ ‘‘مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ پیر ومرشد کی اجازت کے بغیر ان کے آگے سے لقمہ لوں۔’’

جمالی نے غصے میں کہا۔ ‘‘میں جو کہہ رہا ہوں، ذرا چکھ کے تو دیکھ۔’’

شیخ سماء الدین نے مسکرا کر پوچھا۔ ‘‘جمالی! کیا بات ہے؟ تو اتنا ناراض کیوں ہے؟’’

جمالی نے کہا۔ ‘‘حضرت! جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، آپ جانتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اس کو ڈانٹا کیوں نہیں۔ سرزنش کیوں نہیں کی۔’’

آپ نے پوچھا۔ ‘‘لیکن میں اس کو کیوں ڈانٹوں؟’’

جمالی نے کہا۔ ‘‘حضرت! اس ذلیل انسان نے کھچڑی جو پکائی ہے۔ اس کے چاول کچے ہیں اور جو روغن استعمال کیا ہے وہ تلخ ہے۔’’

آپ نے فرمایا۔ ‘‘کیا میں نے تجھ سے یہ پہلے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ اس.... کھانے کے لیے تجھ کو ریاضت کرنا پڑے گی۔ تو نے اس کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پھر یہ وعدہ خلافی کیوں؟’’

جمالی نے عاجزی سے عرض کیا۔ ‘‘حضرت! میں نے کون سی وعدہ خلافی کی۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔’’

آپ نے فرمایا۔ ‘‘صبر وتحمل اور غصے سے مجتنب رہنا بھی عبادت ہے۔ میں نے اسی ریاضت کی تجھ سے بات کی تھی۔ اسی کا وعدہ لیا تھا۔’’

جمالی نے شرم وندامت سے سر جھکا لیا اور خانساماں سے کہا۔ ‘‘بھائی واقعی میں نے وعدہ خلافی کی ہے اور میں بہت نادم ہوں۔ مجھ کو معاف کردو۔’’

خانساماں بہت شرمندہ تھا مگر جمالی کے عجز واصرار نے اسے مجبور کردیا اور اس نے معاف کردیا۔

☆☆☆

اسی دوران جمالی کی طبیعت خراب رہنے لگی، بھوک جاتی رہی اور صحت گرنے لگی، جمالی کو کسی طبیب کی ضرورت تھی۔

ایک دن شیخ کے مرید نے جمالی کو بتایا کہ بنگال سے ایک طبیب آیا ہوا ہے اور وہ کہتا ہے کہ تمہارے مرض کا علاج کروں گا۔ جمالی نے اشتیاق ظاہر کیا کہ اس طبیب سے ملاقات کرائی جائے۔

چنانچہ اس طبیب کو جمالی سے ملوا دیا گیا۔ طبیب نے ان کا حال پوچھا اور پارے کا ذرا سا کشتہ کھانے کے لیے دیا۔ طبیب نے جمالی کو یقین دلایا۔ ''جناب پارے کا یہ ذرا سا کشتہ آپ کو تندرست و توانا کر دے گا۔''

جمالی نے کہا۔ ''کیا اور کشتہ بھی مل جائے گا؟''

طبیب نے جواب دیا۔ ''اس کا اثر تو دیکھ لو اور بھی مل جائے گا مگر یوں نہیں، اگر ضرورت محسوس کی تو۔''

جمالی نے ایک ہفتے کے اندر یہ فرق محسوس کیا کہ پورے جسم میں توانائی کی لہر سی دوڑ گئی۔ بھوک کھل کر لگنے لگی اور صحت سنبھلنے لگی۔ جمالی نے طبیب سے دوبارہ ملاقات کی اور رازداری سے کہا۔ ''طبیب صاحب! میں سمجھتا ہوں اگر آپ مجھ کو ایک خوراک اور مرحمت فرما دیں تو میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

طبیب نے کہا۔ ''جناب! میں سمجھتا ہوں، بس ایک ہی خوراک کافی ہے زیادہ نقصان کر جائے گا۔''

جمالی نے کہا۔ ''اچھا تب پھر مجھ کو پھونکنے کا نسخہ ہی بتا دیجیے کیونکہ آپ اگر بنگال چلے گئے تو میں یہ نسخہ خود ہی تیار کرلوں گا۔''

طبیب نے جواب دیا۔ ''میں دو چار دن میں پارے کو پھونکنے کا عملی مظاہرہ کروں گا بس اس سے سیکھ لینا۔''

جمالی کا شوق فزوں تر ہونے لگا۔ ''اس میں دو چار دن کی کیا بات ہے، ابھی آج ہی کیوں نہیں۔''

طبیب نے کہا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں۔ میں نسخہ لکھوا بھی دوں گا اور عملی ترکیب بھی بتا دوں گا۔''

اس بات کو کئی دن گزر گئے اور چار پانچ دن کے بعد یہ طے پایا کہ جب طبیب اپنے وطن جانے لگے تو جمالی کا کام کر دے گا لیکن اس آخری دن سے پہلے ہی شیخ نے جمالی کو طلب کر لیا۔ پوچھا۔ ''جمالی! تیری طبیعت کا کیا حال ہے؟''

جمالی نے جواب دیا۔ ''بحمد للہ بالکل صحیح ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''پھر مزید کشتے کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے؟''

جمالی کو حیرت ہوئی کہ یہ بات پیرومرشد کو کس طرح معلوم ہوئی کیونکہ طبیب نے یہ بات ہر ایک سے چھپائی تھی۔ یہاں تک کہ جس مرید نے طبیب کو جمالی سے ملوایا تھا، اس کو بھی کشتے کی بات نہیں معلوم تھی کیونکہ طبیب اس کا چرچا نہیں چاہتا تھا۔

جب جمالی نے کوئی جواب نہیں دیا تو شیخ نے انہیں سمجھانا شروع کر دیا۔ ''جمالی! تو نہیں جانتا۔ اس طبیب کا کشتہ کچا رہ جاتا ہے اس لیے اگر تو نے اس کا پھونکا ہوا کشتہ کھایا تو تیرے جسم کو سخت نقصان پہنچ جائے گا اور اگر تو نے اس سے نسخہ حاصل کر کے خود پھونکا تو وہ اور زیادہ کچا رہ جائے گا اور تو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھا جائے گا اس لیے میرا کہنا مان اور کشتوں کے چکر میں نہ پڑ۔''

جمالی نے دبی زبان میں عرض کیا۔ ''حضرت! میری صحت خراب جو رہتی ہے، اس کا میں کیا کروں؟''

آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''خدایا! میں جمالی کو بہت عزیز رکھتا ہوں یہ بیمار رہتا ہے، اس کو صحت یاب کر دے، یہ پریشان رہتا ہے اس کو سکون بخش دے، خدایا! جمالی تیرا نیک بندہ ہے اور عالم بھی ہے۔ اس کے علم سے انسانوں کو فائدے پہنچتے ہیں اور آئندہ بھی پہنچتے رہیں گے۔ اس پر اپنی نظرِ کرم رکھ اور صحت و توانائی عطا فرما۔''

جمالی کو سخت حیرت تھی کہ آپ کی دعائیں طمانیت، سکون اور صحت و تازگی بن کر ان کے جسم و روح میں حلول کر رہی تھیں۔ جمالی نے چند دنوں کے اندر ہی خود کو بالکل صحت یاب اور توانا پایا۔

بنگالی طبیب اپنے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے جمالی سے ملنے گیا، اس نے جمالی کے چہرے پر شگفتگی اور تازگی

محسوس کی تو پوچھا۔ ''کیا بات ہے جمالی! کیا میرا کشتہ اب بھی اثر دکھا رہا ہے؟''

جمالی نے جواب دیا۔ ''میاں! کیسی دوا اور کہاں کا کشتہ' یہ تر و تازگی اور شگفتگی حضرت پیرومرشد کی دعاؤں کے طفیل ہے' جب سے انہوں نے میرے حق میں دعا کی ہے میں بہت خوش اور صحت مند ہو رہا ہوں۔''

اس وقت بنگالی طبیب کو حضرت شیخ کے مقام اور مرتبے کا کسی قدر اندازہ ہوا، وہ حضرت شیخ کے پاس پہنچا اور ان سے درخواست کی کہ اس کے حق میں دعا فرما دیں۔

آپ نے فرمایا۔ ''تو اللہ کی مخلوق کو اپنے تجربوں کی نذر نہ کر۔ جب تو ایسا ہو جائے گا کہ لوگ تیری شکایتیں نہ کرسکیں، اس وقت میں تیرے حق میں ضرور دعا کروں گا۔''

بنگالی طبیب مایوس ہو کر اپنے وطن واپس چلا گیا۔

☆☆☆

شیخ سماء الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ جمالی حج کو جا رہے ہیں تو انہیں تاکید کر دی کہ جلدی واپس آ جانا۔

جمالی حج کے لیے گئے تو ایک مدت تک ان کی خیریت ہی نہیں معلوم ہو سکی۔ شیخ سماء الدین ان کے لیے بے چین رہنے لگے۔ ادھر جمالی واپسی میں بہت پریشان ہوئے، یہاں تک کہ قافلے سے بچھڑ گئے اور ادھر ادھر بھٹکنے لگے، شہروں، ویرانوں جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے رہے لیکن کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

جمالی ایک دن صحرا میں کھڑے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ریت کے تودوں اور سمندر کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس پانی کا جو ذخیرہ تھا' وہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر ان کی وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟

جمالی نے مصلیٰ بچھایا اور سجدے میں گر کر گڑگڑائے کہ ''خدایا! میں نے حج کر لیا اور مدینہ منورہ کی زیارت بھی کر لی۔ اب میں اپنے پیرومرشد کی خدمت میں پہنچنا چاہتا ہوں، میری مدد کر اور میرے دل سے خوف اور شک و شبہے کو دور فرما۔''

جمالی مصلیٰ پر گرے یہ دعا کر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک گھڑسوار آیا اور ان کے پاس رک کر گھوڑے سے اترا اور جمالی کے ہاتھ میں ایک مشکیزہ تھما دیا کہا۔ ''حضرت! جب تک آپ کو وافر مقدار میں پانی نہیں ملتا میرا مشکیزہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس سے کام نکالیے، پھر دیکھا جائے گا۔''

جمالی نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور بعد میں اپنی اس غلطی پر خاصے شرمندہ ہوئے کہ وہ اس شخص کا نام اور پتا نہیں معلوم کر سکے۔

جمالی نے اس مشکیزے کو دورانِ سفر ہمیشہ اپنے پاس رکھا مگر پھر معلوم نہیں اس کو کس نے غائب کر دیا۔ ایک مدت بعد جمالی نے سورت کی بندرگاہ پر قدم رکھا اور دہلی جانے کا منصوبہ بنایا۔ یہاں انہیں بارہا ایسا محسوس ہوا گویا وہ اپنے پیرومرشد کے پاس کھڑے ہیں اور وہ انہیں بڑی نرمی سے ڈانٹ رہے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں۔ ''جمالی! کیا بات ہے؟ اتنا وقت کہاں ضائع کر دیا؟ میں تو تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔''

جمالی نے فوراً رختِ سفر باندھا اور دہلی روانہ ہوئے۔ جب وہ اپنے پیرومرشد کی خدمت میں پہنچے تو شیخ سماء الدین کے ایک بیٹے نے جمالی کو بتایا کہ ابھی چند دن پہلے والد بزرگوار آپ کو بہت یاد کر رہے تھے اور وہ دعا ان کی ایجابِ قبولیت کو پہنچی اور آپ یہاں آ گئے۔

جمالی نے اپنا سر شیخ کے قدموں میں رکھ دیا اور کچھ دیر روتے رہے۔

اب شیخ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ جمالی کو اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا۔ ''جمالی! میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ کیا تجھ کو پتا ہے کہ میں نے کیا دیکھا؟''

جمالی نے نفی میں گردن ہلا دی اور مؤدبانہ عرض کیا۔ ''نہیں، کچھ بھی نہیں۔ آپ ہی بتائیں گے تو خواب کا علم ہو جائے گا۔''

شیخ نے کہا۔ ''میں نے دیکھا۔ میں سلطان شمس الدین التمش کے ساتھ حوضِ شمسی کے کنارے کھڑا ہوں۔ سلطان

التمش حوض کے پاس کی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہے ہیں۔

''شیخ سماء الدین! کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری آخری آرام گاہ یہ ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا، آپ فرماتے ہیں تو یہی میری آرام گاہ ہوگی۔''

جمالی نے یہ خواب سنا تو انہیں رونا آ گیا۔ زاروقطار رونے لگے۔ شیخ نے انہیں تسلی بھی نہیں دی۔

ایک دن شیخ نے کہا۔ ''جمالی! میرا ایک بیٹا ہے عبداللہ بیابانی۔ اس نے نوعمری میں گھر بار چھوڑ دیا اور اللہ کی تلاش میں بن کی راہ لی، پتا نہیں کہ اب وہ کہاں ہوگا؟''

جمالی نے عرض کیا۔ ''پیر و مرشد! اگر آپ کو اپنے بیٹے کی یاد ستا رہی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں..... کہ کہیں نہ کہیں وہ موجود ضرور ہے اور خیریت سے ہے۔''

شیخ نے کہا۔ ''جمالی! تو نہیں جانتا یہ میرا آخری زمانہ ہے پتا نہیں کب میرے مالک کا بلاوا آ جائے اور میں تھکے ہوئے جواری کی طرح کچھ کہے سنے بغیر ہی اس سفر پر روانہ ہو جاؤں۔''

جمالی نے آہستہ سے کہا۔ ''پیر و مرشد! آپ مایوسی کی باتیں نہ کیجیے، ابھی آپ ہم میں بہت دنوں تک رہیں گے۔ آپ اداس نہ ہوں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''جمالی! یہ ساری تسلی دلاسے کی باتیں ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔''

اس گفتگو کے بعد شیخ نے ہر کسی سے ملنا جلنا ترک کر دیا، استغراق اور محویت میں اضافہ ہو گیا۔ ایک دن مغرب کی نماز پڑھ کر جمالی کو طلب کر لیا اور ان سے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ ''جمالی! میرے نہ ملنے سے تو اداس تو نہیں ہوا؟''

جمالی نے جواب دیا۔ ''پیر و مرشد! میں اداس تو بہت ہوا مگر اس میں آپ کی رضا دیکھ کر یہ اذیت بھی جھیل گیا۔''

شیخ نے کہا۔ ''اچھا اب کہیں نہ جانا۔ پتا نہیں کب جدائی کی گھڑی آ جائے۔''

جمالی کو رونا آ گیا۔ لیکن شیخ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر عشا سے پہلے اٹھے اور جمالی سے کہا۔ ''جمالی! میں وضو کرنا چاہتا ہوں۔''

جمالی نے عرض کیا۔ ''حضرت! مغرب کا وضو تو آپ کر چکے ہیں۔ کیا وہ کافی نہیں ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''نہیں۔ میں نے دستور بنا لیا ہے کہ ہر نماز سے پہلے وضو ضرور کر لوں، چنانچہ اس پر میں بڑی سختی سے عمل کر رہا ہوں۔''

عشا کی نماز پڑھ چکنے کے بعد آپ اپنے بستر پر لیٹ گئے اور جمالی سے کہا۔ ''جمالی! تو میں چلا، میرا وقت پورا ہو چکا اور وہ خالق حقیقی میرا منتظر ہے۔''

جمالی نے کچھ کہنے کے لیے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ شیخ کی روح پرواز کر گئی۔

وصال کی خبر آناً فاناً ہر طرف پھیل گئی اور لوگوں کے پرے کے پرے آنے لگے۔ جنازے میں دور دور تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے اور جمالی یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ شیخ کو حوضِ شمسی کے قریب وہیں دفن کیا گیا جس جگہ کو وہ سلطان التمش کے ساتھ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔

جمالی نے ان کی تاریخ وصال کہی

مرشد انس و ملک شاہ سماء الدین چو رفت

اے جمالی بر سریر عرش آمد گام او

ہشت خلد آمد بنام او اگر پرسد کے

سال تاریخش بگو (ہشت) آمدہ بر نام او

۷۰۵+۱۹۶=۹۰۱ھ

ماخذات

اذکار ابرار، محمد غوثی شطاری۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع۔ بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن۔ خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین برنی۔ حضرت بوعلی قلندر، اقبال صلاح الدین

سراب

ڈاکٹر شیر شاہ سید

انسان محبت میں کبھی کبھی کس قدر آگے نکل جاتا ہے اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب کبھی پلٹ کر ایک نظر چھوڑے ہوئے رستوں کو دیکھتا ہے مگر... جانے کیسی اداسی نگاہوں کو زنجیر کر لیتی ہے کہ درد چپکے سے دل میں کروٹ لیتا محسوس ہوتا ہے... ایسا ہی ایک سفر انہوں نے بھی طے کیا تھا لیکن حاصل کچھ نہ تھا...

یک جان دو قالب جوڑے کی تنہائیوں کا قصہ



صبح سویرے کا وقت تھا اور میں گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا کہ عذرا نے مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اس کا چہرہ سرخ تھا اور جسم بھی شدید کانپ رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ ''کیا ہوا، کیا ہوا خیریت تو ہے، سب ٹھیک ہے ...نا؟''

''جاوید فوراً چلیں شازیہ کے گھر فوراً۔''

اس کے چہرے کی وحشت دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ ''بتاؤ تو سہی، کیا بات ہے؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''خیریت تو ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟''

''پتا نہیں کیا بات ہے۔ ابھی شازیہ بھابی کا فون آیا تھا کہ منیر بھائی زندہ ہیں، گھر پر ہیں، صبح پہنچے ہیں۔ ہمیں بلایا ہے اس نے۔'' عذرا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا بات کر رہی ہو؟ پانچ دن پہلے تو ہم نے منیر بھائی کو دفن کیا ہے، اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا ہے میں نے۔ چھ فٹ نیچے، سفید کفن میں، پھر مٹی کی منڈیر پر سلیب رکھ کر اس پر ڈھیروں ڈھیر مٹی ڈالی تھی۔ سب نے دعا کی تھی ان کی بخشش کے لیے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے جواب دیا تھا۔

''ایسا ہی ہوا ہے جاوید، شازیہ بھابی نے تفصیل سے بتایا ہے کہ صبح سویرے فجر سے پہلے وہ پہنچے ہیں۔ وہ تو اسی وقت فون کرنے والی تھیں مگر انہوں نے منع کر دیا تھا اور اب نہا دھو کر ناشتا وغیرہ کر کے وہ سو رہے ہیں تو شازیہ بھابی نے مجھے بتایا ہے بلکہ بلایا ہے۔ چلیں جلدی سے تیار ہو جائیں۔ میرے خدا، جانے کیا ہو رہا ہے ہم لوگوں کے ساتھ۔''

''تم صحیح کہہ رہی ہو نا؟ وہ شازیہ بھابی کی ہی آواز تھی کسی نے مذاق تو نہیں کیا ہے؟'' میں نے پھر بے یقینی سے پوچھا۔

''کیسی بات کر رہے ہیں جاوید، میں نے بیس سنٹ ان سے بات کی ہے۔ تفصیل سے بتاتی ہوں، تیار تو ہوں آپ جلدی سے۔''

میں پریشان سا اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا گیا تھا۔

منیر میرے کزن تھے۔ چچا جان کے سب سے چھوٹے بیٹے، مجھ سے تین سال بڑے۔ بچپن سے ہی بہت دوستی تھی میری ان سے۔ ہم دونوں کا اسکول بھی ایک ہی تھا۔ وہ مجھ سے سینئر تھے اور میں تقریباً ان کے ہی نقش قدم پر چلتا ہوا اسکول سے کالج، کالج سے آئی بی اے اور آئی بی اے سے ایم بی اے کر کے نکلا تھا۔ انہیں ایک ملٹی نیشنل ادارے میں بہت اچھی نوکری مل گئی اور میں نے بینک سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہوں پر اچھا کام کر رہے تھے۔

پھر ان کی زندگی میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ شازیہ ان کی زندگی میں یکا یک داخل ہوگئیں، ذات برادری سے الگ لوگ چچا اور چچی جان کے لیے بالکل ہی قابلِ قبول نہیں تھے، نہ بھائیوں کو اور نہ ہی بہنوں کو۔ منیر چھوٹے تھے، اچھے تعلیم یافتہ تھے، اچھا کما رہے تھے۔ ان کے گھر کے آخری فرد جس کی شادی ہونی تھی بہت دھوم دھام سے۔ بہنوں کو ارمان نکالنا تھے۔ چچا اور چچی نے اپنے پرانے دوست کی بیٹی سے منگنی بھی کر دی تھی ان کی اور اب شازیہ بیچ میں آگئی تھیں۔

شازیہ پڑھی لکھی تھیں اور خوب صورت بھی۔ منیر بھائی کے ایک دوست کی چھوٹی بہن، کوئی بھی انہیں دیکھ کر ان کی محبت میں گرفتار ہوسکتا تھا۔ پنجاب کی خوب صورتی، کراچی کی تعلیم، ایک الگ ہی ماحول اور پھر وہ شہر کے سب سے بڑے انگریزی اخبار میں نوکری کر رہی تھیں۔ منیر بھائی کا متاثر ہونا اور ان سے مرعوب ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں تھی۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ گھر والے اتنی مخالفت کریں گے۔ وہ تو ہنستے بولتے، مسکراتے، گنگناتے، خوش رہنے والے آدمی تھے اور ساتھ میں بڑا مان تھا انہیں اپنے آپ پر، بھائی بہنوں پر اور خاندان کے دوسرے لوگوں پر۔

اس سے پہلے کہ بات گھر والوں تک پہنچتی انہوں نے شازیہ بھابی کو پروپوز کیا، ان کی رضامندی حاصل کی اور وعدے بھی کیے جو کیے جاتے ہیں اور ساتھ شازیہ کے گھر والوں کو بھی اپنے دوست کی مدد سے تیار کر لیا کہ وہ لوگ اپنی بیٹی کا ہاتھ غیر پنجابیوں میں دے دیں۔

مگر بات اس وقت بڑی خراب ہوگئی جب انہوں نے چچا جان کو شازیہ کی تصویر دکھا کر کہا کہ ان لوگوں کے گھر رشتہ لے کر جائیں۔ منیر بھائی کے گھر والے کبھی رشتہ لے کر نہیں گئے۔ دو سال تک گھر میں کشمکش چلتی رہی۔ ناراضی، بحث مباحثہ، بھائی بہنوں کا سمجھانا، چچا جان کا غصہ، چچی جان کی جذباتی تقریریں، سب جانتے ہوئے، سمجھتے ہوئے منیر بھائی اپنی بات پر اڑے رہے کہ شادی اگر ہوگی تو شازیہ سے ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی۔

ایک دن انہوں نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ اپنا سامان لے کر میرے پاس آگئے۔ میں نے عذرا سے شادی کر لی تھی اور خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ ابو، امی، بھائی جان کے پاس اسلام آباد میں تھے اور گھر میں بڑی کشادگی تھی۔ منیر بھائی ہمارے ساتھ چھ مہینے رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنا الگ مکان لیا، میری اور عذرا کی مدد سے اس کا سامان خریدا اور اسے مکان سے گھر میں تبدیل کر دیا۔ اس دوران میں ہر طریقے سے یہ کوشش بھی کرتے رہے کہ کسی طرح سے گھر والوں کو

راضی کر لیں کہ وہ لوگ شازیہ کے رشتے کو قبول کر لیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوسکی۔

ایک دن سادہ طریقے سے چند دوستوں کی موجودگی میں اور میرے جیسے رشتے داروں کے ساتھ ان کی برات شازیہ کے گھر پہنچی اور نکاح کے بعد شازیہ کی رخصتی کرا کے وہ اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔

زندگی اپنی نئی ڈگر پر چل نکلی تھی۔ نہ وہ اپنے گھر والوں کو بھولے اور نہ ہی ان کے گھر والوں نے انہیں معاف کیا لیکن یہ ضرور ہوا کہ ہم لوگ ان کے اور وہ ہمارے بہت قریب آگئے۔ عذرا اور شازیہ کی خوب دوستی ہوگئی تھی جو روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ میرے دو بچے ہوئے، دو بیٹیاں، ان کے بھی چھ سال کے عرصے میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ ہم دونوں خاندانوں کا جیسے ایک چھوٹا سا یونٹ بن گیا تھا۔ عید، بقرعید، سالگرہ کی دعوتیں، ساتھ کھانا اکثر و بیشتر اور ساتھ ہی گھومنا، کبھی کبھی پکنک سمندر کے کنارے یا بچوں کی سالگرہ، گئے برسوں میں کتنے قریب آگئے تھے ہم لوگ۔

منیر کو شازیہ سے شدید محبت تھی مگر شازیہ تو جیسے منیر کی پجارن تھیں۔ بے انتہا چاہتی تھیں، اپنی جان دینے کو تیار۔ انہیں شدید احساس تھا کہ منیر بھائی نے ان کے لیے اپنے پورے خاندان کو چھوڑ دیا ہے اس کا شدید غم بھی تھا انہیں۔ بڑی کوششیں کی تھیں اپنے طور پر انہوں نے کہ منیر بھائی کے گھر والے انہیں معاف کر دیں اور اپنے بیٹے کو، بھائی کو گلے لگالیں۔ اگر ماں باپ نہ سہی تو کم از کم بہنیں اور بھائی ہی کسی طرح کا تعلق رکھیں منیر سے، مگر ایسا ممکن نہیں ہوسکا۔ وہ تو ہر شرط ماننے کو تیار تھیں، سب کچھ کرنے کو تیار۔

میں کبھی نہیں سمجھ سکا کہ چچا جان اور چچی جان نے اس رشتے کو اتنا بڑا مسئلہ کیوں بنا لیا تھا اور یہ بھی میں کبھی نہیں سمجھ سکا کہ ایک آخری چھوٹے بھائی کے لیے دو بہنوں اور دو بھائیوں کے دلوں میں کوئی پیار، محبت، شفقت، الفت کیوں نہیں جاگی، کیوں ان لوگوں نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا، تن تنہا صرف اس وجہ سے کہ وہ شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتے تھے، اپنی زندگی اس کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں، جو انہیں پیارا ہے، جو ان سے پیار کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ چچا اور چچی جان کی شدید محبت تھی جس نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفقود کر دیا تھا۔ وہ انہیں، اپنے آخری بچے کو ٹوٹ کر شدت سے چاہتے تھے۔ شاید انہوں نے کبھی انہیں بڑا نہیں سمجھا۔ ان کے لیے منیر بھائی چھوٹے تھے، بالکل چھوٹے جن سے انہیں شدید پیار تھا۔ جنہیں شاید ہمیشہ ان کی ضرورت تھی اور انہوں نے اس پیار، اس محبت کو پامال کر دیا، اس کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ماں باپ اور خاص کر ان جیسے ماں باپ جو کبھی بھی ان کے لیے برا نہیں کریں گے، برا نہیں سوچیں گے اور جو کچھ ان کے لیے پسند کریں گے وہ زمانے سے بڑھ کر ہوگا۔ وہ منیر بھائی کی پسند کو اپنی محبت کی توہین سمجھتے رہے اور اس جھوٹی انا کے اسیر ہو کر رہ گئے جس نے منیر بھائی اور ان کے خاندان کے درمیان سات سمندروں کا فاصلہ پیدا کر دیا تھا۔

شازیہ بھابی کو غیر ضروری طور پر یہ احساسِ جرم تھا اور منیر بھائی کے دل میں غصہ اور ایک احساسِ بے بسی جس نے ان کے اندر ایک اداسی سی پیدا کر دی تھی، ان حالات نے ان دونوں کو اور بھی زیادہ قریب کر دیا اور دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی دنیا ان دونوں کی ذات میں ہی تھی۔

بچوں کی پیدائش کے بعد گھر میں رونق تھی اور منیر بھائی اپنے کام میں بے پناہ ترقی کر رہے تھے لیکن اکثر ان کی باتوں سے ایسا لگتا جیسے اندر ہی اندر انہیں شدید دکھ ہے کہ ان کے خاندان نے انہیں اور انہوں نے اپنے خاندان کو چھوڑ دیا ہے۔

پھر ایک دن مجھے پتا لگا تھا کہ وہ اپنے سالانہ میڈیکل چیک اپ کے لیے گئے تھے جہاں کچھ ٹیسٹ وغیرہ ہوئے ہیں اور ان کے خون میں کولیسٹرول کا لیول بڑھا ہوا ہے۔ اسی شام ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے رپورٹ کی تفصیل بتائی تھی۔ سگریٹ وہ پیتے نہیں تھے، کبھی کبھار کسی پارٹی میں سال میں تین چار دفعہ بیئر یا وائن پی لی تو پی لی مگر انہیں شرابی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

شازیہ بھابی بہت پریشان ہوگئی تھیں۔ گائے بکری کا گوشت گھر میں بند ہوگیا۔ تیل گھی کا استعمال کم سے کم کر دیا گیا۔ مٹھائی اور روغنی چیزوں پر پابندی لگ گئی۔ سبزیاں پھل زیادہ سے زیادہ آنے لگے، روزانہ ٹہلنے کی ضد اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش۔ شازیہ بھابی کا بس چلتا تو ان کی رگوں میں سرایت کر جاتیں، کولیسٹرول کے چھوٹے بڑے قطروں جیسے بے شمار ذرات کو رگوں، شریانوں، دل کے

خانوں سے چھان کر باہر نکال لاتیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی محبت جنون کی حد تک بڑھ گئی ہے اور وہ ان کے لیے بہت پریشان رہنے لگی ہیں۔

پھر اچانک یہ خبر آئی کہ منیر بھائی کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ شام کو گھر واپس آئے تھے اور اپنے بائیں ہاتھ اور بازو میں درد اور بھاری پن کی شکایت کی تھی۔ شازیہ بھابی نے آہستہ آہستہ بازوؤں کو دبایا، کندھوں پر مساج کیا تو انہیں کچھ اچھا محسوس ہوا تھا۔ دونوں یہ سوچ ہی رہے تھے کہ چل کر ڈاکٹر کو دکھالیں مگر یکایک انہیں سینے میں شدید درد اٹھا اور اس سے پہلے کہ میں پہنچتا، ایمبولینس آتی، وہ شازیہ بھابی، بچوں اور دوستوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ سلام نہ وصیت نہ یار سے گلے لگے اور نہ ہی آخری دفعہ ہاتھوں کو، ماتھے کو، چہرے کو چومنے دیا۔

بڑی اداسی اور غم کے ساتھ انہیں دفن کیا ہم لوگوں نے۔ اپنے ہاتھوں سے انہیں نہلایا، جنازے کو خوشبوؤں میں بسایا، قبرستان لے جاکر منوں مٹی تلے دبا دیا تھا انہیں۔

جانے گزشتہ چار دن کیسے گزرے۔ کل پہلی رات تھی جو آخری پہر میری آنکھ لگی اور صبح صبح عذرا نے جگا دیا کہ منیر بھائی زندہ ہیں۔ میں جلدی جلدی تیار ہوتا رہا اور ایک ساعت میں یہ سارے خیالات میرے ذہن کے پردے پر تیز رفتار فلم کی طرح چل گئے۔ میں کنفیوزڈ تھا، پریشان اور خوفزدہ بھی...... جانے کیا، کیا میرے ذہن میں پک رہا تھا۔ یہ تو صرف اخباروں میں پڑھا تھا کہ غلطی سے زندہ آدمی کو دفن کردیا گیا جو بعد میں لوٹ آیا مگر منیر بھائی...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ انہیں میں نے چھوا تھا، نہلایا تھا وہ مردہ تھے، بالکل مردہ۔

راستے میں عذرا نے بتایا کہ شازیہ بھابی نے بتایا تھا صبح صبح اذانوں سے بھی پہلے دروازے پر دستک ہوئی تھی، انہوں نے ہی دروازہ کھولا تو سامنے منیر بھائی کھڑے تھے، کفن سے اپنے جسم کو ڈھانپے ہوئے، شیو بڑھا ہوا تھا۔ بال منہ اور کفن پر ہر طرف مٹی کے نشان تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بڑی مشکل سے قبر سے اپنے آپ کو نکالا تھا، غلطی سے انہیں زندہ دفن کردیا گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں پر نشان تھے، زخمی ناخن، وہ نہائے، شازیہ بھابی نے انہیں شلوار قمیص دی تھی اور اپنی پسند کا آملیٹ کھا کر اب وہ تھکے ہارے بیڈروم میں سو رہے ہیں۔ بڑی شدید نیند آگئی ہے، تھکا ہارا جسم ٹوٹ گیا ہوگا۔ اس کے بعد شازیہ بھابی نے سب سے پہلے صبح ہوتے ہی ہمیں بلایا تھا۔

میرا تو جیسے سر گھوم گیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے، ہم سب لوگ اتنے پاگل نہیں ہوسکتے کہ ایک زندہ آدمی اور مردہ لاش میں فرق نہ کرسکیں۔ کوئی جان نہیں تھی ان میں۔ ڈاکٹر گھر پر موت کا سرٹیفکیٹ بنا کر گئے تھے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں، میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ دل میں وسوسے لیے ہوئے، جانے کہاں کہاں کی سوچ ذہن میں آتی رہی۔ کنفیوز...... خوف زدہ...... پریشان، ایک عجیب سا احساس جانے کیا ہونے والا ہے۔

ہم نے ان کے گھر پر آہستہ سے دستک دی۔ شازیہ بھابی نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔ گھر میں ابھی تک پھولوں اور عطر کی خوشبو تھی۔ لاؤنج میں دریاں بچھی ہوئی تھیں اور چھوٹی ٹیبل پر سیپارے رکھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ جنازے کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔

شازیہ بھابی کا چہرہ کھلا ہوا تھا، وہ بے تابی سے عذرا کے گلے لگ گئی تھیں۔ ”وہ واپس آگئے، عذرا واپس آگئے بالکل ٹھیک ٹھاک۔ شکر ہے اوپر والے کا، بڑی غلطی ہوگئی تھی ہم لوگوں سے۔ جانے کتنی تکلیف اٹھائی ہوگی انہوں نے۔ آسان تھوڑا ہے اس طرح سے مٹی کے ڈھیر سے زندہ بچ کر نکل آنا۔“ انہوں نے لاؤنج کے کونے میں کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے بڑے جذباتی انداز سے کہا تھا۔

”مگر بھابی کہاں ہیں وہ؟“ میں نے آہستہ سے پوچھا تھا۔

”ہاں چلو میں دکھاتی ہوں۔ سو رہے ہیں۔ ابھی اٹھ جائیں گے دو تین گھنٹے میں۔ پھر بات ہوگی مگر آؤ دیکھ لو ان کو۔“ وہ کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی تھیں۔

بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے کوریڈور سے پہلے میری نظر ڈائننگ ٹیبل پر پڑی جہاں پلیٹ میں انڈوں کا بنا ہوا آملیٹ سوکھ سا گیا تھا۔ بیڈروم میں بستر پر چادر پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی کو اڑھایا گیا ہو، صاف دھلی ہوئی استری کی ہوئی قمیص کے ساتھ ازار بند پروئی ہوئی شلوار بستر کے کونے پر پڑی ہوئی تھی، بستر خالی تھا۔

شازیہ بھابی دروازے پر کھڑی .... خالی بستر کو تکتی رہیں، چکرائیں اور پھر بے ہوش ہوکر دھڑام سے زمین پر گر پڑیں۔

کولن ..... ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اور غیر معمولی حالات میں بھی اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتا لیکن رائس جیسے لوگوں کو برداشت کرنا اتنا آسان ثابت نہیں ہوتا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کا دل چاہا کہ رائس کا خاتمہ کردے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے مارنے کے طریقوں پر بھی غور کرنے لگا تھا۔ کوئی ایسا طریقہ جو دیکھنے میں حادثہ معلوم ہو مثلاً بم دھماکا یا آتش زدگی وغیرہ۔ یہ اس کی بہت بری عادت تھی۔ ذرا سی بات کو لے کر وہ اتنی گہرائی میں چلا جاتا کہ بعد میں خود اسے اپنا وقت ضائع ہونے پر افسوس ہونے لگتا۔ حالانکہ رائس جو کچھ کررہا تھا، اس کے لیے اسے موردِالزام ٹھہرانا صحیح نہیں تھا کیونکہ کولن کو اس کے بارے میں پہلے سے ہی سب کچھ معلوم تھا اور جو کچھ ہورہا تھا، اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں تھی۔

کولن نے اپنے کام کا آغاز چار گاہکوں سے کیا

آخری قہقہہ

ثمر عباس

دنیا میں جانے کتنی بیماریاں ایسی ہیں جن کا علاج صرف دوائوں سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے... چند ہوشیار لوگوں کی خدمات اور تراکیب کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن... کبھی کبھی زیادہ ہوشیاری دکھانے سے یاروں کا بھی ساتھ چھوٹ جاتا ہے اور ہوش بھی ٹھکانے نہیں رہتے مگر یہاں تو کوئی ترکیب آزمانے سے قبل ہی اس کی زندگی کی سانسیں ہی ختم ہوگئی تھیں۔

تمام عمر عیش کرنے کے خواب دیکھنے والے کی بے بس زندگی کا احوال



حالانکہ اسے زیادہ لوگ بھی مل سکتے تھے لیکن ایسی صورت میں وہ شاید ان سب کو یکساں وقت اور توجہ نہ دے پاتا۔ اسے اس کام کا معقول معاوضہ مل رہا تھا اور یہ اس کی ذمے داری تھی کہ وہ اس فیس کے عوض اپنے گاہکوں کا پورا پورا خیال رکھے۔ اس کے پہلے چار گاہکوں میں رائس، جولی، گپتا اور کلیرائس شامل تھے۔ رائس اور جولی سرکاری ملازم تھے اور اس عارضے کی وجہ سے کسی بھی وقت ان کی ملازمت ختم ہوسکتی تھی جبکہ گپتا ایک اسپتال میں لیبارٹری اسسٹنٹ کے طور پر کام کررہا تھا۔ البتہ کلیرائس کا معاملہ ان سب سے مختلف تھا۔ اسے کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ خالی بیٹھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اسے یہ موذی مرض لاحق نہ ہوتا تو وہ بہت اچھی ورکر ثابت ہوسکتی تھی۔ کولن کے یہ چاروں گاہک ایڈ (Add) میں مبتلا تھے جس کا ایڈز جیسی بیماری سے کوئی تعلق نہیں۔

عام خیال یہی ہے کہ یہ عارضہ بچوں کو لاحق ہوتا ہے اور بڑے اس سے متاثر نہیں ہوتے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر بچپن میں اس بیماری کا علاج نہ کیا جائے تو عمر کے ساتھ ساتھ یہ بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اکثر بچے اپنے کلاس ورک، ہوم ورک اور دوسری سرگرمیوں پر پوری توجہ نہیں دیتے جس کی وجہ سے ان کی تعلیم متاثر ہوتی ہے۔ اکثر اوقات والدین یا ٹیچر کی ہدایات غور سے نہیں سنتے۔ اسی طرح کئی مرتبہ وہ ایسا کام کرنا پسند نہیں کرتے جس میں بہت زیادہ ذہنی مشقت درکار ہو۔ اسی غائب دماغی کے سبب کئی مرتبہ انہیں اپنی کتابوں، کاپیوں، پنسل اور کھلونوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑجاتا ہے۔ توجہ نہ دینے کے سبب ان کی یادداشت کمزور ہونے لگتی ہے اور وہ بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں۔ اسی بے پروائی کے سبب ان سے کام میں غلطیاں سرزد ہونے لگتی ہیں۔ وہ اپنا کام وقت پر شروع نہیں کرپاتے یا اس میں دیر کردیتے ہیں اور ان سب مسائل کی جڑ توجہ کی کمی ہے جسے ADD یعنی Attention deficit disorder کہا جاتا ہے۔

کولن کا خیال تھا کہ اگر اس مرض کی صحیح اور بروقت تشخیص نہ کی جائے تو اس کی علامات بار بار ظاہر ہوتی ہیں اور لوگوں کو نارمل زندگی گزارنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس کے چاروں گاہکوں کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال تھی.... اگر ایک بچہ کلاس کا ماحول خراب کرے، اپنا کام کرنا بھول جائے یا نان اسٹاپ بولتا رہے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ پرنسپل کے کمرے میں بلاکر اسے تنبیہ کردی جائے گی لیکن کوئی بالغ ایسی حرکتیں کرنا شروع کردے تو اسے لازماً اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ایسے لوگوں کی شناخت کوئی مشکل کام نہیں۔ کوئی بھی شخص جو تفصیلات پر توجہ نہیں دیتا، بے پروائی کے سبب اس سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، وہ اپنے کام پر توجہ مرکوز نہیں کرتا اور دوسرے کی بات غور سے نہیں سنتا، اسے یہ عارضہ لاحق ہوسکتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی اس زمرے میں شمار ہوتے ہیں جن کی زندگی میں بے ترتیبی ہو۔ جو اپنی چیزیں کہیں رکھ کر بھول جاتے ہوں یا چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہوجاتے ہوں۔

ایسے لوگوں کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں ایک ایسے شخص کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں جو کوچ کا کام کرسکے۔ صرف ڈاکٹر کے پاس جانا اور اس سے دوائیں لکھوانا ہی کافی نہیں۔ جبکہ دوا کے استعمال میں بے احتیاطی ہی نت نئے مسائل کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر دوا کی کم خوراک لی جائے تو وہ بے اثر رہے گی اور زیادہ خوراک لینے کی صورت میں دل کا دورہ پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے لوگوں کو روزمرہ معاملات میں بھی کوچ کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں مسلسل راہنمائی دیتا رہے۔

رائس کا شمار بھی ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ اسکول کے زمانے سے ہی اس کا یہ حال تھا کہ وہ کسی کام پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ اسی لیے اس کے نمبر ہمیشہ کم آتے تھے۔ وہ جب بھی رپورٹ کارڈ لے کر گھر آتا تو باپ اس کی تواضع تھپڑوں سے کرتا۔ کولن کا خیال تھا کہ والدین کے اس طرزِ عمل سے معاملات مزید بگڑ جاتے ہیں۔ رائس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اس کے علاج پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ ماں اس کی حالت دیکھ کر روتی اور باپ چیختا چلاتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کہیں بھی ٹک کر کام نہ کرسکا اور اسے چند ماہ بعد جاب تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آجاتی۔

وہ خود بھی اس صورتِ حال سے پریشان تھا پھر اس نے اپنے ایک دوست سے اس بیماری کے بارے میں سنا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ ساری علامات تو اس میں بھی ہیں۔ پھر اس نے اس موضوع پر ایک کتاب پڑھی اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا جس نے تصدیق کی کہ رائس نے کتاب میں جو کچھ پڑھا، وہ بالکل درست ہے۔ وہ نہ تو احمق ہے اور نہ ہی سست...... اسے صرف ایڈ ہے اور اگر وہ اپنے ہتھیار صحیح طرح استعمال کرے تو نارمل انداز میں زندگی گزار سکتا ہے۔

ڈاکٹر نے اس کے لیے کچھ دوائیں تجویز کیں اور یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اپنے لیے ایک کوچ کی خدمات حاصل کرے کیونکہ یہ دوائیں بھی اسی وقت کارآمد ہوں گی جب انہیں صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے گا۔ اس کے روز مرہ معاملات سدھارنے میں کوچ ہی اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ رائس نے اخبار میں اشتہار دیکھ کر کولن سے رابطہ کیا۔ وہ بچوں کے لیے کام نہیں کرتا تھا کیونکہ انہیں سنبھالنے کے لیے جس صبر، تحمل اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کولن میں نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بچوں کے مقابلے میں بالغ افراد سے معاوضہ بھی زیادہ ملتا تھا۔ کولن کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے گاہک کے گھر جاتا۔ اس کے ساتھ پورا دن گزارتا اور اس کے بارے میں ہر بات کا بغور جائزہ لیتا۔

رائس کی زندگی اسپاگیٹی کے پیالے کے مانند تھی اور کولن کو اس کا ایک ایک ٹکڑا الگ کرکے ترتیب سے رکھنا تھا۔ گوکہ یہ ایک وقت طلب کام تھا لیکن پچھتر ڈالرز فی گھنٹا کے عوض کولن یہ مشقت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ گوکہ رائس کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی۔ کولن نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خوف زدہ ہے لیکن اس کے لیے اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ وہ جن حالات میں زندگی گزار رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہ کیفیت قابلِ فہم تھی اور اس میں شرمندگی کا تاثر بھی نمایاں تھا۔ کولن کو اس کے گھر کی حالت دیکھ کر بھی بہت افسوس ہوا۔ ایک عجیب سی ناگوار بو نے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

خوش قسمتی سے کولن کو اپنے جذبات پر قابو پانے میں کمال حاصل تھا۔ اصل قصور تو خود اس کا تھا۔ اگر وہ اخبار میں اشتہار نہ دیتا تو رائس اس سے رابطہ ہی نہ کرتا۔ اب وہ یہاں آہی گیا ہے تو اسے رائس پر غصہ کرنے یا واپس جانے کے بارے میں سوچنے کے بجائے صورتِ حال کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لینا چاہیے۔ چنانچہ اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکراتے ہوئے رائس سے بولا۔

”کیوں نہ ہم آج سے ہی اپنا کام شروع کردیں؟“

توقع کے مطابق کولن کو ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن چند ملاقاتوں کے بعد حالات بہتر ہونا شروع ہوگئے۔ کولن نے اس کے لیے ایک ایسا نظام وضع کیا جس کی مدد سے وہ ضرورت کے وقت اپنی چیزیں تلاش کرسکتا۔ مثال کے طور پر اسے انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے خطوط موصول ہورہے تھے کہ اس نے گزشتہ کئی برسوں سے ٹیکس ادا نہیں کیا ہے۔ کولن نے فوری طور پر اس کے لیے ایک اکاؤنٹنٹ کا بندوبست کیا جو اس کے ٹیکس کے معاملات سنبھال سکے۔ اسی طرح رائس نے ایک سرچ انجن میں بھی اپنا حصہ ڈال رکھا تھا اور وہاں سے ہر مہینے رائلٹی کے طور پر دس بارہ ہزار کا چیک آتا تھا۔ وہ یہ سارے چیک دراز میں رکھتا گیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ ان چیکس کو اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروادینا چاہیے تھا لیکن اپنی بے پروائی اور سستی کے سبب وہ ایسا نہ کرسکا۔

کولن اس کا ذمے دار رائس کے باپ کو سمجھتا تھا کیونکہ اس نے کبھی بیٹے کے مرض کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور ہمیشہ اسے سست اور احمق ہونے کا طعنہ دیتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رائس بھی اپنے آپ کو نکما اور نالائق سمجھنے لگا لیکن کولن کی کوششوں سے رائس کی زندگی میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی تھی۔ انکم ٹیکس والوں کے ساتھ اس کے مسائل حل ہوچکے تھے اور اس کے بینک اکاؤنٹ میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔ گھر کی حالت بھی کافی بہتر ہوگئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رائس کو ایک گرل فرینڈ مل گئی تھی جس پر وہ ضرورت سے زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ کولن کو اس کا معاوضہ باقاعدگی سے مل رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے حصے کا بونس وصول کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور رائس کو یہ معلوم ہی نہ ہوسکا کہ کبھی کبھی اس کے چیک بینک میں جمع ہونے کے بجائے کولن کے گھر کیسے پہنچ جاتے ہیں۔

☆☆☆

جولی کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ وہ سنہری بالوں، خوب صورت چہرے اور متناسب جسم والی لڑکی تھی اور واشنگٹن کے آفس آف مینجمنٹ اور بجٹ یعنی او ایم بی میں اکاؤنٹنٹ کے طور پر کام کرتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا کہ وہ کوئی کام وقت پر نہیں کرسکتی تھی۔ حالانکہ کولن کا خیال تھا کہ ایڈ میں مبتلا لوگ حساب کتاب میں اچھے ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ کئی اہم شخصیات اور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد اس عارضے میں مبتلا تھے۔ جن میں آئن اسٹائن، سابق صدر ابراہام لنکن اور جان کینیڈی وغیرہ شامل تھے۔ جولی کا خیال تھا کہ وہ اپنے طور پر اس مسئلے سے نمٹ سکتی ہے چنانچہ اس نے ایک جدید طرز کا فون خریدا جس میں آپ اپنا شیڈول، ای میل اور فون نمبرز اسٹور کرسکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ایک گھنٹے بعد الارم بجتا جو اسے شیڈول کے مطابق کام کرنے کی یاددہانی کرواتا۔ چند ہی دنوں بعد وہ ان آوازوں سے بیزار ہوگئی اور اس نے انہیں نظرانداز کرنا شروع کردیا۔ اس کے باوجود الارم کی آواز اس کے

دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستی تھی۔ تنگ آکر اس نے وہ فون گھر پر ہی رکھ دیا۔

کولن نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ تمام الارم کینسل کردیے اور جولی سے پوچھا کہ اس کے نزدیک سب سے اہم مصروفیت کیا ہے۔ جولی نے جواب دیا کہ وہ اپنی دوائیں وقت پر لینا چاہتی ہے۔

''ٹھیک ہے، ہم سب سے پہلے یہی الارم لگاتے ہیں۔''

''میری ماں کو بھی دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے ہی یہ ڈیوٹی ادا کرنی ہوتی ہے۔'' جولی بے چین ہوتے ہوئے بولی۔

''ایک الارم یہ بھی سہی لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ فی الحال یہی دو کافی ہیں۔''

یہ تجربہ کامیاب رہا اور کچھ عرصے بعد جولی کو الارم لگانے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ اب پہلے سے بہتر محسوس کررہی تھی اور اپنا ہر کام وقت پر کررہی تھی۔ کولن اگر اس کے پاس نہ ہوتا تب بھی ٹیلی فون پر اسے یاددہانی کرواتا رہتا۔ اب اس کی جنونی کیفیت میں بھی کمی آگئی تھی اور وہ اپنی شخصیت کو نکھارنے پر توجہ دینے لگی تھی۔ اس لیے جب ایک دن اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا اس میں دلچسپی لے رہا ہے تو کولن کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

گپتا کی کہانی بھی اس سے ملتی جلتی تھی۔ گو کہ وہ اسکول اور کالج کے زمانے میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا لیکن عملی زندگی میں آنے کے بعد اسے مختلف صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بھولنے کی عادت کی وجہ سے وہ اب تک تین نوکریوں سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ آخری ملازمت ختم ہونے سے پہلے وہ اپنے دفتر کی سیکریٹری بیٹسی کے ساتھ ڈیٹنگ کررہا تھا۔ وہ بھی گپتا کو پسند کرتی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ جس شخص سے شادی کرنے والی ہے، وہ بھولنے کے مرض میں مبتلا ہے۔ بعض اوقات وہ اس کی انہی حرکتوں پر چراغ پا ہوجاتی۔ ایک مرتبہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ڈائننگ روم میں رنگ کروانا چاہیے، کام شروع ہوگیا تو گپتا کو خیال آیا کہ مزید رنگ کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ وہ رنگ خریدنے کے لیے قریبی دکان تک چلا گیا لیکن اس کی واپسی رات گئے ہوئی۔ بیٹسی کا غصہ کے مارے برا حال تھا۔ وہ کولن پر چلاتے ہوئے بولی۔

''اس نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں اس کی ماں ہوں جو ہر وقت اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں۔''

اس طرح کی صورتِ حال میں کولن ہی ان دونوں میں صلح کروایا کرتا تھا۔ پہلے تو وہ ان دونوں کو ساتھ بٹھا کر بات کیا کرتا تھا تاکہ وہ کھل کر اپنے دل کی بات کہہ سکیں پھر اس نے ان سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں شروع کردیں۔ اس نے کچھ وقت بیٹسی کے ساتھ بھی گزارہ، وہ اس کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر گیا۔ بیٹسی کو وہ جگہ بہت پسند آئی اور اس نے کولن کے ذوق کی بہت تعریف کی۔ واقعی وقت گزارنے کے لیے اس موٹیل سے اچھا ماحول کہیں نہیں مل سکتا تھا۔

اس کے بعد گپتا اور بیٹسی پہلے سے بہتر نظر آنے لگے۔ کولن ہر ہفتے گپتا سے اپنا چیک وصول کرلیتا۔ اس کی محنت بارآور ثابت ہو رہی تھی۔ دوسری جانب بیٹسی بھی کولن کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آرہی تھی اور یہ سب اس موٹیل کے ماحول کا اثر تھا جہاں وہ کولن کے ساتھ بعد میں بھی جاتی رہتی تھی۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس کھیل میں ہر کھلاڑی اپنے آپ کو فاتح سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

کلیرائس کا مسئلہ مختلف نوعیت کا تھا۔ کسی کام پر توجہ نہ دینا یا بھول جانا ایک الگ مسئلہ ہے لیکن جب اسے دوسرے مسائل سے جوڑ دیا جائے تو معاملہ خطرناک ہوجاتا ہے۔ چھتیس سالہ کلیرائس تنہا رہتی تھی۔ براؤن بالوں اور متناسب جسم کے ساتھ وہ قابلِ قبول لگتی تھی لیکن اس کا چہرہ سپاٹ اور کسی بھی تاثر سے عاری تھا۔ شہر میں اس کا کوئی رشتے دار نہیں تھا لہٰذا وہ اپنی ذات کے خول میں بند تھی۔ شہر کی ایک مصروف شاہراہ سے ذرا ہٹ کر اس کا ایک خوب صورت سا مکان تھا جہاں ٹریفک کا شور بالکل نہیں سنائی دیتا تھا۔ اس کا مکان قیمتی فرنیچر اور آئل پینٹنگز سے آراستہ تھا جو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والوں کو متاثر کرتا تھا۔

کلیرائس نے اپنے کوچ کولن کا خوش دلی سے استقبال کیا اور اسے اپنے مکان کا ہر حصہ دکھایا۔ وہ گیراج میں بھی گئی جہاں کولن نے ایک بوگیٹی اسپورٹس کار دیکھی تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کار کا طاقتور انجن صرف چار سیکنڈ میں ساٹھ میل کی رفتار پکڑ لیتا تھا اور اس کی انتہائی حد دو سو میل فی گھنٹا تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کار کی مالیت کیا ہوگی لیکن اسے ہمیشہ سے ہی اس طرح کی کار چلانے کی خواہش تھی۔ وہ اچھی حالت میں نہیں تھی اور لگتا تھا کہ برسوں سے کسی نے اسے نہیں چلایا۔ کولن نے پہلی نظر میں ہی اس کار کو اپنی ترجیحات میں شامل کرلیا۔

کلیرائس کی ظاہری حالت اور شان و شوکت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے درست سمجھتے ہوں لیکن صرف پیسے کمانے کے لیے ہی کام نہیں کیا جاتا۔ بہت سے لوگ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو استعمال کرنے یا اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں گھر سے باہر نکلنے اور ایک لگے بندھے معمول کے مطابق زندگی گزارنے کا موقع ملتا ہے۔ کولن کے لیے ایک ایسی عورت کو کوچ کرنا بہت مشکل تھا جو کوئی کام نہ کر رہی ہو۔

پہلی ہی ملاقات میں اس نے اپنی کلائنٹ سے اس موضوع پر تفصیل سے بات کی۔ کلیرائس بہت سے کام کرسکتی تھی لیکن وہ کسی ایک کے بارے میں بھی یکسو نہیں تھی۔ اس نے کولن کی خدمات اسی لیے حاصل کی تھیں کہ وہ اس سلسلے میں اس کی مدد کرے اور کولن یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کلیرائس کی کیا مدد کرسکتا ہے۔ اسے سمجھنے میں کچھ وقت لگا لیکن بہت جلد وہ اس کا عادی ہوگیا۔ کلیرائس دہرے مزاج کی عورت تھی اور موسم کی طرح اس کا موڈ بدلتا رہتا تھا۔ کبھی وہ شیرنی کی طرح ہوجاتی اور ذرا ذرا سی بات پر دھاڑنے لگتی اور کبھی اسے اتنا رازدار بنالیتی کہ اس کے سامنے اپنے تمام مالی معاملات کھول کر رکھ دیتی۔ کولن ہی کریڈٹ کارڈ بل اور قسطوں کی ادائیگی کے بارے میں اسے یاد دلاتا پھر انہوں نے ایک ٹرک منگوایا جو اسپورٹس کار کو کھینچ کر ورکشاپ لے گیا۔ انہوں نے مطلوبہ سامان کی فہرست تیار کی اور کلیرائس نے وہ سامان خرید کر ان کے حوالے کردیا۔ کولن یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا اور اب اسے اس دن کا انتظار تھا جب وہ گاڑی تیار ہوکر ورکشاپ سے آتی اور وہ کلیرائس کو پہلو میں بٹھا کر لمبی ڈرائیو پر جاتا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہونے کا وقت قریب آرہا تھا۔

اس دوران وہ کلیرائس کی دلجوئی کرتا رہا۔ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ وہ دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ کلیرائس تنہائی اور ڈپریشن کا شکار تھی۔ اسے کولن کی قربت ملی تو اس کا اعتماد بحال ہونا شروع ہوگیا۔ کولن نے اپنے ہر کلائنٹ کے لیے ایک دن مقرر کیا ہوا تھا لیکن کلیرائس کو وہ اس سے بھی زیادہ وقت دے رہا تھا۔ اس کی محنت رنگ لائی اور کلیرائس جاب پر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ جس دن اسے انٹرویو کے لیے جانا تھا، اسی روز اس کی اسپورٹس کار بھی ورکشاپ سے بن کر آگئی۔ کولن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ فوراً ہی گاڑی لے کر نکل جائے لیکن اس نے جلد بازی کرنے کے بجائے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

کلیرائس کئی سال بعد کسی ملازمت کے لیے انٹرویو دینے جارہی تھی لہٰذا اسے اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کرنا تھا۔ وہ بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کولن نے اسے پرسکون رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔'' وہ چلاتے ہوئے بولی۔ ''تم ایسا کہہ رہے ہو لیکن میں جانتی ہوں کہ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''مجھے بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' کولن نے پیار سے پوچھا۔

''بہت سے کام کرنے ہیں، میں کیا کیا بتاؤں؟'' وہ جھنجلاتے ہوئے بولی۔

''کوئی بات نہیں، تم ایک ایک کرکے بتاتی جاؤ۔''

کلیرائس نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا اور روہانسی آواز میں بولی۔ ''میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے اور ابھی ڈھیروں کام پڑے ہیں۔ مجھے اپنے بال بنانے ہیں، ڈرائی کلینر سے کپڑے لانا ہیں، سی وی کا پرنٹ نکالنا ہے۔''

''اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ میں تمہارے کپڑے لے آتا ہوں۔'' کولن نے اپنی خدمات پیش کیں۔

''تم...... تم میرے لیے یہ کام کروگے؟'' وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''کیوں نہیں۔'' کولن نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ''میں تمہارے لیے سب کچھ کرسکتا ہوں اور یہ کوئی انوکھا کام نہیں ہے۔ آخر میں اپنے کپڑے لے کر بھی آتا ہوں۔''

یہ وہ الفاظ تھے جو اس کی زبان سے ادا ہوئے لیکن دل میں وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اسپورٹس کار میں سواری کرنے کا اس سے بہتر موقع پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ اگر وہ اس کی قیمتی کار لے کر کہیں نکل جاتا تو وہ کبھی اسے تلاش نہیں کرسکتی تھی کیونکہ کولن اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی کلائنٹ کو اصلی نام نہیں بتاتا تھا۔ کلیرائس اور اس کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ اس کا سیل فون تھا اور پولیس بھی اس نمبر کے ذریعے کولن تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جب تک کلیرائس اپنی گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرواتی تب تک وہ کار سمیت بہت دور نکل چکا ہوتا۔ وہ ایسے کئی لوگوں کو جانتا تھا جو چوری کی گئی قیمتی گاڑیاں آدھی قیمت پر

خرید لیا کرتے تھے۔ یہ سوچ اس کے دماغ میں اچانک ہی آگئی تھی لیکن ابھی اس نے اس سلسلے میں کوئی واضح پلان ترتیب نہیں دیا تھا۔ ویسے بھی وہ ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی تھا۔ جلد بازی میں اکثر کام بگڑ جاتے ہیں۔ اس لیے وہ اس بارے میں اچھی طرح سوچ بچار کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا چاہ رہا تھا۔

اس نے کلیرائس کے چہرے پر پیار بھری نظر ڈالی اور باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا لیکن کلیرائس کے فون کی گھنٹی کی آواز سن کر رک گیا۔ اس نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے کوئی عورت بول رہی تھی۔ اس نے اپنا تعارف کلیرائس کی ماں کے طور پر کروایا اور بیٹی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کلیرائس نے منہ بناتے ہوئے ریسیور لے لیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے ماں کی بے وقت مداخلت ناگوار گزری ہے۔ کولن کچھ فاصلے پر کھڑا ان کی گفتگو سنتا رہا۔ کلیرائس بے دلی سے ماں کی باتیں سن رہی تھی۔ غالباً ماں اسے اپنی عادت کے مطابق مشورے دے رہی تھی اور وہ باتیں بتا رہی تھی جن کے بارے میں وہ پہلے سے جانتی تھی۔ کچھ دیر تک وہ ماں کی گفتگو سنتی رہی پھر جھلا کر فون رکھ دیا لیکن اس کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں تھے۔

”کون تھا؟“ کولن نے جانتے بوجھتے انجان بنتے ہوئے کہا۔

”میری ماں۔“ وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ بڑھیا مجھے تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ سمجھتی ہے جیسے میں کچھ جانتی ہی نہیں۔ ہر وقت الٹے سیدھے مشورے دیتی رہتی ہے۔ میں نے خوامخواہ تمہارا وقت برباد کیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ تمہارے جانے کے بعد اس کا فون ریسیو کرتی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ کولن خوش دلی سے بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم کوئی اہم بات نہیں بھول رہی ہوگی اور شاید اس نے تمہیں اسی لیے فون کیا ہو؟“

”تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو حالانکہ اس کے نزدیک ہر بات ہی اہم ہوتی ہے۔ اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ دن بھر کاؤچ پر لیٹی چاکلیٹ کھاتی رہتی ہے اور ٹی وی پر اپنے شیئرز کو بڑھتا ہوا دیکھتی رہتی ہے اور وقفے وقفے سے مجھے فون پر ہدایات دیتی رہتی ہے۔“

”لگتا ہے وہ بہت دولت مند ہے؟“ کولن نے پوچھا۔

”پیسا میرے لیے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ یقین کرو، میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک ملین ڈالرز بھی خرچ کر سکتی ہوں کیونکہ اس کے مرنے کے بعد سب کچھ میرا ہی ہوگا۔“

کولن نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”شاید تمہاری ناراضی کی یہی وجہ ہے کہ وہ اب تک زندہ کیوں ہے یا دوسرے الفاظ میں کہہ لو کہ خزانے پر سانپ بن کر کیوں بیٹھی ہوئی ہے۔“

”تم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“ کلیرائس نے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنی انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں ایک تلخ حقیقت بتانا چاہ رہی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں صورتِ حال کا اندازہ ہو جائے گا۔“

کولن نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔ کافی وقت ہو گیا تھا اور ابھی کئی کام نمٹانے تھے لیکن کلیرائس باتوں میں لگ کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کلیرائس نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا۔

”واقعی کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اسے اب تک مر جانا چاہیے تھا۔ تم جانتے ہو کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی جس کی وجہ سے اسے بہتر زندگی گزارنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ تم خود ہی فیصلہ کرو کہ کیا میں ایسا سوچنے میں حق بجانب نہیں ہوں۔“

”یقیناً! ان حالات میں تمہارے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہے۔“ وہ پیار سے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے کپڑے لے کر آتا ہوں۔ تب تک تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ اور اپنے بال بھی سنوار لو۔“

”تمہارے بغیر میں کیا کروں گی؟“ وہ اس کے قریب آ کر ایک ادا سے بولی۔

”تم مجھے تصور میں یاد کرتی رہنا تو تنہائی محسوس نہیں ہوگی۔“

☆☆☆

گیراج کا دروازہ کھولتے وقت کولن نے اسپورٹس کار کو دیکھ کر سر ہلایا اور اسے اپنی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ وہ محض ایک کار کے لیے یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو کلیرائس اور اس کی ماں کی دولت کے معمولی حصے کے بھی برابر نہیں تھی۔ کلیرائس نے اپنی ماں کے بارے میں .... جو گوہر افشانی کی تھی، وہ سننے کے بعد کولن کا ذہن مختلف خطوط پر کام کر رہا تھا۔ کلیرائس نے اپنی ماں کی صحت کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، اس کے مطابق وہ چند دنوں یا مہینوں کی مہمان تھی اور کسی بھی وقت اس کے مرنے کی خبر آ سکتی تھی۔ پھر کلیرائس ہی اس کی لاکھوں کی جائداد کی واحد وارث ہوتی اور ظاہر ہے کہ وہ اس حالت میں اتنی بڑی جائداد کا انتظام نہیں سنبھال سکتی تھی۔

اسے یقیناً ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو اس کی مدد کر سکے۔ جس پر اسے پورا بھروسا ہو اور اس کام کے لیے کولن سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ اس کے قریب رہے۔ اس کے چھوٹے موٹے کام کرتا رہے اور اسے یہ احساس دلائے کہ کولن سے بڑھ کر اس کا کوئی دوست اور ہمدرد نہیں ہو سکتا۔

کولن محسوس کر رہا تھا کہ کلیرائس کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ بن چکا ہے اور وہ اپنے کام کے لیے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ پہلے ان کے درمیان کوچ اور کلائنٹ کا تعلق تھا اور کولن کی ذمے داری صرف اتنی تھی کہ وہ کلیرائس کو نارمل زندگی گزارنے میں مدد دے سکے لیکن اب اس تعلق کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کلیرائس کے رویّے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کولن کو صرف کوچ ہی نہیں بلکہ اپنا دوست اور ہمدرد بھی سمجھنے لگی ہے ورنہ کبھی بھی اپنی قیمتی گاڑی اس کے حوالے نہ کرتی۔ وہ بھی کتنا بے وقوف تھا کہ سونے کے ڈھیر کو چھوڑ کر ایک سکّے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد کلیرائس بالکل تنہا رہ جائے گی اور ایسی صورت میں صرف وہی اس خلا کو پورا کر سکتا ہے۔

کولن لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے کا قائل تھا۔ جب کلیرائس اس پر پوری طرح اعتماد کرنے لگتی اور اسے یقین ہو جاتا کہ وہ اس کی ذات کے لیے ناگزیر ہو چکا ہے تو کسی بھی سہانی شام وہ اسے شادی کا پروپوزل دے سکتا تھا۔ کلیرائس کی بے کیف زندگی میں یہ پیشکش ہوا کا تازہ جھونکا ثابت ہوتی اور وہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ جاتی۔ کلیرائس سے شادی کرنے کے بعد وہ بلا شرکتِ غیرے اس کی تمام دولت اور جائداد کا مالک بن جاتا۔ گو کہ نام کلیرائس کا ہی ہوتا لیکن عملاً سب کچھ اس کے اختیار اور تصرف میں ہوتا پھر... وہ ایسی دس گاڑیاں خرید سکتا تھا۔ کلیرائس تو ویسے ہی ایڈ کے عارضے میں مبتلا تھی۔ اس کی توجہ کسی ایک نکتے پر مرکوز نہیں رہ سکتی تھی اور ایک سیکنڈ پہلے کہی ہوئی بات بھی اسے یاد نہیں رہتی تھی پھر وہ کولن سے کیا حساب کتاب کرتی۔ اس کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کے شوہر نے سارا انتظام خوش اسلوبی سے سنبھال لیا ہے۔

کلیرائس کو راستے سے ہٹانا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کوئی بھی حادثہ اسے بہ آسانی دوسری دنیا تک پہنچا سکتا تھا۔ کسی کو اس پر شک نہ ہوتا۔ اس کی میڈیکل ہسٹری اور بیک گراؤنڈ سے سبھی واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کلیرائس کس بیماری میں مبتلا ہے۔ حادثے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ دوا کی اضافی خوراک ہی اس کے دل کی دھڑکن بند کر دیتی اور اس کی موت کا سن کر لوگ تاسف میں سر ہلاتے اور اس کی تعریف میں چند کلمات کہہ کر آگے بڑھ جاتے۔ لیکن وہ ایسا کیوں سوچ رہا ہے؟ اسے کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کلیرائس کے زندہ رہنے یا مر جانے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ اس کی زندگی میں بھی عیش و آرام سے رہ سکتا ہے۔

کار کا اگنیشن آن کرتے ہی اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کی زندگی کا وہ یادگار لمحہ آ ہی گیا تھا جس کا اسے عرصے سے انتظار تھا۔ کار کا انجن غرایا اور سیکنڈوں میں کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ ایک سو بیس کی رفتار سے کنٹری روڈ پر جا رہا تھا اور اس جگہ سے نصف میل کے فاصلے پر تھا جہاں یہ سڑک روٹ ایک سو چالیس سے ملتی تھی اور اس پر ہر وقت ٹریفک چلتا رہتا تھا۔ عین اسی وقت اس کا سیل فون بجنے لگا۔ دوسری طرف سے کلیرائس بول رہی تھی۔

”ہیلو ڈارلنگ! کیا بات ہے؟“ کولن نے پوچھا۔

اسے یوں لگا جیسے کلیرائس بدحواسی میں چلا چلا کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس نے کلیرائس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈیئر! اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ سکون سے بات کرو۔“

”گیراج والوں کا فون آیا تھا لیکن میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ انہیں گاڑی میں مزید کام کرنا ہے اور اس کے لیے کچھ پارٹس درکار ہیں۔“

”کیسے پارٹس؟“ کولن نے چونکتے ہوئے کہا۔

”انہوں نے کہا تھا کہ تمہیں بتا دوں۔ کوشش کے باوجود وہ یہ پارٹس حاصل نہیں کر سکے۔“

”ظاہر ہے کہ یہ کار بیس سال پرانی ہے اور اس کے پرزے درختوں پر نہیں اگتے۔ بائی دا وے انہیں کون سے پارٹس درکار ہیں؟ میں کوشش کرتا ہوں۔“

کولن نے اس کے چیخنے کی آواز سنی۔ وہ ہذیانی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”بریک...... انہیں گاڑی کے بریک تبدیل کرنے ہیں۔“

کولن کا پیر بے اختیار بریک پر گیا۔ روٹ ایک سو چالیس کی کراسنگ قریب آ چکی تھی۔ کولن کا جسم پسینے میں نہا گیا۔ فطری طور پر اس کا ہاتھ ہارن پر گیا لیکن وہ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اب اس کے پاس آخری قہقہہ لگانے کی بھی مہلت نہ تھی۔



راہ گم

ناہید سلطانہ اختر

کوئی زیت کے محل خواہ کتنے ہی خوب صورت بنالے لیکن ... مضبوطی کے نام پر مذاق ثابت ہوتے ہیں۔ خواب تک تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر جب کوئی کسی کی زندگی کو ہی مذاق بنالے تو چلتے پھرتے وجود بھی گالی بن کر رہ جاتے ہیں۔ بالخصوص جب کوئی رشتوں کے تقدس کو بھی پامال کرکے خود کو پارسا ثابت کرتا پھرے تو ہر جذبے سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں غلطی کسی ایک کی ہوتی ہے مگر بھگتنا پورے خاندان کو پڑتا ہے... وہ جو اپنی رنگینیوں کی خاطر گھر کے سارے موسموں کو خزاں کا رنگ دے گیا تھا... اسے کسی کی قربت میں بہت سے رشتوں کو دوری میں بدل کر بھی اپنے رفیق کی رفاقت راس نہ آئی... آتی بھی کیسے... جو اپنی رنگینیوں میں زندگی کی سنگینیوں کو بھلا بیٹھا تھا... اسے تو یاد ہی نہ رہا گھر کی عزت کو لٹیروں کو سونپ کر پردیس کاٹنے والے تمام عمر کے لیے اپنے ہی گھر میں پردیسی بن جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی غلطی کی پاداش میں زندگی کی بڑی آزمائش سے گزر رہا تھا پھر کیسے اس کی ہمسفر اس سے متنفر ہوکر اس کی دلجوئی کرسکتی تھی... یہی قدرت کا قانون ہے... بہار کے موسم میں پت جھڑ نہیں آتی اور پت جھڑ میں پھول نہیں کھلتے۔

تنہائی میں شیطانی کھیل کھیلنے والے ہوس پرستوں کا انجام عبرت

''آپا آپ لائن پر ہی ہیں نا؟''

''سن رہی ہوں یشا۔''

''آئی ایم سو ہیپی آپا۔'' اس کے لہجے میں ایک عجیب سی کھنک تھی۔

''سی نو یشا۔'' مجھے اپنی آواز کسی اندھے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

''اوہ! اٹس ونڈرفل آپا...... میں اس خوشی کو اب محسوس کرسکتی ہوں جو آپ نے سنی اور مومو کو کنسیو کرنے پر محسوس کی ہوگی۔ ہم اس خوشی کے احساس کو الفاظ میں تو بیان نہیں کرسکتے نا آپا۔'' اس کے لفظ لفظ سے خوشی پھوٹے پڑ رہی تھی۔

''ہاں یشا۔'' مجھے اپنا دل منوں بوجھ تلے دبا سا لگ رہا تھا۔ مومو اور سنی کا ذکر کرکے اس نے میرا دل مزید دکھا دیا تھا۔ وہ دونوں اب میری زندگی میں کہاں تھے۔ ان کی اپنی اپنی زندگی شروع ہوچکی تھی۔ دونوں بہت مگن تھے اپنی اپنی دنیا میں۔ کبھی کبھی مجھے اور ... مختار کو فون کرلیتے تھے بس۔ کھلے ہاتھوں پیسے بھجوادیتے یا ہماری سالگرہ ہوں پر ہمیں وش کردیتے۔ فون پر پیار کرلیتے اور بس۔ ان کے اور اپنے تعلق کو اتنا رسمی، اتنا محدود خود ہم نے کیا تھا۔ گلے کی گنجائش تو ...ی نہیں۔

''آپا! دانش کہتے ہیں کہ وہ مستقل پاکستان آجائیں گے۔ اپنے بچے کی خاطر...... ہے نا اچھی خبر؟''

اچھی خبر...... یک بارگی میرا دل بیٹھنے لگا۔

''آپا! ماں بننا کیسا زبردست اور خوب صورت تجربہ ہوتا ہے۔ عورت کے پاؤں زمین پر ہی نہیں رہتے، ہواؤں میں اڑنے لگتی ہے۔ جیسے مجھے اپنا آپ اتنا امپورٹنٹ لگ رہا ہے۔ دانش کہہ رہے تھے انہیں معلوم ہے کہ مجھے اب لمحہ لمحہ ان کی ضرورت ہوگی۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اب میرے پاس ہی رہیں گے۔'' یشا بولے جارہی تھی، ہواؤں میں اڑ رہی تھی اور میں گنگ سی ہوکر سن رہی تھی۔ گہرے پانیوں میں ڈوبتی چلی جارہی تھی۔

''اچھا آپا! پھر فون کروں گی۔'' یشا کی آواز سے گویا سات سر پھوٹ رہے تھے۔

''اوکے...... یشا۔'' میری آواز میں کرب آمیز سناٹا تھا۔

''امی...... شا۔'' مختار کی نحیف آواز اس سناٹے میں گونج بن کر ابھری۔ میں نے ٹیب ایک طرف رکھا اور ٹیپو کو پکارا۔

''جی بیگم صاحب۔'' ٹیپو لپکا ہوا آیا۔

''دیکھو صاحب بلا رہے ہیں۔'' ٹیپو نے مختار کے کمرے کا رخ کیا حالانکہ انہوں نے اسے نہیں مجھے پکارا تھا۔ کبھی کبھی رشتے کتنے بے معنی اور ان رشتوں میں بندھے انسان کتنے بے حس ہوجاتے ہیں...... لیکن کیا اس بیگانگی اور بے حسی میں سارا قصور صرف میرا ہی تھا؟

☆☆☆

مختار سے میری شادی مجھ سے ان کے یک طرفہ عشق اور میرے پھوپی زاد حنان کی کم ہمتی پر میرے ردعمل کا نتیجہ تھی۔ مختار کی فیملی سے ہمارے پرانے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کے گھر اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ مختار اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہم دونوں بہنیں تھیں اور ایک بھائی۔ عارف بھائی مجھ سے بڑے تھے اور یشا مجھ سے چھوٹی۔ میرے اور یشا کے درمیان پورے بارہ سال کا فرق تھا۔ اسی لیے وہ میری اور عارف بھائی کی بہت لاڈلی ہوا کرتی تھی۔ ہم دونوں اس سے بزرگوں والا سا رویہ رکھتے اور اسے یوں سنبھال سنبھال کر رکھتے جیسے وہ کانچ کی گڑیا تھی جس کے ذرا سی ٹھیس پر بکھر جانے کا خدشہ رہتا ہو۔

حنان میرے پھوپی زاد تھے۔ میں انہیں پسند کرتی تھی اور وہ مجھے لیکن پھوپی جان کو ہماری یہ باہمی پسندیدگی سخت ناپسند تھی اور اس ناپسندیدگی کا سبب امریکا میں مقیم ان کی بہن کی بیٹی ثمین تھی جسے وہ حنان کی دلہن بنانا چاہتی تھیں۔

مختار مجھے پسند کرتے تھے۔ اس کا اظہار بھی بارہا کرچکے تھے اور انہیں حنان کے بارے میں میری پسندیدگی کا علم بھی تھا۔ میں ہمیشہ ان کی حوصلہ شکنی کردیا کرتی تھی مگر وہ بھی نہایت ثابت قدمی سے ڈٹے رہے۔

حنان کی شادی کا مرحلہ آیا تو پھوپی کا پلڑا ثمین کی طرف ہی جھکا۔ میں نے حنان سے اسٹینڈ لینے کو کہا مگر انہوں نے کم ہمتی دکھائی۔

''کیا کروں یار، امی کے آگے بول نہیں سکتا۔ تمہیں پتا ہے نا کس مزاج کی ہیں وہ۔ کہتی ہیں کہ تم نے ثمین کے لیے انکار کیا تو میں دودھ نہیں بخشوں گی۔ ساری عمر تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی۔ آخر کو ماں ہیں یار...... میں انہیں ناراض کرکے اپنی عاقبت تو برباد نہیں کرسکتا نا۔''

''بھاڑ میں جاؤ تم اور بھاڑ میں جائے تمہاری عاقبت۔'' میں نے غصے سے کہا۔ وہ ڈھٹائی سے مسکرادیا۔

''ہاں اگر میں امی کے خلاف گیا تو ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''سوچ لو۔''

''مجبوری ہے۔''

''امریکا جانے کا لالچ ہے؟'' میں نے حنان کو گھورا۔

''نہیں...... امریکا تو میں کیسے بھی جاسکتا ہوں۔''

''پھر؟''

''امی کو ناراض نہیں کرسکتا۔''

''تم اسٹینڈ تو لو حنان...... مان جائیں گی۔ وہ بس بہن اور بھانجی کی محبت میں مری جارہی ہیں ورنہ پیاری تو میں بھی ہوں انہیں۔ آخر کو ان کے بھائی کی بیٹی ہوں۔ بھتیجی ہوں ان کی۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''معلوم ہے تو ہمت کیوں نہیں پکڑتے۔ کبھی کبھی ہمارے والدین صرف آزمانے کو پتا کھیلتے ہیں۔ لگ گیا تو تیر ورنہ تکا...... تم ڈٹ جاؤ گے تو پھوپو بھی مان جائیں گی۔''

''آئی کانٹ یار...... امی کے سامنے تو میں ود منٹ بھی ان کے خلاف نہیں کھڑا رہ سکتا...... آفٹر آل شی از مائی مدر۔''

''اوکے۔'' میرا موڈ بگڑ گیا۔ ''جاؤ، تم اپنی اماں کے قدموں میں بیٹھے رہو اور آئندہ کبھی میرا نام بھی مت لینا۔''

''ناراض مت ہو یار۔''

''میرا جی چاہ رہا ہے تمہیں شوٹ کردوں۔'' وہ ہنس دیا، میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

حنان کی منگنی ثمین سے ہوگئی اور مختار کے والدین نے میرا رشتہ مانگ لیا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ اب حنان نہیں تو کوئی بھی سہی۔ مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔

شادی کے وقت مختار ایک ملٹی نیشنل ادارے میں جونیئر آفیسر تھے۔ شادی کے بعد انہوں نے میرا اتنا خیال رکھا کہ حنان کا خیال میرے لیے ایک ایسی بھولی بسری یاد بن کر رہ گیا جو آتی اور چپکے سے دل کو چھوتی ہوئی گزر جاتی۔

مختار نے مجھے ایک پرسکون اور آرام دہ گھر دیا۔ آسائشیں دیں، عزت دی، پیار دیا اور دو بچے۔ شہریار جسے ہم پیار سے سنی کہا کرتے تھے اور اس سے دو سال چھوٹی موئل جس کا نک نیم مومو تھا۔ مختار اور دونوں بچوں کے ساتھ میری زندگی بڑے مزے اور آسودگی میں گزر رہی تھی۔ مختار اپنی تعلیمی قابلیت، غیر معمولی صلاحیت اور شاندار شخصیت کے باعث ترقی کرتے کرتے اپنے ادارے کے اعلیٰ عہدے تک جا پہنچے تھے۔ ہمارے دونوں بچوں کی اسکولنگ چل رہی تھی۔ مختار صبح انہیں ڈراپ کرتے ہوئے جاتے، چھٹی کے وقت میں انہیں لے لیتی۔ مختار نے شادی کے ابتدائی سال ہی میں مجھے نہ صرف ڈرائیونگ سکھا دی تھی بلکہ شادی کی تیسری سالگرہ پر انہوں نے مجھے ایک گاڑی گفٹ کرکے بقول ان کے مجھے خود کفیل بھی کردیا تھا۔ میں جب اور جہاں چاہتی جا سکتی تھی۔ امی کے ہاں روزانہ نہ سہی ہر دوسرے دن میرا آنا جانا لازم تھا۔ یشا میری چھوٹی بہن ان دنوں کالج میں تھی۔

بچوں کی اسکولنگ جاری تھی کہ مختار کی تعیناتی دبئی میں ہوگئی۔ ہمیں دبئی جانا پڑا۔ مجھے اگر قلق تھا تو یہ کہ امی، ابو اور یشا سے دور ہوجاؤں گی۔ عارف بھائی تو پہلے ہی کینیڈا جاچکے تھے۔ ان کی بیوی اور بچے بھی وہیں تھے۔ ایسے میں مختار اور میں امی ابو کا بہت بڑا سہارا تھے۔ ابو کی پنشن اور ایک مکان سے ملنے والے کرائے سے حاصل شدہ رقم کے باعث انہیں معاشی مسئلہ تو نہ تھا تاہم احتیاجات زندگی پوری کرنے کے لیے اس رقم کو استعمال میں لانے کو باہر آنا جانا امی ابو کے لیے قدرے مسئلہ ضرور تھا جسے میں اور مختار ان کے لیے مسئلہ نہ بننے دیتے تھے۔ وہ صرف پیسے دیتے اور ان کی تمام ضرورتیں گھر بیٹھے پوری ہوجاتیں۔ مختار بچوں کو اسکول چھوڑنے جاتے تو راستے میں امی کے گھر سے یشا کو بھی لے لیتے اور اس کے کالج تک ڈراپ کردیتے۔ واپسی پر وہ کالج وین سے گھر آتی جس دن کوئی مسئلہ ہوتا امی مجھے فون کردیتیں، میں اسے پک کرلیتی۔ یشا کو شاپنگ کرنا ہوتی یا کہیں اور آنا جانا ہوتا تو وہ بس مجھے فون کردیتی۔ میں جانتی تھی ہمارے دبئی چلے جانے سے امی، ابو اور یشا کو بہت دشواری ہوگی مگر جانا بھی ضروری تھا سو جانا پڑا۔

دبئی کے ماحول میں ہم جلد ہی رچ بس گئے۔ مومو اور سنی دبئی آکر بہت خوش تھے۔ نئے اسکول میں انہوں نے جلد ہی نئے دوست بنالیے تھے۔ امی، ابو کی خیر خبر لینے کو میں انہیں بلاناغہ فون کرتی۔ انہوں نے ایک کل وقتی ملازم رکھ لیا تھا۔ گھر کے کام کاج کے لیے ایک جز وقتی ملازمہ تو پہلے بھی آتی تھی لیکن نئے ملازم نے اندر، باہر سارے کام سنبھال لیے تھے۔

ہمیں دبئی آئے دوسرا برس تھا کہ پاکستان سے مختار کے چچا کا سب سے چھوٹا بیٹا دانش ملازمت کے لیے دبئی آیا اور ہمارا مہمان ہوگیا۔ میرا خیال تھا اپنی رہائش کا بندوبست ہونے تک وہ ہمارے ہاں رہے گا پھر چلا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اپنی غیر معمولی خوش مزاجی کے باعث وہ جلد ہی ہم سب سے بہت گھل مل گیا اور ہمارے گھر میں اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی چلی گئی۔ موی اور سنی کا وہ ہارٹ فیورٹ چاچو بن گیا۔ مختار اسے سگے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتے۔ مجھے بھابی جان کہتے اس کا منہ سوکھتا۔ وہ گھر اور باہر کے کاموں میں دامے درمے، سخنے ہمارا ہاتھ بٹاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے چھوٹے سے کنبے کی ناک کا بال بن گیا چنانچہ جب اس نے ہمارا گھر چھوڑ کر اپنے چند دوستوں کے ساتھ جا کر رہنے کا ارادہ کیا تو مختار نے کہا۔ ''یار! یہاں تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

''مختار بھائی جتنی اپنایت، جس قدر آرام مجھے یہاں ہے اتنا تو شاید مجھے پورے دبئی میں کہیں اور نہ مل سکے۔''

دانش نے مختار کی بات پر کہا۔
’’تو پھر کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے؟‘‘ مختار نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔
’’مختار بھائی! روزگار کی خاطر مجھے نہ جانے کتنے عرصے اور یہاں رہنا ہو۔ اپنی رہائش کا بندوبست تو کرنا پڑے گا۔‘‘
’’ابے یار چھوڑو...... کہیں نہیں بس یہیں۔ تمہاری وجہ سے ہمیں بھی پردیس، پردیس نہیں لگتا۔ تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ احساس رہتا ہے کہ ہم دو بھائی ہیں۔‘‘
’’آپ کی محبت ہے مختار بھائی۔‘‘
’’بس تم کہیں نہیں جارہے...... ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔ ہم ادھر ادھر چلے جائیں تو پھر مجبوری ہے۔‘‘ مختار نے میری جانب دیکھتے ہوئے اپنی بات کی تائید چاہی۔ ’’کیوں ایشا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟‘‘
’’بالکل۔‘‘ میں نے تائید کی۔
’’لو بھئی اب تو تمہاری بھابی نے بھی ٹھپا لگا دیا...... تم کہیں نہیں جارہے۔‘‘
’’ہاں چاچو ہم آپ کو کہیں نہیں جانے دیں گے۔‘‘ سنی بھی اپنے ڈیڈی کا ہمنوا ہوا۔
’’پلیز چاچو!‘‘ مومومجسم التجا بن گئی۔ دانش نے میری طرف دیکھا۔
’’خوش قسمت ہو جو سب تمہاری منت سماجت کررہے ہیں۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
’’سوچ لیں...... میرے حصے کی روٹی کسی اور کو نہیں آپ ہی کو پکانا پڑے گی۔‘‘
’’مائی پلیور۔‘‘ میں نے بشاشت سے کہا۔
’’پھر سوچ لیں؟‘‘
’’ارے روٹیاں پکانے سے تھڑدلیاں گھبراتی ہیں۔ ہمارا دل بہت بڑا ہے۔‘‘
مختار نے اپنا ہاتھ پھر دانش کے کندھے پر رکھا اور مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دانش سے فخریہ بولے۔ ’’یار ہم نے کچھ دیکھ کر ہی ان سے شادی کی ہے۔‘‘
’’مختار بھائی! یہ تو میں کیا سارا خاندان جانتا، مانتا ہے کہ آپ کی چوائس بہت اعلیٰ ہے۔‘‘
دانش کی بات پر میں نے منہ پھاڑ کر مختار کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرادیے۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے واشگاف محبوبیت تھی۔ ہم سب کے اصرار پر دانش کو اپنے دوستوں کے ساتھ جاکر رہنے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔
ہمارے گھر کا ایک کمرا دانش کے لیے وقف ہوگیا۔

☆☆☆

مختار نے غلط نہیں کہا تھا۔ دانش کی موجودگی یہ احساس دیتی تھی کہ پردیس میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ کوئی اپنا تھا جو ہمارے چھوٹے سے کنبے کی خوشی غمی میں ہمارا شریک تھا۔ گاڑی میں پیٹرول ڈلوانا ہوتا تو مختار اپنی گاڑی کی چابی دانش کے حوالے کردیتے۔
’’یار گھر آتے ہوئے خیال نہیں رہا۔ تم باہر جاؤ تو گاڑی میں پیٹرول ڈلوالانا۔‘‘ دانش پیٹرول کے پیسے لینے سے انکار کرتا تو مختار آنکھیں دکھاتے۔ ’’اچھا...... اتنے بڑے ہوگئے ہو تم۔‘‘
دانش جھینپ جاتا۔ مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہوتا تو مختار دانش سے کہتے۔ ’’یار تمہاری بھابی کو شاپنگ کے لیے جانا ہے۔ میں تو آج کل بہت بزی جارہا ہوں۔ تمہیں اگر پرابلم نہ ہو تو لے جانا انہیں۔‘‘ بچوں کو کہیں جانا ہوتا تو وہ دانش کے ساتھ جانا پسند کرتے۔
’’پاپا کو تو بس جلدی پڑی رہتی ہے۔ چاچو اچھے ہیں جتنی دیر مرضی آئے باہر رہو، جلدی نہیں کرتے۔‘‘ سنی اور موموبیک زبان دانش کے لیے رطب اللسان رہتے۔
دانش گویا جادو کی چھڑی تھا جس کے گھومنے سے ہماری زندگی میں آسانیوں کی کثرت ہوگئی تھی۔
میں، مختار کو چھیڑنے کو کہتی۔ ’’آپ ہیں بڑے ہوشیار...... دانش کو اپنے گھر میں ایک کمرا دے کر آپ نے اسے اپنے لیے چراغ کا جن بنالیا ہے۔ بے چارہ ایک ٹانگ سے کھڑا رہتا ہے۔‘‘
’’ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔‘‘ مختار کہتے۔
’’آج کل کے چھوٹے بھائی بھی بڑے بھائیوں کا اتنا لحاظ نہیں کرتے جتنا دانش آپ کا کرتا ہے۔‘‘
’’واقعی!‘‘ مختار اثبات میں سر ہلاتے۔ ’’دانش بہت اچھا لڑکا ہے۔‘‘
’’میرا تو وہ بڑی بہنوں کی طرح احترام کرتا ہے۔‘‘
’’چچی جان نے اپنے سارے بچوں کی تربیت بہت اچھی کی ہے۔ سب کے سب اپنے بڑوں کے ساتھ اسی طرح باادب ہیں۔‘‘
مختار کو اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے سلسلے میں کبھی دیر تک گھر سے باہر رہنا ہوتا تو وہ نہایت اطمینان سے دانش کو میرا اور بچوں کا خیال رکھنے کی ہدایت کرکے خود بے فکر

ہوجاتے۔
’’دانش میاں آج میری واپسی ذرا دیر سے ہوگی۔ اپنی بھابی اور بچوں کا خیال رکھنا۔‘‘
’’آپ فکر ہی نہ کریں۔‘‘ دانش انہیں بڑی سعادت مندی سے اطمینان دلاتا۔
’’گڈ بوائے، یار تمہارے ہونے سے میں گھر کی طرف سے بڑا ریلیکسڈ ہوگیا ہوں۔‘‘
دانش مجھے اور بچوں کو گھمانے پھرانے کے لیے باہر لے جاتا۔ گھر میں ہوتا تو بچوں کے ساتھ ہنستا بولتا، کھیلتا، چائے کا بہت رسیا تھا۔ دن میں جتنی چاہے پلا دو۔
’’بھابی چیاس لگی ہے۔ چائے کی ایک پیالی چل جائے گی۔‘‘ وہ خوش مزاجی سے کہتا۔
’’چائے کی پیالی ایک نہیں دو حاضر مگر چائے کم پیا کرو۔ کالے ہوجاؤ گے۔ لڑکی والے ریجیکٹ کردیں گے۔‘‘ مجھے بھی مذاق سوجھتا۔
’’پروا آشتہ۔‘‘
’’پروا کرنی پڑے گی دیور جی۔ ساری زندگی کنوارے تھوڑی رہو گے۔‘‘
’’کنواروں کے بڑے مزے ہوتے ہیں۔‘‘
’’بائی دے وے کیا؟‘‘
’’چھٹی والے دن کوئی چادر کا کونا کھینچ کر جگانے والی نہیں ہوتی۔ فرمائشوں کی لسٹ نہیں تھامنا پڑتی۔ سیل فون کی چیکنگ کا خطرہ نہیں ہوتا...... آپ ہوتے ہیں اور آپ کی زندگی۔‘‘
’’چھٹی والے دن چادر کا کونا کھینچ کر جگانے والی آپ کے سرہانے بیڈ ٹی بھی تو رکھتی ہے۔ فرمائشوں کی لسٹ تھماتی ہے تو آپ کے مکان کو گھر بنانے کے لیے۔ آپ کا سیل فون چیک کرتی ہے تو آپ کے کہیں گم ہوجانے کے خوف سے۔‘‘ وہ زور سے ہنستا۔
’’ہمارے ابا کہتے ہیں کنوارے کی زندگی دیوانے کی زندگی ہوتی ہے۔ شادی بندے کو پاگل پن سے بچاتی ہے۔‘‘
’’آپ انہیں کوٹ کررہی ہیں جن کے کہے پر کچھ کہنا...... یہ تاب، یہ مجال یہ جرأت نہیں مجھے۔‘‘
’’شادی میں دیر مت کرنا...... جلدی شادی کے بہت فائدے ہوتے ہیں۔‘‘ میں مشورتاً کہتی۔
’’مثلاً؟‘‘
’’مجھے اور مختار کو ابھی ہیئر ڈائی کی ضرورت نہیں پڑی اور بچے بڑے ہوگئے۔‘‘ میں فخر سے کہتی۔
’’یہ تو ہے۔‘‘
’’سو، دیر مت کرنا...... جیسے ہی من پسند لڑکی ملے شادی کرلینا۔‘‘
’’ارے ہے تو۔‘‘
’’ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔‘‘
’’تلاش میں میری مدد کیجیے۔‘‘
’’کیسی لڑکی چاہتے ہو؟‘‘ ایک روز میں نے پوچھا۔
’’بس آپ جیسی ہونی چاہیے...... لونگ، کیئرنگ اور سیلف لیس۔‘‘ اس نے ترت جواب دیا۔
’’تمہیں ایک بات بتاؤں؟‘‘
’’جی۔‘‘ وہ ہمہ تن گوش ہوا۔
’’سیلف لیس نِرا دھوکا ہے۔ ہم کسی کے لیے لونگ اور کیئرنگ بھی اپنی غرض کے تحت ہی ہوتے ہیں۔‘‘
’’کیا مطلب؟‘‘
’’میں جو تمہیں مختار کے لیے لونگ اور کیئرنگ لگتی ہوں تو اس لیے کہ میں خود کو محفوظ اور خوش رکھنا چاہتی ہوں۔ مرد سے عورت کو تحفظ اور خوشی کا احساس رہتا ہے۔‘‘
’’آپ کو مختار بھائی سے محبت نہیں؟‘‘
’’ہر شخص اپنی محبت میں دوسروں سے محبت کرتا ہے۔‘‘
’’گزرگئی۔‘‘ اس نے میری بات نہ سمجھ سکنے پر کہا۔
’’اچھا چھوڑو...... تم فضول کی بحث میں کیوں پڑ گئے...... سیدھی سی بات ہے شادی بروقت۔‘‘
’’میں نے آپ کا گرانقدر مشورہ پلو میں باندھ لیا ہے۔‘‘

☆☆☆

مختار کو کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے کوالالمپور جانا تھا۔ بچوں کے امتحانات نہ چل رہے ہوتے تو شاید میں بھی بچوں کے ہمراہ ان کے ساتھ کوالالمپور جانے کی فرمائش کردیتی۔ نئی نئی جگہیں گھومنے پھرنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ میں مختار سے اکثر کہا کرتی تھی۔ ’’اگر میں عورت نہیں مرد ہوتی تو ابن بطوطہ کی جانشین بنتی۔‘‘
’’شکر ہے کہ تم مرد نہ ہوئیں ورنہ میں کہاں مارا مارا پھرتا۔‘‘
’’آپ جیسے ہینڈسم اور کماؤ مرد کو لڑکیوں کی کیا کمی۔‘‘ میں ان کے منہ سے اپنی تعریف سننے کو کہتی۔
’’یار، تم جیسی مجھے کوئی اور کہاں ملتی...... تمہیں بنانے کے بعد تو اللہ نے وہ سانچہ ہی توڑ دیا ہوگا۔ ون اینڈ اونلی۔‘‘
’’جناب! ہر بندہ ون اینڈ اونلی ہی ہوتا ہے۔‘‘
’’کلوننگ بھی ہونے لگی ہے مادام...... ذرا چیں بہ جبیں ہوئیں تو تم جیسی ایک اور آرڈر کردوں گا۔‘‘ مختار مجھے چھیڑنے کو کہتے۔

''قتل کردوں گی۔''
''کسے؟''
''آپ کو اور......''
''اور؟''
''اس کلونگ کو۔''
مختار قہقہہ مار کر ہنستے پھر کہتے۔ ''آفٹر آل ہو تو عورت ہی۔ دوسری کے ذکر سے بھی چڑتی ہو۔''
''ذکر سے۔'' میں مختار کو گھورتی۔ ''میں اس تصور سے بھی چڑتی ہوں کہ آپ میرے علاوہ کسی اور عورت کو دیکھیں بھی۔''
''یو آر مائی لو...... یو آر مائی ڈارلنگ...... تمہارے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتا میں۔'' مختار مجھے محبوبانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتے۔
حقیقت بھی یہ ہی تھی کہ مختار مجھ سے غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ ہم دونوں جہاں جاتے مرکز نگاہ بن جاتے۔ ہمارے درمیان گہری ذہنی ہم آہنگی تھی۔ مختار سے شادی کے بعد شروع شروع میں مجھے حنان کا خیال آیا ہو تو اور بات لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں یہ بالکل ہی بھول گئی تھی کہ کبھی حنان نام کا میرا ایک کزن میری محبت ہوا کرتا تھا۔ جس کے بنا جینے کا تصور بھی محال تھا میرے لیے۔ میں زندہ تھی...... حنان کے بغیر اور خوش بھی۔
مختار کانفرنس میں شرکت کے لیے کوالالمپور جانے لگے تو انہوں نے دانش سے کہا۔ ''یار، اپنی بھابی اور بچوں کا خیال رکھنا۔''
''آپ فکر ہی نہ کریں۔'' دانش نے انہیں اطمینان دلایا۔
''تمہارے ہوتے مجھے فکر تو خیر نہیں مگر......'' مختار کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔
''مگر......؟'' دانش کے لہجے میں تجسس آمیز بے تابی تھی۔
''یہ جو تمہاری بھابی ہیں نا...... ان سے ایک دن کی دوری بھی مجھے شاق گزرتی ہے۔''
''بچوں کے ایگزامز نہ ہوتے تو میں آپ کو اکیلا جانے دیتی بھلا؟''
''اور کیا میں جاتا تمہیں اکیلا چھوڑ کر؟''
''آپ فکر نہ کریں مختار بھائی، میں یہاں ہوں نا۔''
''تھینک یو یار۔'' مختار نے دانش کا شانہ تھپتھپایا۔ ''تمہارے ہونے سے بڑا سہارا ہے مجھے۔''
مختار کوالالمپور چلے گئے۔ میں، بچے اور دانش انہیں ائرپورٹ تک چھوڑنے گئے۔ ائرپورٹ سے واپسی پر گھر کے راستے میں دانش نے گاڑی ڈرائیو کرنے کے ساتھ ہمیں اپنی باتوں میں بھی لگائے رکھا۔ میں سمجھ سکتی تھی کہ وہ مختار کے جانے کے بعد مجھے اور بچوں کو اداس دیکھ کر ہمیں اپنی باتوں سے بہلانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس سے پہلے مختار اس طرح مجھ سے اور بچوں سے دور کبھی نہ گئے تھے۔ کہیں جانا بھی ہوتا تو میں اور بچے انوٹ انگ بنے ان کے ساتھ ہوتے۔

☆☆☆

مختار کو کوالالمپور گئے تیسرا دن تھا۔ بقول ان کے وہ وہاں مصروف بہت تھے لیکن جیسے ہی وقت ملتا، وہ مجھ سے اور بچوں سے فون پر بات کرتے۔ وہ ہمیں اور ہم انہیں بہت مس کررہے تھے۔ چوتھی شب میں نے بڑا عجیب سا خواب دیکھا۔ جیسے میں تیز آندھی میں سنی اور مومو کے ساتھ کھڑی ہوں۔ دونوں مجھ سے چمٹے ہوئے ہیں۔ خوف زدہ ہیں، تیز ہوا زمین سے ہمارے پاؤں اکھیڑے دیتی ہے۔ میں پریشان ہوں کہ خود کو سنبھالوں یا بچوں کو سہارا دوں۔ بچے خوف زدہ ہو کر رونے لگتے ہیں۔ میں مختار کو پکارتی ہوں۔
''مختار...... مختار...... مختار......'' مگر مختار کا کہیں پتا نہیں پھر جیسے کوئی کہتا ہے مختار کی ڈیڈ باڈی تو اسپتال میں پڑی ہے۔
میری آنکھ کھلی تو میرا دل بری طرح دھک دھک کررہا تھا۔ خوف سے میرا پورا جسم اینٹھے جارہا تھا۔ تشنج کی سی کیفیت تھی۔ مجھے شدید ڈر لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی میں مختار کے بارے میں کچھ عجیب و غریب خواب بارہا دیکھتی رہی تھی۔ جیسے وہ بیمار ہیں...... کہیں چلے گئے ہیں اور میں انہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں یا پھر ان کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملتی ہے لیکن اس خواب نے تو مجھے جی جان سے لرزا دیا۔ شاید مختار گئے ہوئے نہ ہوتے تو میں انہیں اپنے قریب سوتے دیکھ کر حواس بحال کرلیتی مگر ان کی عدم موجودگی نے میرے خوف میں مزید اضافہ کردیا۔ بچے میرے کمرے ہی میں سو رہے تھے مگر انہیں جگا کر ان سے یہ کہنا کہ میں خواب میں ڈر گئی تھی حماقت ہوتی۔ ویسے بھی صبح دونوں کا پیپر تھا۔ میں نے خود کو تسلی دینے اور نارمل ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہی بلکہ خوف اور جسم کی اینٹھن میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ میں اٹھی اور دروازہ کھول کر دانش کے کمرے تک جا پہنچی۔ تین چار مرتبہ دستک دی۔ دروازہ کھلا تو دانش میرے روبرو تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بے ساختہ چونکا۔ اس کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی میں نے ازخود کہا۔ ''دانش میں ڈر گئی ہوں۔''
''کس سے؟''
''خواب میں۔'' میرا بدن ہنوز لرز رہا تھا بلکہ دانت

بجنے لگے تھے۔
''ارے آپ تو بری طرح کانپ رہی ہیں۔'' اس نے کہا۔
''مجھے تسلی دو...... مجھے تسلی دو، دانش...... مختار کو فون کرو۔ فوراً واپس آجائیں۔''
''ریلیکس۔''
''میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے۔'' میں سرتاپا کانپ رہی تھی۔
''خواب...... خواب ہوتے ہیں بھابی۔ کچھ نہیں ہوتا......'' اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔
''نہیں دانش...... نہیں۔'' میں نے اس کی بات کی نفی کی۔ میں نے جو خواب دیکھا تھا، اس کے خوف سے نہیں نکل پارہی تھی۔ تندوتیز ہوا، بچوں کا سہم کر مجھ سے لپٹ جانا۔ میرا مختار کو پکارنا، کوئی جواب نہ ملنا اور پھر کسی کا یہ کہنا کہ مختار کی ڈیڈ باڈی تو اسپتال میں پڑی ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب کچھ خواب نہیں حقیقت تھی اور اگر حقیقت نہیں بھی تھی تو اسے حقیقت بن جانا تھا۔ خوف پھنکاریں مارتا میری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ میرا عالم خواب سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آنا اور دانش کا مجھے بار بار تسلی دینا بھی کچھ کام نہ کررہا تھا۔ میرے جسم پر طاری لرزہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ دانت مسلسل کٹکٹاتے چلے گئے۔ میرے سر میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میں بول بھی نہیں پارہی تھی۔ مجھے اپنے جوفِ دہن میں گوشت پوست کی نرم و ملائم زبان کے بجائے سخت لکڑی کا ایک ٹکڑا حلق تک پھنسا محسوس ہو رہا تھا۔ میں گرنے لگی تھی کہ دفعتاً مجھے دانش نے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا۔
''آپ کو اسپتال لے چلوں؟'' اس نے کہا۔
شاید میں نے اثبات میں سر ہلایا ہو۔ پہلے اس نے اپنی جیکٹ بیڈ سے اٹھا کر میرے شانوں پر ڈالی پھر مجھے سہارا دے کر گاڑی تک پہنچا۔ مجھے بچوں کے اکیلے پن کا، گھر کا، کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ مجھے گاڑی میں ڈال کر دانش تیز رفتاری سے اسپتال روانہ ہوگیا۔ راستے میں وہ بار بار پوچھتا رہا۔ ''آر یو آل رائٹ؟''
''آل رائٹ؟''
میری حالت لمحہ بہ لمحہ ابتر ہوتی چلی جارہی تھی۔ اسپتال پہنچے تو میں اپنے قدموں پر گاڑی سے اترنے کے قابل نہ تھی۔ دانش لپک کر وہیل چیئر لے آیا۔ مجھے اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر وہیل چیئر پر بٹھایا اور ایمرجنسی میں لے گیا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی بلڈ پریشر چیک کیا اور ڈیوٹی نرس کو مجھے فوری انجکشن لگانے کی ہدایت کی۔ بعد میں دانش نے مجھے بتایا کہ میرا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا میں آبزرویشن میں رہی۔ اس دوران دو مرتبہ مجھے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دانش تمام وقت میرے آس پاس رہا۔ انجکشن لگانے سے بلڈ پریشر کم ہوا تو ڈیوٹی ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا ہوا تھا؟''
''ڈاکٹر! یہ سوتے میں خواب دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔'' میرے بجائے دانش نے جواب دیا۔
ڈاکٹر کی حس مزاح تیز تھی۔ ''خواب سوتے ہی میں دیکھے جاتے ہیں۔'' اس کی اردو اس کے پاکستانی یا انڈین ہونے کی گواہ تھی۔ دانش جھینپ کر مسکرا دیا۔
ڈاکٹر نے بڑے دوستانہ انداز میں دانش کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''بیویوں کو اتنا خوف زدہ نہیں رکھنا چاہیے کہ بے چاریاں سوتے میں بھی ڈر جائیں۔''
''آئی ایم سوری ڈاکٹر یہ...... میری بھابی ہیں۔''
''اوہ!'' ڈاکٹر چونکا۔ ''ان کے ہسبینڈ؟''
''وہ آج کل یہاں نہیں ہیں۔''
''آئی سی۔'' ڈاکٹر نے میری طرف توجہ کی اور اپنی خوش طبعی کے اظہار سے باز نہ رہا۔ ''اردو زبان کی ایک ضرب المثل ہے میاں ہمارا گھر نہیں ہمیں کسی کا ڈر نہیں پھر بھلا آپ کیوں ڈر گئیں؟''
''تھینک یو ویری مچ ڈاکٹر۔'' میں جو اپنی حالت میں اب بہت بہتری محسوس کررہی تھی، دھیمی آواز میں بولی۔
''میاں کا خوف بھگانے کا شکریہ ادا کررہی ہیں؟'' ڈاکٹر مسکرایا۔
''جی نہیں...... وہ تو بہت اچھے ہیں۔ ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل شوہر۔''
''ڈاکٹر! انہوں نے انہی کے بارے میں خواب دیکھا تھا۔'' دانش نے کہا۔
''کیا وہ اتنے ہی خوف ناک ہیں؟''
''قابل رشک حد تک ہینڈسم ڈاکٹر۔''
''اوہ!'' ڈاکٹر نے مجھے دیکھا۔
''ہمارے خاندان میں ان دونوں کو چاند سورج کی جوڑی سمجھا جاتا ہے۔'' ڈاکٹر کی بے تکلفی نے دانش کو بھی بے تکلف کردیا تھا۔
''کبھی موقع ملے تو ملوائیے گا ان سے۔'' ڈاکٹر نے

مجھ سے کہا۔

''جی ضرور۔''

''اب کیسا محسوس کررہی ہیں آپ؟'' ڈاکٹر نے میری نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت بہتر۔''

''گڈ۔'' ڈاکٹر نے نرس کو میرا بلڈ پریشر پھر چیک کرنے کی ہدایت کی۔

''اب آپ گھر جاسکتی ہیں لیکن دو تین دن تک بلڈ پریشر چیک کرواتی رہیں۔''

''اوکے۔''

''اور ہاں۔'' ڈاکٹر نے انگلی کھڑی کی پھر اس کا رخ دانش کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''ایسا دیور خدا ہر بھابی کو دے۔ یہ اگر اتنی رات گئے آپ کو اسپتال لے کر نہ پہنچتے تو آپ کسی بڑی ایمرجنسی سے بھی دوچار ہوسکتی تھیں۔''

''اٹ واز مائی ڈیوٹی۔'' دانش نے کہا۔

ڈاکٹر نے دانش کو ستائشی نگاہوں سے دیکھا۔ میں بیڈ سے نیچے اترنے لگی تو دانش نے جو مجھے گھر سے اسپتال لاتے ہوئے بے تکلفی سے اپنا سہارا دیتا رہا، اب قدرے ہچکچاتے ہوئے مجھے بیڈ سے اترنے کو اپنے ہاتھ کا سہارا دیا۔

گھر واپس پہنچے تو دونوں بچے اسی طرح گہری نیند میں تھے۔

''اب آپ آرام سے سوجایئے۔ صبح جلدی اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ میں بچوں کو ناشتا بھی بنادوں گا، اسکول بھی پہنچادوں گا بلکہ واپسی پر بھی انہیں پک کرلوں گا۔'' دانش نے مجھ سے کہا۔

''مجھے نیند نہیں آرہی، لاؤنج میں بیٹھوں گی۔''

''چلیے تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔''

''مختار کی اگر تم سے بات ہو تو انہیں کچھ مت بتانا۔''

''کیوں؟''

''خوامخواہ پریشان ہوں گے بلکہ بچوں کو بھی نہ بتانا، وہ مختار کو بتانے سے باز نہ رہیں گے۔''

''اوکے۔''

''مجھے تو نیند نہیں آرہی۔ صبح ہونے میں ابھی دو ڈھائی گھنٹے ہیں، تم جاکر سوجاؤ صبح آفس بھی جانا ہوگا۔''

''آپ دوبارہ ڈر گئیں تو؟'' دانش کی حسِ مزاح بھی پھڑکی۔

''بہت خوفزدہ کردینے والا خواب تھا۔'' میں نے جھرجھری لی۔

''اچھے اچھے خواب دیکھا کیجیے۔''

''انسان کے اپنے بس میں تھوڑی ہوتا ہے۔''

''ہوتا ہے...... انسان دن بھر جن خیالات کو اپنے دل و دماغ میں بسائے رکھتا ہے وہی رات کو خواب بن جاتے ہیں۔ آپ آج کل دن بھر مختار بھائی کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں۔ ان کی طرف سے فکرمند رہتی ہیں اس لیے آپ نے ان کے بارے میں ایسا پریشان کن خواب دیکھا۔''

''او خدایا! بہت خوف ناک خواب تھا۔''

''ریلیکس...... خواب بس خواب ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے اوپر اتنا نہیں طاری کرنا چاہیے۔''

''تم نہ ہوتے تو میں آج رات خوف سے مرہی جاتی دانش۔''

وہ میرے نزدیک آ کھڑا ہوا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت تھی جس نے مجھے نظریں چرانے پر مجبور کردیا۔ یکایک وہ نیچے بیٹھ گیا۔

''آپ مرجاتیں تو دانش کیسے زندہ رہ پاتا۔'' اس نے کہا۔ میں نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

''آئی لو یو۔'' اس نے کہا پھر وہ ایک سانس میں بولتا ہی چلا گیا۔ ''مجھے آپ کتنی اچھی لگتی ہیں کاش...... میں آپ کو اپنا دل کھول کر دکھا سکتا۔ میرا جی چاہتا ہے مختار بھائی سے آپ کو چھین کر مخمل کی کسی ڈبیا میں چھپا کر اپنی شرٹ کی فرنٹ پاکٹ میں رکھ لوں تاکہ میرے دل کی ہر دھڑکن کو آپ کی قربت کا احساس رہے۔ میرا جی چاہتا ہے مخمل کی اس ڈبیا کو اپنی جیب میں چھپا کر میں دور، بہت دور چلا جاؤں جہاں کوئی اس ڈبیا کو مجھ سے نہ چھین سکے۔ آپ بولتی ہیں تو میرا جی چاہتا ہے آپ کو سنے جاؤں۔ آپ مسکراتی ہیں تو میں اپنے ہوش کھونے لگتا ہوں۔ آپ کی ہنسی مجھے پاگل کردیتی ہے۔ میں نے اپنے خواب آپ کے تصور سے سجا رکھے ہیں۔ آئی لو یو...... آئی میڈلی لو یو۔''

میں دم بخود تھی۔ یکایک اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کردیے اور گڑگڑا کر بولا۔ ''آپ کو اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم مجھے کبھی روکیے گا مت...... میں ساری زندگی اسی طرح آپ کے قدموں میں بیٹھا رہنا اور آپ سے محبت کرتے رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے...... میں ادھوری زندگی نہیں جینا چاہتا۔ میں آپ کے قدموں میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔'' میں گنگ تھی۔

''مجھے اپنے سے دور جانے کو تو نہیں کہیں گی نا کبھی؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں دہل رہی تھی۔ یہ حقیقت تو اس خواب سے بھی زیادہ دہشت ناک تھی۔ میری آواز، الفاظ سب نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔

''میرے اس جرم کی آپ کی طرف سے مجھے جو بھی سزا ملے قبول ہے لیکن میں بے بس ہوں...... آپ سے محبت کیے بنا نہیں رہ سکتا۔''

میں نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ نہ جانے کتنی دیر خاموشی سے گزری پھر یکایک مجھے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر بھاری انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے ہڑبڑا کر اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹا لیے۔

''آپ مختار بھائی کو بتانا چاہیں تو بے شک بتا دیں۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں...... میں پوری دنیا کو چلا چلا کر بتا سکتا ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔'' اب میں نے بولنے کی ہمت کی۔

''تمہیں پتا ہے تم یہ سب کیا کہہ رہے ہو؟ کس سے کہہ رہے ہو؟''

''ہاں مجھے پتا ہے۔'' اس نے دیدہ دلیری سے کہا۔ ''آپ کوئی خدا نہیں ہیں جس کے سامنے بولا نہ جا سکے۔''

''میں تمہارے فرسٹ کزن کی بیوی ہوں۔ سگے بھائی اور فرسٹ کزن میں کچھ زیادہ دوری کا رشتہ نہیں ہوتا۔''

''لیکن کرنے والے سگے بھائی کی بیوی سے بھی محبت کر بیٹھتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''لاحول ولاقوۃ۔''

''مگر جو میں نے کہا اس سے آپ انکار نہیں کر سکتیں۔''

''دو بچوں کی ماں ہوں میں۔''

''محبت دو کیا آٹھ بچوں کی ماں سے بھی ہو سکتی ہے۔''

''دانش!'' میں نے اسے غصے سے گھورا۔

''آپ مجھے گھوریں یا قتل کر ڈالیں اپنی محبت سے دستبردار ہونے پر مجبور نہیں کر سکیں گی...... آئی لو یو...... لو یو۔''

''مجھے پتا ہوتا کہ تم میری مدد کرنے پر اتنے دیدہ دلیر ہو جاؤ گے تو میں خوف سے مر جانے کو ترجیح دیتی۔''

''او گاڈ! آپ غلط سمجھ رہی ہیں...... میں کوئی ایڈوانٹیج لینے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ جو حقیقت ہے وہ میں نے بتا دی ہے آپ کو۔''

''مجھے اپنے آپ سے شرم محسوس ہو رہی ہے۔''

''آپ کا کیا دوش...... قصور میرا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو اس کا سزاوار صرف میں ہوں۔''

''بات منہ سے نکلی ہے۔ کوٹھوں چڑھتی ہے۔ قصوروار مرد ہی کیوں نہ ہو کردار کشی ہمیشہ عورت کی، کی جاتی ہے۔ مختار کی اور میری پرسکون زندگی کو بے سکون کیوں کرنا چاہتے ہو۔ مانتی ہوں کہ جوان بیوی کی موجودگی میں مختار نے ایک نوجوان کزن کو اپنے گھر میں رکھ کر بہت بڑی بھول کی ہے۔''

وہ شرمندہ ہونے کے بجائے دھیرے سے مسکرا دیا۔ ''اب تو وہ یہ حسین بھول کر چکے۔'' اس کی نظریں میرے چہرے پر تھیں۔

میں کچھ دیر ساکت و صامت رہی پھر میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں مختار کو کچھ نہیں بتاؤں گی کیونکہ ایسی باتوں سے افراد اور خاندانوں میں تصادم ہوتا ہے۔''

اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ''آپ بتا بھی دیں تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ آپ کی خاطر اگر مجھے تمام زندگی بھی آپ کے در کا فقیر بن کر بیٹھنا پڑا تو آئی ڈونٹ مائنڈ۔''

''حدیں مت کراس کرو۔''

''محبت حدوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔'' دانش جو ہمارے ساتھ قیام پذیر ہونے کے بعد اب تک انتہائی مؤدب رہا تھا، بے حجاب ہو رہا تھا۔ میں لاؤنج سے جانے کو اٹھی۔ اس نے میرا راستہ روک لیا۔

''مجھ سے دور تو نہیں ہوں گی نا کبھی۔'' وہ سراپا التجا بنا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے راستہ کاٹ کر نکلنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے بازو میری راہ میں حائل کر دیے۔

''مجھے جانے دو۔'' میں اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

''آئی لو یو بھابی۔''

میں نے ناگواری سے اسے دیکھا اور تلخ لہجے میں کہا۔ ''بھابی بھی کہتے ہو اور...... جانتے ہو بھابی بڑی بہن اور ماں کی طرح ہوتی ہے۔''

''میں نے سنا ہے کبھی ایک فلم بنی تھی پاکستان میں...... باجی...... اس میں ہیرو، ہیروئن کو باجی کہتا تھا۔''

میں نے اپنے تیور بگاڑ لیے۔

''آپ کی ناراضگی سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں...... بس۔''

''مختار اگر سن لیں تو تمہیں کھڑے کھڑے اپنے گھر

سے نکال ہی نہ دیں۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''گھر کے باہر ٹینٹ لگا دوں گا۔''

''بی ہیو دانش...... مختار نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے اور تم...... انہی کے ہنستے بستے گھر کو آگ لگانا چاہتے ہو۔''

''اوہ نو...... یہ آپ نے کیسے سمجھا۔ خدانخواستہ میں ایسا تو نہیں چاہتا۔''

''تو پھر کیا چاہتے ہو؟''

''ہمیشہ آپ کے نزدیک رہنے...... آپ کے قدموں میں بیٹھے رہنے کی اجازت...... میں کبھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ بس یہ میری اور آپ کی انڈر اسٹینڈنگ ہو گی۔ آپ بے شک مختار بھائی کی بیوی ہی رہیں بس میری محبت قبول کر لیں۔''

میں نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔ ''تم چاہتے ہو میں اپنے شوہر سے بے وفائی کروں؟''

''یہ میں نے کب کہا...... میں تو تمام عمر آپ کے قدموں میں بیٹھے رہنے کی اجازت مانگ رہا ہوں۔ آپ کا تابعدار، آپ کا نوکر بن کر رہوں گا۔''

''تمہیں پتا ہے میں دو تین گھنٹے پہلے کس کرائسس سے گزری ہوں۔ کیوں مجھے مزید پریشان کرنا چاہتے ہو۔''

''سوری...... میرا خیال ہے آپ کو آرام کرنا چاہیے۔''

''تمہاری اس قسم کی باتوں کے بعد میں خاک آرام کروں گی۔'' میں نے ترش لہجے میں کہا۔

''آیئے آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دوں۔''

''رہنے دو...... میرے پاؤں ہیں، خود چلی جاؤں گی۔''

''ناراض نہ ہوں...... پلیز ناراض نہ ہوں۔''

اچانک وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

میں لاؤنج سے اٹھ کر متذبذب سی اپنے کمرے میں آگئی۔ دل و دماغ گویا بگولوں کی زد پر تھے۔ وہ جو اسپتال میں مجھے اپنا ملجا و ماویٰ محسوس ہو رہا تھا اب مجھے اس سے کراہیت آ رہی تھی۔ مرد آخر مرد ہی ہوتا ہے۔ اپنی اصلیت دکھانے سے باز نہیں رہتا۔ مجھے کمزور پا کر دانش نے کس گرگ دیدگی سے حملہ کیا تھا۔ شاید وہ اس خوش فہمی میں رہا ہو کہ اس وقت مختار کی کمی محسوس کرتے ہوئے میں پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آن گروں گی۔ یہ اس کی بھول تھی۔

کمرے میں آ کر میں سو نہیں سکی۔ میرے ذہن میں جوار بھاٹا کی سی کیفیت تھی۔ کبھی مختار پر غصہ آتا کہ کیوں انہوں نے دانش کو اپنے گھر میں جگہ دی۔ وہ تو اچھا بھلا جا رہا تھا۔ مختار ہی نے اسے اصرار کر کے روکا تھا۔ یہ بھی نہیں اسے گھر میں چھوڑ کر دوسرے ملک چلے گئے تھے۔ بجا کہ ان کی مجبوری تھی مگر یہ تو سوچنا چاہیے تھا انہیں کہ...... جوان بیوی کے ہوتے وہ اپنے نوجوان کزن کو گھر میں کیوں چھوڑے جا رہے تھے۔ کبھی مجھے دانش پر غصہ آنے لگتا۔ احسان فراموش! خائن! جس شخص نے اسے سگے بھائیوں کی سی عزت دی اسی کے گھر میں نقب لگانے کے درپے تھا۔

کہنے والے سچ ہی کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ تادیر کشمکش میں رہنے کے بعد مجھے بھی نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو گھر میں سناٹا تھا۔ کمرے سے باہر نکلی تو گھر میں دانش تھا نہ بچے، البتہ ڈائننگ ٹیبل پر چائے کے برتن پڑے تھے جس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہوئی کہ دانش بچوں کو ناشتا کروا کے اسکول لے گیا تھا۔ خدا جانے اس نے بچوں سے میرے بارے میں کیا کہا ہوگا۔ دانش کا کمرا کھلا ہوا تھا، بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک رقعہ پڑا تھا جس پر صرف ایک لفظ درج تھا۔

''سوری۔''

گیارہ بجے کے لگ بھگ اس نے فون کیا۔ میں خاصی دیر کال ریسیو کرنے یا نہ کرنے کے تذبذب میں رہی بالآخر ریسیو کر لی۔

''طبیعت کیسی ہے آپ کی؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''بچے آپ کو جگانا چاہ رہے تھے، میں نے انہیں صرف اتنا بتایا کہ ماما کی طبیعت خراب ہے۔ رات اسپتال جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا میں نے انہیں۔''

''ٹھیک کیا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ناراض ہیں؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''او کے...... سی یو...... اپنا خیال رکھیے گا۔'' میں کتنی ہی دیر دم بخود بیٹھی رہی۔

مختار، میں اور بچے بڑی متوازن تکون تھے۔ دانش اس تکون کو غیر متوازن کرنے کی کوشش کیوں کر رہا تھا۔

میں بچوں کو لینے کے لیے اسکول پہنچی تو دانش مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھا۔

''میں تھا تو آپ کو کیا ضرورت تھی آنے کی؟'' اس نے کہا۔

''بچے میری اور مختار کی ذمے داری ہیں، تمہاری نہیں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

''آپ کی طبیعت جو ٹھیک نہیں تھی۔'' اس نے کہا۔

''طبیعت ٹھیک ہو یا نہ ہو، بچے بہر حال میری ذمے داری ہیں۔'' میں اکھڑے اکھڑے انداز میں بولی۔

وہ چند ثانیے خاموش کھڑا رہا پھر اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''نہ میری تذلیل، نہ آپ کی ناراضگی...... کوئی مجھے میرے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔''

''تم جاؤ...... بچوں کو میں خود لے جاؤں گی۔''

''او کے۔'' اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں دہل کر رہ گئی۔ ایسے تو مختار نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

بچے چھٹی کے بعد اسکول سے نکلے تو مجھے دیکھ کر سخت مایوس ہوئے۔

''آپ کیوں آگئیں، چاچو نے کہا تھا وہ ہمیں پک کرنے آئیں گے۔ او گاڈ...... ہمیں ان کے ساتھ مزہ کرتا تھا۔''

''زیادہ فری نہ ہوا کرو چاچو کے ساتھ۔'' سنی اور موموں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''آپ کیوں جیلس ہوتی ہیں؟'' سنی نے کہا۔

''مجھے کیا ضرورت ہے جیلس ہونے کی...... سمجھا رہی ہوں تمہیں۔ تمہارے سگے چاچو تو ہیں نہیں وہ۔''

''پاپا کے فرسٹ کزن تو ہیں۔'' موموں بولی۔

''ہاں تو اسی لیے تمہیں زیادہ فری نہیں ہونا چاہیے اس سے۔''

''یہ بات آپ اتنے دنوں بعد کیوں سمجھا رہی ہیں؟'' سنی چہکا۔

''کیا مطلب؟''

''اب تو ہمیں جتنا فری ہونا تھا ہو چکے۔'' سنی نے لاابالی انداز میں کہا اور موموں سے اپنی بات کی تائید چاہی۔ ''کیوں موموں؟''

''ہاں۔'' موموں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''آپ کو ہوا کیا تھا؟'' سنی نے جو فرنٹ سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھا تھا، اپنے بازو سینے پر باندھتے ہوئے رخ میری طرف کیا۔

''کب کیا ہوا تھا؟'' میں نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

''رات...... چاچو بتا رہے تھے آپ کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔''

''ہاں بس ایسے ہی...... تھوڑا سر میں درد اور ہلکا سا ٹمپریچر۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''اچھے بچوں کی طرح جو نہیں رہتیں۔'' عقبی نشست پر بیٹھی موموں اگلی دونوں نشستوں کے درمیان سے منہ نکال کر بولی۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکی۔

''ہر وقت بس کام، کام، کام...... پاپا آئیں گے تو شکایت کردوں گی آپ کی۔''

''اچھا دادی جان کر دینا۔'' میں نے اپنی توجہ سڑک پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

''ماما...... یار آپ پاکستان سے کوئی میڈ کیوں نہیں منگوا لیتیں۔ میرے فرینڈ جودت کی ممی نے تو اپنے گاؤں سے ایک میڈ ادھر منگوا رکھی ہے۔ سارے کام کرتی ہے ان کے۔''

''تمہارے پاپا نے گھر میں میڈ کے لیے کوئی جگہ رہنے دی ہے۔ پورا ایک کمرا تو اپنے اس کزن کو دے رکھا ہے۔''

''دمن چاچو؟'' موموں پھر پیچھے سے پہلے کی طرح جھانکی۔

''یس...... آئی مین چاچو۔''

''ہی از سو سوئٹ ماما۔'' سنی نے مدافعتی لہجے میں کہا۔ ''پاکستان سے میڈ منگوائیں تو اسے رہنے کو جگہ بھی تو دینی پڑے گی۔''

''او کے...... نہ منگوائیں۔'' دانش کی حمایت میں سنی نے میڈ منگوانے کے خیال سے فوراً ہی دستبرداری اختیار کر لی۔

''آئی لو یو ماما۔'' موموں نے عقب سے میرے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے ہونٹ اس کے نرم و گداز بازو سے مس کر دیے۔

''میری زندگی...... میری روح۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

واقعی یہی تھا۔ سنی اور موموں میری زندگی میری روح تھے۔ دانش کو میرے، مختار اور بچوں کے درمیان آنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

☆☆☆

کوالالمپور سے مختار کی واپسی ایک بری خبر کے ساتھ ہوئی۔ انہیں دوبارہ پاکستان میں تعینات کیا جا رہا تھا اور وہ بھی شمالی علاقہ جات میں۔ بچوں نے پاکستان واپس جانے کے نام پر سیاپا ڈال دیا۔

''پاپا، دبئی بہت اچھا ہے۔ پاکستان میں تو روزانہ ہنگامے، روز اسکول بند۔'' سنی بولا۔

''بیٹا اپنا وطن تو ہے نا۔''

''یہاں اسکول بھی اچھے ہیں پاپا...... میم بتا رہی تھیں کہ دبئی کے انسٹی ٹیوشنز انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ کے ہیں۔'' موموں نے کہا۔

''ہم نے یہیں رہنا ہے بس۔'' سنی نے فیصلہ سنایا۔

''اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں، میں جاتا ہوں پاکستان...... تم دونوں اپنی ماما اور چاچو کے ساتھ یہیں رہو۔'' مختار نے مذاقاً کہا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

''آپ ہم سے ملنے کے لیے تو آیا کریں گے نا؟'' میرا خیال تھا بچے مختار کی بات کی نفی کریں گے لیکن سنی کتنے اطمینان سے راضی ہو گیا تھا۔

''ہاں ہاں یار...... کیوں نہیں۔'' مختار نے بیٹے کی بات کو مذاق میں لیتے ہوئے مجھے دیکھ کر چپکے سے آنکھ دبائی۔

''ویک اینڈ پر پاپا؟'' موموں نے پوچھا۔

''ہر رات اپنی گڑیا بیٹی کے خوابوں میں۔'' مختار نے موموں کے سلکی بالوں میں اپنی انگلیاں نہایت محبت سے گھماتے ہوئے کہا۔

''بعض خواب انسان کی زندگی کو تلپٹ بھی کر دیتے ہیں۔'' میں کہنا چاہتی تھی مگر نہ کہہ پائی۔

مذاق میں ہونے والی اس بات پر مختار اتنے سنجیدہ ہو گئے کہ انہوں نے کراچی کے مخدوش حالات اور بچوں کی بہتر تعلیم کے پیش نظر مجھے اور بچوں کو دبئی میں رکھنے اور خود پاکستان میں اپنی نئی تعیناتی پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بچوں کی خواہش کے برخلاف میں نے مختار سے اپنے اور بچوں کے بھی پاکستان جانے کی بات کی تو وہ بولے۔

''یہاں بچوں کے لیے بہتر تعلیم کے مواقع زیادہ ہیں۔ یہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے لیے اعلیٰ تعلیم اور بہتر جاب کے لیے انگلینڈ، امریکا جانا بھی آسان ہو گا۔''

''مگر آپ جو نہیں ہوں گے ہمارے ساتھ۔''

''ساتھ تو میں وہاں بھی نہیں ہوں گا۔ تمہیں اور بچوں کو کراچی میں رہنا پڑے گا اور مجھے اپنی ڈیوٹی پلیس پر۔''

''کراچی میں تو سب ہوں گے یہاں میں اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں؟'' میں نے جرح کی۔

''اکیلی کہاں دانش ہو گا نا تمہارے پاس۔'' میں کیا کہتی ان سے، کیا بتاتی انہیں۔ برسوں بعد اب اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا مختار کو۔

''آئی ول مس یو۔'' میری آنکھیں بھر آئیں اور آواز بھرا گئی۔

''تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہیں مس نہیں کروں گا مگر میری مجبوری اور بچوں کا مستقبل...... دبئی دن رات ترقی کر رہا ہے۔ یورپ والوں کے لیے ہالیڈے ریزورٹ بنتا جا رہا ہے۔ قسمت والوں کو ملتا ہے دبئی میں رہنے کا موقع۔ میری اتنی اچھی جاب اور اتنے مالی وسائل نہ ہوتے تو میں کبھی نہیں سوچ سکتا تھا تمہیں اور بچوں کو دبئی میں رکھنے کا۔ فرصت کر کے کوشش کروں گا کہ میری دوبارہ یہیں یا آس پاس پوسٹنگ ہو جائے۔''

میرے گھر والوں کو معلوم ہوا کہ میں مختار کے ساتھ پاکستان واپس لوٹنے کی خواہش مند تھی تو انہوں نے بھی میری حوصلہ شکنی کے لیے ہر حربہ آزمایا اور مختار کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''مختار ٹھیک تو کہہ رہے ہیں۔ کیا کرو گی یہاں آکر۔ آئے دن ہنگامے، شہر بند، بازار بند، اسکول کالج بند نہ جان محفوظ نہ مال محفوظ۔'' ابو نے کہا۔

''جو یہاں سے نکل گیا، وہ امن میں ہے۔'' امی بولیں۔ دانش خاموش تماشائی بنا رہا اور میں دل ہی دل میں ڈرتی، کانپتی رہی۔ ساتھ جانے کے لیے مختار کی منت سماجت کرتی رہی۔ ہوا وہی جو مختار چاہتے تھے۔

مجھے اور بچوں کو دبئی میں چھوڑ کر مختار پاکستان چلے گئے۔

''تمہاری صرف ایک فون کال پر میں پہلی فلائٹ سے تمہارے پاس ہوں گا۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔

کاش...... مختار جانتے کہ کبھی کبھی پہلی فلائٹ ملنے میں بھی اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ منزل تک پہنچنے پر ہم اپنے پیاروں کو ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہیں۔

مجھ سے اگر یہ غلطی ہوئی کہ میں نے مختار کو اس رات کی کتھا سے نہ آگاہ رکھا تو مختار سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے اپنے نوجوان کزن پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے اسے میرا اور بچوں کا کیئر ٹیکر بنا کر ہوا کو آگ کی راہ دکھائی۔

☆☆☆

مجھے اور بچوں کو دبئی میں چھوڑ کر مختار پاکستان چلے گئے اور وہاں انہوں نے شمالی علاقہ جات میں اپنے مقام تعیناتی پر اپنی منصبی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ اپنے قیام و طعام کے لیے انہوں نے ایک خوش حال گھرانے میں بطور پے انگ گیسٹ بندوبست کر لیا۔ مجھ سے اور بچوں سے وہ بلاناغہ بات کرتے۔ رابطے کے جدید ذرائع نے ہمارے لیے وہ آسانیاں فراہم کر رکھی تھیں جن کا چند برسوں پہلے تصور بھی نہ تھا۔ دانش ہمارے ساتھ تھا اور مختار جس فیملی کے ساتھ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہ رہے تھے، بقول مختار نہایت اچھے اور خیال رکھنے والے لوگ تھے۔ صاحب خانہ کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک شادی شدہ دوسری کنواری اور کسی این جی او کی کارکن۔ مختار کے بقول بڑا مطمئن اور مہذب سا گھرانا تھا جہاں انہیں بالکل اپنایت کا ماحول میسر آگیا تھا۔ مختار خوش تھے کہ انہیں غیر لوگوں میں اپنایت مل گئی تھی اور میں اپنے ہی گھر میں اجنبیت کا شکار تھی۔ دانش کی موجودگی مجھے عدم

تحفظ کا احساس دیتی تھی۔ رات کو میں بچوں کے کمرے میں سوتی اور سونے سے قبل بلکہ رات کو نیند میں آنکھ کھلنے پر بھی دروازے کھڑکیاں اچھی طرح چیک کرتی کہ سویا مرا انسان برابر۔ دانش پر مجھے اعتبار نہ رہا تھا۔

مختار کو پاکستان گئے مہینا بھر ہی گزرا تھا کہ ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اچانک دبئی آگئے۔ بہت خوش تھے۔ گالوں پر تمازت تھی۔ خاصے مطمئن نظر آتے تھے۔ ان کے آنے سے بچے جو خوش ہوئے سو ہوئے، میرے قلب و نظر کو یک گونہ تسکین ملی۔ اپنے گھر میں، میں بہت دن بعد اطمینان اور خوشی محسوس کر رہی تھی مگر اس طمانیت اور خوشی کے دوران دانش کی نگاہیں مجھے بار ہا اپنا تعاقب کرتی اور رقابت کی آگ میں جلتی محسوس ہوئیں۔

تین دن ہمارے ساتھ گزار کر مختار واپس چلے گئے میں پھر اسی تنہائی اور عدم تحفظ کا شکار ہوگئی۔

نئی کلاسیں شروع ہونے سے قبل بچوں کو ٹرم بریک ملی ہوئی تھی۔ دونوں رات گئے تک اپنی اپنی دلچسپیوں کے مشاغل میں لگے رہتے اور صبح دیر تک لمبی تانے سوتے رہتے۔ دانش اپنا ناشتا خود بناتا۔ دفتر کے لیے تیار ہوتا اور چلا جاتا۔ میں صبح خیز تھی مگر کوشش کرتی کہ دانش کے جانے سے پہلے بلا ضرورت کمرے سے نہ نکلوں۔ اگر ضرورتاً نکلتی بھی تو ہمارے درمیان شاذ ہی بڑی رسمی سی گفتگو ہوتی۔

''چائے بنانے جارہا ہوں پئیں گی؟''

''نہیں......ابھی نہیں۔''

''سینڈوچ بناؤں آپ کے لیے؟''

''نہیں...... بچوں کے ساتھ ناشتا کروں گی۔''

مختار کے واپس جانے کے بعد ایک روز اس نے کہا۔ ''مختار بھائی کے سامنے تو آپ بہت خوش رہیں۔'' میں نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کبھی مجھے دیکھ کر بھی مسکرا دیا کیجیے۔'' میرا دل جیسے ساکت ہوگیا۔ مختار سے اس کا کیا مقابلہ تھا۔

''مختار میرے شوہر ہیں۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں آپ کے۔'' چائے میں شکر گھولتے ہوئے اس کی نگاہیں چائے کی پیالی پر مرکوز تھیں۔

''میں اگر مختار کو بتا دیتی تو؟''

''تو......؟'' وہ چمچ پیالی میں چھوڑ کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ مجھے الفاظ نہ ملے۔

''جس کسی نے بھی میرے اور آپ کے درمیان آنے کی کوشش کی خواہ وہ آپ کا شوہر ہی کیوں نہ ہو، نقصان اٹھائے گا۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟''

''ساری زندگی آپ کے نزدیک رہنا۔''

''میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ میرا گھر ہے، شوہر ہے، بچے ہیں۔''

''ہاں......تو کیا ہوا......کیا میں آپ سے آپ کا گھر، شوہر اور بچے چھیننے جارہا ہوں۔''

''مگر مجھے اپ سیٹ تو کر رکھا ہے تم نے۔''

''میں نے تو نہیں کہا آپ سے اپ سیٹ ہونے کو۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''میں بہت ڈسٹرب ہوں۔'' میں روہانسی ہوگئی۔

''مجھ سے زیادہ نہیں ہوں گی۔'' میں بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوگئی۔

''پلیز......فار گاڈ سیک۔'' میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کر دیے۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور سر جھکا کر اپنے لب میرے ہاتھوں سے مس کر دیے۔ میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

''آئی لو یو......آئی لو یو۔'' اس نے کہا۔

میں نے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے کھینچ لیے۔ دن بھر میں الجھی الجھی رہی۔

☆☆☆

بچوں کی نئی کلاسیں شروع ہوگئیں۔ روز و شب کا معمول پھر وہی ہوگیا۔ اپنے ہی گھر میں اجنبیت کا وہی احساس دبے پاؤں ہمہ وقت میرے ساتھ چلتا رہا۔ میں سخت الجھی الجھی اور ناخوش سی رہتی۔ زندگی کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ جانے وہ کون سی گھڑی تھی جو دانش ہمارے گھر آیا تھا۔

مختار دوسری بار مجھ سے اور بچوں سے ملنے کے لیے تقریباً دو ماہ بعد دبئی آئے۔ تین چار دن رہے پھر واپس چلے گئے۔ تیسری مرتبہ وہ اور تاخیر سے آئے۔

ادھر میں اور بچے اور اُدھر مختار زندگی کے اس نئے ڈھب کے جیسے عادی سے ہوتے چلے گئے۔ دانش پاکستان جانے کا نام نہ لیتا حالانکہ اس کے گھر والے اسے پاکستان بلانے کے لیے مصر رہتے۔ کبھی کبھی اس کے گھر والے مجھ سے بھی بات کر لیتے۔

''بھئی ہم تو بہت شکر گزار ہیں تمہارے اور مختار کے کہ دانش کے تم لوگوں کے ساتھ رہنے سے ہمیں اس کی طرف سے کوئی الٹی سیدھی فکر نہیں ہوتی۔'' وہ شکر گزاری کا اظہار کرتے۔

بچوں کی موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو مختار نے مجھے اور بچوں کو پاکستان بلوانے کا ارادہ کیا۔ دانش نے بھی دفتر سے چھٹی لے کر ہمارے ساتھ ہی پاکستان جانے کی تیاری کر لی۔ مجھے سخت کوفت ہوئی۔ پاکستان میں میرا اور بچوں کا قیام زیادہ تر امی کے ہاں اور چند دن مختار کے گھر والوں کے ساتھ رہا۔ مختار سے خصوصی فرمائش کر کے میں دونوں بچوں کے ساتھ ہفتہ بھر کے لیے شمالی علاقہ جات بھی گئی۔ مختار کو دانش کی پاکستان آمد کا علم تو تھا ہی انہوں نے مجھ سے پوچھے بنا... بالا ہی بالا دانش کو بھی شمالی علاقوں کی سیر کی دعوت دے ڈالی۔ وہ تو جیسے منتظر ہی تھا۔ رختِ سفر باندھا اور ہمارے ساتھ ہولیا۔

''دانش کو ہمارا دم چھلا بنانے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے مختار کے پاس پہنچنے پر شکوہ کیا۔

''کیا ہوا اگر بلا لیا......تمہارا اور بچوں کا اتنا خیال بھی تو رکھتا ہے وہ اتنی دور پردیس میں۔''

''میں پرائیویسی چاہتی ہوں۔ انسان کی اپنی بھی کوئی پرائیویٹ لائف ہوتی ہے۔ یہ کیا کہ ہر وقت ایک غیر متعلق آدمی آپ کے سر پر مسلط رہے۔''

''ڈونٹ وری......دیو دل گیٹ آل دی پرائیویسی یو نیڈ۔'' انہوں نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

مختار نے بتایا کہ وہ ہمیں ہوٹل میں ٹھہرانا چاہتے تھے مگر جس فیملی کے ساتھ ان کا قیام بطور پے انگ گیسٹ تھا، انہوں نے اصرار کیا کہ ہوٹل کے بجائے ہمیں بھی ان کا مہمان رکھا جائے، سو ہمارا قیام انہی لوگوں کے ساتھ رہا۔ سربراہِ خانہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر تھے۔ اہلیہ بڑی ملنسار سی خاتون تھیں۔ دو بیٹیاں تھیں، شادی شدہ بیٹی اور اس کا شوہر امریکا میں رہتے تھے۔ چھوٹی غیر شادی شدہ بیٹی پہلے ایک این جی او سے وابستہ تھی لیکن کچھ دن قبل مختار نے اسے اپنے ادارے میں ملازمت دلوا دی تھی جس پر لڑکی خود اور اس کے اہلِ خانہ بھی مختار کے انتہائی ممنون دکھائی دیتے تھے۔

ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ مختار کو جب موقع ملتا، ہمیں گھمانے پھرانے لے جاتے۔ صاحب خانہ کی چھوٹی بیٹی بھی ایک دو بار ہمارے ساتھ گئی۔ خوش شکل، ہنس مکھ اور سمجھدار سی لڑکی تھی۔ مختار کا بہت خیال رکھتی تھی۔ صبح صبح نوکر سے ان کے لیے بیڈ ٹی بھجواتی۔ انہیں کپڑے استری شدہ ملتے، جوتے چمچما رہے ہوتے۔ گھر واپس آتے تو شام کی چائے کھٹاک سے پہنچتی۔ رات کو بہترین کھانا اور صاف ستھرا بستر۔

''مزے ہیں آپ کے تو۔'' میں نے مختار کی اس گھر میں آؤ بھگت دیکھ کر کہا۔

''جب سے ان کی بیٹی کو جاب دلوائی ہے زیادہ معتقد ہوگئے ہیں۔'' مختار بولے۔ ہفتہ بھر مختار کے پاس گزار کر ہم کراچی لوٹ آئے۔ امی، ابو اور میشا کی خواہش تھی کہ بچوں کی تعطیلات ختم ہونے تک ہم پاکستان میں ہی رہیں مگر بچوں کو دبئی کی یاد ستانے لگی تھی۔

دبئی پہنچے تو دوسرا تیسرا دن ہی تھا کہ ایک روز دانش نے کہا۔ ''آپ نے ایک بات نوٹ کی؟''

''کیا؟'' میں بے ساختہ چونکی۔

''جس فیملی کے ساتھ مختار بھائی رہتے ہیں، ان کی بیٹی کچھ زیادہ ہی خیال نہیں رکھتی آپ کے شوہر نامدار کا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا۔

''آپ نے واقعی نہیں نوٹ کیا۔'' اس نے اچنبھا ظاہر کیا۔

''کیا؟''

''دونوں انوالو ہیں۔''

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں۔''

''ایسی ہی بات ہے......گھر والیوں کی طرح خیال رکھتی ہے وہ مختار بھائی کا اور مختار بھائی بھی اسے خاصی لفٹ کرواتے ہیں۔ دیکھا نہیں اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر دفتر لے جاتے ہیں۔''

وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ صبح سویرے اس لڑکی کا نوکر کے ہاتھ ہی سہی مختار کے لیے بیڈ ٹی بھجوانا، دفتر جانے کے لیے استری شدہ کپڑے، پالش شدہ جوتے، ان کی ہر ضرورت کا خیال، وقت پر چائے، وقت پر کھانا اور ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر آفس جانا یہ سب تو میں نے بھی نہ صرف دیکھا بلکہ مختار کو ٹوکا بھی تھا۔

''یہ آپ کے ساتھ آپ کی گاڑی میں آفس کیوں جاتی ہے؟'' میں نے مختار سے کہا تھا۔

''کیا ہوا یار......یہ لوگ اتنا خیال بھی تو رکھتے ہیں میرا۔ ایک ہی جگہ جانا ہوتا ہے اسے بھی اور مجھے بھی۔ اس کے بیٹھنے سے میری گاڑی گھس تو نہیں جاتی۔''

''مجھے اچھا نہیں لگا۔''

''آئی نو......آئی نو یو آر ٹو پوزیسو اباؤٹ می۔''

''کیا نہیں ہونا چاہیے مجھے آپ کے بارے میں پوزیسو......میں بیوی ہوں آپ کی۔''

''دقیانوسی بیوی مت بنو۔ میں تمہیں کھلے دل والی

اور روشن خیال بیوی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یقین رکھو جہاں ہوں، جس کے ساتھ بھی ہوں تمہارا ہی رہوں گا...... یار! تم جیسی خوب صورت بیوی کے ہوتے میں کسی اور طرف بھٹک سکتا ہوں بھلا۔''

''قتل کر دوں گی اسے بھی جو آپ کو بھٹکائے اور آپ کو بھی۔'' میں نے جارحانہ تیوروں سے کہا۔ مختار زور سے ہنس دیے۔

دانش کی بات نے میرے دل کے واہمے کو پھر سے اکسا دیا۔ مختار کا فون آیا تو میں نے ان سے کہا۔ ''ایک بات بتایئے اس لڑکی میں انوالو ہیں آپ؟''

''کیوں شک کرتی ہو مجھ پر؟'' مختار نے کہا۔

''مجھے لگ رہا ہے۔''

''پاگل ہو تم۔'' مگر میرے دل سے وہم رفع نہ ہوا۔

اگلی بار جب مختار دبئی آئے تو مجھے اپنے اور ان کے درمیان اس لڑکی کی موجودگی کا وہم مستقل ستاتا رہا۔

''آپ اس لڑکی میں انوالو ہیں نا؟'' میں نے مختار سے کہا۔

''فرض کرو...... ہوں تو؟'' میں نے مختار کو بے یقینی سے دیکھا۔

''آپ انوالو ہیں؟'' میں نے گویا تصدیق چاہی۔

''ہاں...... ہوں۔''

''کیوں...... کیوں ہیں؟''

''کیونکہ تم میرے پاس نہیں ہوتی ہو۔''

''یہ میری چوائس تھی یا آپ کا فیصلہ؟'' میں غرائی۔

''جو بھی سہی۔'' انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''وہ بیچ، بے غیرت، ذلیل لڑکی۔''

''شی از مائی وائف۔''

''وہاٹ!'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر مختار کو دیکھا۔

''میں اس سے شادی کر چکا ہوں۔''

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور زور سے چلائی۔ دونوں بچے گھبرا کر کمرے سے نکل آئے۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا ماما؟''

''اپنے باپ سے پوچھو۔'' میں نے مختار کی طرف انگلی اٹھائی۔

''کیا ہوا پاپا؟''

''کچھ نہیں۔'' مختار نے بچوں سے نظریں چرا رکھی تھیں۔

''کچھ کیسے نہیں ہوا۔'' میں دہاڑی۔ ''تمہارے ان شریف ابا جان نے دوسری شادی کر لی ہے۔'' میں نے بچوں کو بتایا۔

دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے رہ گئے۔ دونوں شاکڈ نظر آتے تھے۔

مجھ پر ہیجان سا طاری ہونے لگا۔ مختار کا گریبان پکڑ کر میں نے انہیں بری طرح جھنجوڑا۔ میں یقیناً بچوں سے بھی زیادہ صدمے میں تھی۔ مختار سر جھکائے مجرم بنے کھڑے تھے۔ مختار پر میرا بھروسا پارہ پارہ ہو چکا تھا۔

یہ میری زندگی کا وہ اندوہناک صدمہ تھا جس نے میرے دل کو قبرستان کی طرح ویران کر دیا۔ عورت کی زندگی میں اس عذاب سے بڑا دوسرا کوئی عذاب نہیں شاید کہ اس کے ہوتے اس کے مرد کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آجائے۔

اعترافِ حقیقت کے بعد مختار دو دن دبئی میں رہے۔ ہمارے کمرے الگ ہو گئے۔ نگاہیں بدل گئیں اور آنے والے دنوں میں راستے بھی۔ بعض حادثے کتنے دل فگار ہوتے ہیں۔

☆☆☆

مختار کے جانے کے بعد دانش نے جو، ان کی موجودگی میں خاموش تماشائی بنا رہا تھا، میرا صدمہ بٹانے کی کوشش کی۔

''میں نے آپ سے کہا تھا نا۔''

میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں اس صدمۂ گراں میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ایک شانے کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ دانش نے اپنا شانہ پیش کر دیا۔

''میں اس شخص کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مگر خود کو تو سزا نہ دیں۔'' دانش نے کہا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے آنسو پونچھنے کے لیے مجھے ٹشو پیپر پیش کیا۔

''جو شخص آپ کا وفادار نہیں آپ اس کے لیے آنسو کیوں بہا رہی ہیں؟'' اس نے کہا۔

''وہ میرا شوہر، میرے بچوں کا باپ ہے۔''

''اب صرف آپ کا شوہر نہیں رہا اور ہو سکتا ہے کہ صرف آپ ہی کے بچوں کا باپ بھی نہ رہا ہو۔ کوئی اور دعوے دار بھی دنیا میں آجائیں۔''

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے میری دلجوئی کی۔

''روتی کیوں ہیں...... میں ہوں نا...... ساری زندگی آپ کے قدموں میں بیٹھ کر گزارنے کا آرزومند۔ اس سے ڈیوورس لے لیں، میں آپ سے شادی کر لوں گا۔'' میں نے بلبلا کر اسے دیکھا۔

''تاکہ لوگوں کو ہنسنے کا موقع ملے۔''

''لوگوں کی کون پروا کرتا ہے...... ویسے بھی ہم ان لوگوں سے بہت دور ہیں جن کی پروا کی جاسکتی ہے۔'' میں نے دانش کو تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

''ہم اور بھی دور چلے جائیں گے امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا تاکہ آپ تک کسی کی آواز ہی نہ پہنچ سکے۔''

''اور لوگ مختار کی دوسری شادی کو برحق سمجھیں...... عزیزوں، رشتے داروں میں چہ میگوئیاں ہوں کہ میں تمہارے ساتھ انوالو ہو گئی تھی اس لیے مختار نے انتقاماً دوسری شادی کی اور میری بدکرداری پر مجھے آزاد کر دیا۔ تم سے شادی کے بعد مجھے کسی سے بدکرداری کی سند لینے کی تو ضرورت نہیں رہے گی۔ تم سے میری شادی میری بدکرداری کا ثبوت ہو گی۔'' میں نے تند و تلخ لہجے میں کہا۔

''اوکے...... آپ اگر اسی شخص کے نام سے بندھے رہنا چاہتی ہیں تو مجھے یہ بھی قبول ہے۔''

میں نے چونک کر دانش کو دیکھا۔ وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔

''میں پھر بھی آپ ہی کا رہوں گا۔''

☆☆☆

دانش کی دلجوئی نے میرے دل پر مختار کی بے وفائی سے لگنے والے گھاؤ پر مرہم کا کام کیا۔ دانش دن بہ دن میرے قریب سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ہم گناہ کی دلدل میں اتر گئے۔

مختار نے اپنی ذمے داریاں بھلائیں نہ معمول بدلا۔ وہ اسی طرح میری اور بچوں کی کفالت کرتے رہے۔ مہینا دو دو مہینا بعد دبئی آتے اور چند دن رہ کر واپس چلے جاتے۔ میرے اور ان کے تعلقات میں جو سرد مہری آگئی تھی، وہ کم ہو کر نہ دی۔ وہ آتے تو دانش نہایت مؤدب اور محتاط ہو جاتا۔ ان کے جاتے ہی اس کی نگاہوں میں میرے لیے دوسری کیفیت ڈولنا شروع ہو جاتی۔ مختار سے مستقل ناراضگی اور دوری کے باوجود مجھے دانش کے ہونے سے اپنی زندگی میں مرد کی کمی کا احساس نہ ہوتا۔ بچوں کی موجودگی میں ہمارے درمیان جو لحاظ حائل رہتا، ان کی عدم موجودگی میں

سنہری کرنیں

☆ کامیابی کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کتنے بلند خیالات کے مالک تھے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

☆ انسان اپنی غلطیوں کا بہترین وکیل اور دوسروں کی غلطیوں کا بہترین جج ہوتا ہے۔

☆ دوستوں کے غم میں ہر حال میں شامل ہوا کرو لیکن خوشیوں میں تب تک نہ جاؤ جب تک وہ آپ کو خود نہ بلائیں۔

☆ تم وہ نہیں ہو جو ہجوم میں نظر آتے ہو بلکہ تم اصل میں وہ ہو جو تنہائی میں ہو۔

☆ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھائی کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

☆ اللہ کو عبادت سے اور مخلوق کو اخلاق سے راضی رکھو۔ دنیا اور آخرت دونوں میں خوش رہو گے۔

☆ کم ترین علم وہ ہے جو زبان پر رہے اور بلند ترین علم وہ ہے جو کردار سے ظاہر ہو۔

مرسلہ۔ اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ جہلم

☆☆☆

☆ کچھ لوگوں کو ہم سے بہت مسئلے ہوتے ہیں لیکن یہ ان کے مسئلے ہیں ہمیں بالکل فکر نہیں کرنی چاہیے۔

☆ قدرت یتیموں کو سائے دینے والے درختوں کے سائے لمبے کر دیا کرتی ہے۔

☆ جب تم عزیزوں، رشتے داروں، اولاد اور دوستوں سے چڑنے لگو تو جان لو اللہ تم سے ناراض ہے اور جب تم اپنے دل میں دشمنوں کے لیے رحم محسوس کرنے لگو تو سمجھ لو تمہارا خالق تم سے راضی ہے۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑدی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

بے حجاب ہوجاتا۔ رات کو بچوں کے سونے کے بعد میرے گھر میں گناہ کی فصل لہلہانے لگتی۔ تنہائی میں، میں ہوتی اور خیالات کا ایک سیل رواں۔

کیا مختار کو کبھی یہ خیال نہ ستاتا ہوگا کہ جوان بیوی کو اپنے نوجوان عم زاد کے ساتھ چھوڑ کر انہوں نے کیسی فاش خطا کی تھی۔

وطن میں بیٹھے اپنے پرائے نہ جانے کس کس انداز سے سوچتے ہوں گے۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ دانش سے ناجائز مراسم استوار کر کے میں نے مختار سے انتقام لیا تھا یا اپنا کمزور ہونا ثابت کیا تھا۔

میں جو مختار کی دوبارہ دبئی تعیناتی کی دعائیں مانگا کرتی تھی، اب دل و جان سے چاہتی تھی کہ ان کو دوبارہ کبھی دبئی میں پوسٹ نہ کیا جائے۔

وقت کے ساتھ ہماری زندگی ہی نہیں دعائیں بھی بدل جاتی ہیں۔ بچے بھی مختار سے پہلے کی طرح قریب نہ رہے تھے۔ وہ دبئی آتے تو ان سے گھر آئے مہمان کی طرح تکلف سے بات کرتے۔ رہی سہی کسر مختار کی دوسری بیوی کے ہاں بیٹے کی پیدائش نے پوری کر دی تھی۔

مختار چار پانچ سال پاکستان میں رہے پھر انہیں سنگاپور پوسٹ کر دیا گیا۔ مجھے اپنے لوگوں سے پتا چلا کہ وہ اپنی دوسری بیوی اور بچے کے ساتھ سنگاپور چلے گئے تھے۔ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ عورت کے لیے یہ احساس کتنا سوہانِ روح ہوتا ہے کہ اس کے مرد کی زندگی میں اس کی اور اس کے بچوں کی جگہ ایک دوسری عورت اور اس کے بطن سے جنم لینے والی اولاد نے لے لی ہے۔

دانش نے میرا دھیان بٹایا۔

''تمہیں اس شخص سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں ہوں نا تمہاری زندگی میں۔''

دانش جو اوروں کے سامنے مجھ سے بڑے تکلف اور آپ جناب سے بات کرتا، خلوت میں بے تکلفی سے تم پر آجاتا۔

''کب تک؟'' میں نے بلبلا کر اسے دیکھا۔ ''تم بھی کب تک رہو گے میری زندگی میں...... شادی ہو جائے گی تمہاری تو پھر تم ہو گے اور تمہارے بیوی بچے۔''

اس نے میرے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری زندگی میں تمہاری جگہ کوئی دوسری عورت نہیں لے سکے گی۔''

''دیکھیں گے۔'' میں نے کہا۔

''دیکھ لینا۔''

''ویسے بھی تمہارے گھر والے تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں شادی کے لیے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''کس بارے میں؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''میری شادی کے بارے میں...... کیا مجھے شادی کر لینی چاہیے؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں...... یہ تو تم بہتر جانتے ہو گے۔''

''ہوں۔'' وہ مسکرایا اور میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ''تمہیں میں چھوڑ نہیں سکتا اور......''

''اور......؟''

''گھر والوں کو زیادہ عرصہ ٹال نہیں سکتا...... اس لیے سوچتا ہوں شادی کا ٹنٹا بھی نمٹا ہی دوں۔''

میرا دل بیٹھنے لگا۔ مختار کے بعد وہ بھی مجھے دھوکا دینے جا رہا تھا مگر اس کی اگلی بات نے میرے دل کو سہارا دیا۔

''شادی کے بعد اسے پاکستان ہی میں رکھوں گا...... گھر والوں سے کہہ دوں گا کہ فیملی دبئی میں رکھنا میں افورڈ نہیں کر سکتا اور دبئی کو میں چھوڑ نہیں سکتا۔''

مجھے میشا کا خیال آیا۔ امی، ابو کو اس کی شادی کی فکر لگی ہوئی تھی اور وہ کہتی تھی امی، ابو کو میں چھوڑ نہیں سکتی اور کسی دوسرے کی پابند بن کر میں اس کے گھر میں بندھی بیٹھی نہیں رہ سکتی۔

''تمہاری شادی میشا سے نہ کروا دوں؟'' میں نے کہا۔

وہ بے ساختہ چونکا۔ ''میشا سے؟'' اس نے تعجب سے کہا۔

''ہاں۔'' میں نے توثیق کی۔ ''وہ بھی امی ابو کو چھوڑنا نہیں چاہتی اور شادی کے بعد شوہر کی پابند ہو کر اس کے گھر میں بیٹھنا نہیں چاہتی۔ امی ابو نے اس سے کہا کسی ایسے آدمی سے تمہاری شادی کر دیتے ہیں جو گھر داماد کی شرط پر راضی ہو مگر وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوتی۔''

''کیوں؟''

''وہ کہتی ہے جو گھر داماد بن کر رہے گا وہ میرے ساتھ آپ لوگوں کو بھی اپنا یرغمال سمجھے گا۔ اچھی جاب کر رہی ہے۔ جاب کرنے والی اکثر لڑکیوں کی پرابلم یہی ہوتی ہے۔''

''کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''دوسرے کو کم ہی خاطر میں لاتی ہیں۔ خود کفیل ہونے کا احساس انہیں زعم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بہرحال تمہارے لیے میشا کا رشتہ آئیڈیل ہوگا۔ کبھی کبھی چلے جایا کرنا پاکستان بھی۔'' وہ کچھ نہیں بولا۔

دو چار دن کے بعد میں نے پھر یہی موضوع چھیڑا۔

''تو پھر کیا سوچا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''کس سلسلے میں؟''

''میشا سے شادی کے سلسلے میں...... امی ابو میری بات نہیں ٹالیں گے اور جب میشا کو بھی یہ یقین دلا دیا جائے گا کہ شادی کے بعد اسے امی، ابو کے ساتھ ہی رہنا ہوگا اور اس کا شوہر بھی گھر داماد بن کر نہیں رہے گا تو وہ بھی تیار ہو جائے گی۔''

''دیکھ لیں۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''میرے خیال میں تو اس سے بہتر کوئی دوسری صورت ہو ہی نہیں سکتی۔''

''ایز یو وش۔''

''لیکن ایک مسئلہ تمہاری شادی سے بھی زیادہ گمبھیر ہے دانش۔''

''وہ کیا؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''بچے سمجھدار ہو گئے ہیں۔ ان کی موجودگی میں جب تم مجھ سے بات کرتے ہو تو مجھے تمہاری طرف دیکھتے ہوئے ڈر محسوس ہونے لگتا ہے۔ آئی کانٹیکٹ سے دل کے بھید کھل جاتے ہیں۔''

''نو پرابلم۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا پھر دھیرے سے مسکرایا۔ ''آج کل بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے انہیں اعلیٰ تعلیم کی خاطر یورپ، امریکا بھجوا دیا جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکی۔

''اے لیول کے بعد سنی اور مومو کو مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ یا امریکا بھجوایا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ خود بھی بہت خوش ہوں گے اس بات سے۔''

میرا دل جیسے کسی نے نہایت بے رحمی سے شکنجے میں کس لیا۔ سنی اور مومو کے بغیر ایک دن نہیں گزارنے کا تصور تھا میرے نزدیک۔ سو میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ''میں ان کے بغیر کیسے رہ سکوں گی؟''

''میرے بغیر رہ لیں گی؟'' اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ میں چپ رہی۔

زندگی کبھی کبھی ہمیں کیسے دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ مختار سے میرا رشتہ بس نام کی حد تک رہ گیا تھا۔ وہ میرے اور بچوں کے کفیل تھے اور بس...... اور دانش میرا نامحرم ہوتے ہوئے بھی محرم بن گیا تھا۔

☆☆☆

وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ میں نے ابو سے میشا کے لیے دانش کے رشتے کی بات کی تو دونوں بہت خوش ہوئے۔

''لڑکا تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ اگر میشا راضی ہو جاتی ہے تو ہمیں اس رشتے پر خوشی ہوگی۔'' دونوں کا مشترکہ جواب تھا۔

میں نے میشا سے بات کی اور اسے یقین دلایا کہ دانش سے اس کی شادی ہو جانے کی صورت میں اسے امی ابو کو چھوڑنے کا خدشہ نہیں ہوگا۔ وہ اطمینان سے ان کے ساتھ رہتی رہے گی۔ دانش اس کے پاس آتا جاتا رہے گا۔ اگر وہ خود دانش کے پاس کچھ دنوں کے لیے دبئی آنا چاہے تو بخوشی آ کر میرے گھر میں دانش کے ساتھ رہ سکے گی۔ باتوں باتوں میں، میں نے امی ابو اور میشا کو یہ بھی بتا دیا کہ اے لیول کے بعد میں سنی اور مومو کو مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ یا امریکا بھیجنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے تو مختار کے پاس مالی وسائل کی کوئی کمی نہ تھی۔

امی ابو اور میشا کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد میں نے دانش سے اپنے گھر والوں کو میشا کا رشتہ مانگنے کے لیے امی ابو کے پاس بھیجنے کی بات کی۔

دانش کے گھر والے اس کا رشتہ کہیں اور کرنا چاہتے تھے لہٰذا دانش کی خواہش پر اس کے گھر والوں نے شروع میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن دانش کے ڈٹے رہنے پر بالآخر وہ مان گئے۔ میشا سے دانش کا رشتہ طے ہو گیا۔

شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ میں نے بڑھ چڑھ کر امی ابو کا ہاتھ بٹایا۔ خاندان میں میری واہ واہ ہو گئی۔

''بہن ہو تو ایسی...... ماں کی طرح نمٹایا ہے بہن کو۔'' لوگوں نے کہا۔

شادی کے بعد دانش اور میشا ہنی مون پر چلے گئے۔ میں بچوں کے ساتھ دبئی واپس آ گئی۔

میشا کو امی ابو کے پاس چھوڑ کر دانش دبئی واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا نا دنیا کی کوئی دوسری عورت میری زندگی میں آپ کی جگہ نہیں لے سکتی۔''

''میشا میری بہن ہے۔'' میں نے کہا۔

''سو واٹ۔'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور سرد لہجے میں بولا۔ ''میرے لیے وہ ایک خانہ پُری کی حیثیت رکھتی ہے۔''

میں، جو دانش اور میشا کی شادی کے بعد ان کہی بے قراری سے دوچار تھی، سکون میں آ گئی۔ ہماری خودغرضیاں ہمیں کبھی کبھی اپنے مقام سے کتنا نیچے گرا دیتی ہیں۔ میں بھی اپنی بہن کی خوشیوں کی گردن مارے دے رہی تھی۔

☆☆☆

شادی کے بعد وہ دن جو زندگی کے راستے پر ہمسفری اختیار کرنے والے نئے جوڑے کے ایک دوسرے کو سمجھنے کے دن ہوتے ہیں۔ دانش، میشا کے بجائے میرے ساتھ گزار رہا تھا اور خوش تھا۔ میں نے محسوس کیا شادی کے بعد وہ زیادہ بے باک اور بے حجاب ہو گیا تھا۔

میشا اسے روزانہ فون کرتی۔ اپنا، امی، ابو اور اپنی جاب کا احوال اسے سناتی۔ وہ گھر میں ہوتا اور میشا سے فون پر بات کر رہا ہوتا تو میری نظریں تمام وقت گرگ باراں دیدہ کی طرح اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتی رہتیں۔ وہ بھی گاہے بہ گاہے کن انکھیوں سے مجھے دیکھے جاتا۔ میشا سے محتاط لہجے میں بات کرتا۔ بنالگاوٹ کے عموماً سپاٹ لہجے میں۔ میشا سے بات کرتے ہوئے کبھی مسکراتا یا ہنستا تو میرے سینے میں کھلبلی سی مچنے لگتی۔ مجھے اپنی ہی بہن سے جلاپا محسوس ہونے لگتا۔ دانش اور میشا کی بات ختم ہونے کے بعد میں دانش کو ٹوکنا نہ بھولتی۔

''کیا بات تھی بہت مسکرا رہے تھے۔''

وہ میرے روبرو آن کھڑا ہوتا۔ مجھے گہری اور بے حجاب نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔ ''سوئٹ ہارٹ یو آر مائی لو۔''

مختار اس کھیل سے لاعلم اپنی ہی دنیا میں مگن تھے۔ بچوں سے ملنے آتے تو میں نامحرم کی طرح ان سے کھنچی کھنچی رہتی۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ میرے اور بچوں کے حقوق کا بٹوارا کیا تھا اور اس لیے بھی کہ ان سے اپنے بگڑے تعلقات بحال کر کے میں دانش کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ دانش کمال کا کھلاڑی تھا۔ مختار سے اپنے تعلقات میں اس نے سرِ مو فرق نہیں آنے دیا تھا۔ وہ آتے تو دانش روزِ اول کی طرح ان کے ساتھ گرم جوشی سے پیش آتا۔ لپک لپک کر انہیں اپنی خدمات سے مستفید کرتا۔ میشا سے دانش کی شادی کے بعد دانش کے ساتھ مختار کا رویہ اور بھی اپنائیت کا ہو گیا تھا۔

مختار کی دوسری بیوی کے ہاں ایک بیٹی بھی ہو گئی تھی۔ بہر حال مجھے اس عورت اور اس کے بچوں سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اب میری اگر کوئی ترجیح یا دلچسپی تھی تو یہ کہ اے لیول کے بعد دونوں بچے مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ یا امریکا چلے جائیں۔ مختار اس سلسلے میں مکمل اعانت کے لیے تیار تھے۔

☆☆☆

میشا سے شادی کے بعد دانش پہلی بار اپنی شادی کی سالگرہ منانے کے لیے میشا اور اپنے گھر والوں کے اصرار پر آٹھ دس دن کی چھٹی پر پاکستان گیا۔ واپس آیا تو میں نے پوچھا۔ ''میشا خوش ہوئی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور تم؟''

''آئی مسڈ یو۔'' اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ''تم نے مجھے مس کیا؟''

''میں سوچتی ہوں...... تم اگر کبھی میری زندگی میں نہ ہوئے تو میں کیسے جیوں گی۔'' میں نے کہا۔

''ایسا کبھی ہوگا ہی نہیں۔''

میشا سے دانش کی شادی کے بعد مجھے اپنی آرائش و زیبائش کا پہلے سے بڑھ کر خیال رہنے لگا تھا۔ میں باقاعدگی سے یوگا کرتی، پابندی سے سیلون جاتی، نئے فیشن کے ملبوسات زیبِ تن کرتی، میری پوری کوشش ہوتی کہ دانش میرے سحر سے نکل نہ پائے۔ سنی اور مومو فخر محسوس کرتے کہ ان کی ماں ان کے تمام دوستوں کی ماؤں سے بڑھ کر دلکش اور اسمارٹ تھی۔

''مام! میری فرینڈز کہتی ہیں تم بالکل بھی اپنی ماما کی طرح نہیں ہو۔'' مومو کہتی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' میں تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کرتی۔

''وہ کہتی ہیں تمہاری مام تو انڈین ایکٹریسوں کی طرح حسین ہیں۔''

میری آنکھوں میں خمار اتر آتا مگر میں مومو کا دل رکھنے کو اسے پیار کرتے ہوئے کہتی۔ ''تمہاری فرینڈز اگر تمہیں میری آنکھوں سے دیکھیں تو تم انہیں انڈین ایکٹریسوں سے بھی بڑھ کر حسین نظر آؤ۔''

''یو آر سو سوئٹ ماما۔'' مومو میرے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیتی۔

''ماما از مار دیلس۔'' سنی کہتا۔

میرا دل اس خیال سے دکھنے لگتا کہ اے لیول کے بعد جب یہ دونوں مجھ سے دور چلے جائیں گے تو میں ان کے بغیر کیسے رہ پاؤں گی۔

☆☆☆

اپنی شادی کی پہلی سالگرہ کے پانچ ماہ بعد دانش نے اپنے گھر والوں کے اصرار پر میشا کو کچھ دنوں کے لیے دبئی بلا لیا۔ دونوں بچے خالہ کے آنے سے بہت خوش ہوئے۔ بظاہر تو خوش ہونے کی اداکاری مجھے بھی کرنی پڑی مگر سچی بات یہ تھی کہ مجھے میشا کا اپنے گھر میں رہنا دوبھر محسوس ہو رہا تھا۔

''امی ابو کو اکیلا چھوڑ کر آتے تمہیں کیسا لگا میشا؟'' میں

نے ایک دن میشا سے پوچھا۔

''بہت برا آپا لیکن مجبوری تھی...... دانش کی امی اور بہنوں کا اصرار تھا کہ مجھے ان کے پاس دبئی ضرور چکر لگانا چاہیے۔''

''تمہارا اپنا دل نہیں چاہتا تھا کیا؟'' میں نے میشا کے تاثرات پر گہری نظر رکھتے ہوئے بظاہر سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''امی، ابو کا خیال رکھنے والا اور کوئی بھی تو نہیں نا آپا۔'' میشا اداس ہو کر بولی پھر اس کی آنکھوں میں یک بیک چمک سی پیدا ہوئی۔ ''ویسے آپا...... بچے ڈھیر سارے ہونے چاہئیں تاکہ ماں باپ کا خیال رکھنے کو ایک نہ سہی دوسرا، تیسرا کوئی تو ہو۔''

''تم اب دانش کے ساتھ رہنا چاہتی ہو گی؟'' میں نے میشا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے اس کے دل کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''اوں۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''دل تو چاہتا ہے آپا ان کے ساتھ رہنے کو مگر...... امی ابو کو بھی تو اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ دونوں ہی بوڑھے ہیں۔ ویسے میں نے دانش سے کہا ہے دبئی چھوڑیں پاکستان آجائیں۔ کوالیفائڈ ہیں، وہاں بھی جاب مل ہی جائے گی۔ میری بھی جاب ہے، دونوں مل کر گزارہ کرلیں گے۔''

مجھے حیرت ہوئی کہ دانش نے مجھے یہ بات کیوں نہیں بتائی تھی۔

''کب کہی تم نے یہ بات دانش سے؟''

''یہاں آنے کے بعد ابھی ایک دو دن پہلے ہی۔''

مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ دانش بے چارہ مجھے یہ بات کیسے بتا سکتا تھا، میشا کے آنے کے بعد سے وہ مجھ سے دور دور ہی تھا۔

''پھر دانش نے کیا جواب دیا؟'' میں نے کریدا۔

''کچھ خاص نہیں...... ہاں ہوں کر کے بولے دیکھیں گے۔''

''اصل میں پاکستان میں حالات اچھے بھی تو نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کروڑوں لوگ اور بھی تو رہ ہی رہے ہیں آپا۔''

''ہاں جو بے چارے کوئی اور راستہ نہیں پا رہے، وہ رہنے پر مجبور ہیں ورنہ جسے موقع ملتا ہے نکل جاتا ہے۔''

''اپنے دیس سے اچھا کوئی اور دیس نہیں ہوسکتا آپا۔''

''چھوڑو میشا...... یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ جہاں آدمی کی جان محفوظ ہو نہ مال، وہاں رہنے سے فائدہ۔''

''مگر...... بٹی ہوئی فیملی بن کر رہنے میں بھی تو نقصان ہے۔''

''بٹی ہوئی فیملی؟''

''ہاں، دانش یہاں میں وہاں۔'' میشا نے دل گرفتگی سے کہا پھر بولی۔ ''میاں بیوی کے دور دور رہنے کے بہت نقصانات ہوتے ہیں آپا۔ اب آپ اپنی ہی مثال لیں نا...... آپ اور مختار بھائی اکٹھے رہ رہے ہوتے تو مختار بھائی دوسری شادی کر سکتے تھے بھلا۔ ان بے چارے کی تو آپ کے چہرے ہی سے نظر نہ ہٹتی تھی۔ یہ جو کچھ ہوا آپ کے اور ان کے دور دور رہنے کی وجہ سے ہی تو ہوا۔ فیملی کو اکٹھے رہنا چاہیے آپا۔ سیکنڈ فیملی نوٹ بھی جاتی ہے۔''

میرا دل پرانے زخم کی طرح ٹیسیں دینے لگا۔ میشا نے کیا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ مختار اور میں منقسم زندگی نہ گزارتے تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا جو ہو گیا تھا۔ نہ مختار کی زندگی میں میری جگہ کوئی دوسری عورت آئی ہوتی نہ میں اور دانش...... وقت کے ساتھ زندگی کے نین نقش کتنے بدل جاتے ہیں کہ ہماری اپنی زندگی بھی ہمیں غیروں کی طرح اجنبی دکھائی دیتی ہے۔

میشا تقریباً ایک ماہ دبئی میں رہی اور وہ ایک ماہ میرے لیے......! جب وہ تیار ہو کر دانش کے ساتھ کہیں باہر جا رہی ہوتی تو میرے رگ و پے میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگتی۔ جب وہ دانش سے بات کرتی، ہنستی یا اس سے بے تکلف ہوتی تو میرے دل و دماغ کی کیفیت ان کہی ہو جاتی۔ میشا کی موجودگی میں میری اور دانش کی نگاہیں ملتیں تو ہم زیادہ دیر ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھ پاتے اور نظریں چرانے پر مجبور ہو جاتے۔ تنہائی میں مجھے احساسِ ندامت آگھیرتا۔ میں کیسی بہن تھی جس نے اپنی سیاہ کاری پر پردہ ڈالے رکھنے کی خاطر اپنی ہی بہن کو ایک دیمک زدہ گھر میں بسا دیا تھا اور اب بھی اسے انہدام سے بچانے کے بجائے اس کے در و دیوار کو مزید کھوکھلا ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔

میشا گئی تو میں نے چین کا سانس لیا۔

☆☆☆

اے لیول کے بعد سنی اور مومو انگلینڈ چلے گئے۔ مختار نے انہیں ان کی مزید تعلیم کے سلسلے میں ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ دانش حسبِ سابق میرے ساتھ رہتا۔ ہو سکتا ہے پاکستان میں مقیم ہمارے عزیز رشتے داروں میں میرے اور دانش کے ساتھ رہنے پر چہ میگوئیاں رہتی ہوں مگر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ امی، ابو اور میشا کا اطمینان میرے اطمینان کے لیے کافی تھا بلکہ میشا تو اکثر شکر گزار بھی ہوتی۔

''تھینک یو آپا، آپ دانش کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔'' وہ کہتی۔

''دانش اور تم میرے لیے دو تھوڑی ہو ہیشا۔'' میں اپنے دل کے چور کو گول مول جواب کی آڑ میں منہ چھپانے کا موقع فراہم کرتی۔

''تھینک یو آپا...... بہن ہو تو آپ جیسی۔ میں تو اپنی کولیگز سے بھی کہتی ہوں میری آپا فرشتہ ہیں فرشتہ۔ میرے میاں کا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھتی ہیں۔''

مجھے ہیشا کے طمانچے کی دھمک اپنے دل پر محسوس ہوئی۔

دونوں بچوں کے انگلینڈ چلے جانے کے بعد تو میری اور دانش کی کمینگی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ہمیں جیسے کسی کا خوف ہی نہ رہا تھا۔ مختار اب دبئی آنے کے بجائے بچوں سے ملنے کے لیے انگلینڈ چلے جاتے۔ میں گناہ آلود زندگی کی دلدل میں گردن تک اتر گئی تھی۔

دونوں بچے انگلستان کی ہوشربا زندگی میں ایسے مست ہو گئے تھے کہ انہیں خود سے کم ہی میری یاد آتی۔ مجھے ان کو اپنی موجودگی کا احساس خود دلانا پڑتا۔

''خود بھی فون کرلیا کرو۔'' میں انہیں پیار سے گھڑکتی۔

''مام! بہت بزی لائف ہے یہاں کی...... دبئی سے بھی زیادہ۔'' جواب ملتا۔

''بکواس مت کرو۔''

''رئیلی۔'' مجھے یقین دلانے کی کوشش ہوتی۔ ''آدھا دن تو انڈر گراؤنڈ ایک اسٹیشن سے دوسرے پر دوڑتے لپکتے ہی گزر جاتا ہے۔ پلک جھپکی نہیں کہ ٹرین یہ جادہ جا۔''

''خیر تم مجھے یاد کرو یا نہ کرو، میں تمہیں بھولنے والی نہیں۔'' میں جتاتی۔

''مام! آپ جیسی ڈیسنٹ اور گریس فل ماں کو کون بھول سکتا ہے۔ بس ذرا مصروفیت زیادہ رہتی ہے...... ہاں چاچو کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔''

''آپ کا خیال تو رکھتے ہیں نا؟''

''ہاں، ہاں۔''

''ہیشا خالہ سے کہیں ان کی غلطی معاف کردیں۔''

''کون سی غلطی؟''

''دانش چاچو کی ان سے شادی کرنے کی غلطی۔''

''غلطی کیسی؟''

''چاچو دبئی میں خالہ پاکستان میں...... دس از ناٹ نارمل۔ ہسبینڈ اور وائف کو ایک ساتھ رہنا چاہیے۔''

''تمہیں زیادہ بڑا بننے کی ضرورت نہیں...... وہ دونوں اپنا اچھا برا خوب سمجھتے ہیں۔''

''او کے...... او کے مدر ڈیئر...... فائن...... کہیں تو کان بھی پکڑ لوں؟''

''ایک ہاتھ میں تو فون ہوگا۔'' مجھے مذاق سوجھا۔

''دوسرے سے دونوں کو باری باری پکڑ لینے میں کیا برائی ہے۔''

''اچھا بس زیادہ شوخی مت دکھاؤ۔''

''مام! آپ بھی ادھر ہی آجائیں...... ہم دونوں کے پاس۔''

''نہیں بھئی، میں یہیں اچھی ہوں۔''

''اچھی تو آپ ہر جگہ ہی ہیں۔'' میری بات کو ذومعنی انداز میں لیا جاتا۔ ''آجائیں، آجائیں بڑا مزہ آئے گا آپ کو یہاں۔''

''آئی تو ہوں دو مرتبہ میرا تو بالکل دل نہیں لگا۔''

بچوں کے انگلینڈ جانے کے بعد میں بھی دو مرتبہ ان سے ملنے کے لیے انگلینڈ گئی تھی اور دونوں مرتبہ دانش نے مجھے جلدی واپسی کا پابند رکھا تھا۔

''مر جاؤں گا تمہارے بغیر۔'' اس نے کہا تھا۔

''تم بھی ہیشا کے پاس ہو آؤ۔''

''کہیں چلا جاؤں، کسی کے پاس چلا جاؤں...... تمہارے بغیر دل نہیں لگتا۔''

''میرا اپنا بھی یہی حال ہے اب۔''

یہ سچ تھا کہ دانش کو کھو دینے کا خوف مجھے دونوں مرتبہ بچوں کے پاس سے جلدی دبئی واپس کھینچ لایا تھا۔

☆☆☆

سات سال گزر گئے۔ پہلے امی کو فالج ہوا اور وہ دو ڈھائی ماہ بستر علالت پر رہ کر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوئیں۔ امی کو ایک برس بھی نہ گزرا تھا کہ ابو کو بھی نمونیے نے آدبوچا اور وہ بھی امی سے جاملے۔ ہیشا کے لیے اب پاکستان میں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہ رہا۔ اس نے دانش کے سامنے دو آپشنز رکھے۔ پہلا یہ کہ وہ خود بھی پاکستان آجائے اور دونوں مل جل کر کمائیں اور اچھی زندگی گزاریں۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ دبئی سے واپس نہیں آنا چاہتا تو اسے بھی دبئی بلا کر اپنے ساتھ ہی رکھے۔ اسے اپنے ساتھ رکھنے کی صورت میں دانش اور میرا راستہ ایک کیسے رہ سکتا تھا۔ ہیشا کو پاکستان ہی میں رکھنے کے لیے دانش نے بہانے

تراشنے شروع کردیے۔
''گھروں کے کرائے بہت ہیں۔ میں افورڈ نہیں کرسکتا۔''
''آپا کے ساتھ رہ لیں کے نا۔''
''آپا بے چاری پر میرا ہی بار کم ہے جو کہ اب تم بھی...... بے منت کروایا کریں گے۔''
''وہ برا منائیں گی اور کس کس چیز کی پے منٹ کریں گے...... گھر کے کرائے کی، کھانے پینے کی یا یوٹیلٹی بلز کی۔ میں افورڈ نہیں کرسکتا۔''
''میں بھی جاب کرلوں گی۔''
''دبئی میں جاب ملنا اب پہلے کی طرح آسان نہیں رہا ہے۔ بہت دھکے کھانے پڑتے ہیں اور اکثر تو دھکے کھانے کے بعد بھی نہیں ملتی جاب۔''
''میں پاکستان میں بھی تو اکیلی نہیں رہ سکتی نا۔''
''اکیلی کی کیا بات...... میری امی ہیں، بہن بھائی ہیں۔''
''بہن بھائی سب اپنے اپنے گھر کے...... آپ کی امی بھی بڑے بھائی بھابی کے ساتھ رہتی ہیں۔''
''تو تم بھی انہی کے ساتھ رہ لینا۔''
''میری شادی آپ سے ہوئی ہے۔ آپ کے بھائی بھابی کے ساتھ رہنے کے لیے نہیں ہوئی۔''
''بہرحال میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔''
یشا نے دانش کی شکایت مجھ سے کی۔
''غلطی تمہاری ہے یشا۔'' میں نے بے رحمی سے کہا۔
''میری غلطی؟'' وہ چونکی۔
''ہاں...... تمہیں شادی کے بعد دانش کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا۔ تم تو امی ابو کے ساتھ چپکی بیٹھی رہیں۔''
''انہیں میری ضرورت تھی نا آپا۔'' یشا جیسے شاک میں تھی۔
''تمہیں اپنے شوہر کی ضرورت بننا چاہیے تھا۔ جو لڑکیاں شادی کے بعد بھی میکے میں دل لگائے بیٹھی رہتی ہیں، شوہر کی ضرورت نہیں بن پاتیں۔''
''یہ آپ کہہ رہی ہیں آپا...... آپ کو پتا ہے میں شادی کے بعد میکے میں کس لیے بیٹھی رہی۔ میں تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی، آپ نے مجھے مجبور کیا۔ مجھے یقین دلایا کہ دانش کو شادی کے بعد میرے پاکستان میں رہنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''
''وہ تو دانش کو اب بھی نہیں ہے۔ تم اطمینان سے پاکستان میں رہو۔''

''مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ امی ابو کے بعد میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ مجھے دانش کی ضرورت ہے۔''
''مگر دانش کو شاید تمہاری ضرورت نہیں۔''
''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''
''جو میں نے محسوس کیا، وہ تمہیں بتادیا۔''
''لیکن مجھے دانش کی ضرورت ہے...... مجھے دانش کی محبت کی ضرورت ہے۔ مجھے فیملی کی ضرورت بھی ہے۔ شادی کو اتنے سال گزر گئے اور میری گود اب تک خالی ہے۔ دانش کے ساتھ رہوں گی تو ہی فیملی بنے گی نا آپا۔ اب تک تو بس وہ یہ کہتے رہے ہیں جب ہم دونوں ساتھ رہیں گے تو بچے کی سوچیں گے۔ بڑھاپے میں تو بچے پیدا نہیں کیے جاتے آپا۔ ایک وقت ہوتا ہے۔ اب دیکھیے نا آپ خود بھی جوان دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کے بچے بھی جوان ہوگئے۔ کیا میں بوڑھی ہوکر ماں بنوں گی۔''
''دانش سے پوچھو۔'' میں نے بڑی بے نیازی سے کہا۔
''آپ سمجھائیں نا انہیں۔''
میں تو اسے کب کا سمجھا چکی تھی کہ اگر اسے میرا بن کر رہنا ہے تو یشا کو ماں نہ بننے دے۔ ماں بن کر کمزور سے کمزور عورت بھی شوہر کو باندھ کر اس سے اپنا رشتہ مضبوط کردیتی ہے۔ دانش کو یشا سے نہیں، مجھ سے اپنا تعلق مضبوط رکھنا تھا۔ یشا کو دانش کے بھائی بھاوج کے گھر رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

☆☆☆

پانچ سال اور ماضی کی آغوش میں جا دبکے۔ زندگی کا نقشہ مزید پلٹ گیا۔ سنی اور موموجن کے بغیر جینے کا تصور بھی ناممکن تھا میرے لیے، اتنے دبے پاؤں میری زندگی سے نکلے کہ مجھے خبر ہی نہ ہونے دی۔ سنی کو ایک آئرش لڑکی نے اپنی سنہری زلفوں کا اسیر کرلیا اور دونوں ویسی ہی گناہ آلود زندگی گزارنے لگے جیسی کہ برسوں سے میں اور دانش گزار رہے تھے۔ مومو کو یونیورسٹی میں اپنے ایک مصری ہم جماعت سے پیار ہوا اور دونوں نے قاہرہ جاکر شادی کرلی۔
مختار کو برین ہیمرج ہوا۔ ان دنوں وہ ساؤتھ افریقا میں تعینات تھے۔ برین ہیمرج کے نتیجے میں وہ چلنے پھرنے اور بولنے سے معذور ہوگئے۔ ان کی دوسری بیوی جو کچھ سمیٹ سکتی تھی، سمیٹ کر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اپنی بڑی بہن کے پاس امریکا چلی گئی جو شادی کے بعد سے وہیں مقیم تھی اور بہن کو امریکا بلانے میں مددگار تھی۔ مجھے مختار کو اپنے پاس لانا پڑا۔ سنی

اور مومو کو خبر ملی تو وہ دونوں باپ کو دیکھنے کے لیے دبئی آئے۔
''ڈیڈ از لکی ماما کہ آپ ان کا خیال رکھنے کو ہیں۔'' مومو نے کہا۔
''لیکن مجھے اکیلے ان کی دیکھ بھال میں مشکل ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔
''کوئی لڑکا نوکر رکھ لیں جو ڈیڈ کو لک آفٹر کرنے میں آپ کی مدد کرسکے۔'' سنی نے مشورہ دیا۔
''جب مجھے تمہارے باپ کی ضرورت تھی تب تو وہ دوسری عورت کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے رہے۔'' میں نے گلہ کیا۔
''کم آن ماما...... ڈیڈ نے ہمیں کسی چیز کی کمی تو نہیں ہونے دی۔'' مومو نے باپ کے دفاع میں کہا۔
''جس شخص نے ساری زندگی آپ کی ضرورتوں کا خیال رکھا ہو، اس کا ایسے وقت میں تو بہت خیال رکھا جانا چاہیے۔'' سنی نے باپ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔
''اب اس سے زیادہ کیا خیال رکھوں گی۔ وقت پر ناشتا، وقت پر کھانا، صاف ستھرا لباس، ستھرا بستر۔''
''ان کا دل بھی بہلایا کریں۔ پاس بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں، اچھا میوزک، ان سے ان کے بہن بھائیوں کی باتیں۔'' مومو بولی۔
''اتنا فالتو وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔''
''مدر ڈیئر۔'' مومو میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر مجھے پیار کرتے ہوئے بولی۔ ''اس عمر میں وقت ہی تو ہوتا ہے آدمی کے پاس۔''
''آپ کو بھی ایک ساتھی کی ضرورت تو ہے نا۔'' سنی نے کہا۔
''جو مجھے آرام پہنچا سکے۔'' میں نے سنی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔
''اوکے...... اوکے مام۔'' سنی دونوں ہاتھ عموداً کھڑے کرتے ہوئے مسکرایا۔ ''نا ؤ سیز فائر...... اب آپ کی اور ڈیڈ کی پکی پکی صلح ہوجانی چاہیے۔''
''ورنہ......'' مومو نے لقمہ دیا۔
''ورنہ؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے مومو کو دیکھا جو بڑی معنی خیز نگاہوں سے سنی کو دیکھ رہی تھی۔
''ہم لوگ پھر کبھی آپ سے ملنے کے لیے نہیں آئیں گے...... کیوں سنی؟''
''یس۔'' سنی نے مومو کی بات کی پرجوش تائید کی۔
''ان کا اپنا گھر ہے، رہ تو رہے ہیں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''آپ انہیں خوش رکھیں۔''
''مجھے ڈکٹیشن دینے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مومو کو گھورا۔ اپنے اور دانش کے بیچ مختار کا آنا مجھے انتہائی درجہ کھل رہا تھا۔
مومو اور سنی چند دن رہ کر پھر اپنے اپنے مقام پر واپس چلے گئے۔ مختار کی معذوری میرے اور دانش کے لیے نہایت غنیمت تھی۔

☆☆☆

یشا اپنی ساس کے ساتھ دانش کے بڑے بھائی کے گھر میں رہ رہی تھی۔ اس کی ملازمت جاری تھی۔ اکثر اپنے لنچ بریک کے دوران یا پھر رات کو اس کا فون آجاتا۔ امی ابو کے بعد دانش سے اپنی دوری پر وہ بہت اداس رہنے لگی تھی۔ مجھ سے بات کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیتی۔ رات کو جب اس کا فون آتا تو اکثر دانش بھی اس کی باتیں اوور ہیئر کررہا ہوتا۔
''آپ نے تو اتنے سال مختار بھائی کے بغیر گزارے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے نا آپا مرد کے بغیر عورت کی زندگی کتنی ادھوری ہوتی ہے۔'' اس کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوتی۔
''میری طرح ہمت کرو یشا۔'' میں اسے اوپری دل سے دلاسا دیتی۔
''آپ کے پاس سنی اور مومو تو تھے نا آپا...... میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔'' وہ روہانسی ہوجاتی۔
''اللہ سے دعا کرتی رہا کرو۔''
''بہت کرتی ہوں آپا مگر...... بچے آسمان سے تو نہیں ٹپکتے۔ دانش بچے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ بوڑھے ہوکر بچے پیدا کرنے کی سوچیں گے شاید یا کیا پتا تب بھی نہ سوچیں۔'' وہ اور دکھی ہوجاتی۔
''میں تمہارے لیے بہت دعا کرتی ہوں یشا۔'' میں جھوٹ موٹ کہتی۔
یشا بوجھل آواز اور اداس لہجے میں مجھے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیتی۔ دانش نزدیک ہوتا تو میں اس سے کہتی۔ ''سن رہے تھے نا تم؟'' وہ اثبات میں سر ہلاتا۔
''یشا کو بچے کی بڑی خواہش ہے۔'' میں اپنی بات پر دزدیدہ نگاہوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی۔
''سنا ہے ماں بننے کی خواہش ہر شادی شدہ عورت کو ہوتی ہے۔'' وہ کہتا۔
''سنا تو یہ بھی ہے کہ باپ بننے کی خوشی مرد کو عورت سے زیادہ ہوتی ہے۔'' ایک روز میں نے کہا۔
''عورت بے چاری باپ جو نہیں بن سکتی۔'' اس نے پھوکے منہ سے کہا پھر اپنی ہی بات پر زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔

ماں بننے کی یشا کی خواہش پر اس کے غیر سنجیدہ پن سے مجھے یک گونہ خوشی اور تقویت محسوس ہوتی مگر کب تک......؟

☆☆☆

یشا نے ایک دن بڑی عجیب بات کی۔

''آپا آپ کو پتا ہے دانش کی بڑی بھابی نے خاندان میں کیا مشہور کردیا ہے دانش کے بارے میں؟''

''کیا؟'' مجھے اپنا دل یکبارگی ساکت سا ہوتا لگا۔

''انہوں نے یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ دانش تو بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔'' دانش نزدیک ہی بیٹھا سن رہا تھا۔

''یہ بات وہ تمہارے بارے میں بھی تو کہہ سکتی تھیں۔'' میں نے یشا سے کہا۔

''شاید کہہ دیتیں مگر آپ کو شاید یاد نہیں رہا، میں نے آپ کو بتایا تھا نا دانش کی امی نے اپنے اطمینان کے لیے انہی کے ساتھ بھیج کر میرے ٹیسٹ کروائے تھے۔ میری رپورٹس تو ٹھیک آئی تھیں۔ میں نے انہیں بتا بھی دیا کہ دانش کہتے ہیں جب اکٹھے رہیں گے تو فیملی کا سوچیں گے مگر انہوں نے پھر بھی خاندان میں یہ بات اڑا دی ہے۔''

میں نے کن انکھیوں سے دانش کو دیکھا۔ جبڑوں پر دباؤ کے باعث اس کے جبڑوں کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔

''سن لیا؟'' یشا سے بات کرنے کے بعد میں نے دانش سے کہا۔

اس نے اپنی بائیں ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کا مکا پوری قوت سے مارا اور دانت پیس کر بڑبڑایا۔ ''شٹ!''

☆☆☆

ہر تعلق، ہر جذبے کی ایک عمر ہوتی ہے۔ میرے اور دانش کے تعلق کی عمر بھی تمام ہوتی محسوس ہونے لگی۔ یشا سے اس کی شادی کے بعد گزشتہ برسوں میں کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ وہ اتنی جلدی جلدی پاکستان گیا ہو۔ ہفتہ بھر بعد ہی دانش نے اچانک پاکستان جانے کی تیاری کرلی۔

''اس قدر اچانک پاکستان جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تمہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''اپنے وطن کی یاد کسے نہیں آتی۔'' اس نے جھینپ کر جواب دیا۔

''وطن کی یاد آئی ہے یا......؟'' میرے لہجے اور نگاہوں دونوں میں چبھن تھی۔

''یا؟'' اس نے بے اختیار میری طرف دیکھا۔

''جانے دو۔'' میں نے شاہانہ لہجے میں کہا۔

''جانے دیا۔'' اس نے مجھ سے بھی زیادہ شہنشاہی دکھائی اور خجل سی ہنسی ہنس دیا۔

''کتنے دن کے لیے جا رہے ہو؟''

''زیادہ نہیں..... ویک اینڈ کے ساتھ تین دن کی چھٹی اور لی ہے۔''

بالآخر وہ چلا گیا اور میں اپنے گھر میں اپنے علاوہ دو اور نفوس کے ہوتے ہوئے بھی تنہا رہ گئی۔ مختار کا ہونا تو جیسے نہ ہونے جیسا تھا۔ وہ عضو معطل بنے اپنے بستر پر پڑے رہتے۔ ٹیپوان کا کیئر ٹیکر تھا۔ ایک بنگلا دیشی نوجوان جو دن رات ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ انہیں کروٹ دلاتا، بہ ضرورت اٹھاتا، تکیوں کے سہارے بٹھاتا، کھلاتا پلاتا، نہلاتا دھلاتا اور حوائج ضروریہ سے فراغت میں مدد دیتا۔ ٹیپو کا معاوضہ کھانا، پینا، رہائش اور معقول ماہانہ تنخواہ تھی۔ پیسوں کی مجھے کوئی تنگی نہ تھی۔ مختار نے اچھے دنوں میں میرے نام پر معقول سیونگ کر رکھی تھی۔ مومو اور سنی بھی باقاعدگی سے پیسے بھجواتے رہتے تھے۔ میری زندگی میں کمی تھی تو رشتوں کی جو ہوتے ہوئے بھی نہ رہے تھے۔ شوہر معذور، بچے دور، ایک ہی گھر کی چھت تلے رہتے ہوئے مختار سے میرا تعلق اجنبیوں کی طرح رہ گیا تھا۔ میں ان کے کمرے میں جاتی تو وہ مجھے دیکھتے اور بس! ان کی نگاہوں سے بے بسی ٹپکتی۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو بھی دکھائی دیتے جنہیں پونچھے بغیر میں چپ چاپ ان کے کمرے سے نکل آتی۔ کون یقین کرسکتا تھا کہ ہم دونوں نے بھی یک جان دو قالب ہو کر بھی زندگی گزاری تھی۔

دانش پاکستان سے واپس لوٹا تو میں نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ''یشا کیسی ہے؟''

''آپ کی تو روزانہ بات ہوتی ہے اس سے۔'' اس نے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے اس نے میری کوئی فاش غلطی پکڑ لی تھی۔ اپنی خفت اس پر ظاہر کیے بغیر میں نے قدرے ترشی سے کہا۔ ''تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔''

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''بس ٹھیک!'' میرے لہجے میں حاسدانہ چبھن تھی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

میری ناک کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ لبوں پر جلی بھنی مسکراہٹ امڈ آئی۔ ''وطن کی یاد تو بہانہ تھی تم اسی کے لیے گئے تھے نا!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے جھینپ کر نظریں چرالیں مگر دھیمی آواز میں بولا۔ ''آفٹر آل شی از مائی وائف۔''

میرا رواں رواں سلگنے لگا۔

دور سے آتے کسی طوفان کی سنسناہٹیں میرے رگ و پے میں اترنے لگیں۔

☆☆☆

آنے والے مہینوں کے دوران دانش کے معمول میں ایک نمایاں تغیر رونما ہوا۔ وہ جو یشا اور اپنے گھر والوں کے بار بار اصرار کے باوجود طویل وقفوں سے پاکستان جانے کو آمادہ ہوا کرتا تھا، اب جلدی جلدی پاکستان جانے لگا، کبھی ویک اینڈ کے ساتھ دو تین دن کی مزید رخصت لے کر، کبھی کوئی تہوار گھر والوں کے ساتھ منانے کے بہانے تو کبھی اپنی والدہ کی قدم بوسی کو۔ جب وہ مختصر وقفوں کے ساتھ تیسری چوتھی مرتبہ پاکستان جانے کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے اسے ٹوکا۔ ''کیا بات ہے بہت جلدی جلدی پاکستان جانے لگے ہو۔''

''آں..... ہاں.....'' وہ پہلے گڑبڑا گیا پھر اس نے بات بنائی۔ ''امی بے چاری بوڑھی ہیں جانے کتنے دن کی مہمان..... سوچتا ہوں جتنی دعائیں لے سکتا ہوں لے لوں۔''

''امی تو پہلے بھی بوڑھی ہی تھیں۔ کوئی اچانک تو نہیں آگیا ان پر بڑھاپا۔'' میں نے اس کی غلطی پکڑی پھر اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ اچانک تمہیں امی کے بڑھاپے اور ان سے دعائیں لینے کی فکر کیوں ہونے لگی؟''

''بھئی آخر ہمیں بھی تو بوڑھا ہونا ہے۔'' اس نے جھینپ کر نظریں چراتے ہوئے مسکرانے کی ناکام کوشش کے ساتھ کہا پھر یکایک اس کا لہجہ بدل گیا۔ ''اولاد کتنی ہی ناخلف ہو بالآخر ماں باپ کی طرف جھکتی ہے..... وہ کہتے ہیں نا۔ کھوٹا سکہ اور اپنی اولاد انسان کے وقت پر کام آتے ہیں۔''

''دنیا اب اتنی بے وقوف نہیں رہی..... خود غرض ہوگئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے بے ساختہ چونک کر میری جانب دیکھا۔

''نہ کھوٹا سکہ چلتا ہے اب اور نہ ہی اولاد کام آتی ہے۔ مجھے دیکھو دو بچے ہیں مگر دونوں اپنی اپنی زندگی میں مگن۔''

''یہ تو اپنی باری کی بات ہے یا کیے کا پھل..... یاد کیجیے شاید آپ بھی اپنی باری پر اپنی زندگی میں اتنی ہی مگن رہی ہوں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے اسے قدرے برہمی سے دیکھا۔ ''اور بائی دی وے یہ تم مجھ سے آپ جناب سے بات کیوں کرنے لگے ہو پھر سے؟''

وہ نظریں چرانے لگا۔

میں اس کے روبرو جا کھڑی ہوئی۔ ''اے!'' میں نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے.... بے وقوف سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔''

وہ چونک کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

میرے لبوں پر زہرخند مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''تم اگر اس غلط فہمی میں ہو کہ تم سے آپ جناب پر آکر تم مجھے دوبارہ اسی مقام پر لے جا کھڑا کرو گے جہاں میں کبھی ہوتی تھی تو یہ تمہاری بھول ہے۔'' میں نے توقف کیا پھر کہا۔ ''میں بچی نہیں ہوں..... تمہارے تیور بدلتے دیکھ رہی ہوں..... تم مجھ سے دامن چھڑانا چاہتے ہو۔ یہی بات ہے نا!''

وہ کچھ نہیں بولا۔

میں نے ایک گہری سانس کھینچی۔ جسم کو تازہ آکسیجن کی فراہمی نے مجھے توانائی کا احساس دیا۔ ''میں اتنی آسانی سے تمہیں فرار کا راستہ نہیں دوں گی۔''

''یشا آپ کی بہن ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''مجھے اس سے پیار بھی ہے اور..... ہمدردی بھی۔''

''تو پھر آپ کو کیوں میرے اس کی طرف بار بار جانے پر اعتراض ہے..... بے چاری کتنے عرصے سے ایک بچے کے لیے تڑپ رہی ہے..... میں نے اسے اس خوشی سے محروم رکھا۔''

''یہ سب اللہ کے فیصلے ہوتے ہیں۔''

''بندوں کی رذالت بھی ہوتی ہے..... وہ جب بچے کی بات کرتی میں بہانہ کردیتا..... اسے بہلانے کی کوشش کرتا..... کیونکہ میں کسی نئے تعلق کی ڈور میں بندھ کر آپ کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اسے تیوری چڑھا کر دیکھا۔

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے..... میں نے یشا کے ساتھ زیادتی کی اور شاید اپنے ساتھ بھی..... ہمیں اب تک اپنی فیملی بنا لینی چاہیے تھی..... سنی اور مومو اپنی اپنی زندگی میں کتنے ہی مگن سہی مگر کبھی تو آپ کو اور مختار بھائی کو یاد کر ہی لیتے ہیں۔ امی کہتی ہیں اولاد بہت خوب صورت رشتہ ہوتا ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کو مضبوط کرتا ہے..... آپ سے میرا تعلق برسوں بھی رہے تو ریت کا گھروندا ہے۔ میں یشا سے اپنا تعلق مضبوط کرنا چاہتا ہوں۔''

میرے ہاتھ آپ ہی آپ اس کے گریبان تک جا پہنچے۔ میری گرفت اتنی شدید تھی کہ اپنا گریبان چھڑانے کے لیے اسے مجھے جھٹکا دینا اور پرے دھکیلنا پڑا۔ میں دم بخود اسے دیکھتی رہ گئی۔ میرے پاس کہنے کو تھا ہی کیا۔

دانش پاکستان چلا گیا۔

☆☆☆

ان دنوں پھر وہ پاکستان گیا ہوا تھا۔ یشا نے مجھے فون

کر کے خوش خبری سنائی کہ وہ امید سے تھی۔

''آئی ایم سو ہپی آپا!'' اس کے لہجے میں کسی البیلی نار کی سی کھنک تھی۔

''سی ٹو میشا!'' مجھے اپنی آواز کسی اندھے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

''اوہ اٹس ونڈرفل آپا...... میں اس خوشی کو اب محسوس کر سکتی ہوں جو آپ نے سنی اور موموکو کنسیو کرنے پر محسوس کی ہوگی...... آپ اس خوشی کے احساس کو الفاظ میں تو بیان نہیں کر سکتے نا آپا۔'' اس کے لفظ لفظ سے خوشی پھوٹے پڑ رہی تھی۔

''ہاں میشا!'' مجھے اپنا دل منوں بوجھ تلے دبا لگ رہا تھا۔ مومو اور سنی کا ذکر کر کے اس نے میرا دل اور دکھا دیا تھا۔ وہ دونوں اب میری زندگی میں کہاں تھے۔ ان کی اپنی اپنی زندگی تھی۔ دونوں بہت مگن تھے اپنی اپنی دنیا میں۔ کبھی کبھی مجھے اور مختار کو فون کر لیتے۔ کھلے ہاتھوں پیسے بھجوا دیتے یا ہماری سالگراہوں پر ہمیں وش کر دیتے۔ فون پر پیار کر لیتے اور بس...... ان کے اور اپنے تعلق کو استار کی، اتنا محدود خود ہم نے کیا تھا گلہ کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مختار تو ان کے فون کا جواب دینے سے بھی قاصر تھے۔ فون ان کے کان سے لگا دیا جاتا تو ان کی آوازیں سن کر اپنے منہ سے مبہم سی آوازیں نکالتے۔

''آپا! دانش کہتے ہیں کہ وہ مستقل پاکستان آجائیں گے...... اپنے بچے کی خاطر...... ہے نا اچھی خبر؟''

''اچھی خبر!'' میرا دل بیٹھ رہا تھا۔

''آپا ماں بننا کیسا زبردست تجربہ ہوتا ہے۔ عورت کے پاؤں زمین پر ہی نہیں رہتے۔ ہواؤں میں اڑنے لگتی ہے جیسے...... مجھے اپنا آپ اتنا امپورٹنٹ لگ رہا ہے۔ دانش کہہ رہے تھے کہ انہیں معلوم ہے مجھے اب لمحہ لمحہ ان کی ضرورت ہوگی...... وہ کہہ رہے تھے اب میرے پاس ہی رہیں گے۔'' میشا بولے جا رہی تھی، ہواؤں میں اڑ رہی تھی اور میں گنگ تھی گہرے پانیوں میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

دانش پاکستان سے واپس لوٹا تو اس نے مجھ سے نظریں چرا رکھی تھیں۔ وہ وارفتگی، وہ والہانہ پن جس کا وہ مجھے عادی بنا چکا تھا عنقا تھا۔ میں منتظر رہی کہ وہ کچھ کہے اور کچھ نہیں تو میشا کے امید سے ہونے کی خبر ہی سنائے مگر وہ چپ تھا اور میں زیادہ دیر انتظار کی کوفت نہیں اٹھا سکتی تھی سو میں نے اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے خود ہی پہل کی۔ ''خوشخبری سنی ہے میں نے۔'' اس کے ردعمل کا جائزہ لینے کے لیے میں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ اس کی خاموشی نہ ٹوٹی۔

''میشا تو بہت خوش ہوگی؟''

''ہاں۔'' اس نے فقط اتنا ہی کہا۔

''اور تم؟''

وہ خاموش رہا۔

''تم خوش ہو؟''

وہ پھر چپ رہا۔

''میشا بتا رہی تھی تم نے پاکستان میں اس کے ساتھ ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' میں جیسے کسی دیوار سے ہمکلام تھی۔

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر نظریں چرا کر بولا۔ ''میں اپنی جاب سے ریزائن کر رہا ہوں۔''

ملازمت سے اس کے استعفے کا سبب پوچھنا ضروری نہ تھا۔ سو میں نے کہا۔ ''تم میشا کو یہاں بھی تو بلا سکتے تھے۔'' میری آواز گہرے صدمے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''مشکل ہو جاتی۔''

''مشکل!...... کیسی مشکل؟''

''اس کی موجودگی میں، میں آپ کی طرف نہ دیکھ پاتا اور آپ کی موجودگی میں اس سے نظریں نہ ملا پاتا۔'' یکایک اس کے لہجے میں تیزی آگئی۔ ''آپ مختار بھائی کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں شفٹ ہو جاتیں؟''

میں نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ ''خود مشکل میں پڑنا نہیں چاہتے اور مجھے مشکل میں ڈالنا چاہتے ہو۔'' میری آواز میں درد امڈ آیا۔ ''مجھے اب یہیں رہنا ہے...... مختار کے ساتھ...... شاید یہی ایک رشتہ باقی رہ گیا ہے میری زندگی میں...... بچے اپنے راستوں پر نکل گئے...... بہن سے اپنا رشتہ میں نے اپنے ہاتھوں مسخ کر دیا ہے...... کاش!...... کاش!'' میں جو اپنے جذبات کی رو میں اس سے بات کرتے کرتے کھڑکی تک جا پہنچی تھی اپنا رخ پلٹ کر اسے گھائل نظروں سے دیکھتے ہوئے تلخی سے بولی۔ ''کاش! میں شیطان کے بہکائے میں نہ آئی ہوتی۔''

وہ کچھ ایسے سٹپٹا گیا جیسے میں اسی کو شیطان کہہ رہی ہوں۔

میری آنکھیں پچھتاوے کے آنسوؤں سے بھیگنے لگیں۔ میرا حلق درد کی شدت سے چٹخنے لگا۔ ''مختار کی دوسری شادی میرے لیے کتنا ہی بڑا صدمہ سہی مجھے اپنی آبرو کی حرمت کا پاس رکھنا چاہیے تھا۔ مرد تو کبھی بھی بہک سکتا ہے عورت کو ثابت قدم ہونا چاہیے۔ اگر میں اس کڑی منزل سے ثابت قدمی سے گزر جاتی تو آج...... آج میشا کی طرح سرخرو ہوتی...... اس روز

جب وہ فون پر مجھ سے بات کر رہی تھی تو اس کی آواز میں کسی فاتح کا سا غرور تھا...... اس نے تمہارا انتظار کیا اور سرخرو رہی...... میں نے بے صبری دکھائی اور اپنی ہی نظروں میں گر گئی۔" میری آواز بھرا گئی۔ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر میں نے اپنا ہزیمت زدہ چہرہ اس سے چھپالیا۔ مجھے اس کے بھاری قدموں کی چاپ اپنے نزدیک ہوتی سنائی دی پھر اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "آئی ایم سوری۔"

میں نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹالیے۔ وہ مجرم کی طرح نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ میری نگاہیں بھی آپ ہی آپ جھک گئیں۔ "ہم دونوں ہی گناہ گار ہیں۔ میری آواز احساسِ ندامت سے بوجھل تھی۔ "قصوروار مختار بھی ہیں جنہوں نے جوان بیوی کو ایک نامحرم مرد کے ساتھ چھوڑ کر گھر سے جاتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ آدم اور حوا کو جنت سے نکلوانے والا شیطان مسلسل ان کی راہ کھوٹی کرنے کو ان کے تعاقب میں ہے...... اس نے خدا سے کہا تھا نا دائیں بائیں، آگے، پیچھے ہر طرف سے تیرے بندوں کی راہ ماروں گا...... مختار کو سوچنا چاہیے تھا کہ ان کے اندھے اعتماد کا نتیجہ ان کے گھر کی بربادی بھی ہوسکتا ہے۔" میں پل بھر کو تھمی پھر میں نے اپنا رخ کھڑکی کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔ "خدا ہماری غلطیوں پر ہمیں سزا دینے کے لیے آسمان سے ہم پر لٹھ نہیں برساتا...... ہماری خطاؤں کی سزا ہمیں اور ہی طرح ملتی ہے...... بس حساب کتاب سمجھنا پڑتا ہے...... مختار کی دوسری شادی کا انتقام لینے کے لیے میں اپنے راستے سے بھٹک گئی جو بہرحال میری بہت بڑی اور ناقابلِ معافی بھول تھی...... میں ایک کے بعد ایک اپنے رشتے کھوتی چلی گئی...... کیا ضرورت تھی مجھے سنی اور مومو کو اپنی زندگی سے نکالنے کی...... انہیں نکالا تو خود بھی تنہا رہ گئی...... مختار کو ان کی دوسری بیوی چھوڑ گئی اور بچے بھی ان سے دور لے گئی...... مختار زبان سے اظہار نہیں کرسکتے تو کیا ہوا مگر اپنے بچے یاد تو آتے ہوں گے انہیں...... اس یاد کا کرب مختار کے سوا کون محسوس کرسکتا ہے...... اور وہ بچے جن کے بہتر مستقبل کے لالچ میں مختار مجھے پردیس میں ایک نامحرم کے ساتھ چھوڑ گئے تھے اپنی اپنی دنیا میں اتنے مگن ہیں کہ انہیں کم ہی میری اور اپنے باپ کی یاد آتی ہے۔" میری آواز ڈوبنے لگی، لہجے میں درد گھل گیا۔ "یہ وہ وقت تھا جب مجھے اور مختار کو اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کے ساتھ مل بیٹھ کر اپنی زندگی کا یہ دور گزارنا چاہیے تھا مگر ہم اپنی ہی غلطیوں کے ہاتھوں خسارے سے دوچار ہوچکے ہیں......

اوہ خدا! خسارے کا یہ احساس کتنا کرب انگیز ہے۔" پچھتاوے کے احساس سے میرے جبڑے بھنچ گئے۔

"آئی ایم پارٹ آف اٹ...... میں بھی اس خسارے کا حصہ ہوں۔" مجھے اپنے.... عقب سے دانش کی ندامت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

میں پلٹی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اقرارِ جرم اس کہانی کا اختتام نہیں ہے...... جانتے ہو ہم سے جو گناہ سرزد ہوا ہے اس کی سزا کیا ہے؟"

وہ بت بنا مجھے دیکھ رہا تھا۔

"رجم۔" میں نے کہا۔ "ہم دونوں کو سنگسار کیا جانا چاہیے...... اسلام ایک شادی شدہ عورت اور شادی شدہ مرد کے درمیان ناجائز تعلقات کی یہی سزا تجویز کرتا ہے...... بھرے مجمع میں اپنے اور پرائے ہم پر اتنے پتھر برسائیں کہ ہم جان سے جاتے رہیں مگر...... ہم دونوں میں سے کس میں اتنی ہمت ہے کہ یہ سزا برداشت کرسکے اور اس سے پہلے اپنے اس گناہ کا دنیا کے سامنے اعتراف کرسکے۔"

اس نے پھر ایک نظر مجھے دیکھا۔

میرا سر جھک گیا۔ آواز شدتِ ندامت سے بوجھل ہوگئی۔ "ہم انسان گناہ کے راستے پر قدم رکھتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ گمراہی شیطان کا راستہ ہے...... شیطان جو ازل سے ہم انسانوں کا دشمن ہے اور ہمیں اللہ کے راستے سے ہٹانے کے لیے کبھی دائیں کبھی بائیں اور کبھی آگے، پیچھے سے ہمیں گمراہ کرنے کی تاک میں رہتا ہے...... اور ہم اچھی طرح یہ جانتے ہوئے بھی کہ رحمان کا راستہ اور ہے شیطان کا اور...... پھر کیوں بھٹک جاتے ہیں...... کیوں اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھتے ہیں؟"

دانش نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کردیے۔ "مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں نہیں جانتا میری غلطیوں کی سزا مجھے کیا ملے گی اور میری ہونے والی اولاد میرے کتنے قریب ہوگی یا میری طرح...... آپ بس مجھے معاف کردیجیے گا۔"

میں عرقِ ندامت میں ڈوبنے لگی۔

"ہمیں اس سے معافی مانگنی ہے۔" میں نے آسمان کے رخ پر اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ میری پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ وجود لرز رہا تھا اور دل جیسے ڈوب رہا تھا۔

ہر سیاہ کار، گناہ گار کی طرح میں بھی اسی رب سے معافی کی طلب گار تھی جو اوپر بیٹھا ہماری جلوت ہی نہیں خلوت میں بھی ہمیں دیکھ رہا ہے۔